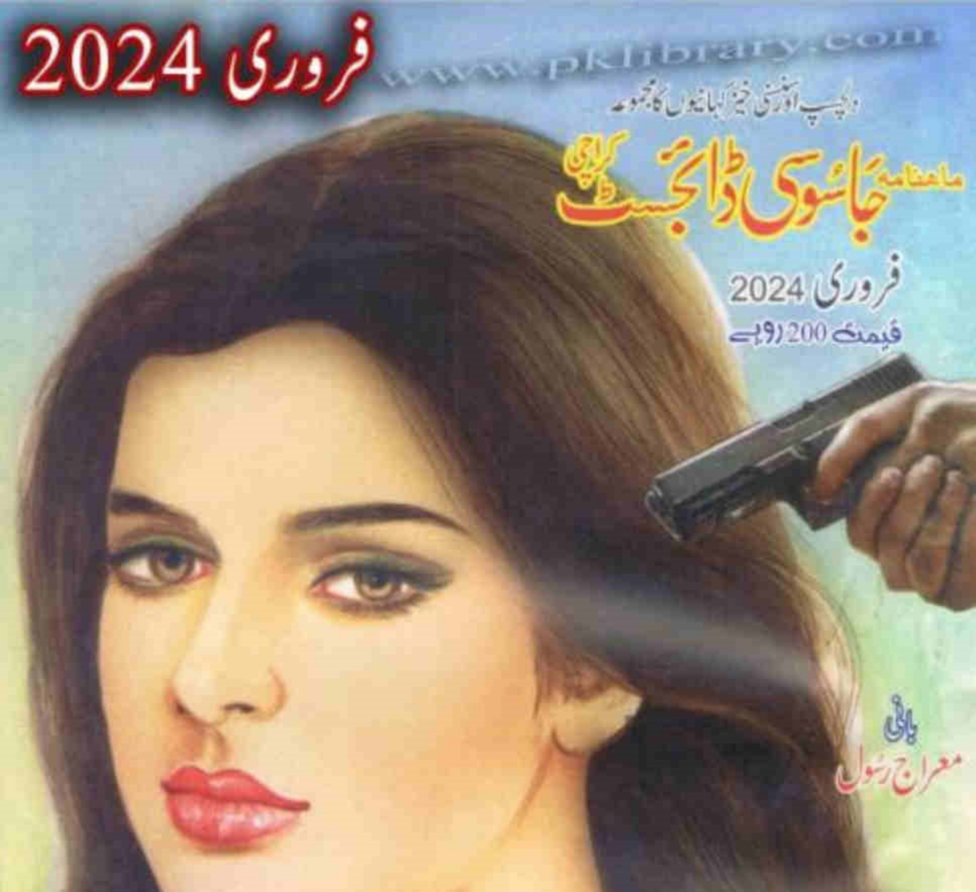

فروری 2024
www.pklibrary.com
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
فروری 2024
قیمت 200 روپے
بانی
معراج رسول

07
چینی نکتہ چینی
مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

12
رونقِ رنگِ چمن
ادارہ
جے ڈی پی کے بانی معراج رسول
کی برسی پر کچھ یادیں کچھ باتیں

14
آئی قیامت
امجد رئیس
سنسنی خیز ناقابل فراموش لمحوں میں دوسروں کے
لیے اپنی زندگی دان کردینے والی فیصلہ کن گھڑیاں

45
گندے انڈے
عکس فاطمہ
الجھن و سلجھن کے سنگین معاملات
میں الجھی خیر و شر کی مقدار و طوالت

53
اُمید کا مینار
یعقوب بھٹی
اُمید، ہمت، محبت اور پھر
بدنصیبی کی اندھیری رات کا مسافر

65
ہمدم
شمرین شمیم
مشاہدے کی عادت اور
تجربے کی نگاہ کا کارگر ہدف

70
دہر
حسام بٹ
چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے
عیار ذہنوں کی ہوش ربا حیلہ سازیاں

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

مارکیٹنگ و
سرکولیشن مینجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789



چینی، نکتہ چینی

مدیرِاعلیٰ

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

فروری 2024ء کے دوسرے شمارے کے ساتھ حاضر ہیں۔ سردی کے ساتھ ساتھ ملک کے طول و عرض میں الیکشن کا موسم بھی شروع ہو چکا ہے۔ تاہم ہر جگہ روایتی گہما گہمی کا شدید فقدان نظر آتا ہے۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کے مطابق 8 فروری کی تاریخ عام انتخابات کے لیے پتھر کی لکیر ہے۔ سیاسی جماعتیں اپنے اپنے طور پر متحرک ہو رہی ہیں اور رفتہ رفتہ انتخابات کا ماحول بننے لگا ہے۔ امید ہے کہ سب مراحل خوش اسلوبی اور احسن طریقے سے انجام پائیں گے۔ سالِ نو کے آغاز میں ہی ملک میں مہنگائی کی شرح بڑھنے کا رجحان ہنوز جاری ہے۔ ملک کی سیاسی غیر یقینی صورتِ حال اور بڑھتی مہنگائی کے باعث عام آدمی کی پریشانی اور صحت دونوں شدت سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق سردی کے رواں موسم کے دوران پنجاب بھر میں نمونیا پھیلنے کے باعث کافی افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ یہ انتہائی تشویش کن صورتِ حال ہے۔ ملک کے تمام علاقے خشک سالی اور شدید سردی کی لپیٹ میں ہیں۔ احتیاطی تدابیر نہ کرنے سے بچے، بوڑھے اور جوان بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ طبی ماہرین کی ہدایات کے مطابق تمام ضروری اقدامات کرنا ازحد ضروری ہیں۔ ملک کے منظرنامے کے ساتھ فلسطین کی کشیدہ صورتِ حال کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مہینوں سے جاری اس بہیمانہ جنگ میں ہزاروں فلسطینی شہید ہو چکے ہیں...... مگر ابھی تک ایسا کوئی عمل سامنے نہیں آیا کہ جنگ بندی کا امکان پیدا ہو سکے۔ معصوم، نہتے فلسطینی دنیا کے مواصلاتی رابطے سے کٹے ہوئے ہیں۔ جو زندہ ہیں...... وہ بھوک و پیاس کی انتہائی شدید تکلیف سے گزر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔ اس دعا کے ساتھ اپنی محفل کی طرف بڑھتے ہیں جہاں ... دوا اور دعا دونوں علاج شدت سے موجود ہیں۔

کراچی سے محمد اقبال کی پسندیدگی ”2024ء کے پہلے ماہ یعنی جنوری کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ جب ہاتھ آیا تو دل خوش ہو گیا۔ ٹائٹل پر خوب صورت حسینہ چھائی ہوئی ہے۔ ستاروں کی جھلملاہٹ بھی اس کے سامنے ماند پڑ رہی ہے۔ صنفِ کرخت کے ہاتھوں میں شعلہ اگلتی پستول ہے اور چہرے پر اس حسینہ سے جیلسی صاف نظر آرہی ہے۔ مجموعی طور پر ٹائٹل چھا گیا ہے جی۔ ویل ڈن ظفر صاحب۔ فہرست کا نیا انداز پسند آیا، خوب محنت کی گئی ہے۔ محنت کیوں نہ کی جائے جی، سال کا پہلا شمارہ جو ہوا۔ فہرست میں وہ تمام رائٹرز موجود ہیں جنہیں ہر قاری پڑھنا چاہتا ہے، فہرست میں یعقوب بھٹی کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، بہت نکلے میرے ارمان پھر بھی کم نکلے۔ اداریے کی ابتدا جس شعر سے کی گئی بہت پسند آیا۔ لہو میں ڈوبے فلسطین کی حالتِ زار پڑھ کر دل رنجیدہ ہو گیا۔ باقی امیدیں نئے الیکشن سے وابستہ ہیں جس کے ذریعے بدلاؤ کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس بار عوام کے ووٹنگ کا ریشو پچھلے الیکشنز سے بہت کم ہوگا۔ چینی نکتہ چینی کے آٹھ صفحات دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ مسندِ صدارت پر سڈنی سے ڈاکٹر ارسلان شاہ اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ براجمان ہیں، مبارکاں جی۔ شاندار تبصرہ ہے۔ دوسرے نمبر پر ملتان سے جنید علی نے بھی ٹکر کا مقابلہ کیا۔ خوب گزری جو مل بیٹھے جاسوسی ڈائجسٹ کے دیوانے دو۔ دونوں کے خط دیکھ اور پڑھ کر ایسا لگا جیسے سڈنی کرکٹ گراؤنڈ پر دونوں کا ڈبل وکٹ میچ ہو رہا ہے۔ سڈنی کا گراؤنڈ میرا پسندیدہ ہے اور باقی ہم تمام تبصرے نگار اپنے تبصروں کے ساتھ شائقین بنے ہوئے ہیں۔ تمام دوستوں سے گزارش ہے کہ ہر ماہ پابندی سے اپنے تبصرے بھیجا کریں، شکریہ۔ کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس کی آبی قیامت پڑھی۔ آبی قیامت نے تو واقعی قیامت کا منظر نظروں میں گھما دیا۔ کیا تیز رفتار اور سنسنی خیز تھرل تھا۔ کائی تناکا، اور اس کے ساتھی اپنی بھرپور کوششیں کر رہے ہیں کہ کسی طرح اس آنے والی تباہی سے اپنے لوگوں کو بچا سکیں۔ اگلے حصے میں معلوم ہوگا کہ وہ اپنی کوششوں میں کتنے کامیاب ہوئے۔ بزدل مجرم کے ساتھ اسما قادری کی کاوش بہت پسند آئی۔ یہ ٹرینڈ بہت زیادہ چل رہا ہے اس سے لوگوں کو آگاہ کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ اسما قادری نے بہت خوب صورتی سے قارئین کو اس جانب متوجہ کیا۔ گمنام مسیحائی کے ساتھ زویا صفوان نے انٹری دی۔ ایک بہترین کہانی ترتیب دی زویا صفوان نے۔ ان کا اندازِ تحریر بہت دلکش ہے ویلڈن زویا صفوان۔ حسام بٹ کی دہر بہت بھرپور انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ کہانی کا ٹیمپو تیز چل رہا ہے۔ سلور کوئین کی ہدایت پر ڈیوڈ اور اس کے حواری جاسم کے خلاف ایکشن میں آگئے ہیں لیکن وہ جاسم کو نہیں جانتے۔ جاسم کی صلاحیتیں بھرپور انداز میں سامنے آرہی ہیں، سلور کوئین اور ڈیوڈ اپنے زخم چاٹنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ آخر میں ایک نئے کردار لینا کا اضافہ ہو گیا، نئی قسط

کا انتظار ہے۔ اس کے بعد طاہر جاوید مغل کی قاتل مسیحا پڑھنا شروع کی۔ جادو رائے کی ٹیم کے ساتھ تابش، عمران، حسام، ماہین وغیرہ اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جس مقصد کے لیے جادو رائے نے اتنا کٹھن سفر شروع کیا تھا۔ اس قبیلے کے رسم و رواج اور عورتوں کی اجارہ داری کے بارے میں پڑھ کر عجیب سا احساس ہوا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا۔ دیکھنا یہ ہے کہ طاہر جاوید مغل، تابش اور اس کی ٹیم کو ان مشکل حالات سے کس طرح نکالتے ہیں بلاشبہ کہانی کا ٹیمپو زبردست ہے۔ عمران قریشی گھاؤ کے ساتھ حاضر تھے۔ بلاشبہ عمران قریشی کی تحریروں میں نکھار آتا جارہا ہے، ایک سے بڑھ کر ایک کہانی پیش کررہے ہیں، بہت عمدگی سے کہانی ترتیب دی اور ایک اچھا پیغام بھی اپنے قارئین تک پہنچایا، ویل ڈن عمران قریشی۔ باقی کہانیاں نہیں پڑھ سکا ہوں۔‘‘

ملتان سے محمد حسنین کے اعتراضات اور خیالات ’’جاسوسی کی محفل میں پھر سردی سے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ حاضر ہوں۔ اتنی شدید سردی پہلے تو کبھی ملتان میں نہ ہوئی تھی۔ لگتا ہے آپ کراچی والوں کی دعائیں لگ گئی ہیں۔ (مگر ہم نے تو سردی کم پڑنے کی مانگی تھی) وہاں کے رشتے دار بتا رہے تھے کہ پنکھا چلانے کی نوبت آگئی ہے جس پر مجھے تو بالکل بھی یقین نہیں آیا۔ اتنی سخت سردی میں پنکھے چلانے والی بات لکھتے ہوئے بھی سردی لگ جاتی ہے۔ بات کریں جاسوسی کی تو جنوری کا شمارہ بروقت مل گیا لیکن میں شادیاں کھانے میں اتنا مصروف رہا کہ بمشکل پڑھ کر تبصرہ کررہا ہوں۔ نئے سال کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ٹائٹل بہت اچھا تو نہیں تھا لیکن اتنا برا بھی نہیں تھا کہ ظفر صاحب کی کارٹون بنانے والی صلاحیتوں کا ذکر کرنے کی نوبت آجائے۔ چینی نکتہ چینی میں تو لمبے چوڑے تبصروں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ سڈنی کے ڈاکٹر ارسلان نے بہترین تجزیہ کیا اور پورے سال کا رویژن کرادیا۔ ویسے مجھے تو لگتا ہے ہر ماہ کا تبصرہ ساتھ ساتھ ہی لکھ لیتے ہیں (ہاں ہمیں... بھی اتنے ہی ہوشیار لگتے ہیں) لیکن آپ کو بھیجتے سال بعد ہیں جب ہی اتنا طویل ہوجاتا۔ ہمارے ملتان کے چہیتے جنید نے بھی ٹکر کا تبصرہ خوب محنت سے لکھا اور سیکنڈ پوزیشن حاصل کی۔ جنید کے تبصرے سے ایک بات تو ثابت ہوگئی کہ امپورٹڈ مال کے ساتھ ساتھ ہمارے لوکل لوگ بھی بہت اچھے تبصرے لکھتے ہیں۔ (جی، بالکل، کوئی شک؟) میں پچھلے ماہ حاضر تو تھا آپ کو ایسا کیوں لگا کہ میری غیر حاضری ہوگئی ہے؟ محمد اقبال، جمیر ارفیق، سلمان بشیر کے تبصرے پسند آئے۔ آسیہ بتول کی ناقص رائے پڑھ کر ایڈیٹر کی اعلیٰ حسِ مزاح کا بھرپور اندازہ ہوا۔ گوجرانوالہ کے آصف صاحب کی تنقید انتہائی نامناسب لگی جب انہوں نے یعقوب بھٹی، عبدالرب بھٹی اور طاہر جاوید مغل کی کہانیوں کو فحش کہا۔ یقیناً ان کی نظروں سے کوئی نیٹ فلکس کی فلم گزری ہوگی۔ کہانیوں پر بات کرنے سے پہلے ایک بات کرنا چاہوں گا ورنہ تبصرے کے اختتام تک بھول جاؤں گا۔ وہ یہ کہ اس بار فہرست کا انداز، کہانیوں کی ترتیب اور لے آؤٹ بہت لاجواب تھا۔ ہر صفحے پر سالگرہ نمبر خوب صورتی میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔ اس محنت کے لیے مبارکباد پہلے وصول کرلیں۔ (باریک بین نظر کا بے حد شکریہ) آپ کی محنت قابلِ قدر ہے کہ اتنی محنت سے ہمارے لیے بہترین کہانیوں کا مجموعہ اتنے دلکش انداز میں پیش کرتی ہیں۔ امجد رئیس فیورٹ رائٹر ہیں اور آبِ قیامت کے صفحات دیکھ کر ہی اندازہ ہوگیا کہ فی الحال اسے اگلے ماہ مکمل ہونے کے بعد ہی پڑھنے کے لیے ہاتھ لگایا جائے۔ عکس فاطمہ کی ہیپی نیو ائیر ہلکی پھلکی تحریر ثابت ہوئی۔ ان کی طبع زاد سے زیادہ تراجم کہانیاں بہتر ہوتی ہیں۔ غلام قادر نے نجاتِ شب میں بہت کچھ قارئین کی عقل پر چھوڑ دیا کہ بھائی لوگ خود ہی اندازے لگاتے رہیں کہ کب کہانی میں کیا ہوا۔ مجموعی طور پر کہانی گزارے لائق تھی لیکن ایک بہت بڑی شکایت ہے کہ انہوں نے ’’اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم‘‘ کو ہندوستانی گانا بنادیا۔ (اچھا، ہم سے چوک ہوگئی) حسام بٹ نے دہر کی پچھلی قسط جتنی اچھی لکھی تھی یہ قسط اتنی ہی ہلکی رہی۔ ہیرو جاسم یاری سے ہٹ کر کہانی کا فوکس ضمنی کرداروں پر رہا اور ان کے بے مقصد واقعات کی تفصیل نے شدید بور کیا۔ چلیں ولنز کی جانب کی کہانی سمجھ آتی ہے کہ وہ ہیرو کے خلاف چالیں چل رہے لیکن کامل یا طلال حسنی وغیرہ کے واقعات اتنی تفصیل سے بیان کرنا کہ وہ پوری قسط ہی کھا جائیں تو مجھے تو مزہ نہیں آیا۔ حسام بٹ صاحب کہانی کو اِدھر اُدھر لے جائیں گے تو شکایتیں تو آئیں گی۔ عمران قریشی کی گھاؤ میں کچھ باتیں وضاحت طلب رہیں۔ عمیرا اگر اس کا نقلی نام تھا تو باقی کی کہانی اصلی نام سے بتائی جاتی، یہ بہتر رہتا۔ اوور آل سسپنس بہتر رہا لیکن انجام تھوڑا ٹھنڈا سا لگا۔ عائشہ نصیر کی اعتراف میں کافی ٹوئسٹ اینڈ ٹرنز تھے۔ رواں ترجمے نے دل خوش کردیا۔ کہانی کا انتخاب بھی عمدہ رہا۔ یہ بات اچھی لگی کہ کڈ کو آخر میں بل کے اعتراف کے باوجود اس کی بے گناہی کا ثبوت مل ہی گیا۔ نور یہ مدثر نے بھی انتہائی مختصر کہانی کے ساتھ شاندار اینٹری دی بس یہی سمجھ نہیں آیا کہ کیس 313 تھا یا 312۔ طاہر جاوید مغل کی قاتل مسیحا پر جاری ہے کے ٹیگ نے شدید حیران کیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اس ماہ ختم ہوجائے گی لیکن یہ تو ابھی بھی جاری ہے۔ کہانی کی اٹھان سے لگ رہا کہ یہ اگلے ماہ بھی شاید ختم نہ ہو اس لیے اب اسے ساتھ ساتھ پڑھنے کا ارادہ ہے۔ (آج کا کام کل پر نہ چھوڑا کرو) علی عباس نے سرپھرے لگتا کافی جلدی میں لکھی لیکن پھر بھی پڑھنے کا مزہ آیا۔ صحافی میر حسن کا تفتیشی انداز بہت دلچسپ ہے اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ آگے کیا ہوگا؟ پولیس کے نکمے پن پر البتہ بہت غصہ آتا ہے کہ آخر وہ کیوں اس انداز کی تفتیش نہیں کرتے؟ کہانی بہترین رہی۔ البتہ جاسوسی ڈائجسٹ کے حوالے سے لکھا گیا پیراگراف کافی بے ربط سا لگا۔ اب ایڈٹ ہوا یا (کچھ ایڈٹ نہیں ہوا) مصنف نے ہی ایسا لکھا کچھ سمجھ نہیں آیا۔ اسما قادری نے بزدل

مجرم کے نام سے ایک زبردست سرورق کہانی لکھی۔ انہیں جاسوسی میں زیادہ سے زیادہ حاضری لگانی چاہیے۔ زویا صفوان نے اس بار بھی چائلڈ ابیوز کے موضوع پر لکھا۔ گمنام مسیحائی ایک اچھی کاوش تھی لیکن مصنفہ کو اب کچھ الگ موضوعات پر بھی لکھنا چاہیے۔ ان کی ہر دوسری تیسری کہانی موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے ایک جیسی نہ ہونے کے باوجود ایک جیسی لگنے لگی ہے۔" اگلے ماہ تک کے لیے خدا حافظ۔"

رحیم یار خان سے ماورا عالمگیر کی خوب صورت واپسی" جنوری 2024ء کا جاسوسی ڈائجسٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ میرے ہاتھوں میں موجود ہے۔ شمارے میں تمام وہ مصنفین ہیں جن کے لیے عوام کے دل دھڑکتے ہیں اور وہ حالاتِ حاضرہ کے عین مطابق لکھ رہے ہیں جدید تقاضوں کے مطابق۔ ایسے میں مجھے سمجھ نہیں آتا جب کچھ قارئین اصرار کرتے نظر آتے ہیں کہ اب وہ بات نہیں رہی اب وہ رائٹرز نہیں رہے جو اچھا لکھتے تھے فلاں ڈھمکاں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جن کو ٹھیک سے اردو لکھنا تو دور پڑھنا بھی نہیں آتی۔ خیر ایسا تو چلتا رہے گا مطلب جب تک قاری پڑھتا رہے گا مین میخ نکالتا رہے گا۔ بھلے سامنے کتنی ہی اچھی چیز ہو ہر چیز ہر ایک کو پسند نہیں آتی اور ہر ایک کے لیے لکھی بھی تو نہیں جاتی۔ خیر موضوع پر آتے ہیں۔ مجھے کل ہی جاسوسی ملا ہے اور میں ابھی تک صرف پانچ کہانیاں پڑھ سکی ہوں۔ مگر جس چیز نے مجھے تبصرہ لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ ہماری پیاری پیاری اسما قادری کی تحریر ہے، بزدل مجرم۔ ہمیشہ کی طرح اسما قادری نے بہت بہترین لکھا۔ یہ کہانی سوشل میڈیا کے دوستوں اور ان پر اعتبار کے حوالے سے لکھی گئی ہے جس میں تلخ سچائی لکھی گئی ہے اور اسما آپ دیکھیں آج نیوز میں بالکل یہی خبر آئی ہے جو آپ نے لکھی۔ میں حیران رہ گئی کراچی کی خبر تھی۔ آپ نے آن لائن دھوکے پر بہت خوب صورتی سے لکھا۔ زورِ قلم ہو اور زیادہ اس کے ساتھ ہی میں فنٹاسٹک فور کے انتظار میں ہوں کہ کب اس کا اگلا حصہ آئے گا پلیز اسما اس پر لکھیں نا...... دوسری کہانی ہماری فیورٹ رائٹرز زویا صفوان کی ہے۔ زویا نے ایک حساس موضوع کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا جس سے آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ زویا کی خوب صورتی ہے کہ وہ ایسا موضوع جس پر کئی دفعہ لکھا جا چکا ہے، اس پر بالکل نئے انداز میں لکھ کے ہمیں حیران کر دیتی ہیں اور محتاط بھی۔ دونوں کہانیاں بہت اچھی رہیں۔ طاہر جاوید مغل بھی موجود ہیں فہرست میں، وہ بھی عمران جونیئر کے ساتھ مکمل پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔ ویسے کہانی کا موضوع بہت اچھا ہے مجھے بھی کبھی کبھی لگتا ہے میں بھی لپ ریڈنگ کر لیتی ہوں۔ خیر ابھی تک جاسوسی بہت اچھا رہا۔ بہت مزا آ رہا ہے پڑھ کے۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں کل گیارہ کہانیاں ہوتی ہیں یا بارہ اور اس میں شاید ایک دو ہی تھوڑی کم اچھی ہوں مگر تبصروں میں لوگ ایسے ری ایکٹ کرتے ہیں جیسے خود مستنصر حسین تارڑ ہوں۔ خط بہت عرصے بعد لکھ رہی ہوں کیونکہ جاسوسی وقت پر نہیں ملتا تو موقع ہی نہیں ملتا مگر 2024ء میں تو تاریخ کو ل گیا جاسوسی امید ہے آگے مزید جلدی ملا کرے گا۔" (ان شاء اللہ)

کوٹری سے حمیرا رفیق کی پُرزور فرمائش" بہت بے چینی سے جنوری 2024ء کے شمارے کا انتظار تھا۔ میری بے چینی کو میرا بھائی کاشف خوب انجوائے کر رہا تھا، کچھ تنگ کرنے کے بعد بالآخر جاسوسی ڈائجسٹ لا کر دے دیا اور ساتھ ہی فرمائش بھی کر دی کہ اگر آج گاجر کا حلوہ بنا کر کھلا دیا تو تین ماہ کے ڈائجسٹ بغیر تنگ کیے حاضر کر دے گا، مرتی کیا نہ کرتی کہ مصداق ڈائجسٹ ایک طرف رکھ کر اس کی فرمائش پوری کر دی تاکہ بلا تعطل ڈائجسٹ ملتا رہے اور انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ اس کے بعد جم کر بیٹھ گئی ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے۔ ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ لگتا ہے ظفر صاحب نے انتہائی خوش گوار موڈ میں ٹائٹل بنایا ہے۔ فہرست پر گرافک ڈیزائنر امتیاز صاحب نے بھی سالِ نو پر خوب محنت کی اور ایک عمدہ فہرست بنائی، ویلڈن جی۔ ایڈیٹر صاحب نے تقریباً تمام ہی ہمارے پسندیدہ رائٹرز کو اس ماہ کے شمارے میں جمع کر دیا بے حد شکریہ آپ کا۔ اداریہ پڑھ کر بے اختیار لبوں سے دعا نکلی ہے کہ آپ جو درد ملک و قوم کے لیے محسوس کرتی ہیں، ہمارے حکمرانوں کے دل میں بھی پیدا ہو جائے، آمین۔ ارر ے......رر......رے یہ......یہ کیا اتنی بھرپور چینی نکتہ چینی کی محفل واؤ مزہ آ گیا۔ پورے سال غائب رہنے والے آسٹریلیا سے ڈاکٹر ارسلان شاہ اپنے تفصیلی تبصرے کا گلدستہ لیے حاضر تھے، بہترین تبصرہ کیا بھائی صاحب نے، بہت عمدہ۔ اس کے بعد نہلے پر دہلا مار دیا ملتان سے جنید علی نے۔ کیا بات ہے جناب کی۔ بھئی واہ بہت عرق ریزی سے تبصرہ کیا ان دونوں حضرات نے۔ جس سے ان دونوں حضرات کی جاسوسی ڈائجسٹ سے محبت ظاہر ہوتی ہے۔ (بالکل...... دونوں کی عرق ریزی کے لیے مشکور ہیں) خیر محبت تو میں بھی کرتی ہوں جاسوسی ڈائجسٹ سے یہ الگ بات ہے کہ میرا تبصرہ مختصر ضرور ہوتا ہے لیکن موجود تو ہوتا ہے نا۔ (جی جی بالکل آپ بھی کسی سے کم نہیں ہیں...... کم لکھیں مگر لکھیں ضرور) سب سے پہلے چھوٹی کہانیاں شروع کیں۔ اپنی اپنی جگہ پر سب ہی اچھی لگیں۔ خاص کر عمران قریشی کی گھاؤ بہت پسند آئی۔ عکس فاطمہ کی تحریر پپی نیو ایئر بھی اچھی لگی۔ علی عباس کی سرپھرے نے بھی متاثر کیا۔ جس میں ایک صحافی اپنی رُوداد پیش کر رہے ہیں۔ زویا صفوان کی گمنام مسیحائی بھی بہت پسند آئی۔ زویا کی تحریروں میں بھی خوب نکھار آ گیا ہے، بہترین کہانیاں ڈائجسٹ کی زینت بنا رہی ہیں۔ قاتل مسیحا، طاہر جاوید مغل کی ابھی نہیں پڑھی ایک ساتھ ہی تمام کہانی پڑھوں پھر تبصرہ کروں گی۔ حسام بٹ کی دہر بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ نئے کرداروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جاسم کی راہ میں رکاوٹیں بڑھتی جا رہی ہیں لیکن مددگار بھی خوب سامنے

آرہے ہیں، اپنے دشمنوں سے جاسم بھرپور انداز میں نمٹ رہا ہے۔ اسما قادری کی بزدل مجرم بھی بہت پسند آئی۔ اسما قادری سے درخواست ہے کہ ہر ماہ اپنی تحریریں پیش کیا کریں۔‘‘ (آپ کی فرمائش یقیناً اسما نے پڑھ لی ہوگی)

کوٹلی، آزاد کشمیر سے احتشام الحق کے خیالات ’’جاسوسی سال کا پہلا شمارہ اس بار خلافِ معمول وقت سے بہت پہلے مل گیا۔ اس بار ٹائٹل پر ظفر صاحب کی محنت نظر آئی، کافی اچھا تھا سرورق لیکن ظفر سر کو مرد حضرات سے کوئی چڑ ہے جو انہیں بالکل کارٹون کی طرح کینوس پر چھاپ دیتے ہیں۔ نکتہ چینی کی محفل جس میں چینی کم اور ادرک زیادہ ہوگئی ہے مطلب ہر بندہ اپنی شکایتیں ہی لے کر بیٹھا ہے۔ معزز قارئین ذرا ادارے پر بھی نظرِ کرم کیجیے جو اتنی مہنگائی میں اور کاغذ کی روز بروز کی گرانی کے باوجود پوری جانفشانی سے پرچے کو ہم تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں ادارے کو چالیس طوپوں کی سلامی قبول ہو۔ (بس جی آپ جیسے ذی فہم لوگ ہی ہماری پریشانی کو سمجھ سکتے ہیں) سڈنی آسٹریلیا سے ڈاکٹر ارسلان شاہ اپنے سالانہ تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں، آپ موصوف نے جو تفصیل فراہم کی، اسے پڑھ کر ہم بھی ششدر رہ گئے۔ اتنی گہرائی سے ہر ٹائٹل کی تفصیل بتائی گئی۔ آپ مہینے میں نہ سہی دو تین مہینوں میں اپنی حاضری ضرور کروایا کریں آپ جیسے نادر ہیروں کے قدردان ابھی بھی اس محفل میں موجود ہیں ویلڈن سر۔ شہر ملتان سے جنید علی کی دھماکے دار سالانہ کارکردگی واہ بھئی آپ نے تو تفصیلات میں ڈاکٹر سڈنی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ویلڈن جی اور تبصرہ واقعی دھماکے دار تھا جو جاسوسی کے شایانِ شان کے مطابق تھا۔ ملتان سے ہی محمد حسنین جو کہ پٹاخے دار تبصرہ ارسال کرتے ہیں، اپنی مختصر غیر حاضری کے بعد پھر سے حاضر ہیں۔ ویلڈن جی بہت اچھا تبصرہ تھا آپ کا بھی۔ کراچی کے محمد اقبال صاحب، بہاولپور سے سلمان سلیم، کوٹری کی حمیرا رفیق صاحبہ اور سب نے بہترین لکھا۔ فہرست پر نظر ڈالیں تو سالگرہ نمبر کی مناسبت سے بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں۔ امجد رئیس، اسما قادری، طاہر جاوید مغل مزہ دوبالا ہوگیا۔ آبی قیامت اگلے مہینے تک کے لیے سنبھال رکھی ہے کہ اتنا انتظار ہم سے نہیں ہوتا اگلے ماہ پڑھ کر اس پر تبصرہ ارسال فرمائیں گے۔ چھوٹی کہانیوں کی بات کی جائے تو سب سے پہلے غلام قادر کی نجاتِ شب پڑھی۔ کہانی میں کچھ نیا نہیں تھا ایسی ہی کہانی جو کہ قادر صاحب کی خاص کہانیوں کا خاصہ ہوتی ہے ہیپی اینڈنگ ہیرو اور ہیروئین پاکستانی ڈراموں کی طرح ہنسی خوشی رہنے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔ ہیپی نیو ایئر عکس فاطمہ نے خوب لکھی‘ منصب علی نے ... بہت احسن انداز میں حق داروں کو ان کا حق اور ذمے داروں کو انجام تک پہنچایا ویلڈن عکس فاطمہ۔ گھاؤ عمران قریشی کی ایک بہترین تحریر تھی، عمیر کو عورتوں پر اور سدرہ کو مردوں پر اعتبار نہیں تھا اور دلچسپ کلائمیکس میں دونوں کا ٹاٹا بائے ہوگیا۔ کیس نمبر 312 نور یہ مدثر ایک ماورائی کہانی تھی جوزف پارکر کو آخر میں خلائی مخلوق پر اعتبار کرنا ہی پڑا۔ سرپھرے علی عباس کی ایک ایوریج کہانی تھی، علی عباس صاحب اچھا لکھتے ہیں لیکن میر حسن سیریز میں واقعات اور تعلقات کو کچھ زیادہ لمبا کھینچتے ہیں غریبوں سے نفرت کرنے والے ابراہیم نے غریب مزدوروں کی زندگیوں کا چراغ گل کر دیا سو سیڈ۔ بزدل مجرم ہماری فیورٹ رائٹر اسما قادری نے ایک بہترین کہانی پیش کی اُف اتنا سسپنس صوفیہ کے اغوا کے گرد گھومتی داستان ہم شازیہ اور اس کے شوہر کو اغوا کار سمجھے اور چوروں کو پڑ گئے مور کے مصداق ثانیہ اور ثاقب نے ان کا بھی گیم بجاڑ الا ویلڈن اسما قادری اچھی کہانی تھی۔ گمنام مسیحائی زویا صفوان نے ایک زبردست کہانی پیش کی لیکن کچھ واقعات سے ہمیں اختلاف بھی ہے سنبل کا سرمد اور نور کی جان لینا بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ یہ بات غلط ہے کہ جو ٹریجڈی آپ کے ساتھ ہوئی ہے وہ واقعی کسی دوسرے کے ساتھ بھی ہو، مجموعی طور پر کہانی بہتر تھی لیکن اسے مزید بہتر بھی کیا جاسکتا تھا۔ طاہر جاوید مغل کی قاتل مسیحا اس بار مصروفیات کی وجہ سے نہیں پڑھ پایا۔ بشرطِ صحت و زندگی اگلے مہینے ملاقات ہوگی۔‘‘

ساہیوال سے آسیہ بتول کے خیالات کے موتی، تول ’’جنوری 24ء کا شمارہ 10 جنوری کی صبح وصول پایا۔ تقریباً تمام کہانیاں پڑھ لی ہیں۔ یوں تو فہرست میں شاذ ہی کسی نئے رائٹر کا نام نظر آتا ہے۔ البتہ کبھی کسی نئے رائٹر کی کہانی شائع ہو تو سب سے پہلے وہی پڑھتی ہوں۔ کیونکہ باقی سب رائٹرز تو دیکھے بھالے ہی ہوتے ہیں۔ اس بار بھی نئے رائٹر نور یہ مدثر کی مختصر سی کہانی کیس نمبر 313، پڑھی اور پسند آئی۔ گو کہ موضوع نیا نہیں اور اس کہانی پر فلم بھی بن چکی ہے، لیکن کہانی کا اسلوب ایسا تھا کہ اچھا لگا۔ گو کہ جاسوسی ڈائجسٹ کا مزاج ایسا نہیں، مگر ایسی پُراسرار کہانیوں کو شاملِ اشاعت کرنا خوش آئند ہے۔ اپنے پسندیدہ قلمکار عمران قریشی کی گھاؤ پڑھی اور پسندیدگی کے احساسات دل میں امڈتے پائے۔ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے، ڈائجسٹ میں آج کل ایسی کہانیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ گھاؤ کا اختتام عمدگی سے ہوا۔ غلام قادر کی نجاتِ شب اچھی کہانی تھی۔ روانی سے پڑھی گئی۔ نہ کوئی پیچ و خم، نہ کوئی جھول۔ کہانی کا عنوان کہانی کے متن سے یکسر بیگانہ تھا۔ (اس لیے تو رکھا تھا) بحیثیتِ مجموعی، کہیں بوریت کا احساس نہیں ہوا۔ عکس فاطمہ کی کہانی ہیپی نیو ایئر بھی پسند آئی۔ مصنفہ کا اسلوب بہت منجھا ہوا ہے۔ ان کے تراجم کا جواب نہیں ہوتا۔ ان کی اس طبع زاد کہانی پر مغربی کہانیوں کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ جو کہ برا نہیں لگا۔ زویا صفوان کی گمنام مسیحائی بھی عمدہ کہانی ثابت ہوئی۔ حساس موضوع پر لکھی مضبوط کہانی۔ زبردست۔ مگر مصنفہ موصوفہ کو کہانیوں کے موضوعات میں تنوع لانا چاہیے۔ میں نے ان کی درجن بھر کہانیاں پڑھی ہیں۔ مصنفہ کا دائرۂ فکر ایک مخصوص سبجیکٹ اور ماحول سے باہر نہیں نکل پا رہا۔ عائشہ نصیر

کا ترجمہ اعتراف خوب رہا۔ مبہم قتل کی ایک دلگداز کہانی۔ ایک حساس فنکار کی کتھا جو بلاوجہ ہی دل پر قتل کا احساسِ جرم لیے موت سے جاملا۔ بلی کو معصوم کہہ لیں یا ضرورت سے زیادہ سادہ لوح، اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ خوب صورت مگر اُداس کن کہانی۔ علی عباس کی سرپھرے تو گویا ایک سانس میں ختم کی۔ اُف۔ اتنی تیز رفتار کہانی۔ بھاگتی دوڑتی، ڈولتی ڈگمگاتی کب ختم ہوئی، کچھ خبر نہ ہوسکی۔ علی عباس بہت عجلت میں لکھتے ہیں شاید۔ مکالمے ہی مکالمے۔ واقعات در واقعات۔ نہ تو اس کہانی کی برائی کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ نہ سراہنے کو من کر رہا ہے۔ سو اس کہانی پر ہمارا فیصلہ محفوظ ہی سمجھیں۔ (یہ زیادہ بہتر ہے) اب کچھ ذکر شمارے کی خاص الخاص کہانی بزدل مجرم کا جسے اسما قادری نے قلمبند کیا۔ ایک نہایت دلچسپ اور رواں کہانی۔ جس کے اختتام نے چونکا دیا۔ ایک بار تو دل دھڑکا کہ صوفی اور اشعر قتل کردیے گئے، مگر پھر سنبھل گیا کہ مصنفہ نے نہایت چابکدستی سے سسپنس پیدا کرنے کے لیے مقتولین بدل دیے۔ کہیں بوریت محسوس نہ ہوئی۔ ایک نشست بلکہ ایک سانس میں کہانی ختم کی۔ اسما قادری نے بہت متنوع موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ ان کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ زویا صفوان کو بھی ایک مخصوص فضا سے نکل کر دائرۂ نظر وسیع کرنا چاہیے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی طویل کہانی قاتل مسیحا کی دونوں اقساط ایک ساتھ پڑھیں۔ مغل صاحب اپنے اسلوب کی سادگی اور پنجاب کے مخصوص ماحول میں رچی کہانی کے ساتھ ہمیشہ کی طرح توجہ سمیٹنے میں کامیاب رہے۔ مگر ہمیشہ کی طرح دوسری قسط کے آخر میں کرداروں کو انڈیا کی سرزمین پر پہنچا کر دم لیا، جیسا کہ وہ اپنے تقریباً تمام طویل سلسلوں میں کرتے آئے ہیں۔ اب کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ یہ کردار کتنی اقساط تک انڈیا میں ہی برسرِ پیکار رہیں گے۔ اب ہمیں سکھوں کے مخصوص پنجابی اسٹائل اردو میں ڈائیلاگ بھی کثرت سے پڑھنے کو ملیں گے اور ہندو کلچر کی جھلکیاں بھی گاہے بگاہے نظر آئیں گی۔ (یعنی یہاں بھی اعتراض ہے آپ کو) لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مغل صاحب قارئین کو حصارِ التفات میں جکڑ لیں گے۔ مغل صاحب ایک بھرپور طویل سلسلہ نئے کرداروں کے ساتھ ہی لکھیں۔ جو کہ معقول بات ہے۔ ویسے لگتا یوں ہے جیسے مغل صاحب اب کے دیوی، تاوان، للکار وغیرہ کے پائے کا طویل سلسلہ لکھنے میں کچھ متذبذب ہیں۔ اب اس کی وجوہات کیا ہیں، ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ (مغل صاحب بہت اچھی طبیعت کے مالک ہیں، آپ ڈائریکٹ انہیں خط لکھ کر وجوہات معلوم کرسکتے ہیں) ابتدائی صفحات پر امجد رئیس براجمان ہوں اور سب سے پہلے ان کا ترجمہ نہ پڑھا جائے اگر اس بار نہیں پڑھا کیونکہ اختتام پر باقی واقعات آئندہ ماہ لکھا ہوا تھا اور صفحات بھی اتنے کم۔ لہٰذا ان کی آبی آفت اگلے ماہ اکٹھی پڑھی جائے گی۔ اب اجازت دیں۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔‘‘

ملتان سے جنید علی کی تعلیمی سرگرمیاں ’’اس ماہ تعلیمی مصروفیات یعنی سمسٹر کے فائنل پھر ڈیپارٹمنٹ کی سالانہ پارٹی اور اس کے بعد ٹرپ اور ان سب کی تیاریوں کی وجہ سے جلدی میں یہ مختصر سا تبصرہ ٹائپ کر رہا ہوں۔ روشن سا سرورق، فہرست کا دلکش انداز، پسندیدہ مصنفین کی تحریریں، دلچسپ اور ریلیونٹ کارٹز کو ٹیشنز اور پہلے سے مختلف گرافک ڈیزائننگ اور فونٹ سلیکشن نے سالگرہ اور سالِ نو نمبر کا لطف دوبالا کردیا۔ آبی قیامت اور قسط وار تحریروں پر اگلے ماہ تفصیلی بات ہوگی کہ وقت کی کمی کے سبب پڑھیں نہیں۔ خطوط کے جہان میں چلے تو سارے برادران یعنی ارسلان شاہ، سلمان سلیم، احتشام الحق، محمد اقبال، آفاق احمد اور آصف محمود کے ساتھ حمیرا رفیق، آسیہ بتول کی آمد نے محفل کو روشن کردیا مگر انور یوسف زئی، سہانا شیخ، عاتکہ کامران اور مومنہ کشف کی کمی بھی محسوس ہوئی اور بقول آپ کے اپنی دھما کے دار انٹری کو دیکھ کر دل گارڈن گارڈن ہوگیا۔ جاسوسی کے نئے سلسلے وار ناول کا اشتہار دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ امجد جاوید جاسوسی میں مستقل آرہے ہیں۔ عائشہ نصیر جو جاسوسی میں بہت اچھا اضافہ ہیں اور تراجم کرنے میں ماہر ہیں، ہر بار کی طرح دلچسپ تحریر پیش کی جس میں زیکے نے اپنے جرم کا اعتراف پکڑے جانے پر کیا۔ عکس فاطمہ نے بھی سالِ نو سے متعلق اچھی تحریر پیش کی جس میں منصب کا کردار یادگار رہا۔ غلام قادر معذرت اس بار کہانی پسند نہیں آئی۔ علی عباس کی تحریر میں صحافی کی ڈائری کے سنسنی خیز اوراق پسند آئے۔ ویسے شروع میں ہی ابراہیم پر شک ہوگیا تھا اور وہی ہوا آخر میں یہی قاتل نکلا۔ سیریناراض کافی وقت سے غائب ہیں، ان سے بھی جاسوسی کے لیے کوئی تحریر لکھوائیں۔ نوریہ مدثر کی شاید پہلی تحریر تھی مگر شروعات اچھی رہی۔ کہانی مختصر مگر پُر اسرار اور معیاری تھی۔ عمران قریشی بھی حسبِ معمول دلچسپ تحریر کے سنگ حاضر تھے جس کا اختتام چونکا دینے والا ہی تھا۔ عمیر اور واجد بیگ اور اس کا باپ بدترین انجام کے مستحق تھے۔ سوشل میڈیا کے تحت مکروفریب پر اسما قادری کی تحریر بہت اصلاحی تھی جس میں صوفیہ جیسے لوگوں کے لیے سبق تھا۔ زویا صفوان ہر بار کی طرح اس بار بھی معاشرتی تلخ موضوع کو عمدگی سے قلم بند کررہی تھیں جس میں سنبل گمنام مسیحا بنی وہیں والدین کے لیے اس تحریر میں بہت سے اصلاحی پہلو تھے۔ پہلی بار اتنا مختصر اور ہنگامی تبصرہ لکھا ہے جس میں تشنگی کا احساس ہوگا تو اگلے ماہ ملتے ہیں تب تک آپ جاتی ہوئی سردیوں کے سنگ فروری کے جاسوسی سے لطف اندوز ہوں۔‘‘

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

عاتکہ کامران، حیدرآباد۔ عذرا ضمیر، کراچی۔ آفاق احمد، کوٹری۔ زاہدہ نور، کراچی۔



رونق رنگ چمن

کسی مورخ کا قول ہے کہ کتابوں کے بغیر تاریخ گونگی ہے۔ یعنی کہ کتابوں کے بغیر انسان ادھورا ہے۔ کتابوں کی دنیا کی طرف چلیں تو ایک معتبر درخشاں و تاباں نام معراج رسول صاحب کا نظر آتا ہے۔ پاکستان میں اردو کی ترویج اور مطالعے کی عادت کے فروغ میں ان کے اہم کردار کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ڈائجسٹوں میں چھپنے والی دلچسپ تخلیقات نے شہروں اور دور دراز کے گاؤں، قصبوں، دیہاتوں، گوٹھوں میں اردو کے بے شمار قاری پیدا کیے۔ انہیں زبان کی چاشنی اور داستان گوئی کے حسن کا اسیر بنایا۔

بہت دنوں سے نہیں اپنے درمیان وہ شخص
اداس کر کے ہمیں چل دیا کہاں وہ شخص
اس ایک شخص میں تھیں دل ربائیاں کیا کیا
ہزار لوگ ملیں گے مگر کہاں وہ شخص

ہر سال کے آغاز پر یادوں کی سوئی 22 فروری 2019ء پر رک جاتی ہے۔ دل کی تختی پر ان کا نام...... یادیں...... ان کے لمبے سفر کی صعوبتیں...... ماہ و سال کی بتدریج بڑھتی کامیابیاں اور پھر یکایک ان کی جدائی کا دن ابھرتا ہے...... تسلیاں دیتا ہے......

بہت سے لوگ اچھے موسموں میں یاد آتے ہیں
مگر تیری کمی میں واقعی محسوس کرتا ہوں

ہر شخص ان کی کمی کو محسوس کرتا ہے...... نرم خوئی، حساس دلی اور مردم شناسی جیسی خوبیوں کے مالک معراج رسول کبھی ذہن و دل سے محو نہیں ہوتے...... معراج رسول ڈائجسٹ ادب میں درخشاں و تاباں ستارے کے مانند ہیں، ان کی کامیاب زندگی کا ایک زمانہ آشنا اور معترف ہے۔ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن سے شائع ہونے والے چاروں ڈائجسٹوں نے اپنے انداز...... مخصوص مزاج اور انفرادیت سے قارئین کو مسحور کیے رکھا...... انہوں نے اپنے پسندیدہ مصنفین کے ذریعے زندگی کے عملی تجربات کو موقلم کے ذریعے قرطاس پر منتقل کر کے ڈائجسٹ ادب کو مالا مال کر دیا۔ احمد اقبال کی شکاری، اناڑی ہو...... اقلیم علیم کی موت کے سوداگر، مفرور ہو یا پھر طاہر جاوید مغل کی للکار، انگارے، دیوی اور تاوان جیسے شاہکار۔ محمود احمد مودی کی سرکش، اسما قادری کی گرداب،



مشعلِ راہِ وفا

عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد، امجد جاوید، منظر امام، امجد رئیس کے شاندار تراجم، ایم اے راحت، انوار صدیقی، احمد صغیر صدیقی، علیم الحق حقی، تنویر ریاض، کاشف زبیر، مختار آزاد اور بہت سے مصنفین کی یادگار کہانیاں...... محی الدین نواب کی ان گنت کہانیاں۔ خاص کر طویل سلسلہ دیوتا کے ذکر کے بغیر ڈائجسٹ کی تاریخ ادھوری رہتی ہے۔

ان کی شب و روز کی محنت کا ثمر جے ڈی پی ایک باغ و بہار گلشن کی صورت میں قائم دائم ہے۔ صحرا میں نخلستان کی صورت اپنی چھاؤں تلے ہر دل مصنفین، رفقائے کار، شاعر اور ان کے ادارے کے تمام کارکن آج بھی بیٹھے ہیں...... ہر شخص ان کے اخلاق، مروت اور ضیافت کا ایسا اسیر ہے کہ اس چھاؤں کو چھوڑنے کا سوچتا بھی نہیں...... ان کی پرخلوص عنایات اور مہمان نوازی کا سلسلہ تھا نہیں بلکہ ان کی مشعل راہ وفا...... شریک سفر...... ہم خیال، ہم مزاج اور ہم نشین عذرا رسول صاحبہ نے اسی طرح جاری و ساری رکھا ہوا ہے...... معراج رسول صاحب کے خوابوں سے سربلند اس گلشن کی آبیاری کو عذرا رسول صاحبہ نے نامساعد حالات اور ناموافق موسموں کے باوجود روکا نہیں...... بلکہ اپنی محنت...... جانفشانی سے سینچا ہے...... انتہائی مہذب، بااخلاق، حسن و سیرت میں یکتا...... عذرا رسول صاحبہ کی جے ڈی پی سے محبت انتہائی گہری اور شدید ہے۔ منصب انسانیت کے تمام تقاضوں کو ہمیشہ مدِنظر رکھتی ہیں۔ دفتر میں ان کے بیٹھنے سے بہت سے امور جانفشانی سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ روزانہ دفتر میں نشست و برخاست کے باعث خیر اور سچائی کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کئی مخفی پہلو آہستہ آہستہ منکشف ہوئے ہیں۔ ہم ان کی خوش اخلاق طبیعت کے اسیر ہیں۔ بہت سے لوگ تمغوں اور خطابات سے پہچانے جاتے ہیں...... مگر معدودے چند ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بقول شاعر

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ہماری طرف سے عذرا رسول صاحبہ کو مبارک باد کہ ان کے عزم و ہمت اور وفا کا شعلہ ہر پل بھڑکتا رہے۔ حوصلوں سے اس امتحان میں وہ ہمیشہ سرخرو...... کامیاب...... جاوداں رہیں۔

لبنیٰ خیال

جاسوسی کے اوّلین صفحات پر ایڈونچر اور تھرل سے بھرپور سوغات

دوسرا اور آخری حصہ

آبی قیامت

امجد رئیس

ارضِ کائنات میں کہیں نہ کہیں کوئی بھی حادثہ رونما ہوتا ہے... حادثات سے بچنے کی تدبیر کی جاسکتی ہے مگر آفاتِ الٰہی سے بچنا ناممکنات میں سے ہے... گوکہ جدید سائنس اِن قدرتی آفات کو روک نہیں سکتی مگر قبل ازوقت پیش گوئی کر کے اُس کی خطرناکی اور ہولناک تباہی سے بچنے کے خطرے کا الارم دینے میں کامیاب ہو چکی ہے... زیرِ نظر ناول بھی قدرتی آفات میں سے ایک آفت کے گرد گھومتا ہے... ایسی انجانی... طوفانی... آناً فاناً جھپٹ لینے والی کہ دوسرا سانس لینا اور اگلا منظر دیکھنے کی سکت نہ رہے۔ ہنستی مسکراتی زندگی کے بھرپور کرداروں سے آغاز کرتی ایک المناک داستاں... سمندر کے خوب صورت ساحلوں پر اپنی زندگی کا یادگار وقت گزارتے شوخ چُلبلے لوگوں کی اٹکھیلیاں... کسی عفریت کے مانند اونچی، لمبی اور بے مثال طاقت سے بھرپور لہروں نے ... انہیں ہر شے سمیت اپنے اندر نگل لیا...

سنسنی خیز نا قابلِ فراموش لمحوں میں دوسروں کے لیے اپنی زندگی وار کردینے والی فیصلہ کن گھڑیاں

11:14 am

(آٹھ منٹ باقی تھے)

حتی الامکان تیزی سے براڈ، کائی، ٹریسا اور لڑکا اُس مقام کی طرف جا رہے تھے جہاں سے جیٹ اسکائیز حاصل کی جاسکتی تھیں۔

''تمہارا نام؟'' کائی نے لڑکے سے دریافت کیا۔

''جیک۔''

''شکریہ جیک۔ میرا نام کائی ہے۔ لانی میری بیٹی ہے۔'' وہ ساحل پر جیٹ اسکائیز کے قریب رک گئے۔ ہوائی کے تمام ساحل عوامی تھے۔ لہٰذا گرینڈ ہوائین نے جیٹ اسکائیز کے لیے کوئی گھاٹ، پشتہ یا شیڈ نہیں بنایا تھا۔ ہوٹل کی طرف سے ایک ٹرالر ان آبی موٹر بائیکس کو وہاں پہنچا دیتا تھا۔ جیٹ اسکائیز دو قسم کی تھیں۔ ایک میں آگے پیچھے دو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ دوسری ٹائپ میں ڈرائیور کے پیچھے دو افراد یعنی کُل تین افراد بیٹھ سکتے تھے۔ اسٹاف بدحواسی میں اسکائیز کو وہیں چھوڑ گیا تھا۔ چار میں سے تین میں دو افراد کی گنجائش تھی



جبکہ چوتھی میں چار افراد بیٹھ سکتے تھے۔

''لڑکیاں کہاں تھیں؟'' کائی نے جیک کو مخاطب کیا۔

جیک نے ڈائمنڈ ہیڈ کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''میں میریٹ کے قریب پانی سے باہر آیا تھا۔''

''تم ان کو دیکھ سکتے ہو؟'' کائی نے براڈ کو دیکھا۔

''ہاں۔'' براڈ نے ہتھیلی سے پیشانی پر چھجا بنا کر ڈائمنڈ ہیڈ کی سمت دیکھا۔

''تم جیٹ اسکائی ڈرائیو کر سکتے ہو؟'' کائی نے جیک سے سوال کیا۔ براڈ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لڑکے نے اثبات میں جواب دیا۔ کائی نے سوالیہ نظروں سے ٹریسا کو دیکھا۔ ٹریسا نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ٹریسا کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس طرح آبی سواری میں بیٹھنے کی گنجائش کم ہو جاتی۔ لیکن وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ٹریسا نہیں مانے گی۔ بحث کا وقت ہی نہیں تھا۔ لمحہ لمحہ قیمتی تھا۔ وہ آبی قیامت کے سامنے کھڑے تھے۔ کائی نے دو سواریوں والی جیٹ اسکائی جیک کے حوالے کی۔ تین سواریوں والی خود سنبھالی۔ تیسری پر ٹریسا، براڈ کے عقب میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

جیٹ اسکائیز پوری رفتار سے مطلوبہ سمت میں اُڑی جا رہی تھیں۔ رفتار کے باعث بسا اوقات پانی سے اوپر اٹھ جاتیں۔ دو سو گز جانے کے بعد کائی نے رفتار کم کی اور براڈ کی طرف دیکھا۔ براڈ نے جیٹ اسکائی کی سائڈوں پر پیر جما کر خود کو کھڑا کیا اور نظریں گھمائیں۔ وہ واپس بیٹھا اور کائی کو اشارہ کیا۔ انہوں نے زاویہ تبدیل کر کے اسکائیز بھگائیں۔ براڈ آگے تھا۔ ٹریسا اس کی کمر سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ مزید دو سو گز دور گئے تھے کہ جیک چلّایا۔

''وہ رہا...... ٹام وہ رہا......''

کائی نے دو زرد رنگ کی چمکیلی کائیک دیکھ لی تھیں۔

کائی نے مڑ کر ساحلی کنارے کی طرف دیکھا جو تین سو گز کے فاصلے پر تھا۔ کائیک پر موجود نفوس نے جیٹ اسکائی کی موٹر کا شور سن لیا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا رہے تھے۔ وہ مزید قریب ہوئے تو لانی چیخ اٹھی۔

''ڈیڈی!''

ایک لفظ نے لانی کی کیفیت کھول کے رکھ دی۔ اُس نے پہلی مرتبہ کائی کو ڈیڈی کہا تھا۔

☆☆☆

میا جگہ بنا کے براڈ اور ٹریسا کے درمیان سما گئی۔ وہ متواتر رو رہی تھی۔

''ہنی اب تم محفوظ ہو۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔'' کائی بخوبی آگاہ تھا کہ ٹریسا اضطراری طور پر بیٹی کو تسلی دے رہی تھی۔ وہ ایک کھوکھلا وعدہ کر رہی تھی۔ وہ سب انتہائی خطرناک صورت حال سے دو چار تھے۔

لانی کو کائی نے سنبھالا اور ٹام، جیک کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کائی نے گھڑی دیکھی۔ وقت تین منٹ سے بھی کم تھا۔ ''وقت نہیں ہے۔ نکلو یہاں سے۔'' وہ چیخا۔

تینوں نے تھروٹل کھینچے۔ جیٹ اسکائیز کی غراہٹ بلند ہوئی۔

''کس طرف؟'' براڈ نے سوال کیا۔

کائی نے کاپیولانی پارک کے ساتھ بیس منزلہ ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ساحل سے صرف ایک بلاک دور تھا۔ ہوٹل کے پیچھے کونڈو (کونڈومینیم) بلڈنگ تھی۔ جس کی بلندی دس منزلہ تھی۔ ہوٹل کو دوسری لہریں گرائیں گی۔ لیکن پہلی لہر پر کونڈو بلڈنگ ہوٹل کو سہارا دے سکتی تھی۔

''لیکن اگر تیسری لہر......'' براڈ چیخا۔

''میں جانتا ہوں۔'' کائی نے چیخ کا جواب دیا۔

تیسری لہر مصدقہ نہیں تھی تاہم امکانات بہت زیادہ تھے۔ اگر پہلی لہر واقعتاً اسّی فٹ بلند ہوئی ایسی صورت میں کونڈو بفر کا کام دے گی اور انہیں کچھ وقت مل جائے گا۔ اصل گھبراہٹ یہی تھی کہ وہ ہوٹل تک پہنچ سکیں گے یا نہیں۔ زمین پر سونامی سے ٹکرانا فوری موت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسی صورت میں تو بیس فٹ کی لہر بھی جان لینے کے لیے کافی تھی۔

تینوں نے تھروٹل کو آخری حد تک استعمال کیا تھا لیکن جلد ہی یہ احساس ہوا کہ وہ مطلوبہ رفتار پکڑ نہیں پا رہے ہیں بلکہ جیٹ اسکائیز کی رفتار کم ہو رہی تھی۔

''کچھ گڑبڑ ہے۔'' جیک کی آواز آئی۔

''میرے ساتھ بھی۔'' براڈ نے تصدیق کی۔

کائی نے سامنے، عقب اور پھر نیچے دیکھا۔ وجہ سمجھ میں آ گئی۔ وہ سانس لینا بھول گیا۔ جیٹ اسکائیز کی رفتار اس لیے کم ہوتی جا رہی تھی...... کہ پانی عقب میں سمٹتا جا رہا تھا۔ سونامی آ گیا تھا۔

☆☆☆

11:22 a.m

(پہلی لہر)

ایلی ویٹرز کے ذریعے لابی کے معذور سپاہیوں کا گروپ، اسٹار لائٹ ریسٹورنٹ میں منتقل ہو چکا تھا۔ وہاں سے ہونولولو کا پینا رومک منظر نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف شیشے تھے،

شمال کے علاوہ۔ مغرب میں گرینڈ ہوائین کا ٹاور اور ہونولولو کا ڈاؤن ٹاؤن تھا۔ مشرق میں ڈائمنڈ ہیڈ۔ جنوب میں سحر طاری کرنے والا بحرالکاہل افق تک پھیلا ہوا تھا۔

راشیل وعدہ کیے بغیر خوف زدہ افراد کے سوالات کا جواب دے رہی تھی۔ ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ اچانک کھڑکی کے قریب موجود ایک عورت نے چیخنا شروع کر دیا۔ وہ باہر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ سب کی گردنیں ادھر مڑ گئیں۔ میکس بھی کھڑکی کے قریب تھا۔ اس نے راشیل کو آواز دی۔ وہ تیزی سے میکس کے قریب گئی۔ باہر دیکھا، راشیل کا منہ کھلا رہ گیا۔

ساحل کا پانی غائب ہو چکا تھا۔ میلوں تک گیلی ریت نظر آ رہی تھی۔ الاوائی نہر خالی پڑی تھی، جیسے کسی نے بہت بڑے اسٹرا سے اس کا پانی کھینچ لیا ہو۔ الاوائی میرینا کی خالی ریت پر جگہ جگہ یاٹ، بوٹ وغیرہ پہلو کے بل پڑی تھیں۔ ایک سو پچاس فٹ طویل سفید رنگ کی لگژری یاٹ کے ڈیک پر مسافر بے یارومددگار کھڑے تھے۔ کچھ اوپر سے نیچے کود کر بلند جگہ پر جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

راشیل نے آنکھیں سکیڑ کر مشرق کی سمت دیکھا۔ چند بونے دوڑتے دکھائی دیے۔

''کائی۔'' وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔

''کیا؟'' میکس ہکا بکا رہ گیا۔

''میرا شوہر اور بیٹی...... وہ اس وقت بھی قریبی بلڈنگ سے کم از کم سوگز دور ہیں۔''

''او مائی گاڈ، وہ نہیں پہنچ سکیں گے۔''

''ایسے مت کہو۔ وہ پہنچ جائیں گے۔''

دفعتاً ایک اور ہیبت ناک نشانی ظہور پذیر ہوئی۔ دور افق پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پانی کی لکیر نمودار ہوئی۔ جو ناقابلِ یقین رفتار سے ساحل کی جانب لپک رہی تھی۔ جیسے جیسے نمایاں ہو رہی تھی۔ ویسے ویسے اس کی بلندی بھی بڑھ رہی تھی۔

راشیل نے ایک ہاتھ کھڑکی پر رکھا اور ماتھا ٹکا دیا۔

''کائی...... جلدی کرو...... تم کر سکتے ہو۔'' دوسرے ہاتھ سے اس نے میکس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ کیا کر سکتی تھی۔

کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

وہ آبی گاڑیوں سے باہر کودے تو ریت پر تھے۔ پانی اس وقت تقریباً چالیس فٹ پیچھے جا چکا تھا۔ جیسے کوئی پہاڑ جیسا ویکیوم سمندر کا پانی کھینچ رہا ہو۔

بیگ کائی کی پشت پر اور ہاتھ میں لانی کا ہاتھ تھا۔ وہ دیوانہ وار ہوٹل کی سمت بھاگ رہا تھا۔ لانی ایسی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ رکے بغیر کائی نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ ایک نیا ولولہ اور توانائی گویا جسم میں بھر گئی...... معمولی فاصلہ صحارا ڈیزرٹ کے مانند ناقابلِ عبور معلوم ہو رہا تھا اور یہ فاصلہ ایک منٹ میں عبور کرنا تھا۔ کائی نے پیچھے دیکھنے کی حماقت نہیں کی تھی۔

براڈ نے میا کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ میا کی حالت لانی سے بھی ابتر تھی۔ کائی کی تقلید میں اس نے بھی میا کو گود میں اٹھا لیا۔ ذرا پیچھے ٹریسا، ٹام اور جیک تھے......

جو ہوا بہت تیزی سے ہوا۔ مدھم گونج اچانک نمایاں ہوئی اور بڑھتی چلی گئی۔ یوں لگا جہنم کی ہر بلا آزاد ہو گئی ہو۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں بھوکے دیوزاد مل کر گرج رہے تھے۔ وہ سیکنڈ کے دسویں حصے میں ٹھکے ہوں گے۔

''بھاگو!'' کائی حلق پھاڑ کے چیختا تھا۔ ایک دوسرے کی آواز سننا دشوار ہو گیا تھا۔ ان کا رخ غلط بلڈنگ کی طرف ہو گیا۔

''نہیں، نہیں...... ہوٹل کی طرف جاؤ۔'' کائی چلایا۔

شاید انہوں نے سنا ہی نہیں۔ وہ کونڈو بلڈنگ کے سامنے تھے۔ کائی نے ہوٹل کی طرف دیکھا۔ سونامی انہیں نگلنے کے لیے تیار تھا۔ ہوٹل تک جانا ممکن نہیں تھا۔ براڈ نے ہوٹل کی طرف جانا چاہا۔ عقب میں سونامی کی بلندی نے سایہ بنایا اور روشنی کم ہو گئی۔ کائی کی نس نس میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اس نے براڈ کو دھکا دیا۔ چند لمحوں میں وہ کونڈو کے اندر تھے۔

''سیڑھیاں...... سیڑھیاں......؟''

''وہ اُدھر۔'' ٹریسا چلائی۔ ایمرجنسی اسٹیئر ویل کے دونوں طرف شیشہ لگا ہوا تھا۔ کائی نے دیکھا کہ تباہ کن سونامی وائی کی کی پر تھا۔ پانی کی عمودی دیوار کی تباہ کن طاقت ہر شے کو تہس نہس کرتی چلی آ رہی تھی۔ پام کے درختوں کو بے وزن تنکوں کے مانند اکھاڑ کے پھینک دیا تھا۔ آبی دیوار گرجتی برستی پانچ منزلہ ہوٹل میں سے گزری۔ پتا نہیں ہوٹل اپنی بنیادوں پر تھا یا نہیں یا پانی میں چھپ گیا تھا۔ مختلف قسم کے ملبے کے ساتھ دبیز سفید جھاگ گویا آراستہ موت تھی۔ پانی زندگی ہے۔ پانی موت بن گیا تھا۔ آفت تھی، قیامت تھی اور انسانی سائنس و ٹیکنالوجی فیل تھی۔ قدرتی آفات کا مقابلہ کرنے کے لیے انسانی ٹیکنالوجی کا وجود گمان سے پرے تھا...... رینچ اسٹائل کے گھر لمحوں میں نابود ہو گئے......

انہوں نے تیزی سے سیڑھیاں چڑھنی شروع کر دیں۔ کائی نے اندر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ کونڈو کی تعمیر قلعہ نما مضبوط کنکریٹ سے کی گئی تھی۔ خوش گمانی تھی کہ کونڈو پہلی لہر کے مہیب حملے کو برداشت کر لے گا۔ وہ چھٹی منزل تک آگئے۔ نیچے پانی چوتھی منزل پر غراتے ہوئے گھوم رہا تھا، بل کھا رہا تھا۔ پانی اوپر آ رہا تھا...... براڈ پیچھے تھا۔

''جلدی کرو......'' کائی اضطراری انداز میں چیخا۔

☆☆☆

11:23 a.m

(سونامی کی دوسری لہر چوبیس منٹ بعد)

راشیل وحشت کے عالم میں باہر کی جانب تک رہی تھی۔ بدن غیر محسوس انداز میں کانپ رہا تھا۔ وہ لوگ بظاہر سونامی سے بچ گئے تھے۔ لیکن عمارت نے ان کو نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اس نے کائی کے سیل فون پر کال کی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ تمام لائنز مصروف ہیں۔ میکس کے واکی ٹاکی پر بھی کامیابی ہاتھ نہ آئی۔

راشیل نے توجہ سونامی کی طرف مبذول کی۔ وہ موجودہ لہر سے بہت بلندی پر تھے۔ لیکن پہلی لہر کی تباہ کن قوت اور اونچائی ہلاکت خیز تھی۔ راشیل کی توجہ الاوائی نہر کے قریب کینل بوٹ (canl boat) پر تھی۔ تین سو فٹ طویل کینل بوٹ کو سونامی نے کھلونے کی طرح اٹھا لیا تھا۔ سونامی نے گرینڈ ہوائین کو کیونکر چھوڑنا تھا۔ تاہم اصل خطرہ جو راشیل نے محسوس کیا، وہ یہ تھا کہ کینل بوٹ بھی ہوٹل سے ٹکراتی نظر آ رہی تھی۔ کہنے کو تو بوٹ تھی لیکن چھوٹا موٹا جہاز کہنے میں کوئی مبالغہ نہ تھا۔

سب نے ہی دیکھ لیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ ریسٹورنٹ میں چیخ و پکار کا ہنگامہ سر اٹھا رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس افراد جمع تھے۔ سونامی کے ٹکرانے سے پہلے ہی ہوٹل کی بلڈنگ اس طرح ہلی جیسے زلزلے کا جھٹکا لگا ہو۔ کھڑکیاں بھی بول اٹھیں۔

کینل بوٹ ظاہر ہے کہ کپتان کے کنٹرول میں نہیں تھی۔ پانی کی زد میں ضرور تھی لیکن پانی کے بھی کنٹرول میں نہیں تھی۔ ڈول رہی تھی، گھوم رہی تھی۔

عین وقت پر اس کا رخ بدل گیا۔ اطمینان تو ہوا لیکن اب وزنی بوٹ ہوٹل کے ٹاور کے قریب تھی۔ تصادم ناگزیر تھا۔ سونامی نے جناتی قوت کے ساتھ کینل بوٹ کو ٹوئن ٹاور ہوٹل کے ٹاور پر پھینکا۔ پانی کی دیوار بھی متصادم ہوئی۔ اسٹیل، گلاس، کنکریٹ کی ملی جلی آواز اوپر مونا ٹاور کی اٹھائیسویں منزل پر سنائی دی۔ شپ کا پچاس فٹ حصہ ٹاور کی چھٹی منزل کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ سونامی دباؤ کے ساتھ اپنی بلندی بڑھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ دیگر ملبے کا کافی حصہ ٹاور کے اندر چلا گیا۔ شپ کا بقیہ حصہ کچھ دیر پانی کے اندر اوپر نیچے ہونے کے بعد ٹوٹ گیا۔ بعدازاں پانی کے ساتھ غائب ہو گیا۔ آگے جانے والا سونامی پیچھے ٹاور کے ساتھ جو ملبا چھوڑ گیا تھا، ان میں گاڑیاں، بوٹس، درخت، عمارتوں کے ٹکڑے اور یقیناً چند لاشیں بھی تھیں۔ اچھا ہوا کہ راشیل کو لاشوں کے دردناک مناظر نظر نہیں آئے۔ بیشتر تو بلاشبہ ٹوٹی ہوئی کینل بوٹ میں ہی تھے۔

راشیل اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ فرض کیا جائے کہ پہلی لہر واپس ہونے پر وہ نیچے جا کر سڑکوں کے ذریعے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں بہت بڑا خطرہ پوشیدہ تھا۔ دوسری لہر زیادہ دور نہیں تھی اور اس کے ساتھ ریٹائرڈ سپاہیوں کا گروپ صحت مند نہیں تھا۔ انہیں بچانے کی واحد امید یہی تھی کہ ان کو بائی ائر اٹھایا جائے۔ کائی نے بھی جاتے جاتے ہیلی کاپٹر کا اشارہ دیا تھا۔ فضا میں سویلین اور عسکری دونوں طرح کے ہیلی کاپٹر پرواز کر رہے تھے۔

''ہمیں ان سے مدد لینی ہوگی۔'' راشیل نے میکس کو دیکھتے ہوئے ہیلی کاپٹرز کی طرف اشارہ کیا۔ اور 911 کو آزمانے کے لیے سیل فون نکالا۔ وہ دوسری مرتبہ ڈائل کر رہی تھی۔

معاً اس کی نظر ٹاور میں پھنسے ہوئے جہاز کے ٹوٹے ہوئے حصے پر پڑی۔ راشیل کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ جہاں تھے اس سے کئی منزل نیچے کینل بوٹ کے ٹوٹے ہوئے حصے میں ایک گنجا آدمی نظر آ رہا تھا۔ اس کی پھولدار شرٹ پھٹی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیل فون تھا۔ فاصلہ ہونے کے باوجود دیکھا جا سکتا تھا کہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''وہ پھنس گیا ہے۔'' راشیل بڑبڑائی۔ ''اور وہ یہ بات جانتا ہے۔ ٹاور کی چھت مونا ٹاور کی چھت کے مانند سپاٹ نہیں بلکہ نوک دار تھی۔ ہیلی کاپٹر وہاں نہیں اتر سکتا تھا۔

''مائی گاڈ!'' میکس نے بھی دیکھ لیا۔ راشیل نے ہاتھ لہرا لہرا کر کھڑکی پر گھونسے مارنے شروع کیے۔ میکس بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اچانک ایک عورت آدمی کے قریب نمودار ہوئی۔ عورت کے پیچھے تین بچے تھے۔ دفعتاً بڑے لڑکے نے اوپر راشیل کی حرکات کو تاڑ لیا اور آدمی کا بازو پکڑ کے اشارہ

کیا۔ آدمی نے راشیل کے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ لہرایا۔ ذرا دیر میں پانچوں نے اٹھائیسویں منزل کے ریسٹورنٹ کو دیکھ لیا۔

''اب کیا کریں؟'' میکس نے سر کھجایا۔

''ہیلی کاپٹر ٹاور پر نہیں اتر سکتا اور ہیلی کاپٹر ہی ہمارے اور ان کے لیے امید کی کرن ہے۔'' راشیل نے پھر سیل فون کو آزمایا۔ اچانک الارم بول اٹھے، لائٹ غائب ہوئی اور تاریکی چھا گئی۔

☆☆☆

HSCD بنکر (ہوائین اسٹیٹ سول ڈیفنس) سے برائین فکرمندی کے ساتھ اوہائیو کے میجر پاور اسٹیشنز کا جائزہ لے رہا تھا۔ منصوبہ بندی میں آندھیوں اور سونامی کا خیال رکھا گیا تھا۔ آندھی کی صورت میں جوار بھاٹا پندرہ فٹ سے اوپر نہیں جاتا تھا اور سونامی زیادہ سے زیادہ تیس فٹ۔ جبکہ پاور پلانٹس تیس فٹ سے کافی اوپر تھے۔ میگا سونامی کسی کے خواب و خیال میں نہ تھا...... جب اسی فٹ بلند سونامی کی لہر اوہائیو کی کوسٹ لائن سے ٹکرائی تو تینوں پاور پلانٹس کو لے ڈوبی۔ اس کے علاوہ پاور لائنز اور ٹاورز بھی تباہ ہوگئے۔ ڈوبنے سے بچنے والے سب اسٹیشنز پر لوڈ بڑھتا گیا۔ جو ناقابلِ برداشت تھا۔ نتیجتاً سرکٹ بریکرز ٹرپ کر گئے۔

اوہائیو تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ چند مقامات پر ابھی تک روشنی تھی۔ بیک اپ جنریٹرز اور بیٹریز تین مقامات کو روشنی دے رہے تھے۔ HSCD، اسپتال اور آرمی وہیلر ائر فیلڈ کے ائر ٹریفک کنٹرول ٹاور کو۔

برائن جانتا تھا ایک اور میجر سسٹم کام کر رہا تھا۔ ہر ایک سیل فون ٹاور کے ڈیزائن میں بیک اپ جنریٹر موجود تھا۔

☆☆☆

کائی کا گروپ دس منزلہ کونڈو کی چھت پر تھا۔ کونڈو کے ائرکنڈیشن اور شیشے متاثر ہوئے تھے۔ تاہم عمارت اپنی جگہ ایستادہ تھی۔ کائی نے چھت کے کنارے سے نیچے جھانکا۔ پانی پندرہ فٹ نیچے بہہ رہا تھا۔ ٹاپ فلور کا بالائی حصہ چند انچ تک خشک تھا۔ پانی کا بہاؤ دریا کے مانند۔ دریا میں ہر طرح کا ملبا شامل تھا۔ کائی سوچ رہا تھا کہ دوسری لہر کا دباؤ بھی عمارت سہہ گئی تو بھی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ پانی نے مزید پانچ منزل اوپر چلے جانا تھا جبکہ وہ آخری حد پر یعنی چھت پر تھے۔ کائی نے واکی ٹاکی نکالا اور چند کوششوں کے بعد راشیل سے رابطہ قائم ہو گیا۔ لانی اس کے قریب تھی۔

''راشیل تم ٹھیک ہو؟''

''تھینک گاڈ، کائی۔ پلیز اپنے اور لانی کے بارے میں بتاؤ۔''

''وہ میرے ساتھ ہے۔ تم اس کی کہانی سنو۔'' کائی واکی ٹاکی لانی کو دے کر براڈ کی طرف چلا گیا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' براڈ نے سوال کیا۔ کائی اسے ایک طرف لے گیا۔ ٹریسا بھی ان کے قریب آگئی۔

''تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔'' کائی نے کہا۔ ''پانی پسپا ہوگا۔ ہمیں کچھ وقت مل جائے گا۔ ہم کونڈو سے اتر کے بلندی کی طرف جائیں گے۔ اس دوران ہم ہیلی کاپٹر کو بھی متوجہ کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ ہمیں اٹھالے۔''

''لیکن ہم اکیلے نہیں ہیں، وہ دیکھو۔'' ٹریسا نے اشارہ کیا۔ وائی کی کی اور ہونولولو کی دوسری عمارتوں کی چھتوں پر خاصے لوگ جمع تھے جو آسمان کی طرف ہاتھ لہرا رہے تھے۔ کثیر تعداد تھی۔ یہ ایک دل شکن نظارہ تھا۔ امداد کے منتظر افراد کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ وہ وہاں رک نہیں سکتے تھے اور اترنے میں خطرات پنہاں تھے۔ ایک تو وقت کم ملتا، دوسرے افراد کے مقابلے میں ہیلی کاپٹرز کی تعداد کم تھی۔

کائی نے براڈ سے سیل فون لیا اور کئی مرتبہ 911 پر کوشش کی۔ مایوس ہوکر ریگی کا نمبر ملایا۔ پھر اچانک رک گیا۔ ریگی کا پیغام نظر آیا تھا۔

''کائی، میں ریگی بات کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ پیغام مل جائے گا۔ جس کا مطلب ہے کہ تم بچ نکلے ہو۔ اس وقت ہم فورٹ ویور روڈ پر ہیں۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ ہیں۔ میرا رابطہ الاسکا سے نہیں ہوا۔ شاید تمہاری بات ہوئی ہو۔ میں پھر بات کروں گا۔ وہیلر بیس پر پہنچنے کے بعد فون کرنے میں آسانی ہوگی۔

کائی کو امید تھی کہ HSCD، پالمر کے وارننگ سینٹر سے رابطے میں ہوگی۔ بحرالکاہل کے جزائر کی آبادیاں نئی اطلاعات سے لاعلم ہوں گی۔ کیونکہ کائی PTWC کی پوسٹ چھوڑ چکا تھا۔ اس کا وہاں رکنا ممکن بھی نہ تھا۔ اب اطلاعات کا واحد سہارا HSCD تھی۔

''کون تھا؟'' براڈ نے استفسار کیا۔

''ریگی، ممکن ہے وہ ہیلی کاپٹر بھیج دے۔''

اس اثنا میں لانی وہاں آگئی۔ ''ماں بات کریں گی۔''

''تم بات کرو، میں ریگی کو سمجھاتا ہوں۔'' کائی نے واکی ٹاکی براڈ کو دے دیا۔

کائی نے ریگی کے لیے پیغام ریکارڈ کرایا۔

''ریگی، میں کائی ہوں۔ اگر تم کو پیغام دس منٹ میں موصول ہو جائے تو سمجھنا کہ ہم سفید رنگ کی دس منزلہ کونڈو

بلڈنگ کی چھت پر ہیں۔ وائی کی کی کے کونڈو مشرقی کنارے پر۔ کونڈو کا نام ہے ''دی سی سائڈ'' یہ کالا کاؤ اور لا کالا ایمنا سڑکوں کی کراسنگ پر ہے۔ دس منٹ میں ممکن ہے تو مجھے کال کرو۔''

''کیا وہ ہیلی کاپٹر بھیج سکتا ہے؟'' ٹریسا نے سوال کیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دوسری صورت میں ہمیں یہاں سے بھاگنا ہوگا۔''

''کیا مطلب ہوا؟''

کائی بھول گیا تھا کہ ٹریسا سونامی کو پوری طرح نہیں سمجھتی۔ وہ بولا۔ ''یہ لہر واپس جائے گی اور دوسری آئے گی۔ اس دوران ہمیں کچھ وقت مل جائے گا۔''

ٹریسا نے مزید سوالات کیے۔ کائی نے تیزی سے مختصر جوابات دیے۔ کائی تخمینہ لگا رہا تھا۔ لہر واپس جانے کے بعد وہ نیچے جائیں گے۔ دوسری لہر سے بچنے کے لیے ان کو دس منٹ ملیں گے۔ بہترین حالت میں وہ ایک میل دوڑ سکتے تھے جبکہ جسمانی حالت خراب تھی۔ مزید یہ کہ نیچے کیچڑ کے علاوہ مختلف قسم کا ملبا مطلوبہ رفتار پکڑنے میں حائل ہو جاتا۔ سونامی کی دوسری لہر ایک میل جانے سے پہلے ہی انہیں دبوچ لیتی۔ ہیلی کاپٹر کا آسرا محض ایک چانس تھا۔

کائی نے اطراف کی عمارتوں کا جائزہ لیا۔ سی سائڈ نامی کونڈو سے پانچ بلاک دور ایک عمارت پر اس کی نظریں جم گئیں۔ وہ عمارت موجودہ کونڈو سے دگنی بلند تھی۔ وہاں سے محفوظ بلند مقام زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے مینڈک یاد آیا۔ کائی نے مینڈک کا طرزِ عمل اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ کوئی بڑا شاندار منصوبہ نہیں تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ اس نے بے بسی محسوس کی۔ وہ خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ تاہم سر جھٹک کر اس نے مایوسی کو دور کیا اور پلان سب کے اوپر واضح کر دیا۔

☆☆☆

11:30 a.m

(سترہ منٹ بعد سونامی کی دوسری لہر)

براڈ نے راشیل کو بریف کیا۔ رابطہ ختم کیا اور راشیل اپنے نئے مسئلے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے میکس کے ساتھ کئی پہلوؤں کا جائزہ لیا اور مسترد کر دیا۔ آخر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا۔

''ایک امکان ہے کہ وہ اسکائی برج استعمال کر کے یہاں آجائیں۔''

میکس نے عجیب نظروں سے راشیل کو دیکھا۔ ''اسکائی برج تو نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ کیا وہ سلامت بھی ہے؟''

اسکائی برج دراصل معلق برج کے مانند تھا جو سولہ فولادی کیبلو کے ذریعے لٹکا ہوا تھا۔ آٹھ کیبلو ادھر اور آٹھ اُدھر۔ فولادی رستے دونوں ٹاورز کی آٹھویں منزل تک آتے تھے۔ ان کے بالائی سرے دکھائی دے رہے تھے لیکن کیا برج کیبلو کے ساتھ ابھی تک منسلک تھا۔ اس کی تصدیق پانی کی سطح گرنے پر ہی کی جا سکتی تھی۔

نیچے پھنسی ہوئی فیملی کے چہرے روشن ہو گئے تھے۔ وہ جنونی انداز میں مونا ٹاور کی طرف ہاتھ ہلا رہے تھے۔ وہ بے خبر تھے کہ انہیں کیا کرنا ہوگا اور مونا ٹاور کے کیا حالات ہیں......

''ہمیں ان سے رابطہ کرنا پڑے گا۔''

''مگر کیسے؟ پاور ڈاؤن ہے۔ ہوٹل کے فون استعمال نہیں کر سکتے۔'' میکس الجھن کا شکار تھا۔

''ہمیں کسی چیز پر لکھنا ہوگا۔'' راشیل نے یہاں وہاں نظریں دوڑائیں اور ٹیبل کی طرف جا کر اس کا سفید کپڑا کھینچ لیا۔ ٹیبل پر پڑی اشیا اِدھر اُدھر لڑھک گئیں۔ چاٹنا مار کرلے کر راشیل نے بڑے بڑے حروف میں مختصر پیغام لکھا۔

''چھٹی منزل پر اسکائی برج تک جاؤ۔''

''آؤ میری مدد کرو۔ نہیں ایک منٹ رکو۔ پہلے دیکھنا پڑے گا کہ اسکائی برج ہے بھی یا نہیں۔ پانی کی سطح گرنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ دونوں سانس روک کے دیکھ رہے تھے۔ پانی چھٹی منزل پھر اس سے نیچے گیا۔ راشیل نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ برج اپنی جگہ پر موجود تھا۔ البتہ وہاں کاٹھ کباڑ بھی پڑا تھا۔

دونوں نے مل کر ٹیبل کلاتھ کھڑکی کے ساتھ اس طرح لگایا کہ وہ پیغام پڑھ سکیں۔ مرد اور عورت نے انگوٹھے بلند کر کے مثبت اشارہ دیا۔

راشیل نے سپاہیوں کے بارے میں میکس کو ہدایات دیں کہ انہیں چھت پر پہنچائے اور ہیلی کاپٹرز کو کال کرتا رہے۔

''تمہارا برج پر جانا ضروری ہے؟''

''ہاں۔'' راشیل نے وجہ بتائی اور نیچے جانے کے لیے ایمرجنسی ایگزٹ کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

ہونولولو کی فضاؤں میں کائی جتنے ہیلی کاپٹرز دیکھ رہا تھا۔ اتنی اقسام کو وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ آرمی بلیک ہاکس، جسیم نیوی HH-53S سب سے بڑے تھے، نیوز چاپرز، سینگ ٹور ہیلی کاپٹرز...... وغیرہ وغیرہ...... کائی کا گروپ پاگلوں کی

طرح خلا میں ہاتھ چلا رہا تھا۔ لیکن کوئی بھی اس طرف نہیں آیا۔ عوام زیادہ تھی۔ دوسرا حل تھا کہ نیچے اترا جائے۔

پانی کی سطح گرنا شروع ہوگئی تھی۔ کائی نے ہیلی کاپٹرز کو نظرانداز کر کے پانی پر نظر ڈالی۔ دیکھی اَن دیکھی مختلف اقسام کی اشیا موجود تھیں۔ سب سے ڈراؤنی چیز انسانی لاشیں تھیں۔ مرد، عورتوں کی کم از کم تیس لاشیں تھیں۔ بعض مکمل عریاں حالت میں تھیں۔ ہولناک منظر بچوں کے مردہ اجسام کا تھا۔ اس نے لانی کو مردہ اجسام کی طرف دیکھنے سے منع کر دیا تھا۔ پالتو جانوروں کی لاشیں بھی ماحول کی دہشت میں اضافہ کر رہی تھیں۔

”آجاؤ سب، حرکت کا وقت ہے۔“ کائی نے کہا۔ وہ ان کو لے کر مرکزی سیڑھیوں پر آیا۔ اسٹیئر ویل کا جائزہ لیا۔ عجیب بو پھیلی ہوئی تھی۔ گیسولین، کچرا، کیمیکل...... اسے کھانسی آئی۔ پانی حیرت انگیز طور پر نیچے جا رہا تھا۔ سیڑھیاں اپنی جگہ پر تھیں اور پانی کی سطح آٹھویں منزل پر۔ فی الحال دسویں منزل خشک ہوئی تھی۔ نیچے جانے کے بجائے کائی نے دسویں منزل کا دروازہ کھولا۔

”کیا کر رہے ہو؟“

”پانی نکلتے ہی پیچھے ہر قسم کا ملبا/کاٹھ کباڑ چھوڑ جائے گا۔“ لانی اور میا کو جوتوں کی ضرورت پڑے گی۔“ کائی نے جواب دیا۔

”اگر ریگی نے ہیلی کاپٹر بھیجا تو کسی کو چھت پر جانا پڑے گا۔ کام شروع کرو۔ براڈ میرے ساتھ رہے گا۔“

پانی چھٹی منزل تک چلا گیا تھا۔ منزل بہ منزل ان کی تلاش جاری تھی۔ پانی مکمل باہر نکل جاتا تو انہیں بھی وقت کی کمی کے پیشِ نظر تلاش ختم کر کے نکل جانا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بیک وقت دو دو کمروں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔

ڈور کی طرف سے کائی نے براڈ کو پکارتے سنا۔ ہوائی کی روایت کے مطابق ڈور پوری طرح کھلا تھا۔ مقصد کونڈو میں ہوا کی آمد و رفت کو برقرار رکھنا تھا۔ اتنے میں لانی کی شکل نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں سفید جوتے تھے۔

”سائز درست ہے؟“

”ہاں۔“

”پہن لو۔“ کائی نے اشارہ کیا۔ پھر وہ لیونگ روم میں براڈ کی جانب گیا۔ وہاں پہنچ کر اس کی سماعت سے اجنبی آواز ٹکرائی جیسے کوئی بڑا اژدھا پھنکاریں مار رہا ہو۔ آواز بالکونی کی طرف سے آرہی تھی۔ اس نے پہچان لیا۔ وہ پھنکار نے بلکہ گیس خارج ہونے کی آواز تھی۔ خاصی تیز آواز تھی۔ کائی بالکونی کی طرف لپکا۔ بالکونی پر پہنچ کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

اس کے سامنے بیس منزلہ دیوزاد اسٹرکچر موجود تھا۔ جس کی نویں منزل پر جسیم پروپین ٹینک کھڑکی سے نکل گیا تھا۔ اس کا رخ ان کے کونڈو کی طرف تھا۔ اس میں موجود ٹارچ نما سوراخ سات انچ قطر کا حامل تھا۔ جہاں سے گیس آواز اور رفتار کے ساتھ خارج ہو رہی تھی۔ آناً فاناً وہ سلگتی ہوئی ٹارچ میں تبدیل ہوگئی۔

”براڈ، نکلو یہاں سے...... بھاگو......“ کائی حلق کے بل چیخا تھا۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ دیوزاد خوفناک ٹینک وہاں کیونکر اور کہاں سے آیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ براڈ نے بالکونی کی طرف جانے کی کوشش کی۔ کائی نے دھکا دے کر یہ کوشش ناکام بنائی اور کہا۔ پروپین ٹینک گیس اسٹیشن سے الگ ہو کر پانی کے ساتھ یہاں تک آگیا ہے۔ اگلی لہر کے آنے تک کوئی امکان نہیں ہے کہ ٹینک یہاں سے ہٹ سکے۔ گیس بڑی مقدار میں خارج ہو رہی ہے اور اسپارک ہونے سے یہ مہیب آگ کے تباہ کن گولے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ کسی بھی لمحہ پھٹ سکتا ہے۔

کائی نے چلا کر سب کو اطلاع دی اور بھاگنے کے لیے کہا۔ سب بھاگ بھاگ کر اپنی سمجھ کے مطابق روپوش ہوگئے اور ٹینک خوفناک دھماکے سے پھٹ گیا۔ یوں لگا گویا قوتِ سماعت ناکارہ ہوگئی ہو۔ کونڈو بلڈنگ نے جھٹکا کھایا۔ کئی دروازے اکھڑ گئے۔ کائی نے لانی کو اپنے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ ٹینک کے نوکدار مہلک ٹکڑے دیواروں میں گھس گئے تھے۔ جھلسا دینے والی گرم لہر کا جھونکا اندر آیا اور تقریباً سب کو متاثر کر گیا۔ کائی کے جسم پر بال کئی جگہوں پر جل گئے۔ ران کی جلن نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔

ماحول قدرے پُرسکون ہوا تو لانی باپ کی محفوظ آڑ سے نکل آئی۔ ”اوہ ڈیڈی!“ اس نے کائی کی ران کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں پانچ انچ لمبے گھاؤ سے خون نکل رہا تھا۔ کائی نے جائزہ لیا۔ زخم گہرا یا جان لیوا نہیں تھا۔ لانی نے اسے کپڑے کا ٹکڑا لا کر دیا جو کائی نے زخم پر باندھ لیا۔

”باقی لوگ کہاں ہیں؟“

”شاید دوسرے اپارٹمنٹ میں۔“ کائی نے جواب دیا۔ وہ دونوں ہال کی طرف بھاگے۔ ہال کا بہت برا حال تھا۔ ایک طرف کی دیوار تڑخ چکی تھی۔ جس کے سوراخ سے ایک پانچ منزلہ عمارت کا ملبا نظر آرہا تھا۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ سی سائڈ نامی کونڈو نے سونامی اور فیول ٹینک کے دھماکے

دونوں کو کافی حد تک برداشت کر لیا تھا۔ اگرچہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

وہ اور لانی دوسروں کو آوازیں دے رہے تھے۔ اسٹیئر ویل کی جانب سے کھانسنے کی آواز آئی۔ کائی اس طرف بھاگا۔ فائر ڈور لٹک رہا تھا۔ چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی ریلنگ مڑ تڑ گئی تھی۔ آٹھویں منزل کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے ٹام جھانک رہا تھا۔ اس کا چہرہ اذیت سے بگڑ گیا تھا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے اپنا بایاں بازو پکڑا ہوا تھا جو غیر فطری انداز میں مڑ چکا تھا۔

''ٹام، جیک کہاں ہے؟''

''میرے خیال میں وہ مر چکا ہے۔'' اس نے بھیانک انکشاف کیا۔

''تمہیں یقین ہے؟'' کائی نے سوال کیا۔

''نہیں۔ لیکن وہ حرکت نہیں کر رہا ہے۔''

اچانک ایک چیخ بلند ہوئی۔ ''کائی، مدد کرو۔'' وہ ٹریسا کی آواز تھی۔

''میں یہیں ہوں، کیا ہوا؟''

ہال وے سے ٹریسا کا چہرہ نمودار ہوا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

''براڈ اور میا......'' وہ جیسے رو پڑی۔ ''وہ گری ہوئی دیوار کے پیچھے پھنس گئے ہیں۔''

☆☆☆

سپاہیوں کے گروپ کو چھت پر پہنچا کر میکس نے تین عورتوں کی ذمے داری لگائی کہ وہ میز کا کپڑا لہرا لہرا کر ہیلی کاپٹرز کو متوجہ کریں۔ میکس اوپر آتے وقت سیل فون پر پولیس، فائر ڈپارٹمنٹ اور دیگر کے ساتھ کوشش کرتا رہا تھا کہ ہیلی کاپٹر بھیجا جائے۔

چھت پر سے میکس نے نیچے کے ہولناک مناظر دیکھے۔ سونامی کی لہر کا پانی قیامت بپا کر کے واپسی کے سفر پر تھا۔ میکس نے اسکائی برج کو دیکھا۔ برج کی چھت میں بڑا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ برج اپنی جگہ پر تھا لیکن خاصی ابتر حالت میں تھا۔

☆☆☆

راشیل چھٹے فلور پر تھی۔ اسکائی برج کی حالت ایسی تھی جیسے اسے بم سے اڑانے کی کوشش کی گئی ہو۔ کھڑکیوں کا ہر شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ خود برج نامناسب زاویے پر جھک کر توازن کھو بیٹھا تھا۔ برج کی چھت میں بڑا سوراخ تھا جہاں سے سورج کی روشنی اندر کے برج کی ابتر حالت کی تصویر کھینچ رہی تھی۔ برج کے فرش میں بھی جابجا سوراخ نظر آ رہے تھے۔ پانی وہاں سے پچاس فٹ نیچے جا چکا تھا۔ خوش قسمتی سے برج موجود تھا لیکن دوسری لہر میں برج کی بربادی یقینی تھی۔

واک وے کے دوسرے سرے پر ساٹھ فٹ کے فاصلے پر ٹوٹے ہوئے جہاز کی فیملی موجود تھی۔ باپ نے گیارہ سالہ چھوٹی بیٹی کو اٹھایا ہوا تھا۔ بڑا لڑکا اور دوسری لڑکی ماں کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ فیملی نے ابھی تک اسکائی برج پر قدم نہیں رکھا تھا۔ برج کی مخدوش حالت ان کو ڈرا رہی تھی۔ راشیل نے بلند آواز میں اپنا تعارف کرایا پھر ان کے بارے میں سوال کیا۔ باپ کا نام بل راجرز تھا اور وائف کا نام پیگ۔ بچوں کے نام وائٹ، حنا اور ایشلے تھے۔

''کیا اس پر چلنا محفوظ ہے؟'' پیگ ہراساں تھی۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ بل تم شروع کرو۔ برج کے جھکاؤ کا خیال رکھنا۔ یہاں کے ٹاور کی چھت سے ہم ہیلی کاپٹر کے ذریعے نکل جائیں گے۔''

''ہیلی کاپٹر تو اس ٹاور پر بھی آ سکتا ہے۔'' پیگ نے کہا۔

''نہیں، اس ٹاور کی چھت مختلف ہے۔ وقت کم ہے جلدی کرو۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ مزید لہریں آنے والی ہیں۔ ڈرو گے تو مرو گے۔ شروع ہو جاؤ۔''

تاہم وہ ہچکچا رہے تھے کہ برج ہی نہ ڈھے جائے۔ خاص طور پر بچے کیسے کراس کریں گے۔ فیصلے کا وقت تھا۔

''تم وہاں سے وائٹ کو روانہ کرو، میں آدھے راستے میں اسے لے لوں گی۔ سب ایک ساتھ قدم نہیں رکھ سکتے۔'' وہ ماں تھی اور اس نے پھر اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دوسری ماں کے لیے۔ جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے جوتے اتار پھینکے اور برج پر قدم رکھا۔ دراز ہاتھ نے بہ آسانی ایک پلر کا سہارا لیا۔ دھیرے دھیرے وہ دوسرے پلر تک آئی۔

''تم دیکھ رہے ہو، شاباش آ جاؤ۔''

وائٹ نے فرش سے چھت تک جانے والے پلر پر ہاتھ ڈالا اور قدم اٹھایا۔

''کم آن ہنی، تم کر سکتے ہو۔'' راشیل نے کہا۔ وہ دونوں احتیاط سے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب ہو رہے تھے۔ وہ راشیل کے قریب پہنچنے والا تھا۔ تب اسکائی برج کے تڑخنے کی آواز نے سب کی سانسیں روک دیں۔ چند لمحے بعد راشیل نے سرگوشی کی۔ ''آگے آؤ۔''

حتیٰ کہ راشیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ راشیل کو وقت کی

فکر بھی کھائے جارہی تھی۔ ”مجھے پکڑلو۔“ وہ بولی۔
دونوں نے دوسرے سرے کی طرف جانا شروع کیا۔ اچانک برج آواز کے ساتھ تھوڑا اور ترچھا ہو گیا۔ پیگ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا لیکن وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ برج کا سفران کی توقع سے زیادہ مخدوش تھا۔ انہوں نے پھر حرکت کی۔ کنارے کے قریب رفتار بڑھادی تھی۔ دونوں آخری پلر تک پہنچ گئے تھے کہ کسی چکنی شے پر وائٹ کا پاؤں پھسلا۔ دونوں پیر ہوا میں چلے گئے، وہ نیچے گرا۔ راشیل بھی ساتھ گئی۔
برج کے دوسرے کنارے سے چلّانے کی آواز آئی۔
راشیل ایک ہاتھ کے بل پر لٹکی ہوئی تھی اور وائٹ اس کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ وہ گویا موت کے منہ میں تھے......

☆☆☆

دھیلر آرمی ایئر فیلڈ میں سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ بیس کے بیک اَپ سسٹم نے اس کے لیپ ٹاپ کے لیے پاور اور انٹرنیٹ فراہم کر دیا تھا۔ وہ HSDC کے برائن سے رابطے میں تھا۔ HSDC،PTWC کے بجائے الاسکا وارننگ سینٹر، پالمر سے اپ ڈیٹس لے رہے تھے۔ کیونکہ PTWC میں کوئی نہیں تھا۔ ایک گھنٹے پہلے جو تخمینہ لگایا گیا تھا، وہ تیسری لہر کے دو سوفٹ بلند تھا جب وہ ہونولولو پر چڑھائی کرتی۔
ٹریسا عملاً کائی کو گھسیٹتی ہوئی اس جگہ لائی جہاں میا ٹریپ ہو گئی تھی، ادھڑے ہوئے کونڈو کے اس حصے نے کائی کے حواس گم کر دیے۔ کائی کے مانند براڈ نے بھی میا کو بچانے کے لیے اپنی آڑ فراہم کی تھی۔ سونامی سے زیادہ پروپین ٹینک کے ساعت شکن دھماکے نے کونڈو کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ دھماکے کی وجہ سے چھت کا فولادی شہتیر نکل کر ایک طرف دیوار میں گھس گیا تھا اور دوسری جانب کاؤنٹر کو توڑ دیا تھا۔ کائی حیران تھا کہ انہوں نے سمندر کی جانب کمروں میں پناہ لینے کے بجائے کچن میں کیوں چلے آئے تھے۔ ٹریسا پانچ فٹ کے فرق سے شہتیر کی زد میں آنے سے بچ گئی تھی۔
”تم تو ٹھیک ہو؟“ کائی نے براڈ کو دیکھا۔
”ہاں، بس حرکت نہیں کر پا رہا ہوں۔“
”کوشش کرتا ہوں۔“ کائی نے کہا اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر تمام زور لگا دیا۔
”رک جاؤ۔“ براڈ کی چیخ نکل گئی۔ اس طرح تو میرے ہاتھ اکھڑ جائیں گے۔ ٹریسا، میا کے بال سہلاتے ہوئے اسے تسلی دے رہی تھی۔ شہتیر کی چوڑائی بھی ایک فٹ کے قریب تھی۔ صورتِ حال حوصلہ شکن تھی۔ وقت سکڑتا جا رہا تھا اور منحوس شہتیر کو ہٹانا ممکن نہیں تھا۔

”پلیز ہمیں چھوڑ کے مت جانا۔“ میا رو پڑی۔
”کوئی چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ ہم تمہیں یہاں سے نکال لیں گے۔ کائی ٹریسا کے ساتھ ہال وے کی طرف چلا۔
”ہنی میں آرہی ہوں۔“ ٹریسا نے آواز لگائی۔
”تم جیک کو چیک کرو اور بتاؤ کیا معاملہ ہے۔ میں میا اور براڈ کے لیے کوئی حل نکالتا ہوں۔“
”کتنا وقت ہے؟“
”دس منٹ۔“ کائی نے کہا۔ ”پانچ منٹ میں ہمیں نکلنا ہوگا۔ کائی نے بے چینی سے اِدھر اُدھر جھانکنا شروع کیا۔ اسے دیوار پر کلہاڑا نظر آیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ دیوار پر کیسے رہ گیا۔ اس نے کلہاڑا اتار لیا۔
”اس کا کیا کرو گے؟“ ٹریسا نے قدرے حیرت سے سوال کیا۔
”پتا نہیں۔“

☆☆☆

ٹریسا آٹھویں منزل پر ٹام سے ملی۔ وہ لینڈنگ پر عجیب انداز میں پڑا تھا۔
”میں پھسل کر گرا تھا۔ یہ ٹوٹ گیا ہے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔
”نہیں، اس کا جوڑ ہٹ گیا ہے۔“ ٹریسا نے کہا۔
”جیک کہاں ہے؟“
ٹام نے دوسرے ہاتھ سے ہال کی طرف اشارہ کیا۔
”ایسا لگا جیسے بم سے حملہ ہوا تھا۔ جیک، ٹام کے مقابلے میں بدقسمت ثابت ہوا۔ کند دھات کا دو فٹ لمبا ٹکڑا آسانی دیوار میں سے گزرا اور دیوار کے ساتھ موجود جیک کے سینے میں ترازو ہو گیا۔ دھاتی ٹکڑے کا ایک حصہ سامنے سینے کے باہر نکل آیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ لہو نے دیوار کو رنگین کر دیا تھا۔ سامنے زخم سے بھی خون رس رہا تھا۔ سانس کی رفتار مدھم تھی۔
”کیا وہ زندہ ہے؟ کیا تم کچھ کرسکتی ہو؟“ ٹام کراہنے لگا۔
ٹریسا زخمی کو دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ یہ نو وِن (No win) صورتِ حال تھی۔ وہ کچھ کرتی تو لڑکا مرتا، نہ کرتی تب بھی اس نے مرنا تھا۔ فوری پیشہ ورانہ امداد اور ایمبولینس کی ضرورت تھی جس کا امکان صفر تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ ٹریسا کا دم گھٹنے لگا۔
وہ ٹام کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”تمہارا ہاتھ ٹوٹا نہیں جوڑ جگہ سے ہٹ گیا ہے۔ میں ٹھیک کر دوں گی۔“

"درد ہوگا؟" ٹام نے سوال کیا۔

"ہاں، تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔" وہ پشت کے بل لیٹ گیا۔ ٹریسا نے پوزیشن لی۔ بایاں ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا اور دایاں ہاتھ کہنی پر۔

"میں تین تک گنوں گی پھر دباؤ کے ساتھ جوڑ کو واپس ساکٹ میں بٹھادوں گی۔ او کے؟"

"رائٹ۔"

"ون...... ٹو...... تھری......" ٹریسا نے تیز حرکت کی اور جوڑ کو واپس بٹھادیا۔ ٹام نے بمشکل چیخ کا گلا گھونٹا تھا۔ تاہم اس کا درد کم ہوتا چلا گیا۔

ٹام نے شکریہ ادا کیا۔

"جیک کا کیا ہوگا؟"

"ٹام میں بے بس ہوں۔ وہ نہیں بچے گا۔"

"تم ڈاکٹر ہو؟"

"ہاں، لیکن وہ جس حال میں ہے، کوئی ڈاکٹر کچھ نہیں کرسکتا۔"

ٹام کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ٹریسا نے اسے گلے سے لگالیا اور سر سہلانے لگی۔ وہ خود بھی اشک بار تھی۔

"میرا قصور ہے۔" ٹام نے سسکی لی۔ "میں نے مام اور ڈیڈ کو راضی کیا تھا کہ جیک کو ساتھ آنے دیں۔"

"نہیں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم دونوں نے جو کچھ کیا ہے اسے جان کر تمہارے والدین فخر کریں گے۔ تم دونوں ہیرو ہو۔ ہم مقروض ہیں تمہارے۔ تم نے لائی اور میری بیٹی کی جان بچائی ہے۔ جیک بھی ہیرو ہے۔"

☆☆☆

"جیک؟" کائی، ٹریسا کا اداس چہرہ دیکھ کر چونکا۔ پھر اس نے ٹام کا چہرہ دیکھا۔

ٹریسا نے کچھ کہے بغیر سر جھکا لیا اور کائی حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا۔ جیک اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ بقا کی جنگ لڑتے ہوئے ان کے گروپ کا ایک رکن زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ان کی مدد کرنے کے بجائے وہ اپنی فکر کرتا تو اکیلا ہائی گراؤنڈ تک جا سکتا تھا۔ کائی کے چہرے سے کسی نے خون نچوڑ لیا۔ وہ سوگ بھی نہیں منا سکتا تھا۔ کئی اور زندگیاں موت کے منہ میں تھیں۔

"میا کیسی ہے؟" ٹریسا نے استفسار کیا۔

"ٹھیک، مگر تکلیف میں ہے۔ کلہاڑے کو میں لیور کے طور پر استعمال کرنا چاہ رہا تھا لیکن یہ شہتیر کافی وزنی ہے۔"

"ہم سب مل کر کوشش کرتے ہیں۔" ٹریسا نے تجویز دی۔

"بات نہیں بنے گی۔ بہرحال ٹرائی کرتے ہیں۔" ٹریسا نے کلہاڑا ٹام کو دیا۔ "تم اسے پھنسا کر دائیں ہاتھ سے زور لگانا۔"

پھر انہوں نے مل کر زور آزمائی شروع کردی۔ انہوں نے دو مرتبہ زور لگایا۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

ٹام کے ذہن میں جیک کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اچانک وہ بول اٹھا۔ "اگر ہمیں گاڑی کا جیک مل جائے تو کام ہوجائے گا۔"

سب جیسے اچھل پڑے۔

"بہت اچھے، جلدی کرو۔" ٹریسا نے کہا۔ اس وقت پانی بھی اتر چکا تھا۔ سڑکوں پر اور ساحل پر جہاں بہت کچھ پڑا تھا۔ وہیں کاریں بھی تھیں۔ کوئی الٹی ہوئی تھی، کوئی پہلو کے بل پڑی تھی، بعض سیدھی حالت میں بھی تھیں۔ حالت ظاہر ہے ناگفتہ بہ تھی۔ انہیں بھی ڈرائیو نہیں کرنی تھی۔

"دو جیک مل جائیں تو کام یقینی سمجھو۔" کائی نے کہا اور گھڑی دیکھی۔ صرف سات منٹ رہ گئے تھے۔ بہت قلیل وقفے میں جیک بھی لینے تھے اور واپس بھی جانا تھا۔ سخت اعصابی تناؤ تھا۔ کائی کے گرد ناامیدی نے گھیرا ڈالنا شروع کیا۔ بہت کم وقت تھا...... تاہم وہ باہر نکلے تو غیر اختیاری طور پر اس کی نظر کونڈو کے عقب میں تباہ شدہ عمارت پر پڑی۔ دماغ میں امید کی کرن لہرائی۔ تباہ شدہ عمارت سے سوگز کے فاصلے پر ایک اور عمارت تھی جو ابھی تک ایستادہ تھی۔ کائی نے اس کی پیشانی پر مٹے مٹے حروف پڑھے اور مخصوص نشان دیکھا۔ وہ ایک اسکیوبا (Scuba) شاپ تھی۔

☆☆☆

میکس چھت کے کنارے پر گیا اور اسکائی برج کی طرف دیکھا۔ راشیل کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ وہاں اسے کسی قسم کی کوئی حرکت نظر نہیں آئی۔ وا کی ٹاکی بھی راشیل کے پاس تھا۔ دور سے ہیلی کاپٹرز کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ چھتوں پر بھی اتر رہے تھے۔ لیکن ان کی طرف کسی نے رخ نہیں کیا تھا۔ معاً ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز قریب سے سنائی دی۔ میکس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ کچھ اور افراد کے سر بھی اوپر ہوگئے۔ ایک ہیلی کاپٹر ان کی سمت آرہا تھا۔ میکس نے اندازہ لگایا کہ اس میں چھ سے زیادہ نشستیں نہیں ہوں گی۔ دوسروں کے مانند اس نے بھی پاگلوں کی طرح ہاتھ لہرانے شروع کردیے۔

وہ حلق پھاڑ کر چیخ بھی رہے تھے۔ حالانکہ چیخ پکار ہیلی کاپٹر کے شور میں بے معنی تھی۔ ہیلی کاپٹر سو گز کی دوری پر رہ گیا تو میکس کو پائلٹ کا چہرہ نظر آنے لگا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ہیلی کاپٹر میں چند مسافر بھی تھے۔ پائلٹ نے مشین کو نیچے لانا شروع کیا اور تیس گز اوپر رک گیا۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے میدان صاف کرنے کے لیے کہا۔ ہر کوئی آگے رہنا چاہتا تھا۔ میکس نے سمجھایا کہ پائلٹ کیا چاہتا ہے۔ کچھ افراد نے چھت کے کنارے پر جا کے ہیلی کاپٹر کے لیے لینڈنگ زون کی جگہ بنائی۔

ہیلی کاپٹر چھت پر اترا تو میکس نے ایڈرین کو بے قرار سپاہیوں کے گروپ کو سنبھالنے کا اشارہ کیا اور سر جھکا کر ہیلی کاپٹر کی طرف بھاگا۔

"کتنے ہیں؟" پائلٹ نے براہِ راست سوال کیا۔

"ساٹھ، پینسٹھ......"

"اوہ نو۔" پائلٹ نے سیٹی بجائی۔ "میں دیکھوں گا کہ کتنے چاپرز اس طرف آسکتے ہیں۔"

میکس نے کیبن میں جھانکا۔ دو نشستیں خالی تھیں۔

"دو تو جا سکتے ہیں؟"

"ہاں صرف دو۔ زیادہ لے جانے کے چکر میں کئی ہیلی کاپٹر کریش کر چکے ہیں۔"

"سمجھ گیا۔" میکس واپس سپاہیوں کی طرف چلا گیا۔ صورتِ حال سمجھائی کہ دو کی گنجائش ہے۔ مزید ہیلی کاپٹرز آرہے ہیں۔ پہلے عورتوں کو روانہ کیا جائے گا۔ معمولی اختلاف کے بعد لائحہ عمل طے پا گیا۔ میکس نے دو عمر رسیدہ عورتوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں اپنے شوہروں سے مل کر ہیلی کاپٹر کی طرف چل پڑیں۔

"میں مسافروں کو ٹرپل میڈیکل سینٹر چھوڑوں گا۔ اگر وہ مصروف ہوا تو ہیلر فیلڈ لے جاؤں گا۔ ہر ممکن جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" پائلٹ نے اعلان کیا۔

☆☆☆

راشیل نے ایک ہاتھ سے پلر اور دوسرے ہاتھ سے وائٹ کا ہاتھ پکڑا۔ بل نے برج پر آنے کی کوشش کی تو راشیل نے چیخ کر اسے روک دیا کہ مزید وزن ڈالنے سے برج گر بھی سکتا ہے۔ وہ رک تو گیا لیکن سخت بوکھلایا ہوا تھا۔ دوسری طرف وائٹ کا وزن زیادہ تھا۔ راشیل اسے اوپر نہیں کھینچ سکتی تھی۔

"وائٹ......" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میری ٹانگوں سے لپٹ کر میری کمر تک آجاؤ۔" ہمت جمع کر کے راشیل نے اسے تھوڑا اوپر اٹھایا۔ وائٹ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ راشیل کا دوسرا ہاتھ آزاد ہوا تو اس نے پلر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ صورتِ حال قدرے بہتر ہوگئی تھی۔ وائٹ کا ایک ہاتھ، پھر دوسرا بھی پلر تک آگیا۔ جدوجہد کے بعد وہ برج پر واپس آگیا۔ اب راشیل کی باری تھی۔ وائٹ کا بوجھ ختم ہونے سے اس پر دباؤ بھی معدوم ہوگیا۔ ایک ٹانگ اوپر کر کے اس نے برج میں پھنسائی...... کچھ دیر میں وہ بھی برج پر تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ دونوں یقینی موت کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ چند قدم چل کر انہوں نے برج کراس کیا اور لابی میں لیٹ گئے۔

برج کے دوسرے سرے پر وائٹ فیملی کے چہرے کھل اٹھے تھے...... "پیگ اب تم حنا کے ساتھ آؤ۔ ڈرنا مت مگر محتاط رہنا۔ میں یہیں ہوں کیونکہ برج پر وزن زیادہ نہیں پڑنا چاہیے۔" راشیل نے کھڑے ہو کر اشارہ کیا۔ بل نے پیگ کا شانہ تھپتھپایا۔ پیگ نے آٹھ سالہ بیٹی کا ہاتھ پکڑ کے اسکائی برج پر قدم رکھا۔ راشیل خاموش لیکن سراسیمہ تھی۔ تاہم اس نے چہرے کے تاثرات پُرسکون رکھے تھے۔ پیگ، بیٹی کو لے کر کامیابی سے مونا ٹاور تک آگئی۔

راشیل نے اسے سمجھایا کہ کتنا وقت ہے، خطرہ کیا ہے اور اگلی لہر ڈیڑھ سو فٹ کے لگ بھگ ہوگی۔ ہمیں کم از کم پندرھویں فلور تک پہنچ جانا چاہیے۔ بچوں کو سیڑھیوں کے ذریعے اوپر جانے دو، بل آجائے گا۔ بل کے آنے کے بعد اوپر جانا شروع کیا تو بمشکل دس منزل تک پہنچ پائیں گے۔

پیگ کے چہرے پر کشمکش تھی۔ اس نے بل کی سمت دیکھا۔ وہ نیچے جھکا اور ایشلے عقب سے اس کی گردن میں بازو حمائل کر کے پشت پر سوار ہوگئی۔ پیگ نے راشیل کو دیکھا جو ان کی نجات دہندہ تھی اور خود بھی مرتے مرتے بچی تھی۔ اس کے مشوروں کو ٹھکرانا حماقت تھی۔ بالآخر وہ مان گئی۔

"میری بھی فیملی ہے اور ایک بیٹی ہے۔" راشیل نے آخری بات کہی۔

پیگ نے سر ہلایا۔

"کیا تم میری خاطر بچوں کو اوپر لے جاؤ گی۔ میں بل اور ایشلے کو یہاں نہیں چھوڑ سکتی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"میں سمجھ سکتی ہوں۔ ٹھیک ہے میں بچوں کو لے جاتی ہوں۔ ہم سولھویں منزل پر تمہارا انتظار کریں گے۔"

"اگر میں دس منٹ میں نہیں پہنچ سکی؟"

"میں بچوں کا خیال رکھوں گی۔" راشیل نے یقین

سے کہا۔
''تھینک یو۔''
راشیل نے بچوں کا ہاتھ تھاما اور چل پڑی۔
''موم اور ڈیڈ آرہے ہیں۔'' حنا نے کہا۔
''مجھے نہیں معلوم۔'' راشیل نے سوچتے ہوئے پلٹ کر بل اور ایشلے کی طرف دیکھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''میں امید کرتی ہوں، دعا کرتی ہوں...... لیکن میں جانتی نہیں ہوں۔''

☆☆☆

11:41 a.m

(دوسری لہر آنے میں چھ منٹ)

اسکیوبا شاپ کئی منزلہ عمارت کی دوسری منزل پر تھی۔ اتنا کچھ بھگتنے کے بعد اچانک خوش قسمتی کا اشارہ کائی کے لیے حیران کن تھا۔ جیک مل بھی جاتا تو وہ بروقت براڈ اور میا کو نکال کر دوسری بلند عمارت تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن اسکیوبا شاپ دیکھ کر نئے خیال، نئی امید نے جنم لیا۔ اگرچہ وہ اب بھی بچنے کے لیے بلند عمارت میں جا سکتے تھے۔ تاہم میا اور براڈ کو کیونکر چھوڑا جا سکتا تھا۔

ثریا کو کائی نے جیک کی تلاش پر لگایا...... ایک دو تین جتنے بھی مل جائیں۔ باہر کچھ اور افراد بھی تھے جو غالباً انہی کی طرح بچ گئے تھے۔ تاہم اگلا ہولناک مرحلہ سب کے لیے جان لیوا تھا۔ پتا نہیں وہ اجنبی افراد آنے والی صورتِ حال سے باخبر تھے بھی یا نہیں۔ متعدد ٹین ایجرز ایک ہوٹل سے نکل کر پہاڑ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک ایشین عورت دس سالہ لڑکے کے ساتھ دوسرے ہوٹل میں غائب ہوتی نظر آئی...... دو افراد دسویں منزل کی بالکونی سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ وہ دو سو گز دور تھے۔ ایک نیم برہنہ آدمی ان کے پاس آیا اور ایملی کے بارے میں پوچھنے لگا۔

''کون ایملی؟''

اس نے کائی کا گریبان پکڑ کر سوال دہرایا۔ کائی نے انکار میں جواب دیا۔ گریبان چھوڑ کر وہ دوسری طرف چل دیا۔ وہ ہر دروازے اور کھڑکی میں جھانک رہا تھا۔ ایسے ہی المناک مناظر اطراف میں بکھرے ہوئے تھے جو مر چکے تھے، وہ فکر و فاقے سے آزاد تھے۔ کائی کسی کے لیے کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ جنگل کا قانون بنا ہوا تھا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔

کائی، لانی اور ٹام کے ساتھ اسکیوبا شاپ والی عمارت میں چلا گیا۔ اندر جا کر اسے علم ہوا کہ عمارت خاصی متاثر ہوئی تھی۔ اسٹور کی مکمل سپلائی جگہ پر نہیں تھی۔ وہ کاٹھ کباڑ میں اسکیوبا ٹینک تلاش کر رہا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ اعصاب ٹوٹ رہے تھے۔ عقبی دیوار کے ساتھ اسے بڑی پلائی ووڈ شیٹ نظر آئی جو ایک طرف لٹک گئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک دروازہ تھا۔ پلائی ووڈ ہٹا کے کائی نے دروازہ کھولا۔ نئے کمرے کے سرے پر دھاتی دروازہ بظاہر درست حالت میں تھا۔ دروازہ کھول کر وہ کمرے میں آیا تو آنکھیں روشن ہو گئیں...... ہر مطلوبہ چیز وہاں موجود تھی۔ کائی نے گھڑی دیکھی۔ پانچ منٹ۔

نوّے سیکنڈ میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ تین ائر ٹینک، تین اوکٹوپس ائر ہوزز اور نائیلون کی رسی۔ ہم چھ ہیں۔ ائر ہوزز میں دو ریگولیٹرز ہونے چاہئیں۔ خیال رکھنا۔ شروع ہو جاؤ۔ ہم میا اور براڈ کو بروقت نہیں نکال سکتے۔ دوسرا طریقہ استعمال کریں گے۔ دوسری لہر کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''آپ نے یہ کام کیا ہے؟'' لانی نے سوال کیا۔
''میرے پاس باقاعدہ سند ہے۔''

لانی نے رسی کا جو لچھا اٹھایا تھا۔ کائی کے مطابق وہ سو فٹ طویل تھا۔ لمبائی زیادہ تھی۔ ڈائیو نائف، ماسک اور فلیش لائٹ بھی...... جلدی کرو۔ ماسک نہیں ملے اور کائی نے نکلنے کا اشارہ کیا۔ نکلتے نکلتے اس کی نظر ایک پرانی لائف رافٹ پر پڑی۔ وہ اس کی مدد سے لہروں پر فلوٹ کر سکتے تھے۔ گریٹ آئیڈیا نہیں تھا لیکن حالات کے تحت بہتر تھا کہ بیڑا کی نہ کرنی پڑی۔

''لانی تم اسے لا سکتی ہو؟''
''ہاں۔''

☆☆☆

ثریا کو پہلی کار میں سے ہی جیک مل گیا۔ اسے شک تھا کہ پانی نے اسے جام نہ کر دیا ہو۔ اندازہ ٹھیک نکلا۔ اس نے گریس کے آسرے میں ڈیش بورڈ کھولا لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ دوسری گاڑی کی طرف بھاگی۔ گاڑی شیوی تھی، جو الٹی پڑی تھی۔ یہاں بھی مایوسی۔ وہ وین کی طرف بھاگی۔ قسمت نے کام دکھایا۔ وین سے دوسرا جیک اور گریس کا ڈبا بھی مل گیا۔ وہ تینوں اشیا کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب اس نے کائی، ٹام اور لانی کو دیکھا۔ دفعتاً ایک اُلجھی ڈاڑھی والا بدہیئت آدمی وین کے دوسری طرف سے نمودار ہوا۔

''چور، ڈاکو......'' اس نے بدتمیزی سے کہا۔

ثریا نے ہاتھ نیچے کر لیے۔ ”میں چور نہیں ہوں۔ جیک کے ذریعے مجھے کسی کی مدد کرنی ہے۔“

”میں جانتا ہوں تم جیسوں کو آج میں نے کئی لٹیرے پکڑے ہیں۔“

ثریا نے اب تک اس کے ہاتھ کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھایا جس میں آٹومیٹک پسٹل موجود تھا۔

”میری بات سنو......“

”میرے ساتھ پولیس کے پاس چلو۔“ وہ بولا۔

”سونامی آنے والا ہے۔“

”ہاں، تم جیسے خوش ہیں اور لوٹ مار میں معروف ہیں۔“ وہ غرایا۔

”سر......“

”پولیس...... پولیس......!“ اس نے شور مچا دیا۔

”کائی پیچھے جاؤ۔“ ثریا نے بلند آواز میں کہا۔

داڑھی والے نے مڑ کے دیکھا کہ وہ کس کے ساتھ مخاطب ہے۔ اس نے تیزی سے مڑ کر گن کو بلند کیا۔ اس کا توازن قدرے بگڑ گیا۔ اس کے ساتھ بحث کرنا لاحاصل تھا، وقت کا زیاں تھا۔ اس کا چہرہ کائی کی طرف تھا۔ ثریا نے بلاتامل وزنی جیک دونوں ہاتھوں میں گھما کر اس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ گن ہاتھ سے نکل گئی۔ ثریا نے گن اٹھا کر میگزین نکالا اور گن کو کچرے میں اچھال دیا۔ داڑھی والا آگے جھکا اور لیٹ گیا۔

”کتیا۔“ وہ بڑبڑایا۔

☆☆☆

11:45 a.m

(سونامی کی دوسری لہر آنے میں دو منٹ)

بل، ایشلے کو پشت پر لے کر آہستہ آہستہ مونا ٹاور کی طرف جا رہا تھا۔ ایک آدھ جگہ سلپ ہونے کے علاوہ وہ کامیابی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بل کا وزن زیادہ تھا۔ واک وے میں گاہے گاہے مشکوک آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

”شاباش، ویری گڈ!“ پیگ نے حوصلہ بڑھایا۔ بل بیٹی کو لے کر ریلنگ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ چند قدم باقی تھے۔ معاً برج کے دوسرے سرے پر ہڑبونگ ہونے لگی۔ پانچ کالج کی عمر کے لڑکے نشے میں دھت اول فول بک رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ پیگ اور بل کچھ کہتے، انہوں نے برج کے واک وے پر قدم رکھ دیے۔ پیگ کی دہشت ناک چیخ بلند ہوئی۔

پانچوں چند قدم چلے تھے کہ ایک تو پھسل کر نیچے جا گرا۔ بچنے کی کوشش میں وہ دو اور لڑکے ساتھ لے گیا۔ نازک اسکائی برج کے کیبل ٹوٹے، برج نے ہچکولے کھائے۔

”بل کود جاؤ۔“ پیگ حلق کے بل چیخی لیکن بل کا گرنا یقینی تھا۔ اس نے پھرتی سے ایشلے کو کمر سے گود میں لیا اور چھوٹی بچی کو جھکولا دے کر پیگ کے منتظر ہاتھوں میں اچھال دیا اور اسی لمحے برج درمیان سے ٹوٹ گیا۔ برج کے دونوں حصے ابھی الگ الگ ٹاورز کے ساتھ منسلک تھے۔ پانچوں لڑکے موت کی نذر ہو گئے تھے۔ بل نے دونوں ہاتھوں سے پلر کو تھاما ہوا تھا۔ مخالف سمت میں برج کا ٹوٹا ہوا حصہ لہرا کر ٹاور سے ٹکرایا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نیچے لاشوں پر جا گرا۔

بل والا ٹوٹا ہوا برج بھی مونا ٹاور سے ٹکرا کر مزید ٹوٹ گیا۔ واک وے ٹوٹ پھوٹ کر تقریباً غائب ہو چکا تھا۔ لیکن چھت عمودی پلرز کے ساتھ صرف دو آہنی کیبلز کے ساتھ موجود تھی۔ مونا ٹاور کے واک وے کا کچھ حصہ بچ گیا تھا۔

پیگ نے خوف زدہ انداز میں کنارے سے نیچے کی جانب جھانک کر دیکھا۔ بل نے دونوں ہاتھوں سے پلر کو تھاما ہوا تھا۔ پیگ نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ بے خبر تھی کہ یہ محض چند منٹ کی بات ہے۔ بل کی گرفت ختم ہوگی یا پھر آنے والا سونامی بہت کچھ ہڑپ کر جائے گا۔

☆☆☆

راشیل تھک چکی تھی۔ وہ سولہویں منزل کے اسٹیئر ویل فائر ڈور سے سر ٹکائے کھڑی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ واکی ٹاکی پر کائی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہی۔ جواب نہ آنے پر وہ مزید پریشان ہو گئی۔

”کائی کون ہے؟“ وائٹ نے سوال کیا۔

”میرا شوہر اور لانی کا باپ ہے۔“

”کیا ہوا ان کو؟“ حنا نے سوال کیا۔

”پتا نہیں......“ وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ حنا اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

”تھینک یو، بیٹی۔“ راشیل نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پھر واکی ٹاکی اٹھایا۔

☆☆☆

”میں تو سمجھا کہ تم لوگ ہمیں بھول گئے۔“ براڈ بدترین

حالات میں مسکرایا۔

"تم دونوں کے بغیر نہیں جا سکتے۔" کائی نے کہا۔

"یہ کس لیے؟" براڈ نے اسکوبا ٹینکس کو دیکھا۔

"بتاتا ہوں۔"

ٹریسا نے دونوں جیک دکھائے۔

"ہاں، جیک لگاؤ۔" براڈ نے بے قراری سے کہا۔

"رک جاؤ، وقت نہیں۔" کائی نے کہا۔

"پہلے ہمیں تو نکالو۔" براڈ کسمسایا۔

"غور سے سنو اور سمجھو، زیادہ سے زیادہ دو منٹ بچے ہیں۔" کائی نے پھرتی سے رسی کو دس دس فٹ کے ٹکڑوں میں کاٹا۔ "پہلے ہمیں خود کو آپس میں باندھنا ہوگا۔"

"تم مذاق کر رہے ہو۔" براڈ بوکھلا گیا۔ "میں یہاں نہیں رکوں گا۔ نکالو یہاں سے...... میں نہیں رک سکتا۔"

"اور کوئی حل نہیں ہے، پرسکون رہو۔" کائی نے رسیاں ٹریسا کو دیں۔ "مضبوطی سے باندھنا شروع کرو۔ اس کام کے لیے شہتیر بہترین ہے۔"

"لیکن پانی......" براڈ کے چہرے پر کشمکش تھی۔

"جانتا ہوں۔ ہمیں پچاس فٹ پانی کے نیچے رہنا ہو گا۔" کائی نے جواب دیا۔ صرف کونڈو بلڈنگ کی مضبوطی کا سوال بار بار کائی کے دماغ میں کسی زہریلے سانپ کے مانند سر اٹھا رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کونڈو اگلی لہر کے سامنے کھڑا رہے گا تو ان کے بچنے کے امکانات بھی رہیں گے۔ جب کائی نے براڈ اور میا کو بھی شہتیر کے ساتھ باندھنے کے لیے کہا تو ٹریسا نے نکتہ اٹھایا۔

"کیوں، وہ تو پہلے ہی وزنی شہتیر کے نیچے پھنسے ہوئے ہیں؟"

"تمہیں پانی کی طاقت اور دباؤ کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔" کائی نے جواب دیا۔

"اور تم؟"

"میں خود کو لانی کے قریب جکڑ لوں گا۔" یہ کہہ کر کائی نے ٹریسا کی کمر کے گرد رسی لپیٹ کر شہتیر کے ساتھ مخصوص گرہیں لگا دیں۔

ٹام نے ریگولیٹر ہوزز ہر ٹینک کے ساتھ ٹائٹ کر دیے۔ ہر یونٹ کے ساتھ آکٹوپس ہوز تھا، جس میں سانس کے لیے دوسرا ریگولیٹر منسلک تھا۔ چھ افراد کے لیے تین ٹینک۔ ڈائیولائٹ کائی کی کلائی پر تھی۔ رسی کے آخری ٹکڑے کے ذریعے لائف رافٹ کو اس نے فولادی شہتیر کے ساتھ باندھ دیا۔ دو منٹ قریب الختم تھے۔ عین اس وقت جو آواز انہوں نے سنی وہ گویا سماعت کے لیے بدمست موسیقی کے.... مانند تھی۔ آہنی پرندہ عین کونڈو کے اوپر پھڑپھڑا رہا تھا۔ کائی کی درخواست کے مطابق بلاشبہ ریگی نے کارروائی ڈالی تھی لیکن ٹائمنگ...... وائے قسمت، ہائے قسمت......

اگر ہیلی کاپٹر جلدی بھی آ جاتا تو وہ براڈ اور میا کو وہاں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ کائی نے برق رفتاری سے تخمینہ لگایا کہ کم از کم ٹام اور لانی کو روانہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا۔ سب بندھے پڑے تھے۔ ان دونوں کو کھول کر چھت پر پہنچانے میں کئی منٹ لگتے تھے۔ اس دوران سونامی نے پھر انہیں دبوچ لینا تھا۔ دل سب کے مچل رہے تھے لیکن کائی نے عالمِ بے چارگی میں یہ خیال مسترد کر دیا۔ بڑی دلخراش صورتِ حال تھی۔ اگلے منٹ میں ہیلی کاپٹر کی آواز دور چلی گئی۔ غالباً کسی اور بلڈنگ کی چھت کی طرف۔ "سب لوگ ریگولیٹر مضبوطی سے منہ میں رکھ لو، دانتوں کا استعمال کرو۔" کائی نے ہدایت دی۔

"ریگولیٹر ہر صورت میں رہنا چاہیے۔ دونوں ہاتھ بھی استعمال کر سکتے ہو۔ ماسک نہیں ہیں۔ لہٰذا آنکھیں بند رکھنا۔ کاٹھ کباڑ ساتھ آئے گا۔ سر کو بچانے کی کوشش کرنا۔ اگرچہ تم دیکھ نہیں سکتے۔ ہم جو کرنے جا رہے ہیں یہ بہت دشوار ہے۔ تاہم ناممکن نہیں ہے۔"

☆☆☆

11:47 a.m

(سونامی کی دوسری لہر)

بل راجرز پلر کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ اوپر آنے کی کوشش ناکام ہو گئی تو۔ ایک تو اس کا وزن ڈھائی سو پاؤنڈ تھا۔ دوسرے مونا ٹاور کی جانب کا بچا ہوا تھوڑا سا حصہ خاصا مخدوش ہو گیا تھا۔

پیگ محض دس فٹ کے فاصلے سے بے بسی کے عالم میں شوہر کو موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا دیکھ رہی تھی۔

"موی، ڈیڈی کی مدد کریں۔" ایشلے نے کہا۔

"ہنی تم وہاں اسٹیئر ویل کے قریب انتظار کرو۔" پیگ نے ایگزٹ کے نشان کی طرف اشارہ کیا۔

ایشلے بسورتی ہوئی اسٹیئر ویل کی طرف چلی گئی۔

پیگ، بل کی طرف متوجہ ہوئی۔ "ہمت کرو میں کچھ لے کر آتی ہوں۔" وہ بولی۔ چند سیکنڈ سوچ کر وہ ٹوئن ٹاور ہوٹل کی سمندر والی سمت میں بھاگی۔ اسے فائر ہوز کی تلاش تھی۔ ہال وے میں فائر ہوز کا شیشے کا باکس ٹوٹا ہوا تھا۔ تاہم فائر ہوز موجود تھا۔ اس نے چند قدم اٹھائے تھے کہ مخصوص

گرجدار آواز اُبھری اور بڑھتی چلی گئی۔ سونامی کی سفید جھاگ دار لکیر دور افق پر نظر آرہی تھی۔ پیگ کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ واپس ٹوٹے ہوئے برج کی سمت بھاگی۔

بل نے بھی بھیانک آفت کی جھلک دیکھ لی تھی۔

"کچھ ملا؟" بل کے بازو سن ہونے لگے تھے۔

"وقت نہیں ہے۔ میں خود تمہیں سہارا دیتی ہوں۔"

"نہیں!" بل چلا اٹھا۔ "اسکائی برج خستہ حالت میں ہے۔ تمہارا وزن برداشت نہیں کرے گا۔ ہم دونوں مارے جائیں گے۔"

جناتی گرج بلند تر ہوگئی۔

"جاؤ یہاں سے۔" اس کی آواز میں اداسی اور پیار کا ملا جلا امتزاج تھا۔

"نہیں۔" پیگ سسکیاں لینے لگی۔

"ایشلے کی خاطر جاؤ......"

"نہیں، تم میرے ساتھ آؤ گے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔" وہ رونے لگی۔

سونامی کی جھاگ اُڑاتی تباہ کن دیوار بلند تر تھی اور محض پانچ سو گز کے فاصلے پر۔

"پیگ تم بے قصور ہو۔ آئی لو یو۔" اور بل نے پلر پر سے گرفت ڈھیلی کردی۔

"بل!" وہ حلق کے بل چیخی تھی۔ چھٹی منزل سے نیچے گرنا لمحوں کا سفر تھا۔ اس کا ٹوٹا پھوٹا مردہ جسم ملبے پر ساکت پڑا تھا۔

پیگ ہچکیاں لیتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ سونامی کی قیامت سر پر تھی۔ وہ روتی ہوئی بیٹی کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

ڈھیلر آرمی فیلڈ میں ریگی کمپیوٹر اور ٹی وی کے ساتھ موجود تھا۔ الاسکا سونامی وارننگ سینٹر میں اس کا رابطہ فرینک مینائی کے ساتھ قائم تھا۔ وہ سیل فون استعمال کررہا تھا۔ ٹی وی پر ہیلی کاپٹر کا منظر دوسرے سونامی کی ناقابلِ مزاحمت کو آگے بڑھتا دکھا رہا تھا۔ تباہ شدہ ٹی وی اسٹیشنز پر کام کرنا ممکن نہ تھا۔ سیلائٹ سے اپ لنک وینز ضروری عملے کے ساتھ بلندی پر جاکر براڈ کاسٹ کررہی تھیں۔ بدترین تباہی و بربادی تاریخ میں قدرتی آفات کا ایک نیا باب کھول رہی تھیں۔

"مینائی تم نے دیکھا؟" ریگی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"ہاں، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ کیا تمہارے ساتھی مل گئے؟"

"ابھی نہیں، بلیک ہاک کی خبر حوصلہ افزا نہیں ہے۔ وہاں چھت پر کوئی نہیں تھا۔ شاید وہ پہلے ہی بھاگ نکلے تھے۔"

"اگر ایسا ہوا تو وہ بڑی مصیبت کا سامنا کرنے والے ہیں۔" مینائی کی آواز میں تشویش تھی۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔ تم تیسرے سونامی کی بات کررہے ہو۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"دو سو فٹ بلند سونامی سے بڑی اور کیا مصیبت ہوسکتی ہے؟" ریگی کا دل سینے میں شور مچانے لگا۔

"میں چوتھے سونامی کی بات کررہا ہوں۔"

"چوتھی لہر؟ کیا کہہ رہے ہو؟"

"ایک منٹ پہلے ڈارٹ بوائے کی تازہ ریڈنگ آئی ہے۔ ناقابلِ یقین خبر ہے۔ چوتھی لہر کا قد وقامت...... وہ تین سو فٹ سے بلند ہوگی۔"

ریگی کے کچھ بولنے سے پہلے دوسری لہر نے وائی کی کی کو روندنا شروع کردیا تھا۔

☆☆☆

کائی نے آنکھیں بند کرلیں۔ پانی کھڑکیوں، بالکونی، نچلی اور بالائی منزلوں سے ہر طرف سے آرہا تھا۔ شور نے سماعت مفلوج کردی تھی۔ پانی کونڈو میں مختلف سمتوں اور زاویوں سے آیا تھا۔ اسی لیے پوزیشن بدل بدل کے ٹکرا رہا تھا، گھوم رہا تھا، بل کھا رہا تھا۔ وہ بلڈنگ کے اندر ہونے کے باوجود شدید دباؤ برداشت کررہے تھے۔ ایک گھن چکر تھا...... بھنور بن رہے تھے۔ ان کی حالت ایسی تھی گویا ان کو بہت بڑی واشنگ مشین میں ڈال دیا گیا ہو۔ ملبے کے ٹکڑوں کا خطرہ شدید تھا۔ پہلی لہر میں زیادہ تر اموات ڈوبنے کے بجائے ملبے کی وجہ سے ہوئی تھیں۔ شیشے کے ایک دھاری دار ٹکڑے نے کائی کے رخسار پر کٹ لگایا...... پانی ان کے اوپر بالواسطہ طور پر بلندی بڑھاتا جارہا تھا۔ ان کے اوپر پانی کا دباؤ بالائی سمت سے بڑھنے لگا۔ کائی نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اور آلودہ پانی نے چبھن کا احساس دلایا۔ اس نے بلاتاخیر آنکھیں بند کرلیں۔ بدترین صورتِ حال نرم پڑتی محسوس ہوئی۔ تاہم پانی کا بہاؤ مستقل تھا۔ یوں لگا جیسے وہ ہمیشہ سے اس حالت میں تھے۔

کائی کے دماغ میں دوسرے خطرے نے سر اٹھایا۔ کونڈومینیم ابھی تک اپنی جگہ پر تھی۔ لیکن کوئی ضمانت نہیں

تھی۔ وہ کسی بھی وقت زمین بوس ہو سکتی تھی۔ کائی نے پھر آنکھیں کھولیں۔ چبھن کم ہو گئی تھی۔ ڈائیو واچ کی مدھم روشنی نے بتایا کہ وہ ہمیشہ سے وہاں نہیں تھے بلکہ ابھی صرف تیس سیکنڈز گزرے تھے۔ جیسے جیسے پانی بلند ہوا، سورج کی روشنی مدھم ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔

کائی نے واچ کی لائٹ آن کی جو زیادہ مددگار تو نہیں تھی، تاہم کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے پھر کھولیں۔ لانی نظر نہ آئی تو سینے میں گویا آگ بھڑک اٹھی۔ روشنی کی لکیر اس نے اِدھر اُدھر گھمائی۔ کائی نے حیرت سے دیکھا کہ لانی اس کے اوپر فلوٹ کر رہی تھی۔ لانی کی آنکھیں سختی سے بند تھیں لیکن اس نے ریگولیٹر منہ سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ پھر کائی نے ماؤتھ پیس میں سے بلبلے نکلتے دیکھے اور مطمئن ہو گیا۔ لانی بدترین مرحلہ جھیل گئی تھی۔

کائی نے ہاتھ اوپر کیا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ ایک سیکنڈ کے لیے لانی کی آنکھیں کھل کر بند ہو گئیں۔ کائی نے انگوٹھا اونچا کیا اور لانی نے سر ہلایا...... براڈ اور میا بھی بظاہر ٹھیک تھے۔ ٹریسا اور ٹام کا دھندلا سایہ اگرچہ نظر آرہا تھا۔ لیکن کائی لاعلم تھا کہ وہ دونوں کس حال میں ہیں۔"

☆☆☆

راشیل بچوں کے ساتھ سولھویں منزل تک نہیں پہنچی تھی کہ ہولناک چنگھاڑ کے ساتھ دوسری لہر گرینڈ ہوائین سے ٹکرائی۔ ہوٹل لرز اٹھا۔ دل میں خوف تھا، کیا بل اور پیگ بروقت دسویں منزل کو کراس کر جائیں گے۔ وہ خود بارھویں منزل پر تھی کہ اس نے پیگ اور ایشلے کو دیکھا اور حیران رہ گئی۔ حیرت کے ساتھ ایک خدشے نے دماغ میں سر اٹھایا۔

''بل کہاں ہے؟'' راشیل نے غور سے پیگ کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔ جواب میں وقتی طور پر رکنے والے آنسو پھر سے پیگ کے رخساروں پر بہنے لگے۔ سوال جواب کی ضرورت ہی ختم ہو گئی۔ راشیل نے آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ پیگ کو گلے لگا لیا۔ ''آئی ایم سوری۔''

پانی کی بڑھتی ہوئی گونج دار آواز نے اسے چونکا دیا۔ اشیا کی ٹوٹ پھوٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ''چلو نکلو!'' وہ سمجھ گئی کہ پیگ جلدی کیسے پہنچ گئی۔ انھوں نے اوپر کی منزلوں کا رخ کیا۔

☆☆☆

11:50 a.m

(تیسری لہر بائیس منٹ کے فاصلے پر)

دوسری لہر جب گرینڈ ہوائین سے ٹکرائی تو اونچی بلڈنگ کی لرزش نے چھت پر موجود افراد کو بدحواس کر دیا۔ وہاں ہیلی کاپٹرز کی آمدورفت جاری تھی۔ افراد کم ہوتے جا رہے تھے لیکن رفتار تسلی بخش نہیں تھی۔

میکس نے کنارے سے نیچے جھانک کے دیکھا۔ پانی پندرھویں منزل تک آچکا تھا۔ راشیل کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اسکائی برج کی تباہی سے وہ آگاہ تھا۔ اسی وقت ایک ہیلی کاپٹر چھت پر اترا۔ میکس نے ایڈرین کو ایک منٹ کے لیے رکنے کا کہا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''راشیل کو آجانا چاہیے تھا۔ میں سیڑھیاں چیک کرتا ہوں۔''

دروازہ کھول کے میکس نے اسٹیئر ویل میں جھانکا۔ کوئی آثار نہیں تھے۔

''ہیلو راشیل، تم کہاں ہو؟'' وہ کئی بار چلّایا۔ ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ میں اس کی آواز دب رہی تھی۔ سو فٹ نیچے پانی کا شور بھی تھا۔ عقب سے اس کے کندھے پر ایڈرین نے ہاتھ رکھا۔

''میکس پائلٹ اشارے کر رہا ہے۔'' وہ بولی۔

میکس بوجھل قدموں کے ساتھ پلٹا۔

☆☆☆

کائی پر دل دہلا دینے والا انکشاف ہوا۔ جہاں جیک باندھے گئے تھے، وہ جگہ کائی اور لانی کے قریب تھی۔ کوئی وزنی چیز وہاں ٹکرائی تھی۔ کائی نے دیکھ لیا کہ جیک استعمال کے قابل نہیں رہے تھے۔ روشنی کی محدود رسائی میں وہ نہیں دیکھ سکا کہ کیا چیز ٹکرائی تھی۔ اگر لانی کی ایک گرہ نہ کھلتی اور وہ اوپر نہ جاتی تو یقیناً وہ بھی زد میں آتی...... خوشی بھی تھی اور مایوسی بھی۔

پانی غالباً اپنی انتہائی بلندی تک پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ کائی نے محسوس کیا کہ سمندر کی جانب سے پانی کے بہاؤ میں ٹھہراؤ تھا۔ تین منٹ سے کم وقفے میں تباہ کن لہر کے پانی نے ہونولولو کو ڈیڑھ سو فٹ کے قریب ڈبو دیا تھا۔

مایوسی کو جھٹک کر کائی نے نئی ترکیب کے بارے میں سوچا۔ نظر اس کی لائف رافٹ پر تھی۔ دماغ میں خیالات و خدشات کی کھچڑی پک رہی تھی۔ رافٹ کے ساتھ CO2 کارٹریج موجود تھا۔ جو سیکنڈوں میں رافٹ کو پھلا دیتا۔ اس نے مدھم روشنی میں جائزہ لیا۔ رافٹ میں آٹھ افراد کی گنجائش تھی۔ مطلب سطح آب پر سولہ سو پاؤنڈ اور زیرِ آب سولہ سو سے دگنا وزن اٹھا سکتی تھی۔ اس نے انوکھا لیکن خطرناک

فیصلے کے لیے کشمکش سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ لائف رافٹ کو بطور جیک استعمال کرنا چاہ رہا تھا۔ شہتیر کے نیچے موزوں مقام پر رکھ کر رافٹ کو پھلانا تھا۔ لیکن کئی خطرات موجود تھے۔ پہلا یہ کہ وہ یہ کوشش صرف ایک بار کرسکتا تھا۔ دوسرے اگر رافٹ موزوں جگہ پر نہ ہوئی تو پھول کر اپنی جگہ سے نکل جائے گی اور کٹی پتنگ کی طرح بے قابو ہو کر بلڈنگ سے باہر نکلے گی۔ تیسرا رسک، یہ تھا کہ کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ جیک کا کام کرتے ہوئے شہتیر کے نیچے اچانک پھٹے گی نہیں۔ پھلانے کا عمل کنٹرول سے باہر تھا۔ ایک مرتبہ کائی نے ٹریگر استعمال کیا تو رافٹ مکمل طور پر پھول جائے گی۔ کائی کامیاب ہو بھی گیا اور اگر شہتیر ہی ان پر لڑھک گیا......؟ کائی نے بندشیں کاٹ کر خود کو آزاد کیا۔

خطرات مول لینے ہی تھے، قسمت آزمانی تھی اور کوئی راہ نجات نہیں تھی۔ وقت بھی کم تھا۔ پانی جیسے آیا تھا، ویسے ہی خلیج میں واپس جانے والا تھا۔ پانی کے بغیر رافٹ بیکار تھی۔ وہ براڈ اور میا کو چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتے تھے۔ کائی نے پانی کا بہاؤ اور دباؤ بدلتا محسوس کیا۔ اشارہ تھا کہ ان کے پاس چند منٹ ہیں۔ کونڈو بلڈنگ تیسری لہر کو برداشت کر جائے گی، یہ ناممکن تھا......

کائی نے احتیاط سے چاقو رافٹ کی بندشوں پر آزمایا۔ غلط حرکت سے چاقو رافٹ کو بیکار کر دیتا...... پانی کا بہاؤ پسپائی کی طرف تھا۔ آہنی شہتیر افقی حالت میں تھا۔ کائی نے براڈ کے شانے پر ہاتھ مار کے اشارہ کیا۔ براڈ نے سر ہلا کے جواب دیا۔ معاً کائی نے اندازہ لگایا کہ جہاں وہ رافٹ کو رکھنا چاہتا تھا۔ ریگولیٹر ہوز وہاں تک رسائی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے تیزی سے فیصلہ کیا اور ٹریسا کو اشارہ کیا۔ ٹریسا نے سر کو جنبش دی۔ دونوں نے گہرا سانس کھینچا اور ریگولیٹرز آپس میں تبدیل کر لیے۔

پانی کے الٹے بہاؤ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کائی نے تیرنے کی کوشش نہیں کی، وہ کچھ نہ کچھ پکڑ کے حتی الامکان تیزی، ...... کے ساتھ ..... مطلوبہ مقام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں اس کے خیال میں رافٹ کو شہتیر کے نیچے رکھا جانا تھا۔ یہ بھی خیال رکھنا تھا کہ بہاؤ کے ساتھ رافٹ ہی کو نہ کھو دے۔ دفعتاً اس کے سر نے جھٹکا کھایا اور ریگولیٹر منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔ کائی کو ابھی مزید دو فٹ آگے جانا تھا۔ مخالف بہاؤ ... رافٹ کو کھینچنے لگا تھا۔ کائی نے گہری سانس لی اور ریگولیٹر چھوڑ دیا...... دو فٹ آگے اس نے رافٹ کو شہتیر کے نیچے کیا اور مخصوص ٹریگر کھینچ ڈالا۔ گیس کی تیز سرسراہٹ سنائی دی اور رافٹ پھولتی چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں رافٹ کے بالائی حصے شہتیر کے زیریں حصے سے جا لگے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ گیس بھرنے کی آواز آرہی تھی۔

اور پھر کرشمہ رونما ہوا۔ شہتیر نے حرکت کی۔ کائی کے پھیپھڑے جل رہے تھے۔ شہتیر نے اٹھنا شروع کیا اور کائی سانس لینے کے لیے واپس پلٹا۔ پانی کا مخالف بہاؤ اسے باہر کھینچنے کے درپے تھا۔ آکسیجن ٹینک کے ساتھ ہوز اور اس کے ساتھ ریگولیٹر تھا۔ کائی ریگولیٹر تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ پھیپھڑوں میں آگ لگی تھی۔ آخری لمحات میں اس نے ریگولیٹر منہ میں لے کر گہرے گہرے سانس لیے۔ وہ ٹام کے قریب تھا۔ ٹام نے اپنے صحت مند ہاتھ سے کائی کو بہنے سے بچانے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا۔ واٹر کرنٹ کی شدت کے باعث کائی کا جسم افقی حالت میں آچکا تھا۔ کائی نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس رسی کو پکڑنے کی کوشش کی جس کے ساتھ ٹام بندھا ہوا تھا۔ عین اس وقت کوئی وزنی شے اس کے کندھے سے ٹکرا کر بہاؤ کے ساتھ چلی گئی۔ تصادم نے ٹام کا ہاتھ بھی چھڑوا دیا۔

کائی کا جسم گھوم کر باہر جاتے پانی کی زد میں بہہ نکلا۔ ریگولیٹر منہ سے نکل گیا۔ پانی کے ساتھ بلڈنگ سے باہر نکلنے کا مطلب تھا کہ وہ سیدھا سمندر میں جاتا۔

☆☆☆

راشیل، پیگ اور بچوں کے ساتھ اوپر جا رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بل زندہ نہیں ہے اور یہ کہ برج تباہ ہو چکا ہے۔ یہ اسے نہیں معلوم تھا کہ بل نے واک وے تقریباً کراس کر لیا تھا اور احمق لڑکوں کی وجہ سے اسکائی برج تباہ ہوا۔ وہ کیا کر سکتی تھی۔ خود اس نے اپنی جان داؤ پر لگائی ہوئی تھی۔ کم از کم پیگ اور بچے بچ گئے تھے۔ تاہم اسے خیال آیا تھا کہ ایشلے تو بل کی پشت پر سوار تھی۔ لیکن سوال جواب یا کہانی سننے کا وقت نہیں تھا۔ دوسری لہر ٹکرا چکی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ کی آوازیں اور پانی کا شور تھا۔ اچانک ایک نیا دھماکا ہوا۔ عجیب خوفناک ملی جلی بلند تر آوازیں تھیں۔ مونا ٹاور بھی بدمست ڈائنوسار کے مانند جھومنے لگا۔

انہوں نے خود کو گرنے سے بچایا۔ پیگ نے ایشلے اور راشیل نے حنا کو پکڑا ہوا تھا۔ وائٹ لڑھکا پھر سنبھل گیا۔ مونا ٹاور کی مستی تھمی تو راشیل نے حنا کو وائٹ کے حوالے کیا اور کھڑکی پر گئی۔ گرد کے طوفان نے پانی کی دہشت کو مات کر دیا تھا۔ پورا ہوٹل اوپر تک گرد و غبار میں ملفوف تھا۔ راشیل کو ٹی وی پر نو گیارہ کی بربادی کا منظر یاد آیا۔ سمجھنے میں ایک لمحہ

نہیں لگا کہ ٹاور ٹوٹ پھوٹ کر زمین بوس ہو چکا ہے۔ دونوں ٹاور اب بھی پانی سے کافی باہر تھے۔ اگر پانی نہ ہوتا تو نچلی منزلوں کا غبار منظر کو مزید دہشت ناک بنا دیتا۔

پانی میں طغیانی کی کیفیت تھی۔ بالائی منزلیں خستہ ٹھیکروں کے مانند بیٹھتی چلی گئی تھیں۔ ان کا غبار نمایاں تھا۔ نچلی منزلوں کی گرد زیادہ تر پانی میں ہی رہ گئی تھی۔ اکیسویں صدی کی جدید ترین تعمیری ٹیکنالوجی کا شاہکار آناً فاناً تنکوں کی طرح بکھر گیا تھا۔ تشویشناک بات یہ تھی کہ دونوں ٹاورز ایک ہوٹل کا حصہ تھے اور دونوں اپنی جگہ پر مضبوطی کی مثال تھے۔ ویسے بھی ساحلی علاقوں میں تعمیر کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اب مونا ٹاور تنہا تھا۔

''اوپر بھاگو!'' راشیل پلٹی۔

☆☆☆

11:55 a.m

(تیسری لہر سترہ منٹ بعد)

پانی کا تیز بہاؤ کائی کو کونڈو سے باہر لے جا رہا تھا۔ کچھ پکڑنے کے لیے وہ اِدھر اُدھر ہاتھ لہرا رہا تھا۔ ڈائیو لائٹ ابھی تک اس کے ساتھ تھی۔ ہال وے سے گزرتے ہوئے وہ کونڈو یونٹ کی جنوبی سمت میں تھا۔ اس سے پہلے کہ کرنٹ اسے باہر لے جاتا، کائی نے ٹوٹے ہوئے دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ ڈال دیا۔ بہتا ہوا جسم رک گیا لیکن وہ ہوا سے محروم تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ نوے سیکنڈ تک سانس روک سکتا تھا۔ تیز بہاؤ میں واپس بھی نہیں تیر سکتا تھا۔ بہاؤ کی شدت بیس ناٹ تھی۔

دو سادہ امکانات تھے کہ نوے سیکنڈ میں پانی کم از کم سانس لینے کی حد تک نیچے آ جائے یا پھر وہ گرفت ختم کر کے بہاؤ کے ساتھ تیر کر سطح آب پر آنے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں وہ جانتا تھا کہ وہ سمندر کی نذر ہو جائے گا اور واپسی کا امکان صفر کے قریب تھا۔ اگر سانس ٹوٹنے تک وہ وہیں چپکا رہا تب بھی سمندر اس کا مدفن تھا۔

کوشش کرتے ہوئے مرنا بہتر تھا۔ اس نے چوکھٹ چھوڑ کر سطح آب پکڑنے کا ارادہ باندھا۔ جو ہلاکت خیز ایڈونچر ہی تھا۔ دفعتاً ڈائیو لائٹ کی مدھم روشنی میں اس نے گدلے پانی میں خفیف اجالا محسوس کیا۔ اجالا بڑھتا گیا۔ وہ سطح آب سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ حقیقت اس کی توقعات کے برخلاف تھی۔ سورج کی روشنی کھڑکیوں میں تھی۔ مطلب ہوا اور اس کے درمیان پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ کائی نے خوف کو جھٹک کر اپنی جگہ پر رکنے کا فیصلہ کیا۔

کمرے میں روشنی بڑھتی گئی۔ اشیا بھی نمایاں ہوتی گئیں۔ ایک منٹ گزر گیا تھا۔ کائی کے پھیپھڑے ایک بار پھر جلنے لگے۔ تاہم اس نے آس نہیں چھوڑی۔ پانی جس تیزی سے آیا تھا اسی رفتار سے واپس جا رہا تھا...... کائی نے ہمت کی چوکھٹ کے سہارے ذرا اوپر ہوا اور اس کی ناک پانی سے باہر آ گئی۔ سانس ٹوٹ گئی۔ وہ اب بدبودار ہوا میں سانس لے رہا تھا۔ پانی اس طرح وائی کی کی بے میں واپس جا رہا تھا جیسے کسی بہت ہی بڑے باتھ ٹب کا پلگ نکال دیا گیا ہو۔ سطح آب بھی اتنی ہی تیزی سے گر رہی تھی۔

پانی فرش پر چار فٹ رہ گیا تو کائی ساتھیوں کی سمت میں حرکت پذیر ہوا۔ اس نے براڈ کو آزاد حالت میں دیکھا۔ لیکن وہ خاصا بدحال نظر آیا۔ تاہم وہ پُرعزم بھی دکھائی دے رہا تھا۔ کائی کو دیکھ کر اس نے انگوٹھا بلند کیا۔ کائی نے اپنا جائزہ لیا۔ جگہ جگہ زخم اور خراشیں لگی ہوئی تھیں لیکن شدید زخموں سے وہ بچا ہوا تھا۔ براڈ نے شہتیر سے جان چھڑاتے ہی پانی کم ہونے پر پہلے میا کو کھولا تھا۔ رافٹ دوسری طرف نکل گئی تھی اور شہتیر واپس گر گیا تھا...... کائی نے ٹریسا کے بندھن کاٹے۔ کچھ دیر میں سب آزاد تھے۔ حالت سب کی ابتر تھی۔ کرشمہ تھا کہ وہ ایک جان لیوا صورتِ حال سے بچ نکلے تھے۔

کونڈو بلڈنگ نے ساتھ دیا تھا لیکن اجنبی خوف زدہ کر دینے والی آوازیں اعلان کر رہی تھیں کہ کونڈو یونٹ بھی فوت ہونے والا ہے۔

کچھ کہے سنے بغیر ہی سب نے ایک ساتھ حرکت کی۔ کائی تیسری منزل کی لینڈنگ پر پہنچا تو ٹام لڑکھڑا کر گرا۔ کائی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا...... مختلف نوعیت کی ڈراؤنی آوازیں تھیں۔ گویا کونڈو کو زبان مل گئی تھی۔ وہ کراہ رہی تھی۔ قریب المرگ تھی۔ وہ اندھا دھند بھاگے۔ ان کے باہر نکلنے کے چند سیکنڈ بعد دس منزلہ ادھڑا ہوا کونڈو دھڑ دھڑا کے گرا اور ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ ملبا دس فٹ اونچا تھا۔ وہ سب ریت پر آڑے ترچھے پڑے ہانپ رہے تھے۔ کائی نے اٹھ کر اطراف میں دیکھا۔ ''وائی کی کی'' کا دلکش ساحل تیس منٹ میں بری طرح اجڑ گیا تھا۔ دوسروں نے بھی اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے زخموں کا جائزہ لیا۔ براڈ نے کائی کو دیکھا۔ ''ہم وہیں آ گئے، جہاں سے چلے تھے۔''

☆☆☆

''میا کی جان بچانے کا شکریہ۔'' ٹریسا نے کائی سے کہا۔ ٹریسا کی آنکھوں میں تشکر کے گہرے تاثرات تھے۔

کائی حوصلہ افزا انداز میں مسکرایا۔
"اب کیا کرنا چاہیے؟" براڈ نے کائی کو اور پھر بچی ہوئی عمارات میں سے ایک کو نظر بھر کے دیکھا۔ وہ قریب تھی۔ تین سو گز کے فاصلے پر۔
"ہاں قریب ہے۔" کائی نے کہا۔ "لیکن یہ بیس منزلہ ہے۔ دو لہروں کے بعد بھی کھڑی ہے لیکن اونچائی ناکافی ہے جبکہ تیسری لہر مزید بلند اور دباؤ شدید تر ہوگا۔" کائی نے اعتراض کیا۔
"پھر کیا کریں؟" ثریا نے سوال کیا۔
کائی نے چند سیکنڈ بعد جواب دیا۔ وہ کوارٹر میل کے فاصلے پر تیس منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی۔ جہاں دسویں منزل کے اختتام پر سڑک کے اوپر چارٹر فشنگ بوٹ معلق تھی۔ بوٹ کی لمبائی ساٹھ فٹ تھی جس کے جڑواں پروپیلر اتنے فاصلے سے بھی صاف نظر آرہے تھے۔
وہ جاگنگ کے انداز میں مذکورہ عمارت کی طرف رواں دواں تھے۔ ناگفتہ بہ حالت میں وہ پہاڑوں پر بروقت پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔

☆☆☆

راشیل کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ پیگ اور اس کے بچوں کے ساتھ مونا ٹاور کی چھت پر تھی۔ چھت پر سناٹا تھا۔ آدم نہ آدم زاد۔ پیگ نے سراسیمگی کے عالم میں اس کا بازو دبایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ راشیل نے بھرائی ہوئی آواز میں اسے چھت کا احوال بتایا۔
"انہوں نے میرا انتظار کیا ہوگا۔ مایوس ہو کر مجبوراً چلے گئے......"
"تم نے ہماری خاطر......؟" پیگ کے آنسو بہہ نکلے۔ راشیل نے اسے سینے سے لگا لیا۔
"میں کچھ کرتی ہوں۔" وہ بولی۔

☆☆☆

12:04 p.m

(آٹھ منٹ بعد تیسری لہر)

کائی کا گروپ "بوٹ بلڈنگ" کے قریب تھا۔ لانی نے باپ کی کمر پر ہاتھ مارا۔
"ڈیڈی آواز آرہی ہے؟"
"کیسی آواز؟"
"شاید آپ کے بیگ میں سے آرہی ہے۔"
اچانک کائی کو حماقت کا احساس ہوا۔ پے در پے ہنگامی حالات میں اسے پشت کے بیگ کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ واکی ٹاکی اور فون بیگ میں تھے اور کوئی رابطے کے لیے کوشش کر رہا تھا۔
کائی نے بلڈنگ میں پہنچ کر بیگ کھولا۔ وہ اندر سے گیلا تو نہیں تھا لیکن واٹر پروف ہونے کے باوجود نمی آگئی۔ کائی نے ایک جانب کٹ دیکھا جو گہرا نہیں تھا۔ بصورت دیگر بیگ میں پانی بھر جاتا تھا۔ کائی نے واکی ٹاکی چیک کیا۔ پھر سیل فون اٹھایا۔ ڈسپلے پر تڑختے کا بال جیسا نشان تھا۔ کائی نے پہلے 911 پر کوشش کی۔ بعدازاں اس نے راشیل سے رابطہ کیا اور والیم فل کر دیا۔ وہ دوسروں کے مانند اوپر سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔
"راشیل! کم آن!"
"راشیل! میں کائی بول رہا ہوں کیا تم سن رہی ہو؟"
دفعتاً نسوانی آواز سنائی دی۔ "کائی، تم کہاں ہو؟ ٹھیک ہو؟ لانی کہاں ہے؟" راشیل نے بیک وقت کئی سوال کیے۔
"ہم سب ٹھیک ہیں۔ اگرچہ مصیبت ٹلی نہیں ہے۔" کائی نے جواب دیا۔ "تمہاری کیا پوزیشن ہے؟"
"تمہاری آواز اور بات سن کر اطمینان ہوا ہے۔" راشیل کی آواز میں ملی جلی کیفیت تھی۔ "یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ دوسرا ٹاور گر جائے گا۔"
"کیا کہا؟ اور تم ابھی تک ہوٹل میں ہو؟ فوراً نکلو وہاں سے۔" کائی بوکھلا گیا۔
راشیل نے صورت حال کی وضاحت کی اور سوال کیا۔
"تم وائی کی کی سے نکل گئے ہو؟"
"ہم یہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ گرینڈ ہوائین سے ایک میل کے فاصلے پر۔ یہ سفید رنگ کی تیس منزلہ عمارت ہے۔ دسویں منزل پر ایک بڑی بوٹ باہر سے بھی نظر آئے گی۔"
"ہم چھت پر ہیں۔" راشیل نے کہا۔ "یہاں سے سفید بلڈنگ نظر نہیں آرہی۔"
"زاویہ نہیں بن رہا ہوگا۔ ہم چھت پر جا کے ہاتھ لہراتے ہیں۔ تمہارے ساتھ جو عورت ہے، کیا اس کے پاس فون ہے؟"
"ہاں۔" راشیل نے جواب دیا۔
"اسے بولو کہ 911 پر ٹرائی کرتی رہے۔ اور تم رنگی سے ہیلی کاپٹر منگواؤ۔" کائی نے رنگی کا نمبر بتایا۔ "کو یو ہنی...... جلدی کرو۔"
"میں کرتی ہوں۔"

''اور ہاں، اگلی لہر دو سوفٹ بلند ہو سکتی ہے۔''

☆☆☆

کائی باتوں کے دوران دوسروں سے پیچھے رہ گیا تھا۔ گرینڈ ہوائین کے ایک ٹاور کے ڈھیر ہونے کی اطلاع نے اسے دہلا دیا تھا۔

چھت پر پہنچ کر اس نے واکی ٹاکی نکالا۔ ساتھ ہی براڈ کو اشارہ کیا کہ وہ سیل فون پر ٹرائی کرے۔ وقت کی طنابیں تیزی سے سکڑ رہی تھیں۔ سونامی کا قہر بہت زیادہ دور نہیں تھا۔

☆☆☆

ریگی پونا کی براڈ سے رابطے کی تو کوششیں ناکام ہو چکی تھیں، اس نے کئی پیغامات بھی چھوڑے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ لوگ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ تاریخی بربادی ہوئی تھی اور سلسلہ جاری تھا۔ ریگی کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا۔ ایک بھیانک خواب تھا۔ حالانکہ وہ تھائی لینڈ اور انڈونیشیا میں آنے والے سونامی کے دو ہفتے بعد وہاں کی تباہی کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ ساٹرا کا شمالی کونا نقشے سے مٹ گیا تھا۔ جنوبی ایشیا کی تعمیرات امریکا کے مقابلے میں کمتر تھیں۔

ہوائی میں سمندر کے قریب ہوٹلز اور دیگر عمارتیں کنکریٹ و فولاد کو ملا کر بنائی گئی تھیں۔ بیشتر نے پہلے اور دوسرے سونامی کا مقابلہ کر کے اپنی مضبوطی کا ثبوت دیا تھا۔ اس میں تعمیراتی ڈیزائن کا بھی دخل تھا تاہم پھر بھی کافی تعمیرات زمین بوس ہو چکی تھیں۔ پانی نے ایسی عمارتوں کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ نمائشی تعمیرات کا مکمل صفایا ہو گیا تھا۔ ہوائی، موائی، اوہائیو اور کوائی کی تصاویر اور وڈیوز میجر نیٹ ورکس پر تھیں۔ جو بتا رہی تھیں قدرت کی طاقت و آفت کے سامنے جدید ترین ٹیکنالوجی بے حیثیت ہے۔ خدائی ہاتھ نے میلوں تک انسان اور انسان کی نشانیوں کو مٹا دیا تھا۔

پنچ باؤل نیشنل سیمٹری میں تل دھرنے کو جگہ نہیں بچی تھی۔ ہیلی کاپٹرز وہاں ان لوگوں کو اَن لوڈ نہیں کر پا رہے تھے۔ جن کو وہ بلند و بالا عمارتوں کی چھتوں، بعید ترین ساحلوں اور الٹنے والے سمندری جہازوں سے لائے تھے۔ ٹرپل آرمی میڈیکل سینٹرز زیریں علاقوں سے لائے گئے افراد سے یوں بھرا ہوا تھا۔ جیسے پیالے میں پانی کناروں سے چھلک رہا ہو۔ اَن گنت افراد کی قطاریں پہاڑوں پر اونچائی کی طرف رینگ رہی تھیں۔

تھوڑی جگہ وھیلر فیلڈ میں تھی۔ واکی کی سے دس منٹ کا ٹرپ تھا۔ اس میں افراد کو لوڈ اور اَن لوڈ کرنے کا وقت شامل نہیں تھا۔ ریگی کی سوچ کے مطابق یہ ممکن تھا کہ کائی اور براڈ وغیرہ کو کسی ہیلی کاپٹر نے وہاں سے اٹھا کے وھیلر فیلڈ میں چھوڑ دیا ہو۔ لیکن کیا گارنٹی تھی۔ بذاتِ خود اس نے امید کا دامن اس وقت چھوڑ دیا تھا جب دس منزلہ عمارت مکمل تباہ ہو گئی تھی۔ وہی کونڈو یونٹ جہاں اس نے دو مرتبہ ہیلی کاپٹر بھیجا تھا۔

ریگی کے سیل فون نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر نکال لیا۔ اس نے ٹی وی سے نظر ہٹا کر کالر آئی ڈی دیکھی۔ نمبر اس کے لیے اجنبی تھا۔ تاہم اس نے کال وصول کی۔

''ہیلو؟''

آواز سن کر وہ شاک میں چلا گیا۔

''ریگی، میں راشیل بات کر رہی ہوں۔''

''راشیل!'' وہ جیسے چیخ پڑا۔ ''تھینک گاڈ تم ٹھیک ہو۔ کائی......'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔ وہ کس طرح بتائے۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا......''

''کائی از فائن۔'' راشیل نے اس کا تذبذب ختم کرنے کے ساتھ اسے حیرت زدہ کر دیا۔

''واقعی؟ میرا مطلب ہے، یہ شاندار خبر ہے۔''

''لیکن ہم مشکلات کا شکار ہیں۔ ہم ابھی تک وائی کی کی میں ہیں۔ مختصر احوال بتایا کہ اور اس کے ساتھ کون کون ہے۔''

''وہ کیسے؟ کہاں پر؟ تم سب ساتھ ہو؟''

''نہیں، میں ہوٹل کی چھت پر ہوں۔ کائی ایک اونچی عمارت کی چھت پر ہے۔ وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ یہاں سے شمال مشرق میں ایک میل دور ہے۔ میں اس کے ساتھ واکی ٹاکی پر بات کر سکتی ہوں۔ ہمیں ایک ہیلی کاپٹر کی ضرورت ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ ہم پیدل بھاگ کر بچ نہیں سکتے اور دونوں عمارات کی حالت بھی مشکوک ہے۔''

''گھبراؤ نہیں، کچھ کرتا ہوں۔'' ریگی نے کہا۔ ''کائی والی بلڈنگ کا نام کیا ہے؟''

''نام نہیں معلوم...... بلڈنگ کی دسویں منزل پر ایک بڑی بوٹ معلق ہے۔ تیس منزلہ سفید بلڈنگ ہے۔'' راشیل نے اشارے دیے۔

''میں سمجھ گیا، دیکھ لوں گا۔''

''ہاں، جلدی کرو۔''

''سمجھتا ہوں، لیکن تم شاید بے خبر ہو کہ چوتھی لہر بھی آئے گی۔'' ریگی نے کہا۔

''وہاٹ؟''

’’ہاں چند منٹ پہلے الاسکا سے خبر آئی تھی۔ آخری سونامی 12:37 پر آئے گا۔ بلندی تین سو فٹ۔‘‘

دوسری طرف خاموشی طاری تھی۔

’’راشیل، تم سن رہی ہو؟‘‘

’’ریگی، جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔‘‘ راشیل نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

ریگی آفس سے نکل کر کرنل جانسن تک پہنچا۔ وہ قریبی کمرے میں سیل فون پر بات کر رہا تھا۔ ریگی کی صورت دیکھ کر کرنل نے گفتگو مختصر کر دی۔ ریگی نے مدعا بیان کیا۔ کرنل نے کھڑے ہو کر جیکٹ پہنی۔

’’میں تمہارے دوست کے لیے اظہارِ افسوس کرتا ہوں۔ وہ عمارت ملبے کا ڈھیر ہے۔‘‘

’’وہ زندہ ہیں۔ میں تصدیق کر کے آ رہا ہوں۔‘‘

’’کیا کہہ رہے ہو؟ وہ کہاں ہیں؟‘‘

’’وائی کی کی۔‘‘ ریگی نے جواب دیا۔

کرنل نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’مسٹر ریگی، میں مجبور ہوں۔‘‘

’’مجبوری؟ کائی کی وجہ سے میں، تم، تمہاری فیملی اور بہت سارے لوگوں کی زندگی بچی ہے۔ اس نے اپنا کیریئر داؤ پر لگا کر وارننگ کو فائنل کیا تھا......‘‘

’’میرا مطلب کچھ اور ہے مسٹر ریگی۔‘‘ کرنل نے ریگی کو دیکھا۔ ’’ہیلی کاپٹرز اوہائیو کی دوسری جانب ہیں۔ ان کو یہاں بلانے میں کم از کم پندرہ منٹ خرچ ہو جائیں گے۔ کیا اتنا وقت ہے؟‘‘

ریگی نے سر پکڑ لیا۔ ’’کوئی اور راستہ؟‘‘

’’دیکھو، میں الرٹ روانہ کرتا ہوں لیکن وعدہ نہیں کر سکتا۔ ہیلی کاپٹرز نامناسب گیسولین کے ساتھ ہیں۔ وھیلر پر فیول کی فراہمی کا لوڈ زیادہ ہے۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی لوکیشن بتا دو اور دوسرا امکان بھی تلاش کرو۔‘‘

ریگی نے شکریہ ادا کر کے سر گھمایا۔ دوسرا آئیڈیا کیا ہو سکتا ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ لوگ زندہ ہیں لہٰذا وہ ہار نہیں مان سکتا تھا۔ ملٹری کے علاوہ کس کے پاس ہیلی کاپٹر ہو گا۔ اس نے آفس کی کھڑکی سے باہر جھانکا اور اچانک باہر کی جانب بھاگا۔

☆☆☆

لارا یا میلو CBS کی جانب سے رپورٹر تھی۔ اس نے PTWC کے باہر سے براڈ کاسٹنگ کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مائیک تھا اور وہ کیمرا مین کو سامان لپیٹنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ ریگی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ ردِعمل میں لارا نے کیمرا مین کو مختلف اشارہ کیا۔

’’نہیں، نہیں...... میں انٹرویو کے لیے نہیں آیا ہوں۔ مجھے کچھ اور چاہیے۔‘‘ ریگی نے کہا۔

’’میں؟ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟‘‘

’’CBS کا ہیلی کاپٹر وائی کی کی کے علاقے میں ہے۔‘‘

’’وہ ہم نے کرائے پر لیا ہوا ہے۔ کرایہ بھی فی منٹ کے حساب سے ہے۔‘‘ لارا نے کہا۔

’’کائی تناکا اور اس کے بیوی بچے وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہیلی کاپٹر میں رپورٹر کون ہے؟‘‘

’’رپورٹر نہیں ہے۔ کیمرا مین ہے۔‘‘ لارا نے جواب دیا۔ ’’وہ زندہ ہیں، ناقابلِ یقین۔‘‘

’’ہاں ایسا ہی ہے۔ ملٹری ہیلی کاپٹر کا چانس کم ہے اور وقت بھی کم ہے۔‘‘ ریگی نے کہا۔

’’میں نہیں جانتی کہ میں کچھ کر سکوں گی؟‘‘

’’کائی نے تمہارے اسٹیشن کو بریکنگ اسٹوری دی تھی اور اب اس کے پاس جو اسٹوری ہے، وہ تمہارے کیریئر کو مزید اوپر لے جائے گی۔ اس سے ہٹ کر یہ کئی زندگیوں کا سوال ہے۔ وہ بذاتِ خود اَن گنت زندگیاں بچانے کا سبب بنا ہے۔ سوچو ذرا۔‘‘ ریگی نے التجائی انداز میں کہا۔ ’’تمہارے کیریئر کی بیسٹ اسٹوری اس کے پاس ہے۔‘‘

لارا نے کیمرا مین کی آنکھوں میں جھانکا۔ دونوں کے چہروں پر تذبذب سے زیادہ تجسس تھا۔ ریگی نے اندازہ لگایا کہ بات بن گئی ہے۔

☆☆☆

12:12 p.m

(تیسری لہر)

راشیل نے ریگی سے رابطہ منقطع کیا اور چند منٹ میں دیکھا کہ ساحل پر اُڑتے ہوئے ایک ہیلی کاپٹر نے اپنی سمت تبدیل کی۔ اب وہ ہوٹل کی طرف آ رہا تھا۔

’’تمہارا دوست بہت تیز ہے۔‘‘ پیگ نے کہا۔ ریگی کی کارکردگی پر خود راشیل حیرت زدہ تھی اور متاثر بھی۔ چھت پر موجود گروپ کے چہرے روشن ہو گئے تھے۔ ہیلی کاپٹر یقینی موت کے جبڑوں سے انہیں کھینچ کر لے جانے کے لیے آ رہا تھا......

ہیلی کاپٹر چھت پر اترا، راشیل اور پیگ جھک کر اس کی

طرف دوڑے۔ راشیل نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ملٹری کا ہیلی کاپٹر نہیں تھا۔ پائلٹ کے ساتھ ایک عورت وڈیو کیمرا لیے بیٹھی تھی۔

"خوشی ہوئی تم دونوں کو دیکھ کر۔" راشیل نے ہیلی کاپٹر کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا۔ کچھ سامان بھی رکھا ہوا تھا۔

"رگی سے بات ہوئی ہے؟"

"نہیں ہمیں ٹی وی اسٹیشن سے کال آئی تھی۔ تم کتنے افراد ہو؟"

"پانچ......تین بچے اور ہم دونوں۔" راشیل نے کہا۔

پائلٹ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور بولا۔ "اس میں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ تم دونوں آجاؤ یا بچے آجائیں۔"

اس کا جملہ راشیل کے سر پر بم کی طرح پھٹا۔ ہیلی کاپٹر کا سائز دیکھ کر اسے شک تو ہوا تھا۔ پائلٹ نے شک کو یقین میں بدل دیا۔

"بچوں کو کیسے چھوڑا جاسکتا ہے؟" راشیل نے دیکھا کہ سمندر کا پانی تیزی سے واپس جارہا تھا۔

"چلو تم لوگ بیٹھو۔" اس نے بچوں کو اشارہ کیا۔

"ایک منٹ۔" پائلٹ نے رکنے کا اشارہ کیا اور ہیلی کاپٹر کے ڈیش بورڈ پر پینلز کا جائزہ لیا۔

"اس باکس کو باہر چھوڑ دو۔" اس نے ساتھی کیمرا وومین سے کہا اور راشیل کو مدد کا اشارہ دیا۔

راشیل فوراً اندر چلی گئی۔ دونوں نے مل کر وزنی باکس کو عقبی جانب سے نکال کر چھت پر رکھ دیا۔ باہر سے پیگ نے بھی ہاتھ بٹایا۔

"جلدی کرو، سب آجاؤ۔" پائلٹ نے کہا۔ پہلے پیگ گئی۔ چھوٹے بچے اس کی گود میں اور وائٹ سمٹ کر ساتھ بیٹھ گیا۔ راشیل نے اندر جانے سے پہلے واکی ٹاکی پر کائی سے رابطہ کر کے رگی کی اطلاع پہنچائی کہ اگلی لہر تین سوفٹ تک جا سکتی ہے۔ یہ بھی بتادیا کہ رگی نے ہیلی کاپٹر بھیج دیا ہے۔

"نکلو وہاں سے بلا تاخیر نکلو۔" کائی نے عالم اضطراب میں کہا۔

"یہاں جگہ کم ہے۔ یہ ملٹری ہیلی کاپٹر نہیں ہے۔"

"کچھ بھی کرو، نکل جاؤ۔"

☆☆☆

رگی پھر کرنل کے آفس میں تھا۔

"دیکھو میں نے کوشش کی ہے۔" کرنل نے بتایا۔

"وہاں جو ہیلی کاپٹر ہیں، ان میں کوئی بھی خالی نہیں ہے، چانس ہے کہ کسی میں کچھ جگہ ہوگی تو وہ تمہاری بتائی ہوئی بلڈنگ تک پہنچے گا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے......" رگی ہاتھ مل رہا تھا۔

☆☆☆

آج ہی آج قلیل وقفوں کے ساتھ تیسری مرتبہ وہ ہونولولو کو سونامی کے قہر کی زد میں دیکھ رہا تھا۔ مووی میں لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا لیکن وہ متواتر براہِ راست دہشت ناک آفت کی زد میں تھے۔ اس مرتبہ دائیں طرف حدِ نگاہ تک اور بائیں طرف بھی...... گو تین ساٹھ ڈگری کا زاویہ تھا۔ پانی کی فلک بوس موٹی دیوار دہاڑتی چنگھاڑتی برق رفتاری سے بڑھی چلی آرہی تھی۔ ایسا منظر تاریخ میں چند افراد نے ہی دیکھا ہوگا۔ 1958ء میں لیٹوابے، الاسکا میں لینڈ سلائڈ (زیرآب) کے باعث جو پانی کی لہر بلند ہوئی تھی، وہ کوارٹر مائل اونچی تھی۔ اب کائی جو کچھ دیکھنے والا تھا، اس کی قوت، شدت، اونچائی بے مثال اور غضب کی انتہا پر تھی۔

پانی کا دباؤ دس ٹن فی اسکوائر فٹ تھا۔ بچی ہوئی عمارتیں بلند اور مضبوط عمارتیں ملبے میں تبدیل ہورہی تھیں۔ ٹاور،

تین انڈے

سوزی نے ایک مدت کے بعد گھر کی خوب صفائی کرنے کی ٹھان لی۔ شادی کے پچھلے بیس برسوں میں مسہری کے نیچے کاٹھ کباڑ کا ایک انبار جمع ہوگیا تھا۔ اس نے مسہری سرکا کر وہ سب نکالا تو اسے قدرے صاف ستھرا ایک چوبی ڈبا نظر آیا۔ سوزی کو حیرت ہوئی کہ اس پر گرد و غبار کی تہیں کیوں نہیں تھیں۔ ڈبا کھولا تو اس میں تین انڈے اور دس ہزار ڈالر موجود تھے۔

شام کو شوہر کی واپسی پر اس نے ڈبے کا ذکر کیا تو اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ جب بھی سوزی سے بے وفائی کا مرتکب ہوتا ہے تو ڈبے میں ایک انڈا ڈال دیتا ہے، سوزی نے دل میں سوچا کہ بیس برس میں شوہر کا صرف تین بار بہکنا قابلِ معافی ہے۔ اس نے اگلا سوال ڈالرز کے بارے میں کیا۔

"بکس چھوٹا ہے۔" شوہر نے ایمان داری سے بتایا۔ "انڈے زیادہ ہوجاتے ہیں تو میں انہیں بیچ کر رقم اسی ڈبے میں ڈال دیتا ہوں۔"

کوئٹہ سے حبیب اللہ جان کی ایمان داری

موٹا اور بلٹن بھی ڈھیر ہو گئے تھے۔

کائی سانس روکے گرینڈ ہوائین کے اکلوتے ٹاور کو گھور رہا تھا۔ لانی نے سرباپ کے سینے میں چھپالیا تھا۔ سونامی گرینڈ ہوائین سے ٹکرایا۔ پانی کی بوچھاڑ خلا میں سیکڑوں فٹ اوپر گئی۔ یوں لگا کہ جیسے ٹاور ایک طرف جھکا ہو۔ لیکن وہ نظر کا دھوکا تھا۔ پانی جناتی اژدہے کے مانند ٹاور کے گرد لپٹ کر آگے گیا۔ عقبی عمارات کھڑی نظر آئیں۔ کیونکہ ان کے سامنے والی عمارات نے دباؤ کم کر دیا تھا۔ بیشتر زمین بوس ہو گئی تھیں۔

پانی بوٹ بلڈنگ کے قریب تھا۔ گرج ایسی تھی جیسے درجنوں ٹورینڈو ایک ساتھ متحرک ہو گئے ہوں۔ دو عمارتیں عین بوٹ بلڈنگ کے سامنے تھیں۔ لہر پوری طاقت سے ٹکرائی۔ پہلی عمارت موآنا سرف رائیڈر تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو کر زیرِ آب دفن ہو گئی۔ پانی دوسری عمارت سے ٹکرایا جس کی بلندی کم تھی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی تعمیر میں فولاد زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ عمارت سونامی کی جناتی ٹکر کو برداشت کر گئی۔ تاہم پانی اس کے تمام دروازے اور کھڑکیاں توڑتا ہوا دوسری جانب نکل گیا...... لہر کائی والی عمارت سے ٹکرائی۔ دباؤ کی شدت ٹوٹنے کے بعد بھی خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ کائی بخوبی آگاہ تھا کہ جلد یا بدیر بوٹ بلڈنگ نے ڈھے جانا تھا۔

☆☆☆

12:14 p.m

(چوتھی لہر تیئس منٹ کی دوری پر)

پائلٹ اسٹین نے کیمرا او مین دینا سے کہا۔

''کیمرا چھوڑ دو!''

''کیا؟ معلوم ہے کہ کتنا قیمتی ہے؟''

''یہ وزنی ہے اور انسانی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔'' اسٹین سنجیدہ تھا۔

دینا نے ہچکچاتے ہوئے وڈیو کیمرا چھت پر چھوڑنے سے پہلے ٹیپ نکال لیا۔ سب سمٹ سمٹا کر چھوٹے ہیلی کاپٹر میں سما گئے تھے۔

اسٹین انجن کو فل اسپیڈ پر لے گیا۔ پھر اس نے سائیکل اسٹک کو کھینچا۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اسٹین نے کوشش جاری رکھی۔ ہیلی کاپٹر اچانک ایک گز اوپر اٹھا اور چھت کے کنارے کی طرف جھکا۔ اسٹین ہوائی پرندے کو قابو کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ سب خاموش اور خوف زدہ تھے۔ اسٹین نے بمشکل ہیلی کاپٹر قابو کر کے وہیں بٹھا دیا جہاں سے اُڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ اسٹین نے بے بسی سے باری باری تینوں خواتین کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ اظہار کا یارانہ بیان کی قدرت۔ بچے بے خبر تھے لیکن وہ تینوں سمجھ گئیں۔ بالآخر وہ بولا، آواز ٹوٹ گئی۔

''سوری...... ایک کو اترنا پڑے گا۔'' اس نے پیٹلو کی سوئیوں کو دیکھا۔ امکان ایک ہی تھا، ظاہر تھا اور عیاں تھا۔ پیگ یا راشیل؟

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

پیگ کے چہرے پر تاریکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ راشیل نے پہلے ہی بہت قربانی دی تھی۔ وہ منیجر ضرور تھی لیکن وہ جو کچھ کرتی آرہی تھی، اس کی ذمّے داری نہیں تھی۔ پیگ نے حرکت کی۔ ''میرے بچوں کا خیال......'' وہ رونے لگی۔ اشکوں کا سیلِ رواں تھا۔ ایک سونامی اس کے چہرے پر بہنے لگا۔

''میں رک سکتا ہوں، اگر کوئی ہیلی کاپٹر اُڑا سکے؟'' اسٹین کی آواز بھرا گئی۔

راشیل نے پیگ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''میں رکوں گی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی اور اترنے کے لیے حرکت کی۔ اچانک پیگ نے ہاتھ پکڑا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ وہ بولنے سے قاصر تھی۔

راشیل نیچے اتر گئی۔ ہیلی کاپٹر گویا ہانپتے ہوئے پرندے کی طرح فضا میں گیا۔ تیس فٹ اوپر راشیل کے گرد ایک چکر لگایا...... انہوں نے ہاتھ ہلائے، راشیل نے انگوٹھا اونچا کیا۔ اسٹین نے دوبارہ آنے کا اشارہ دیا۔ تاہم راشیل آگاہ تھی کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔

ہیلی کاپٹر نے ڈاؤن ٹاؤن ہونولولو کا رخ کیا۔

گرینڈ ہوائین ہوٹل کے اکلوتے ٹاور کی چھت پر راشیل اکیلی کھڑی تھی۔ تقدیر کا فیصلہ کوئی کیا جانے......

☆☆☆

12:17 p.m

(چوتھی لہر بیس منٹ دور)

کائی اور اس کے ہمراہیوں نے جب گرینڈ ہوائین کی چھت سے ہیلی کاپٹر کو ٹیک آف کرتے دیکھا تو ان کے تنے ہوئے اعصاب پُرسکون ہو گئے۔ چہرے کھل اٹھے۔ بس ناچنے کی کمی رہ گئی تھی۔ پانی کی غراہٹ اور گرج نے ان کی توجہ کھینچ لی۔ بوٹ بلڈنگ دباؤ کے خلاف مزاحمت پیش کر رہی تھی لیکن مزاحمت سے زیادہ وہ احتجاج کر رہی تھی۔

راشیل والے ہیلی کاپٹر کی واپسی کا انتظار انتہائی خطرناک تھا۔ کائی نے واکی ٹاکی سنبھال کر ”مے ڈے“ کا پیغام روانہ کیا۔ اپنا نام بتایا، بلڈنگ کی لوکیشن بتائی اور کہا کہ عمارت ساحل سے چھ بلاک اور ہونولولو زو (Zoo) سے آٹھ بلاک مغرب میں ہے۔ ”کیا کوئی مجھے سن رہا ہے......“

واکی ٹاکی کا دائرہ کار چند میل تک محدود تھا۔ کائی پُرامید تھا کہ اس دائرے میں کوئی نہ کوئی سن لے گا۔ تاہم کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ راشیل کی دی ہوئی فریکوئنسی پر کوشش کر رہا تھا۔ چوتھی کوشش میں وہ کامیاب ہوگیا۔

”مسٹر تناکا میں CWO (چیف وارنٹ آفیسر، آرمی) ہنری مچل ہوں۔ آرمی فلائٹ فلائٹ نمبر ایک سو ترانوے۔ میں تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ کیا صورتِ حال ہے؟“

ٹریسا نے میا کو لپٹا لیا۔ ٹام چلّانے لگا۔

”تم ہمیں دیکھ رہے ہو؟“ کائی نے کہا۔

”ہم ڈائمنڈ ہیڈ کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔“

کائی نے مڑ کر مشرق کی سمت دیکھا۔ بلیک ہاک ہیلی کاپٹر تیزی سے ان کی طرف آرہا تھا۔

”تھینک گاڈ۔“ کائی بولا۔ ”یہاں چھ افراد ہیں۔“

بلیک ہاک نے وہاں اترنے کے بجائے عمارت کا چکر لگایا اور بلند ہونے لگا۔ ”مسٹر تناکا، میں معذرت خواہ ہوں۔ لیکن میرے پاس مزید گنجائش نہیں ہے۔“

”صرف چند لوگ ہیں۔“ کائی گڑگڑانے لگا۔ ”یہاں بچے بھی ہیں۔ ان کو تو لے جاؤ۔“

”مجبوری ہے۔“ ہنری نے کہا۔ ”میں وھیلر کی طرف جارہا ہوں۔ وہاں ڈراپ کر کے جلد از جلد واپس آتا ہوں۔“

”کتنی جلدی؟“

”فیول بھی ختم ہو رہا ہے۔ تیس منٹ لگ سکتے ہیں۔“ وہ بولا۔

کائی، براڈ اور ٹریسا کا رنگ اُڑ گیا۔

”فیول، وھیلر سے ہی مل سکتا ہے۔“

تیس منٹ سے پہلے ہی تاریخی قیامت بہت کچھ فنا کر دے گی۔ ہیلی کاپٹر دور ہونے لگا۔ اپنے ساتھ کائی تناکا کی امیدوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ کیا نیرنگ تماشا ہے، جنوں کا عالم ہے...... ٹوٹی کہاں کمند......

دفعتاً واکی ٹاکی بیدار ہوا۔

”کائی۔“ راشیل کی آواز تھی۔ ”میں سن رہی تھی۔ سمجھ نہیں سکی۔ تم اب کہاں ہو؟“

”راشیل؟“ کائی کو توقع نہیں تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ راشیل بات کر رہی ہے۔ وہ سمجھا تھا کہ ہیلی کاپٹر اسے لے گیا ہے۔ ”تم کہاں ہو؟“ اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔

”ہیلی کاپٹر میں گنجائش نہیں تھی۔ مجھے رکنا پڑا۔“ راشیل نے جواب دیا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ تم ابھی تک ہوٹل کی چھت پر ہو؟“ کائی بدحواس ہوگیا۔ اس نے ہوٹل کی چھت کو غور سے دیکھا۔ راشیل کی شبیہہ چھوٹے سے کارٹون کی شکل میں وہاں نظر آرہی تھی۔ کائی کو لگا کہ وہ بے ہوش ہوجائے گا۔

”کیا تم مجھے اٹھا سکتے ہو؟“ راشیل نے سوال کیا۔ آواز اس نے حتی الامکان مضبوط رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”ہنی، ہم ہیلی کاپٹر میں نہیں ہیں۔ وہ پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر میں واپس آئے گا۔“

دوسری جانب خاموشی دل توڑنے والی تھی۔ کیونکہ نالہ و آہ کریں، خاموشی بہتر ہے...... بے ربطیٔ حالات کا حل کیا ہے...... بالآخر اس نے گہری سانس لی۔ آواز کی مضبوطی میں دراڑ سی آگئی۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ بولی۔ ”یہاں جو پائلٹ آیا تھا، وہ واپس آئے گا لیکن تم اپنی جگہ پر کوشش جاری رکھو۔“

”ہاں میں ایسا کروں گا۔ مجھ پر بھروسا رکھو، ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“ کائی نے کہا۔

”میں جانتی ہوں۔“ وہ بولی لیکن کائی نے محسوس کرلیا کہ وہ غیر یقینی کیفیت میں ہے۔

☆☆☆

اسٹین کا ہیلی کاپٹر، ٹرپلر آرمی میڈیکل سینٹر کے اوپر تھا۔ وسیع اسپتال کا انچ انچ نکالے جانے والے افراد سے بھرا پڑا تھا۔ ایک نیوی سی اسٹالون نے پارکنگ سے ٹیک آف کیا۔ قبل اس کے وہاں کوئی اور اترتا۔ اسٹین نے لینڈنگ کے لیے پوزیشن لے لی...... سواریوں کو اتارا۔ وہ واپس ہوٹل کی طرف وائی کی کی جانا چاہتا تھا۔ وہ اتر کر پیچھے کی طرف گیا۔ ٹیل روٹر اس کی توقع سے زیادہ متاثر ہوچکا تھا۔ ایک اور مدھم اجنبی آواز پرواز کے دوران اس نے سنی تھی۔ اس کا دس سالہ تجربہ الارم بجا رہا تھا۔ وہ فوراً وائی کی کی نہیں جاسکتا تھا۔ فیول بھروا کر اس نے وھیلر جا کے چیک اَپ کرانا تھا۔

اس نے پائلٹ کی نشست سنبھالی تو دینا بھی ہیلی کاپٹر میں واپس آگئی۔

”تم یہیں رکو۔“ شور کی وجہ سے اسٹین نے بلند آواز میں کہا۔

”کیا؟ مجھے کیمرا لینے ہوٹل واپس جانا ہے۔“

پیگ بھی قریب آ گئی تھی۔ بچے فاصلے سے ان کو دیکھ رہے تھے۔

''میں واپس نہیں جا سکتا۔ ہیلی کاپٹر کی حالت درست نہیں ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' پیگ چیخی۔ ''تمہیں اسے لانا ہوگا۔ اس کی وجہ سے میں اور میرے بچے زندہ ہیں۔''

اسٹین کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پیگ کے آنسو نکل پڑے۔ اسٹین کو ہوٹل کا منظر یاد آیا۔ راشیل کی قربانی اور بہادری تصور میں در آئی۔ اس نے شرمندگی محسوس کی۔ راشیل نے جان کی بازی کھیلی اور وہ پرواز کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا۔ اسٹین نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں اُسے لینے جاؤں گا۔''

''تھینک یو۔'' پیگ نے کہا۔

انجن بند کر کے روٹر کا جائزہ لینے سے مزید وقت برباد ہوتا۔ اس نے اپنے تجربے اور پالتو پرندے کی سخت جانی کو امتحان میں ڈال دیا۔

''میں اکیلا جاؤں گا۔'' اس نے دینا کو دیکھا۔ اس کی توقع کے مطابق دینا نے احتجاج نہیں کیا۔ دونوں آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو سمجھ گئے۔ دینا نیچے اتر گئی۔

☆☆☆

12:19 p.m

(چوتھی لہر اٹھارہ منٹ کے فاصلے پر)

تیسری لہر کا پانی پلٹنا شروع ہوا۔ ٹوٹنے، تڑخنے اور گرجنے کی آوازیں تھیں۔ ملبا بھی باہم ٹکرا رہا تھا۔ کائی بار بار واکی ٹاکی پر کوششیں کر رہا تھا۔ وائس ٹریفک ناقابلِ فہم تھا۔ ملی جلی آوازوں میں اچانک اس نے راشیل کا نام سنا۔ کائی نے وہی گفتگو پکڑنے کی کوشش کی۔ بات چیت مدھم ہو کر غائب ہوئی پھر دوبارہ نمایاں ہو کر سنائی دینے لگی۔

''آئی ریپیٹ، راشیل...... ہوائین...... واپس آرہا ہوں، تم وہاں پر......ہو......؟''

معاً راشیل کی صاف آواز آئی۔ ''میں راشیل تناکا، گرینڈ ہوائین پر ہوں۔ صاف سنائی نہیں دیا۔ دوبارہ پیغام دو۔''

''میں اسٹین بول رہا ہوں۔ ٹرپلی آرمی میڈیکل سے تمہیں لینے آرہا ہوں۔ تیار رہو۔''

''اسٹین میری بات سنو۔ میرے شوہر اور بیٹی کو پہلے اٹھاؤ۔''

''کیا تم تنہا نہیں ہو؟''

''یہاں میں تنہا ہوں۔'' راشیل نے یہ کہہ کر بوٹ بلڈنگ کی لوکیشن بتائی۔ دفعتاً خوفناک گڑگڑاہٹ نے اس کی آواز دبا دی۔ کائی کی دھڑکن رک گئی۔ ہوٹل منہدم ہونے والا تھا۔ کائی کو اذیت ناک احساس ہوا کہ راشیل کی زندگی شدید خطرے سے دوچار ہے۔ اور وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

''پائلٹ نہیں۔'' وہ چیخا۔ ''اسٹین پہلے راشیل کو وہاں سے نکالو۔''

براڈ نے کائی کا بازو پکڑا۔

''کائی، نہیں...... لانی اور تم پہلے۔ اسٹین میرے شوہر اور بیٹی کو بچاؤ۔'' راشیل کی آواز آئی۔

کائی نے بازو چھڑایا۔ ''خوش قسمتی ہے کہ موناناوا اب تک کھڑا ہے۔''

''اور قسمت ہے کہ بوٹ بلڈنگ بھی کھڑی ہے۔'' براڈ بولا۔ ''میں پانی میں نہیں جانا چاہتا۔''

''باسٹرڈ، اپنے بارے میں سوچ رہے ہو۔'' کائی بپھر گیا۔ ''وہ میری بیوی ہے۔''

''کائی حقیقت کا سامنا کرو۔ یہاں تمہاری بیٹی ہے......ہم ہیں......'' براڈ نے کہا۔

''میں براڈ کی حمایت کروں گی۔'' ٹریسا نے زبان کھولی۔ ''ہمیں لڑکیوں کو بچانا ہے۔''

''شاید میں باسٹرڈ ہوں۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ راشیل تمہیں بھی معاف نہیں کرے گی۔''

سازِ رگِ جاں خاموش تھا۔ عذابِ جان کی تکمیل کے لیے یہ موڑ بھی آنا تھا۔ بیوی یا بیٹی؟ سوال تھا یا سولی تھی؟ کوئی درست جواب نہ تھا۔ بس ایک جگر پاش فیصلہ تھا۔ کائی نے سب کے دھواں دھواں چہرے دیکھے۔ ہاں وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ بچوں سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ کائی نے بولنا شروع کیا۔

''اوکے اسٹین۔ ہمیں لے لو۔ کیا کوئی اور ہیلی کاپٹر ہے علاقے میں؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تمہارے ساتھ کون کون ہے؟''

''دو بچے، دو مرد اور ایک خاتون۔''

اسٹین خاموش ہو گیا۔ ذرا سا وقفہ دیا اور بولا۔ ''مشکل ہو جائے گی۔ ہوٹل میں بھی یہی مسئلہ تھا۔''

کچھ کچھ کائی سمجھ گیا۔ راشیل نے کسی اور کے لیے قربانی دی اور وہاں اکیلی رہ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ہوٹل تک پہنچ گئے تو راشیل کو نکلوا کے وہ خود وہاں رہ جائے گا۔

''تم مجھے دیکھ رہے ہو، شمال مغرب کی طرف؟'' پائلٹ نے سوال کیا۔ کائی نے گردن گھمائی اور ہیلی کاپٹر کو

قریب آتے دیکھا۔ وہ ایک چھوٹا ہیلی کاپٹر تھا۔

''ہنی، ہم تمہیں لینے آرہے ہیں۔'' کائی نے واکی ٹاکی استعمال کیا۔

''مجھے لانی سے بات کرنی ہے۔'' راشیل نے خواہش ظاہر کی۔ کائی نے واکی ٹاکی لانی کے قریب کر دیا۔

''ہائے ہنی۔ لانی میں کہنا چاہتی ہوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔''

''آئی لو یو، موم۔'' لانی نے سسکی لی۔

''میری زندگی میں رنگ تم سے ہے۔ مجھے تمہاری ماں ہونے پر فخر ہے۔''

لانی بے تحاشا رونے لگی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ ''آج جو کچھ ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن میری پیاری خوب صورت بیٹی تم نے مضبوط رہنا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ بڑی ہو کر تم ایک شاندار عورت ثابت ہو گی۔''

''موم ہم آرہے ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں تمہیں سینے سے لگانا چاہتی ہوں۔''

''اور میں بھی۔''

کائی نے بوٹ بلڈنگ کو تڑختے چٹختے سنا۔ فاصلے پر مونا ٹاور کو سونامی کا مہیب ظالم اژدہا نگلنے کے لیے تیار تھا۔

''جلدی کرو۔'' کائی چلایا۔

ہیلی کاپٹر ان کے سروں پر تھا۔ اسٹین سوچ رہا تھا کہ پچھلے چکر میں تین بچے اور دو بالغ افراد تھے۔ راشیل اتر گئی تھی۔ یہاں تین بچے اور تین بالغ افراد تھے اور دونوں عمارتیں گرنے والی تھیں۔ لیکن وہ داؤ کھیل چکا تھا۔ اس نے پانی کی آگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہیلی کاپٹر چھت پر اترا۔ میا اور لانی، کائی اور براڈ کی گود میں تھے۔ ٹام، ٹریسا کے ساتھ لگا تھا۔ کسی نہ کسی طرح انہوں نے زبردستی اندر جگہ بنا لی۔ اسٹین اپنے کیریئر کی خطرناک ترین پرواز کے لیے ذہن بنا رہا تھا۔ یقینی اور بے یقینی کے درمیان جھول رہا تھا۔ روٹر کی آواز نے سماعت ناکارہ کر دی تھی۔ بلڈنگ خشک پتے کی طرح لرزی۔ ہیلی کاپٹر بدنما انداز میں چند گز اوپر فضا میں ڈول رہا تھا۔ کائی کو اندازہ تھا کہ ہیلی کاپٹر میں وزن زیادہ ہے۔

''میں اتر جاتا ہوں۔'' وہ زور سے چیخا۔ ''تم جا کے راشیل کو لے لو۔''

اسٹین خاموش تھا۔ اس کی تمام تر توجہ ہیلی کاپٹر پر تھی۔ اچانک ہیلی کاپٹر نے بلند ہو کے رخ ہوٹل کی طرف کیا۔

''کائی؟'' راشیل کی آواز میں خوف در آیا۔ اس کی آواز کے ساتھ ڈراؤنی گڑگڑاہٹ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

''ایک منٹ سے پہلے ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔'' کائی نے بے چینی سے کہا۔

''نہیں ہو سکتا، دیر ہو گئی ہے۔'' راشیل نے کہا۔ کائی نے جھک کر کاک پٹ سے ہوٹل کو دیکھا۔ سیکنڈوں میں پہنچنا تھا۔ لیکن وہ درست کہہ رہی تھی۔ ہوٹل کا اکلوتا ٹاور عالم نزع میں تھا۔ کائی پھر بھی امید کی نازک سی ڈور کے ساتھ جھول رہا تھا۔

''ہنی، ایسا مت کہو۔''

''میں ہیلی کاپٹر دیکھ رہی ہوں، لیکن...... کائی آئی لو یو...... میں تمہیں مس (miss) کروں گی۔''

''نہیں، نہیں...... راشیل، ہم پہنچنے والے ہیں۔''

''لانی کا بہت خیال رکھنا۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے جوان ہوتے دیکھ سکتی۔'' کائی نے محسوس کر لیا کہ راشیل کی آواز میں درد تھا، کسک تھی۔

''راشیل۔''

''ہنی، مائی ہنی۔''

کائی کا دل انجانے ہاتھ نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا۔ آنسو آنکھوں سے آزاد ہو کر بہہ نکلے۔

''راشیل، آئی لو یو...... مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔''

''میں نہیں جانا چاہتی...... آئی لو یو......'' آواز منقطع ہو گئی۔

''راشیل۔'' وہ چلایا۔ ''راشیل......''

کوئی جواب نہ آیا۔ ٹاور دائیں بائیں لہرایا اور بالائی منزلیں ٹوٹ پھوٹ کر پانی میں گریں۔ پھر بقیہ منزلیں کچی اینٹوں کے مانند بیٹھتی چلی گئیں۔ ٹاور کی جگہ پر بھونچال کی کیفیت تھی۔ ہوٹل کا مکمل وجود نیست و نابود ہو گیا تھا۔ کائی بے جان لاشے کے مانند نشست میں گر کر زار و قطار رو رہا تھا۔ لانی کی آہ و بکا اور چیخوں نے اسے متحرک کیا۔ وہ شاک کی حالت میں تھا۔ سکتہ طاری تھا۔ وہ اٹھا اور لانی کو سینے سے لگا کر دیکھا کہ ہیلی کاپٹر واپس جا رہا تھا۔ بوٹ بلڈنگ کی طرف۔ دیکھتے ہی دیکھتے بوٹ بلڈنگ بھی سونامی کی وحشت ناک غضب کا شکار ہو گئی۔

☆☆☆

12:22 p.m

(چوتھی لہر پندرہ منٹ کے فاصلے پر)

میری بیوی مرگئی اور میری وجہ سے۔ میں قصوروار ہوں۔ کائی کے دماغ میں بس یہی ایک بات تھی۔ کائی کی ذمے داری تھی۔ لوگوں کے ساتھ بیوی کو بچانا۔

وہ فیل ہو گیا تھا۔ پیشہ ورانہ طور پر اور ذاتی طور پر وہ ناکام ہو گیا تھا۔ وہ کائی کا کاندھا تھا جس پر تھک کر وہ سر رکھ دیتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ راشیل کو کائی کی فکر تھی۔ تہی دستی سی تہی دستی ہے...... دلکش موضوع رہا نہ جاں گداز افسانے...... سینہ پھٹ کیوں نہیں جاتا، سانس رکتی کیوں نہیں...... خواب ہے یا عالمِ بیداری ہے؟ کرب و اذیت کا مفہوم اب اسے معلوم ہوا تھا۔ یہ کیسی ناانصافی ہے؟ چیخیں اس کے سینے میں تھیں۔ ایسے تو وہ کبھی بھی نہیں رویا تھا۔ وہ کتنے قریب تھے۔ راشیل کو بچانے والے تھے۔ وہ خفیہ فیصلہ کر چکا تھا کہ راشیل کو اٹھانے کے لیے وہ خود کسی کو بتائے بغیر پانی میں کود جائے گا۔ دل پھٹا جا رہا تھا۔ وہ کیسے برداشت کرے گا؟ کیونکر جیے گا؟

معاً اس نے محسوس کیا کہ لانی کا سر اس کی بغل میں ہے۔ لانی سرتاپا لرز رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی۔ راشیل نے آخر میں کہا تھا کہ لانی کا خیال رکھنا۔ اس نے لانی کے سر پر بوسہ دیا۔ وہ لانی کے لیے زندہ رہے گا۔ اچانک اس کے دل میں راشیل کے لیے فخر کی لہر بلند ہوئی۔ بلاشبہ کسی اور کو بچانے کے لیے اس نے جگہ خالی کی تھی اور اپنی جان داؤ پر لگائی تھی۔ لوگ تو اپنی جان بچانے کے لیے دوسروں کی جان لے لیتے ہیں۔ وہ آخری وقت میں بھی بچ سکتی تھی۔ لیکن راشیل نے اسٹین کو مجبور کیا کہ وہ پہلے بوٹ بلڈنگ پر جائے...... راشیل، ٹریسا کے لیے دوست نہیں بہن جیسی تھی۔ ٹریسا زار و قطار رو رہی تھی۔

چوتھی لہر ہونولولو کو دفن کرنے کے لیے پندرہ منٹ بعد قہر بن کر ٹوٹنے والی تھی۔

نہیں زندگی ختم نہیں ہوئی۔ سازِ رگِ جاں پر ''لانی'' مضراب کے مانند تھی...... وہ اب بھی خطرے میں تھے۔ وہ لڑے گا، آخری سانس تک لڑے گا۔

☆☆☆

ہیلی کاپٹر کا رخ سینڈ آئی لینڈ کی طرف تھا۔ کائی خود کو روکنے میں ناکام رہا۔ وہ خالی خالی نظروں سے نیچے واپس جاتے ہوئے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ پانی کی منزل سمندر تھا اور سمندر اس کی بیوی کا قبرستان۔ آخری چند منٹوں کی فلم بار بار ریوائنڈ ہو رہی تھی۔

''مسٹر تاناکا'' اسٹین کی آواز آئی۔ ''میں ریگی کو اطلاع کرتا ہوں کہ تم لوگ محفوظ ہو۔''

''اور راشیل؟'' دل چیخ اٹھا۔

''ریگی نے تمہیں بھیجا تھا؟''

''یس سر، ہم سات منٹ میں وھیلر پہنچ جائیں گے۔''

ہونولولو انٹرنیشنل اور ہک مین ائرفورس بیس کی متاثرہ علامات صرف کنٹرول ٹاور کی وجہ سے موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ ٹاور پانی سے باہر تھا۔ وہ ٹرمینل کے قریب تھے۔

''نہیں ابھی نہیں۔'' اسٹین چلایا۔

''کیا ہوا؟'' کائی نے دیکھا کہ ہیلی کاپٹر کی بلندی کم ہوتی جا رہی تھی۔

''ٹیلی روٹر کام نہیں کر رہا۔'' اسٹین کے چہرے پر پسینا تھا۔ ''ہم کریش کر جائیں گے۔''

☆☆☆

12:24 p.m

(چوتھی لہر تیرہ منٹ کے فاصلے پر)

پانی مکمل طور پر پسپا نہیں ہوا تھا۔ متعدد عمارات کی چھتیں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ پانی میں جا نہیں سکتے تھے۔ نظر آنے والی چھتوں کی عمارات سونامی کو برداشت کر گئی تھیں۔ جہاز ائرپورٹ کے اردگرد بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن سونامی نے انہیں ناکارہ کر دیا تھا۔

''میں ٹرمینل پر اترنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اسٹین نے کہا۔ کائی بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ٹرمینل واحد چانس تھا۔ ٹرمینل کی وسیع و عریض چھت ہیلی کاپٹر کے لیے کافی تھی۔ وہ بمشکل تین چار منزل اونچی تھی۔ آنے والا سونامی تین چار منزلیں بہ آسانی نگل جاتا۔ وہاں اترنے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ سوال آہنی میخ کے مانند دماغ میں اتر گیا تھا۔

☆☆☆

ہیلی کاپٹر کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ بہ آسانی ٹرمینل کی چھت پر اتر جاتا۔ بہرحال یہ کرنا تھا۔ ہیلی کاپٹر بھدے انداز میں لڑکھڑاتا ہوا اترا اور کنارے کی طرف پھسلتا چلا گیا۔ اسٹین اپنی بہترین صلاحیت صرف کر رہا تھا۔ سب کے چہروں پر خوف عیاں تھا۔ کائی کو لگا کہ ہیلی کاپٹر بروقت نہیں رکے گا۔ ایک بھیانک خواب تھا جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ چھت کا کنارہ چند فٹ دور تھا۔ دفعتاً دو فٹ کے فاصلے پر ہیلی کاپٹر تھم گیا۔ میا اور لانی کی چیخ و پکار کو بھی بریک لگ گیا۔ اسٹین نے انجن بند کر دیا۔ سب باہر آ کے چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

کائی نے ٹاور کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہمیں ٹاور کی ٹاپ

پر جانا چاہیے؟"

براڈ نے سر اٹھایا۔ "ٹاور کی اونچائی مشکوک ہے اور میرا نہیں خیال کہ چوتھے سونامی کی ٹکر کو ٹاور برداشت کرے گا۔"

"اسٹین، تم ریڈیو کی مدد سے کوئی اور ہیلی کاپٹر تلاش کرو۔"

اسٹین سر ہلا کر مے ڈے کی ٹرانسمیشن کے لیے ہیلی کاپٹر میں چلا گیا۔

☆☆☆

کائی ہیلی کاپٹر سے ٹیک لگا کر سر دائیں بائیں ہلانے لگا۔ "براڈ، میں نے کیا سوچا تھا؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں اپنی فیملی کو نہیں بچا سکا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ پوری آبادی کو بچا لوں گا؟"

"کیا واقعی تم نے ایسا سوچا تھا؟ وہ تمہاری جاب تھی۔"

"ہاں، میرا کام تھا!"

"نہیں ایسا نہیں تھا۔" براڈ نے کہا۔ "تمہاری جاب جان بچانے کے لیے ہر ایک کو موقع فراہم کرنا تھا۔ ان کو وارن کرنا تھا اور تم نے یہی کیا۔ ہر ایک کو تم نہیں بچا سکتے تھے۔ لوگوں نے خود کو بچانا تھا۔"

"شاید......" کائی اُلجھ گیا پھر اس نے ہیلی کاپٹر میں جھانکا۔ "کوئی ملا؟" کائی نے اسٹین سے سوال کرتے ہوئے گھڑی دیکھی۔

اسٹین کے سر پر ہیڈ فون تھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے انتظار کا اشارہ کیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے انگوٹھا بلند کیا۔ اس کے چہرے پر حوصلہ افزا مسکراہٹ تھی۔ کائی نے بھی سب کو انگوٹھا دکھایا۔ ہر ایک چہرہ نئی امید کے ساتھ روشن ہو گیا......

☆☆☆

ہر کوئی آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخری سونامی تباہ کن تاریخ رقم کرنے والا تھا۔ سات منٹ رہ گئے۔ آسمان خالی تھا۔ اسٹین ہیڈ فون اتار کے ٹرمینل کی چھت پر آ گیا تھا۔ کائی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ پائلٹ نے سر کو مثبت جنبش دی......

گروپ کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ نظریں آسمان کو کھنگال رہی تھیں۔ معاً ایک سیاہ دھبا نمودار ہوا۔ پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ وہ بڑا ملٹری ہیلی کاپٹر تھا۔ جو تیز رفتاری سے قریب تر ہوتا گیا۔ سب ہاتھ لہرا رہے تھے۔ اچھل رہے تھے۔ وہ چھت پر اترا تو تین منٹ بچے تھے۔ سب پھرتی سے اندر سما گئے۔ دور سے خوفناک گرج کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ سونامی کی لہر نے جھلک دکھا دی تھی۔

ہیلی کاپٹر نے بلا تاخیر اُڑان بھری۔ لہر طوفانی رفتار سے جھاگ اُڑاتی آ رہی تھی۔ پائلٹ عمودی زاویے کو ترجیح دیتے ہوئے، حتیٰ الامکان انتہائی ترچھی اڑان کے ساتھ بلندی پکڑ رہا تھا۔ گویا وہ ایک جان لیوا دوڑ تھی۔ سب کے دل پوری شدت سے دھڑک رہے تھے۔ پانی کی دیوار مہیب اور بلند ترین تھی۔

آخری لمحے میں ہیلی کاپٹر نے خود کو تصادم سے بچایا۔ لیکن پانی کی پھوار میں جیسے نہا گیا۔ رکی ہوئی سانسیں خارج ہوئیں۔ پائلٹ نے مزید بلند ہونے کے بعد نارمل انداز اختیار کیا اور رخ وھیلر بیس کی طرف کر دیا۔

کائی آخری بار رویا تھا۔ خاموش، بے آواز۔ صرف آنسو بہہ رہے تھے۔ خاسانِ وفا شعورِ غم تک پہنچے...... نظروں سے چھلک کے ہم تک پہنچے۔

☆☆☆

وہ وھیلر تک پہنچے تو وہاں ایک ہجوم بے کراں تھا۔ رن وے ٹارمک بھی چھلک رہا تھا۔ وھیلر کا اپنا آئل پاور پلانٹ تھا۔ تمام ساحلی پاور پلانٹس کا صفایا ہو چکا تھا۔ اوہائیو کے چند مقامات میں سے وہ ایک تھا جہاں ابھی تک روشنی تھی۔ ائر بیس سیاحوں اور مقامی افراد کے لیے ان حالات میں جنت کے مانند تھا۔ وہاں پینتیس جیٹ کھڑے تھے۔ جو فیول کی غیر موجودگی میں واپس اپنے مرکز پر نہیں جا سکتے تھے۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لہٰذا طیاروں کے مسافر اندر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

آرمی میڈیکل سینٹر متاثرین اور زخمیوں سے لبالب بھرا تھا۔ چیخ پکار اور رونے دھونے کا شور تھا، لوگ اپنے بچھڑے ہوئے اقربا کو یاد کر رہے تھے۔ کائی جیسے گونگا ہو گیا تھا۔

ریگی، براڈ سے مل چکا تھا اور باخبر تھا...... کائی سے ملا تو گلے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کائی خاموش تھا۔

"ریگی تمہارا شکریہ۔" کائی نے آہستہ سے کہا۔

ریگی نے جواب دینا چاہا لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔

"ریگی، کیا تم میرے ساتھ یہاں چند منٹ کے لیے کھڑے ہو سکتے ہو...... بالکل خاموش۔" کائی نے کہا۔ وہ جہاں تھے، وہاں سے سمندر نظر آ رہا تھا۔ ریگی نے سر ہلایا۔

کائی جھلمل کرتے سمندر کو دیکھ رہا تھا...... دور، فاصلے پر......

❖❖❖

استیفن شین اپنی گن صاف کر رہا تھا کہ گولی چل گئی۔ پھر بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور دو افراد لقمۂ اجل بن گئے جن میں سے ایک شین کی بیوی ایلس شین اور دوسرا ایلس کا آشنا جیمس گوے تھا......

یہ بیان تھا شین کے وکیل ٹامی فرڈیننڈ کا جو کہ ایک ڈیفنس اٹارنی تھا۔ وہ صرف دولت مند افراد ہی کے کیس لیا کرتا تھا۔ اس کے سامنے کاؤنٹی اٹارنی پراسیکیوٹر ریے برین بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں اِس وقت جائے وقوعہ یعنی شین کی عالی شان رہائش گاہ پر موجود تھے۔ اُن کے درمیان

الجھن و سلجھن کے سنگین معاملات میں الجھی خیر و شر کی مقدار و طوالت......

کامیابی اور جیت کے لیے پیشہ ورانہ قابلیت... مکاری... عیاری چالاکی یا پھر دولت کی چمک دمک جیسے بھرپور عناصر اپنا کردار ادا کرتے ہیں... اہم امر یہ ہے کہ ان حربوں کو استعمال کرنے کا ہنر ہونا چاہیے... ایسے ہی کرداروں سے متعارف کراتی تحریر جو اپنے اپنے مفادات کے لیے موقع سے فائدہ اٹھانے کا دادِ ہنر رکھتے تھے...

گندے انڈے

عکس فاطمہ



مسابقانہ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔

''کیا تم نے مجھے کوئی چھوٹا بچہ سمجھ رکھا ہے جو اس قسم کی احمقانہ تاویلات پیش کر رہے ہو......!'' رے برین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''عجیب اتفاق ہے...... گن صاف کرتے ہوئے دو گولیاں چلیں اور ایک بھی فائر مس نہیں ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے دو بے وفا انسان موت کے منہ میں چلے گئے۔ تم دیکھ لینا ٹامی! میں تمہاری اس تھیوری کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔''

''کورٹ کے باہر بڑی بڑی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں رے!'' ٹامی نے بڑے غرور سے کہا۔ ''میں اپنے کلائنٹ کو اس کیس سے اس طرح نکال لوں گا جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے!''

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ٹامی فرڈینینڈ ایک مشہور اور کامیاب کرمنل ڈیفنس اٹارنی تھا۔ اس نے آج تک شاید ہی کوئی کیس ہارا ہو۔ یہ الگ بات کہ اس کی جیت کے پیچھے پیشہ ورانہ قابلیت یا عیاری، مکاری یا پھر دولت کی چمک کا عمل دخل تھا۔ وہ پیسا بنانے اور اسے استعمال کرنے کا ہنر جانتا تھا۔

''کسی بھی انسان کی طاقت کا اندازہ اس کے دشمنوں کی تعداد سے ہوتا ہے۔'' رے برین نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہ تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے اچھے خاصے دشمن بنا لیے ہیں جن میں زیادہ تعداد کمزور اور پسے ہوئے افراد کی ہے اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ غریب جب اپنی آئی پر آجائے تو اس کے سامنے ٹھہرنا آسان نہیں ہوتا......!''

ٹامی نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور شاہانہ انداز میں اپنے کوٹ کی آستین پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے مذکورہ کوٹ کی مالیت، رے برین کے وارڈ روب میں ٹنگے تمام ملبوسات کی مجموعی قیمت سے بھی زیادہ تھی۔ اس واقعے کے فوراً بعد شین نے فون کر کے ٹامی کو اپنے پاس بُلا لیا تھا اور ''نائن الیون'' پر کال کر کے اس حادثے کی اطلاع بھی دے دی تھی۔ اس کے بعد ہی کرائم سین کا پروسس شروع ہوا تھا۔ ٹیکنیکل اسٹاف وقوعہ کی کارروائی میں مصروف تھا اور وہ دونوں اٹارنی، شین کے ڈائننگ روم میں بیٹھے، عدالت میں جانے سے پہلے ہی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔

''رے! میں تمہیں ایک آفر دیتا ہوں......!'' ٹامی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر تم میرے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے راضی ہو جاؤ تو میں تمہیں شین سے بہت کچھ دلوا سکتا ہوں...... بہت کچھ!''

ٹامی نے اپنی پیشکش کے آخری الفاظ پر اچھا خاصا دباؤ ڈالا تھا۔ اس کی بات سُن کر رے نے بُرا سا منہ بنایا اور اکتاہٹ آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

''ساتھ مل کر کام کرنے سے تمہاری کیا مراد ہے ٹامی؟''

''میں اسٹیفن شین کو یہ پٹی پڑھا دوں گا کہ وہ عدالت میں، بے احتیاطی سے گن صاف کرنے والی اپنی حرکت پر معافی مانگ لے اور جج سے وعدہ کرے کہ آئندہ وہ ایسی بے وقوفی نہیں کرے گا۔ مجھے اُمید ہے، جج اسے ہفتے، دس دن کے لیے کسی سینی ٹوریم بھجوانے کی سزا کے ساتھ اس کیس کو ختم کر دے گا۔'' ٹامی نے شاطرانہ انداز میں جواب دیا۔ ''اور عین ممکن ہے کہ سینی ٹوریم والی سزا، بھاری جرمانہ بھرنے سے ٹل جائے۔''

''ٹامی! کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟'' رے نے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔ ''یہ صرف بے احتیاطی سے گن صاف کرنے کا معاملہ نہیں ہے۔ شین کے بیڈ روم میں دو لاشیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ ایلس اور گوے کو شین نے باقاعدہ شوٹ کیا ہے۔ یہ سیدھی سادی دُہرے قتل کی ایک سنگین واردات ہے۔''

''وہ دونوں بے وفائی کے مرتکب تھے۔'' ٹامی نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔ ''ایلس، شین کو اور گوے اپنی بیوہ شارلٹ کو دھوکا دے رہا تھا۔ ان دونوں کا انجام اس سے بھی زیادہ بھیانک ہونا چاہیے تھا۔''

''تم کون ہوتے ہو کسی کی وفا اور بے وفائی کا فیصلہ کرنے والے اور وہ بھی عدالت سے باہر......!'' رے نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''یہ کام عدالت میں بیٹھی جیوری کا ہے اور...... مقتولین کے بے وفا ثابت ہو جانے سے بھی شین کا جرم کم نہیں ہو جاتا۔ اس نے دو انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ میں اسے لمبے عرصے کے لیے جیل بھجوا کر ہی دم لوں گا۔''

''دماغ کو اتنی زیادہ گرمی میں رکھنا صحت کے لیے مضر ثابت ہو سکتا ہے رے......!'' ٹامی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ ہماری اس کاؤنٹی کے تمام ادارے کس قدر بے بسی اور تباہ حالی کا شکار ہیں۔ فنڈز کی کمی کے باعث کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہیں ہو پا رہا

یہاں۔ اِن حالات میں، شین کا دم غنیمت ہے۔ وہ ایک بہت بڑا بزنس مین ہے۔ کنسٹرکشن کے کام میں وہ پوری طرح گھسا ہوا ہے۔ چندروز پہلے اس نے ہماری کاؤنٹی میں ایک ہاؤسنگ اسکیم کا اعلان کیا ہے۔ وہ آسان اقساط پر لوگوں کو سستی رہائش گاہیں فراہم کرنے والا ہے۔ اسی اسکیم کے دو گھر اس نے مجھے گفٹ کردیے ہیں۔''

''ٹامی......!'' رے ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''شین کا وہ ''گفٹ'' محض اس لیے ہے کہ تم اسے کسی لمبی سزا سے بچانے کے لیے ہر قسم کے جوڑ توڑ میں مصروف ہو۔ مجھے تم نے جو ابھی پیشکش کی ہے، وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن میں تم پر واضح کردوں کہ تمہاری گفتار کا جادو مجھ پر چل نہیں سکے گا ویسے......'' لحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اِن الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''ویسے تم عدالت سے باہر بیٹھ کر بھی اپنے کلائنٹ کی اچھی وکالت کر رہے ہو۔''

''میں مشورے بھی بہت اچھے دیتا ہوں رے، اگر سامنے والے کی سمجھ میں آجائیں تو......'' ٹامی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میری نظر میں تم ایک سمجھ دار انسان ہو۔ اگر میری آفر تمہارے بھیجے میں بیٹھ گئی تو سمجھ لو، شین کی ہاؤسنگ اسکیم میں تمہارے لیے بھی ایک گھر پکا......!''

رے نے ناپسندیدہ نظر سے ٹامی کو گھورا پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ٹامی سے گفتگو کے دوران میں وہ گاہے بگاہے جورگ میلاگرو کو بھی اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ جورگ سرتاپا سفید پلاسٹک کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ وہ ایک نہایت ہی قابل اور تجربہ کار ''کرائم سین ٹیکنیشن'' تھا مگر کاؤنٹی کے بجٹ میں کمی کے سبب، جورگ کو اس نوعیت کی ٹیکنیکل سپورٹ حاصل نہیں تھی جیسا کہ ٹی وی سیریز اور مووِیز وغیرہ میں دکھایا جاتا ہے۔ وہ اس شعبے میں فردِ واحد کی حیثیت سے کام کررہا تھا اور وہ بھی کسمپرسی کے عالم میں......

''پولیس والے تھوڑی ہی دیر میں ایلس اور گوے کی لاشوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔'' ٹامی نے اپنی ٹائی کی گرہ کو درست کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میڈیا والے گھر کے باہر اپنے ساز و سامان کے ساتھ بالکل تیار کھڑے ہیں رے! قبل اس کے کہ ان کا بندر تماشا شروع

ہو، تمہیں کسی فیصلے پر پہنچ جانا چاہیے۔ اگر میڈیا والوں کے سامنے ایک بار زبان سے جو بھی نکل گیا، اسے آخر تک مینیج کرنا پڑتا ہے۔ ابھی وقت ہے...... ہم دونوں مل کر سب سنبھال سکتے ہیں۔ کاؤنٹی شیرف، انتظامیہ اور جیوری کے ایک دو جج بھی میری مٹھی میں ہیں۔‘‘

’’میں تمہارے کسی بھی جھانسے یا بہلاوے میں آنے والا نہیں ہوں ٹامی!‘‘ رے نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ’’میں تمہاری اور تمہارے کلائنٹ اسٹیفن شین کی کسی بھی آفر میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ میں اس کیس میں وہی کروں گا جو میں نے سوچ رکھا ہے۔ تم جانتے ہو، قانون اس معاملے میں کیا کہتا ہے لہٰذا تم مجھ پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے کلائنٹ کی سزا کو کم کرانے کی تراکیب پر غور کرو۔‘‘

’’تمہارے منہ سے قانون کی باتیں اچھی نہیں لگتیں رے......!‘‘ ٹامی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ’’میں جانتا ہوں، تم کتنے قانون پسند اور کردار کے صاف ہو......!‘‘

’’آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟‘‘ رے نے اکھڑے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ’’میرے کردار کے صاف ہونے میں تمہیں کیا پریشانی ہے؟‘‘

’’ذرا پوپ لینکن والے کیس کو یاد کرو رے......!‘‘ ٹامی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’اس کیس میں تمہارا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ تم نے اس کی موت کو ایک اتفاقی حادثہ ثابت کیا تھا نا...... حالانکہ پوپ کے سر میں گولی مار کر اسے ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ سیدھا سیدھا قتل کا کیس تھا رے...... ہیں نا؟‘‘

’’ٹامی کا وضاحتی جواب سن کر رے کو ایک لمحے کے لیے چپ سی لگ گئی، اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

’’تم مجھ پر کیچڑ اچھال کر میرے کردار کو آلودہ نہیں کر سکتے ٹامی! میں اس کاؤنٹی کا منتخب اٹارنی ہوں۔ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ میں انہی کے ووٹس سے منتخب ہوا تھا۔ وہ تمہاری کسی بھی بھونڈی بات کا یقین نہیں کریں گے۔‘‘

’’تم پچھلی بار اتفاق سے کاؤنٹی اٹارنی منتخب ہو گئے تھے مگر اس مرتبہ ایسا نہیں ہوگا۔‘‘ ٹامی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ’’جب اس کاؤنٹی کی عوام کو پتا چلے گا کہ شین کے کیس میں تم ایک اتفاقی حادثے کو قتل کی واردات ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہو تو ان کے ذہن میں پوپ لینکن والا کیس تازہ ہو جائے گا جب تم نے پوپ کی موت کو اتفاقی حادثہ قرار دے کر اس کے قاتل کو صاف بچ نکلنے کے لیے محفوظ راستہ فراہم کر دیا تھا۔ یہ مت بھولو کہ پوپ لینکن ایک نیشنل ہیرو تھا۔ کاؤنٹی کے اندر اور باہر ہزاروں لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ شین والے کیس میں تمہارے کردار کو دیکھ کر انہیں اپنے ہیرو پوپ لینکن کی بے عزتی محسوس ہوگی۔ تمہیں ووٹ دینا تو رہ گیا ایک طرف، مجھے یقین ہے وہ تم سے شدید نفرت کرنے لگیں گے۔ یہ جو فینز ہوتے ہیں نا، اپنے ہیرو کے معاملے کو لے کر کسی بھی انتہا کو جا سکتے ہیں۔‘‘

پوپ لینکن ہائی اسکول کی فٹ بال ٹیم کا کوچ ہوا کرتا تھا۔ وہ لگ بھگ تیس سال تک یہ ذمے داری نبھاتا رہا۔ بچوں اور بڑوں، سب کے لیے وہ ایک پسندیدہ انسان تھا۔ اس ہر دل عزیز شخص کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی، عوام کے پُرزور اصرار پر اسے دوبارہ اس جاب پر بُلا لیا گیا تھا۔ وہ اپنی موت سے ایک دن پہلے تک فٹ بال ٹیم کی کوچنگ کرتا رہا تھا۔ پولیس کی تفتیش اور میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق، اپنی گن کو صاف کرتے ہوئے اس کی موت، سر میں گولی لگنے سے واقع ہوئی تھی۔ لوگوں کو پوپ کی موت سے بڑا دھچکا لگا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی، پولیس کی تفتیش سے مطمئن نہیں تھا۔ اُن کے خیال میں پوپ کی موت والے معاملے کو بہت باریک بینی سے دیکھنے کی ضرورت تھی اور کاؤنٹی کا پولیس ڈپارٹمنٹ ایسی سہولیات سے یکسر محروم تھا اسی لیے اس کیس کو ’’لپیٹ‘‘ دیا گیا تھا۔

’’میں نے پوپ لینکن کے کیس میں جو کیا، وہ بالکل ٹھیک تھا اور شین والے کیس میں بھی میں کچھ غلط نہیں کرنے جا رہا......‘‘ رے برین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’میں تمہاری ان بلیک میلنگ والی باتوں سے خوف زدہ ہونے والا نہیں ہوں ٹامی۔ تم اپنے کلائنٹ کو بتا دو کہ میں کل کسی وقت اس کا انٹرویو کرنے آ رہا ہوں۔ وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کر لے۔‘‘

’’تو کیا میں شین کو یقین دلا دوں کہ ہمارے درمیان ڈیل ہو چکی ہے......؟‘‘ ٹامی نے مکاری بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’ہرگز نہیں۔‘‘ رے نے خفگی آمیز انداز میں جواب دیا۔ ’’کیا میں نے تم سے ایسی کوئی بات کی ہے ٹامی؟‘‘ اس نے تیز نظر سے ڈیفنس اٹارنی کو گھورا۔

ہاتھی کے مانند پھیلے ہوئے بدن کے مالک ٹامی فرڈینڈ کے ہونٹوں پر بڑی واہیات مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ’’دیکھ لینا رے، میں تمہیں قائل کر کے ہی رہوں گا۔‘‘

''ڈھٹائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔'' رے برین نے اپنے دماغ میں سوچا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

ٹامی نے شاکی نظر سے اسے دیکھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، ٹامی نے رے کی سوچ کو پڑھ لیا ہو۔ رے نے اس کے چہرے کے تاثرات پر زیادہ توجہ نہیں دی اور اٹھ کر اس بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا جہاں تفتیشی ٹیم، فرانزک ایکسپرٹ مسٹر جورگ کے ساتھ واقعاتی شواہد اور دیگر اہم نکات کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔

''کیا چل رہا ہے جورگ؟'' رے نے کرائم سین ٹیکنیشن سے پوچھا۔ ''کوئی کارآمد شے ہاتھ لگی یا نہیں؟''

''ہم نے کافی کچھ حاصل کرلیا ہے مگر وہی بات کہ ان شواہد کو مناسب انداز میں ٹیسٹ کرنے کے لیے ہماری کاؤنٹی کی یتیم لیبارٹری میں خاطر خواہ سہولیات نہیں ہیں اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔'' جورگ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مایوس کن لہجے میں جواب دیا۔ ''اس طرح ہماری ساری محنت رائگاں جائے گی۔''

''دل چھوٹا نہیں کرو جورگ!'' رے نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''ہم اس مقصد کے لیے دوسری کاؤنٹیز کی ٹیسٹ لیبارٹریز سے رابطہ کریں گے۔ میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں، یہ تم بھی جانتے ہو۔''

جورگ نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

رے برین اپنی اسسٹنٹ جونیئر وکیل نینا ہولٹ کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ وہ دونوں اس وقت رے کے آفس میں موجود تھے۔ رے نے نینا کو ڈیفنس اٹارنی ٹامی فرڈیننڈ سے ہونے والی اپنی بات چیت کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ وہ اپنی اسسٹنٹ پر پورا بھروسا کرتا تھا۔ اس کی نظر میں نینا ایک بیدار مغز اور صائب الرائے وکیل تھی۔ اس کا دیا ہوا کوئی بھی مشورہ، آج تک رے کے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ پینتیس سالہ نینا، رے کے آفس کے تمام معاملات سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ رے اس سے کچھ بھی نہیں چھپاتا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ اپنے ڈاکٹر، وکیل اور مشیر سے کچھ بھی خفیہ نہیں رکھنا چاہیے ورنہ پچھتاوے اور گھاٹے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

''موٹا سانڈ بہت ہی شاطر اور ابن الوقت ہے۔'' نینا نے ٹامی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''وہ اس نقطے کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ آپ جس قسم کے لیبارٹری ٹیسٹ کرانا چاہتے ہیں، اس سے شین کا جرم بہ آسانی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ مطلب، وہ اپنے کلائنٹ اسٹیفن شین کو کسی بھی صورت بچا نہیں پائے گا اسی لیے اس نے آپ کو اتنی تگڑی آفر دی ہے۔ بہرکیف......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر رے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''آپ بہت اچھا کھیل رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے، فتح ہماری ہی ہوگی سر!''

''ہاں...... بالکل!'' رے نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''ٹامی یہ بھی جانتا ہے کہ میں کاؤنٹی کونسل سے جن ٹیسٹس کا مطالبہ کروں گا، ان کے لیے ہماری مقامی لیبارٹری کسی بھی حوالے سے مفید و معاون ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر میں اسی طرح اپنی ضد پر جما کھڑا رہا تو شین، ٹامی کے ذریعے مذکورہ لیبارٹری کے انچارج اور کاؤنٹی کونسل کے ممبرز کو خریدنے کی کوشش کرسکتا ہے تاکہ وہ لوگ میرے ساتھ خاطر خواہ تعاون نہ کریں، جیسا کہ ٹامی نے مجھے خریدنے کی بات کی ہے۔ اسٹیفن شین کے پاس دولت کی کمی نہیں اور اس کے وکیل کی کھوپڑی میں شیطان کا دماغ پلانٹ ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ کاؤنٹی شیرف اور جیوری کے ایک، دو جج بھی اس کی مٹھی میں ہیں۔ اگر میں اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤں تو وہ سب کچھ ٹھیک کرسکتا ہے حتیٰ کہ وہ شین کی دولت کا استعمال کر کے مجھے دوبارہ اس کاؤنٹی کا اٹارنی بھی منتخب کروا سکتا ہے۔''

''دیکھ لیں سر......!'' نینا نے زیرِلب مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ٹامی کو آپ کی اور آپ کے مستقبل کی کتنی فکر ہے۔ اتنی سنجیدگی سے تو آپ نے بھی کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔''

قبل اس کے کہ رے اپنی اسسٹنٹ کی پُرمعنی دلیل کے جواب میں کچھ کہتا، میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ رے نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو سیکریٹری کیٹ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''سر! مسز گومے لائن پر ہے۔''

''بے چاری...... جیمس کی بیوہ!'' رے نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے اپنی سیکریٹری سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ کال ٹرانسفر کردو۔''

اگلے ہی لمحے شارلٹ گومے، رے برین کے رابطے میں آچکی تھی۔ نینا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں، مجھے اب باہر چلے جانا

چاہیے۔"

رے نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اثبات میں گردن ہلا کر کہا۔ "ہاں، یہی مناسب ہوگا۔" پھر وہ شارلٹ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں بولا۔

"شارلٹ! مجھے افسوس ہے کہ میں اس عظیم نقصان پر تعزیت کرنے تمہارے گھر نہیں آسکا......!"

"کوئی بات نہیں رے۔" وہ عام سے لہجے میں بولی۔ "آپ ایک مصروف انسان ہیں۔ آپ مجھ سے فون پر بات کر رہے ہیں، میرے لیے یہی بہت ہے۔"

شارلٹ کی آواز کے ٹھہراؤ اور لہجے سے جھلکتے اطمینان سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی ایسی بیوہ ہے جسے اپنے مقتول شوہر کی موت پر لاکھوں ڈالرز کا انعام ملا ہو یا پھر بیٹھے بٹھائے اس کی کوئی لاٹری لگ گئی ہو۔

"بہرحال......!" رے نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔"

"جو پولیس آفیسر اس سانحے کی اطلاع دینے میرے گھر آیا تھا، اس کے ساتھ اسٹیفن شین کا ایک خاص آدمی بھی تھا۔" وہ رے کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے اپنی ہی دُھن میں بولتی چلی گئی۔ "شین کے آدمی نے علیحدگی میں بات کر کے مجھے یقین دلایا کہ اگر میں شین کے وکیل سے تعاون کروں گی تو اس کے بدلے میں وہ مجھے بلڈمنی (خوں بہا) کی مد میں اتنا پیسا دیں گے جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے اس بندے کی پیشکش قبول کر لی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جیمس گوے سے پہلے میں دو شوہروں کو طلاق دے چکی ہوں جن کی طرف سے مجھے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی۔ اس لحاظ سے جیمس گوے کی موت میرے لیے خاصی سودمند ثابت ہوئی ہے۔"

"مجھے تمہارے شوہر کی موت کا دکھ تو ہے ہی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ اس سانحے نے تمہارے دن پھیر دیے ہیں۔" رے نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ "مستقبل قریب میں تم ایک دولت مند بیوہ کی حیثیت سے اس کاؤنٹی میں، زبان زد خاص و عام کا اعزاز حاصل کرنے والی ہو۔"

شارلٹ، رے کے گہرے طنز کو یا تو سمجھ نہیں پائی تھی اور یا پھر سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ "مجھے امید ہے، آپ بھی مجھ سے بھرپور تعاون کرو گے۔" اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنا خاص مقصد رے کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ سے ایک فیور چاہیے رے برین......!"

"کیسی فیور؟" رے نے استفسار کیا۔

"ٹامی فرڈیننڈ نے مجھے، آپ کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کے بارے میں بتا دیا ہے۔" شارلٹ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ آپ اس افسوس ناک واقعے کو اتفاقی حادثہ ثابت کرنے کے لیے ٹامی سے تعاون کریں۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی اور فائدہ ہے۔ جیمس گوے اور ایلس شین اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ انہیں واپس لانا ممکن نہیں ہے اور...... انہیں اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسٹیفن شین نے انہیں دانستہ، ایک منصوبے کے تحت موت کے گھاٹ اتارا ہے یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر دوسری دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا......؟"

رے کو یہ جانچنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ شارلٹ، ڈیفنس اٹارنی ٹامی فرڈیننڈ کی زبان بول رہی تھی۔ اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔

"میں سردست ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"اس سال کے آخر میں کاؤنٹی کے الیکشن ہونے جا رہے ہیں۔" شارلٹ نے ترپ کا پتا پھینکتے ہوئے کہا۔ "آپ کے اس تعاون کے لیے بدلے میں، میں آپ کی انتخابی مہم کے لیے بھاری عطیہ دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" رے نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ "میں اس بارے میں سوچوں گا۔"

"شکریہ اٹارنی!" شارلٹ نے مطمئن انداز میں کہا۔ "آپ ایک ذہین اور قابل وکیل ہیں۔ یقیناً آپ سب کی بھلائی کو ذہن میں رکھ کر ہی سوچیں گے۔"

رے نے گول مول جواب دیا پھر الوداعی کلمات کی ادائی کے بعد ریسیور کریڈل کر دیا۔ اگلے ہی لمحے فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اس مرتبہ بھی دوسری طرف اس کی سیکریٹری کیٹ ہی تھی۔

"سر! کاؤنٹی شیرف آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" کیٹ نے بتایا۔

"اوکے...... لائن دے دو۔" رے نے کہا۔

"کیا تم جورگ کو کچھ دیر کے لیے خالی چھوڑ سکتے ہو؟" کسی بھی قسم کی رسمی علیک سلیک کے بغیر ہی شیرف آدریا واربرٹن نے براہِ راست رے سے سوال کیا۔ "میں اس سے چند اہم باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

رے کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیا اِن اہم باتوں کا تعلق اسٹیفن شین کیس سے ہے؟" اس نے معتدل انداز

میں پوچھا۔

''ہاں، بالکل!'' شیرف نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ اس سے میں سیریل کلر کا معاملہ بھی ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔''

''سوری شیرف......!'' رے نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''جورگ میلاگرو اس وقت اسی کیس پر کام کررہا ہے۔ آپ جانتی ہو، ہماری کاؤنٹی کی ٹیسٹ لیبارٹری کا کیا حال ہے اور کرائم سین ٹیکنیشن کے نام پر ہمارے پاس صرف ایک یہی جورگ ہے جسے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی گھسیٹا جارہا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ وہ بہت مصروف ہے۔ میں فوری طور پر اسے فری کرنے کا رسک نہیں لے سکتا شیرف......!''

رے کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ شیرف آدریا، جورگ سے مل کر اسے کون سی پٹی پڑھانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ٹامی کے دعوے کے مطابق، شیرف اس کی مٹھی میں تھی۔ گویا شین اپنی دولت کے بل پر، ڈیفنس اٹارنی کے ذریعے ہر محاذ پر لڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

''سنو...... میں اس وقت کاؤنٹی سے باہر ''ماؤنٹ روز'' کے علاقے میں ہوں۔'' شیرف نے کہا۔ ''یہ وہی جگہ ہے جہاں اس لڑکی کی لاش پڑی ملی تھی جسے ہم کافی دنوں سے ڈھونڈ رہے تھے۔ تحقیق اور تفتیش پر ہمیں پتا چلا تھا کہ مقتول جسم فروشی کے دھندے میں ملوث تھی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ دو ماہ پہلے بھی ایک ایسی ہی عورت کی لاش، کچرے کے ڈھیر میں سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ عورت اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب پائی گئی تھی۔''

''ہاں، یہ دونوں واقعات میرے ذہن میں تازہ ہیں۔'' رے نے نارمل انداز میں کہا۔ ''لیکن میں یہ سمجھ نہیں پارہا کہ اس ذکر سے تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کررہی ہو شیرف......؟''

''کوئی خطرناک قاتل اس کاؤنٹی کی بے وفا اور آبرو باختہ عورتوں کو ٹھکانے لگانے کی مہم میں جُتا ہوا ہے۔'' آدریا نے ٹامی فرڈینینڈ کے الفاظ اپنی زبان سے رے برین کی سماعت میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''وہ کوئی سیریل کلر بھی ہوسکتا ہے۔ عین ممکن ہے......!'' شیرف نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''عین ممکن ہے، ایلس شین بھی اسی بے رحم سیریل کلر کی سفاکی کا شکار ہوگئی ہو۔ تم اس حقیقت سے تو انکار نہیں کرسکتے کہ ایلس ایک بے وفا بیوی تھی جو شین کو دھوکے میں رکھ کر اپنے آشنا جیمس گومے کے ساتھ عیش کررہی تھی......''

''شیرف! میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کاؤنٹی کی عدالت سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو پہلی فرصت میں فارغ کردینا چاہیے۔'' رے نے حد درجہ کڑوے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ جیوری کا کام تو اب تم اور وہ ہاتھی ٹامی، چلتے پھرتے گلی کوچوں میں کرنے لگے ہو...... آدریا! یہ مت بھولو کہ ایلس شین کے ساتھ ہی جیمس گومے کی بھی موت واقع ہوئی ہے۔ اس کا کیا کروگی......؟''

''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں رے!'' شیرف آدریا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اسے ہم شین کے بے احتیاطی سے گن صاف کرنے کے کھاتے میں ڈال دیں گے جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے پوپ لینکن والے کیس میں کیا گیا تھا۔''

''یہ دونوں کیس ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں شیرف!'' رے نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ بات میں بھی جانتی ہوں رے!'' آدریا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مگر یہ بھی تو دیکھو کہ شین ہماری کاؤنٹی کے مختلف اداروں خصوصاً پولیس ڈپارٹمنٹ کی بھرپور مالی مدد کرنے کو تیار ہے جس سے ہم ایک جدید فرانزک لیب بناسکتے ہیں جو اعلیٰ درجے کے قیمتی آلاتِ تحقیق سے پوری طرح لیس ہوگی۔ ہم ٹیکنیشن اور دیگر افراد کی تعداد میں اضافہ کرسکیں گے۔ ہمیں کسی کرائم سین کے معاملات سے نمٹنے کے لیے دوسری کاؤنٹیز کی جانب امداد طلب نظر سے نہیں دیکھنا پڑے گا اور...... اور اس میں ہم سب کا مالی فائدہ بھی ہے جو...... تمہاری توقع سے بہت بڑھ کر ہے۔''

''میں سوچ کر جواب دوں گا شیرف!'' رے نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

شیرف نے بغیر کچھ کہے، ٹیلی فونک سلسلہ موقوف کردیا جیسے اسے یقین ہو کہ رے برین کا جواب اس کی توقع کے عین مطابق ہوگا۔

☆☆☆

رے برین کا ذہن تیز رفتاری سے کام کررہا تھا۔ اس کیس سے جُڑے ہوئے تمام کردار اور اُن کے خیالات پوری طرح کھل کر سامنے آچکے تھے۔ ٹامی فرڈینینڈ ہو یا آدریا وار برٹن اور یا پھر شارلٹ گومے...... سب نے اپنی اپنی بال کو ہٹ لگا کر رے کے کورٹ میں پھینک دیا تھا اور رے اس کھیل کا پرانا کھلاڑی تھا۔ وہ اپنی طرف آنے والی ہر بال کو میرٹ پر کھیلنا بخوبی جانتا تھا۔

نینا ہولٹ اس کے چیمبر میں داخل ہوئی تو وہ سیدھا ہو

کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے جب رے کی سیکریٹری کیٹ نے شارلٹ گومے کی کال ٹرانسفر کی تھی تو نینا اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ اس کے غیاب میں شارلٹ کے علاوہ شیرف سے بھی رے کی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ نینا چونکہ رے کے ہر معاملے میں شامل رہتی تھی اور وہ نینا کی رائے کو اہمیت بھی دیتا تھا لہٰذا اس نے نینا کو شارلٹ اور آدریا سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کردیا۔

"ویسے شیرف اپنی جگہ بالکل ٹھیک سوچ رہی ہے۔" پوری بات سننے کے بعد نینا نے معتدل انداز میں کہا۔ "کرائم سین کے حوالے سے ڈیل کرنے کے لیے ہماری کاؤنٹی کی ٹیسٹ لیبارٹری ایک دم بیکار اور ناقابلِ بھروسا ہے۔ پولیس کے جوان اور فرانزک والے جو شواہد اکٹھا بھی کرتے ہیں، ان سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے جس کی وجہ سے ہر معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔ ان تمام مسائل کے حل کے لیے جن فنڈز کی ضرورت ہے، وہ کہاں سے آئیں گے، اس بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ اس سے ایک ہی سیکھ ملتی ہے کہ ہم سب کو اپنی مدد آپ کے تحت مل جل کر کام کرنا چاہیے۔"

"تمہاری سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ نینا کہ تم کسی بھی قسم کی صورتِ حال میں بڑا سودمند اور دانشمندانہ مشورہ دیتی ہو۔" رے نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کھیل اب فائنل لیول میں داخل ہوچکا ہے اور تم مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کررہی ہو کہ ہم سب کو مل جل کر، کاؤنٹی کے سنگین مسائل کو حل کرنا ہوگا...... ہیں نا؟"

"بالکل!" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ "اتفاق میں بڑی برکت ہے سر...... آپ پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ اس کھیل کو کھیلتے ہوئے یہاں تک لائے ہیں۔ بس اب ونگ اسٹروک کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے، آپ نے اپنی ترجیحات کے بارے میں سوچ لیا ہوگا؟"

"یہ کام تو سب سے پہلے کرنے کا ہوتا ہے نینا!" رے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "عمارت چھوٹی ہو یا بڑی، اسے کھڑا کرنے کے لیے ایک بنیاد کی ضرورت تو بہرحال لازمی پیش آتی ہے...... ہیں نا؟"

"ہاں، بالکل سر!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی اور آپ نے تو شیرف اور گینڈے ٹامی کی نفسیات سے کھیلتے ہوئے، اپنے مزاحمتی رویے سے اتنی بلند عمارت کھڑی کردی ہے کہ یہ کیس اور ہماری کاؤنٹی کی ٹیسٹ لیبارٹری کے تمام مسائل حل کردے گا اور کسی کو یہ شک بھی نہیں ہوگا کہ اس "ڈیل" کے لیے آپ کا ذہن پہلے سے بنا ہوا تھا۔"

"میں نے تو ہمیشہ تمہارے مشورے پر عمل کیا ہے نینا!" رے زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہارے کہنے کے مطابق ٹامی کو میرے مستقبل کی بہت فکر ہے۔ ایسے مخلص اور خیرخواہ لوگوں کے جذبات کی قدر کرنا چاہیے۔"

نینا کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سج گئی۔

"ویسے ٹامی کا آئیڈیا مجھے پسند آیا ہے۔" رے نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "اس طرح ہمارا کام نکل آنے کے ساتھ ساتھ اس کیس کے قانونی تقاضے بھی، کسی حد تک پورے ہوجائیں گے۔"

"آپ کس آئیڈیا کی بات کررہے ہیں سر؟"

"ٹامی نے ساتھ مل کر کام کرنے کے حوالے سے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے کلائنٹ کو یہ پٹی پڑھا دے گا کہ وہ عدالت میں بے احتیاطی سے گن صاف کرنے والی اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے بعد جج سے معافی کی درخواست کرے اور عدالت سے وعدہ کرے کہ وہ آئندہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ اس صورت میں عدالت شین کو ہفتے بھر کے لیے کسی سٹی ٹوریم بھیجنے کی سزا پر اکتفا کرلے گی۔" وہ سانس درست کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"شین کی بے وفا بیوی ایلس کی موت کو تو شیرف نے ویسے بھی سیریل کلر کے کھاتے میں ڈالنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"کیا شین ہفتہ، دس دن کے لیے سٹی ٹوریم جانے پر راضی ہوجائے گا سر؟" نینا نے ایک اہم سوال اٹھایا۔ "وہ ایک معروف بزنس مین ہے۔"

"شین، ٹامی کا کلائنٹ ہے۔ اسے تیار کرنا میری نہیں، ٹامی کی ذمے داری ہے نینا!" رے نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "ویسے بھی شین کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ اپنے بزنس اور اپنی دولت سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ دو افراد کے قتل کے جرم میں ساری زندگی جیل میں سڑنے کے مقابلے میں ہفتے بھر کی سٹی ٹوریم والی سزا کو قبول کرلینا اس کے لیے گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا۔"

نینا حیرت اور دلچسپی بھری نظر سے رے کو دیکھتی چلی گئی۔ ان لمحات میں وہ سوچ رہی تھی کہ ڈیفنس اٹارنی ٹامی فرڈیننڈ کا شیطانی دماغ رے برین کی شاطرانہ چالوں کے سامنے کچھ نہیں بیچتا......!

◆◆◆



اُمید کا مینار

یعقوب بھٹی

یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ جسم کے اندر جو لاتعداد سرکٹ ہیں... اُن میں کس طرح کے تاثرات اور محبت و نفرت کی کتنی لہریں دوڑتی پھرتی ہیں... زندگی میں ہر شخص کی اپنی اپنی دلچسپیاں ہوتی ہیں... بعض ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کے سلسلے میں صرف دوستوں سے بات کی جا سکتی ہے... دیارِ غیر میں ہزاروں لوگوں کی موجودگی کے باوجود وہ خود کو تنہا محسوس کررہا تھا... اور دور کہیں کوئی اس کی تنہائی کو محسوس کررہا تھا... دوست کی صورت اچانک مل جانے والی خوشی اس کے لیے اُمید کا مینار تھی... جذبات و محبت میں گندھی ایک دل گداز کہانی...

امید، ہمت، محبت اور پھر بدنصیبی کی اندھیری رات کا مسافر......

وہ فرینکفرٹ کی ایک ٹھٹھری ہوئی دوپہر تھی۔ پرانے سے اوورکوٹ میں لپٹا میر تاج یونیورسٹی کی ایک سنگی بینچ پر بیٹھا سورج کی کہر میں لپٹی کرنوں سے حرارت کشید کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس دوران وہ اپنی سوچوں میں اِس قدر غلطاں تھا کہ اس لڑکی کو نہ دیکھ سکا جو اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی تھی پھر ایک مترنم آواز نے اسے چونکایا۔

''تم ضرورت سے زیادہ پریشان لگ رہے ہو...... کیا تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہوگیا ہے؟''

میر تاج نے چونک کر سر اٹھایا۔ اسی کے مانند گھسے پٹے اوور کوٹ، پرانے جوتوں اور قدرے نئی فر کی گرم ٹوپی میں خود کو سردی سے بچانے کی کوشش کرتی وہ ایک دبلی پتلی اور سلونی سی لڑکی تھی جس کی ناک کی پھنگی سردی کی شدت سے سرخ ہو رہی تھی۔ وہ انگریزی میں مخاطب ہوئی تھی مگر لہجہ دیسی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے میر تاج پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

میر تاج بولا۔ ''تمہاری فکر مندی کے لیے شکریہ!میں ٹھیک ہوں۔''

لڑکی واضح طور پر چونکی۔ ''تم یورپین نہیں ہو؟''

میر تاج نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ اسے جرمنی آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے مگر بھوری آنکھوں اور بالوں کے ساتھ اس کا رنگ بھی سرخی مائل سپید تھا جس کے باعث زیادہ تر لوگ اسے یورپین سمجھ بیٹھتے تھے۔

''نہیں میں پاکستان سے ہوں۔''

لڑکی کے چہرے پر خوشی چمکی۔ ''پھر تو ہم ہمسائے ہوئے...... میں انڈیا سے ہوں...... سائرہ بانو...... پرانی دہلی کی باسی ہوں۔'' ساتھ ہی اس نے اوور کوٹ کی جیب سے دستانہ پوش ہاتھ نکال کر بڑی گرم جوشی سے مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

میر تاج کے ہاتھ بھی کوٹ کی جیبوں میں تھے۔ اس نے بھی ہاتھ نکال کر اس کا دستانہ پوش ہاتھ تھام لیا۔ ''میں، میر تاج ہوں۔''

سائرہ نے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے زیرِ لب اس کا نام دہرایا، پھر بولی۔ ''خوب صورت اور منفرد نام ہے۔'' ساتھ ہی اس کی توجہ میر تاج کے ہاتھ کی طرف ہوئی، اس نے قدرے حیرت سے کہا۔

''تم نے دستانے نہیں پہنے؟''

میر تاج نے اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ ''اتنی سردی بھی نہیں ہے۔ میں دستانوں کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔'' ساتھ ہی اس نے غیر ارادی طور پر نظریں چرالیں۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ حیرت سے چیخی۔ ''اس وقت کھلے میں شاید تم واحد فرد ہو جو بغیر دستانوں کے ہے۔'' اجنبیت کا اثر زائل ہوتے ہی وہ اردو بولنے لگ گئی تھی۔

میر تاج کندھے اچکا کر خاموش رہا۔ سائرہ کی چمک دار آنکھیں اسے ٹٹولنے لگیں۔ جھکا ہوا سر اور خستہ حالی...... بہت سی باتوں کی چغلی کھا رہی تھی۔

سائرہ نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''صاف گوئی کی معافی چاہتی ہوں مگر تم، مجھے مالی پریشانی کا شکار لگ رہے ہو اور یہ پریشانی تمہارے چہرے سے اس قدر عیاں ہے کہ میں بے اختیار رک گئی تھی۔ خیر یہ ہمارے جیسے ملکوں سے آنے والے طالب علموں کا عام مسئلہ ہے۔ تم اسکالرشپ پر ہی آئے ہونا؟''

میر تاج نے اثبات میں سر ہلایا۔ ساتھ ہی اس نے غیر ارادی طور پر تسلیم کرلیا تھا کہ سائرہ کا اس سے متعلق تجزیہ درست تھا۔ سائرہ اچانک ہی تیزی میں نظر آئی۔ اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔ ٹھیک پچاس منٹ بعد کلاک ٹاور کے نیچے والے کیفے ٹیریا کے باہر ملو، تمہاری مدد کرنے کے لیے ایک زبردست ایپ ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ یہ جا وہ جا۔

میر تاج، اسٹوڈنٹس کے درمیان اسے اوجھل ہوتا دیکھتا رہا۔ ساتھ ہی کچھ ڈھارس بندھی تھی۔ اس نے یونیورسٹی میں ہر طرف سے نظر آنے والے کلاک ٹاور کی طرف دیکھا۔ اس کا اوپری حصہ ہلکی دھند میں لپٹا تھا۔ یونیورسٹی میں کلاک ٹاور کو ''امید کا مینار'' کہا جاتا تھا۔ اس نے جیب ٹٹولی۔ کچھ ریزگاری اور ایک مڑا تڑا نوٹ پڑا تھا...... جس سے سائرہ کو کافی پلائی جا سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر پختہ روش پر ہولیا۔ مقررہ وقت پر وہ کیفے ٹیریا کے سامنے کھڑا ہنستے، کھِلتے جوڑوں اور اسٹوڈنٹس کے گروپس کو کیفے ٹیریا آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی تعلیم پاکستان کی یونیورسٹیوں سے مکمل کی تھی اور اب پی، ایچ، ڈی کے لیے جرمنی کے تعلیمی پروگرام کی ایک سہولت کے سبب یہاں پر تھا۔ سائرہ مقرر وقت پر آپہنچی۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ میر تاج کو اپنا منتظر دیکھ کر اس کے گداز ہونٹوں پر بے نام سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اس کے قریب آکر وہ بولی۔

''تمہیں وقت کا پابند دیکھ کر اچھا لگا۔''

تھوڑی دیر بعد وہ پُرہجوم کیفے ٹیریا کی ایک تختہ نما میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے کافی کے بھاپ اڑاتے مگ رکھے تھے۔ اندر کے معتدل ماحول کے سبب سائرہ نے اپنی ٹوپی اتار کر میز پر ڈال دی۔ میر تاج لمحے بھر کے لیے مبہوت رہ گیا۔ فر کی وہ ٹوپی ایک سیاہ اور بے حد چمکیلے آبشار کو مقید کیے ہوئے تھی۔ سائرہ نے بے پروائی سے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''رہائش تو لازمی بات ہے...... تمہاری ہوسٹل میں ہی

ہوگی...... مسئلہ فیس اور روزمرہ کے اخراجات کا درپیش ہوگا۔ جس کے لیے تمہیں پارٹ ٹائم کام کرنے کی ضرورت ہو گی۔"

میر تاج نے آبشار سے نگاہیں چرائیں۔ آس پاس موجود مرد و زن کی پُرستائش نظریں اس آبشار پر تھیں۔ وہ، اس لڑکی کی تیز رفتاری پر حیران ہوا۔ جس نے لمحے بھر میں اس کا سارا مسئلہ کھول کر رکھ دیا تھا۔ شاید یہ غریب ممالک سے آنے والے طالب علموں کا عمومی مسئلہ تھا۔

میر تاج نے کافی کا مگ اٹھایا "بالکل یہی صورتِ حال ہے" ساتھ ہی وہ متذبذب ہوا۔ "تم کسی ایپ کا ذکر کر رہی تھیں۔"

سائرہ نے بھی مگ اٹھایا اور ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے اوورکوٹ کی جیب سے اسمارٹ فون نکالتے ہوئے بولی۔ "بالکل کہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ کافی کا مگ ختم ہونے سے پہلے تمہارے لیے پارٹ ٹائم نوکری کا انتظام ہو چکا ہو گا۔" اس کا انداز بے حد پُراعتماد تھا، ساتھ ہی اس کا انگوٹھا فون کی اسکرین پر متحرک ہو گیا۔

بے چینی سے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کی نگاہیں بے اختیار سیاہ آبشار پر جا رکی تھیں جو اس کے جھکے ہوئے سر سے ہوتا ہوا اس کی گود میں گر رہا تھا۔ اچانک ہی سائرہ نے سر اٹھایا تو آنکھوں کی چوری کے سبب میر تاج گڑبڑا گیا اور آنکھیں چرالیں۔

سائرہ کی آنکھوں میں شوخی آمیز شرارت چمکی۔ "کیا دیکھ رہے تھے؟"

"مگ...... کچھ نہیں۔" وہ باقاعدہ بوکھلا گیا۔

وہ ہنسی۔ "ہائے...... ہمارے مشرقی مرد! تم جو کچھ دیکھ رہے تھے...... وہ، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی دیکھ سکتے ہو۔" اس کے پُراعتماد اور بولڈ انداز نے میر تاج کے ہاتھ، پاؤں پُھلا دیے۔ سائرہ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں سے لطف اندوز ہونے لگی۔

میر تاج نے اعتماد بحال کرتے ہوئے کہا۔ "میری غیر ارادی سی نگاہ تم پر تھی...... تمہیں بُرا لگا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔"

سائرہ کی توجہ دوبارہ فون کی طرف ہو گئی۔ ابھی ابھی ایک نوٹیفکیشن آیا تھا۔ وہ مصروف سے انداز میں بولی۔ "معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ ایک بار روم میں صفائی کا کام ہے کرلو گے؟ ڈیوٹی کے اوقات سخت ہیں۔" اس نے تفصیلات پر نظر ڈالتے ہوئے مزید کہا۔ "رات نو بجے سے نصف رات تک...... جب بار روم بند ہوگا۔ کام سخت ہے مگر معقول آمدنی ہو جائے گی...... فی گھنٹے کے حساب سے۔"

میر تاج کا دماغ متحرک ہوا۔ لحظے سے بھی کم وقت میں اس نے اپنے پڑھائی کے شیڈول پر نظر ڈالی۔ وقت نکالا جا سکتا تھا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ وہ اس آمدنی سے کچھ پس انداز کر کے ماں اور چھوٹی بہن کو بھی بھیج سکتا تھا جو اس کی آس پر بیٹھی تھیں۔

ماں اور بہن کا خیال آیا تو سینے کی گہرائیوں سے ایک ٹھنڈی سانس آزاد ہو گئی۔ سائرہ نے فوراً اس ٹھنڈی سانس کو نوٹس کیا۔

"کیا ہوا؟ کون یاد آ گیا؟"

میر تاج نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی نہیں، بار روم والی نوکری کے لیے میں رضامند ہوں۔"

سائرہ نے جیسے اس کی سنی ہی نہیں۔ اس نے فون میز پر ڈال دیا۔ "تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا...... میں چہرہ پڑھ لیتی ہوں۔"

"نہیں۔"

"تو پھر فوراً اس ٹھنڈے سانس اور چہرے پر اترنے والی افسردگی کی وجہ بیان کرو۔"

میر تاج نے خود کو کمزور پڑتا محسوس کیا۔ وہ ایک حاوی ہو جانے والی غیر معمولی لڑکی تھی مگر اس دیارِ غیر میں اس کے لیے امید کی کرن بلکہ "امید کا مینار" بن کر سامنے آئی تھی۔ اس کے مخلص اور ہمدرد ہونے میں ذرا بھی شک نہیں تھا...... اس کے ساتھ درد شیئر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔

"ماں اور بہن یاد آ گئی تھیں۔ ان کی ذمے داری بھی مجھ پر ہے۔ تمہاری مہربانی سے بار روم والی نوکری مل گئی تو...... انہیں بھی ماہانہ کی بنیاد......" آواز رندھنے لگی تو میر تاج خاموش ہو گیا۔ اس لمحے اسے محسوس ہوا کہ جیسے سائرہ کی آنکھوں میں پانی سا چمکا ہے مگر اس نے تیزی سے فون اٹھایا اور سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ آبشار میں مقید ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو وہ بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔

"بار روم والی نوکری کنفرم ہو گئی ہے۔" اس نے اوورکوٹ کی جیب سے پوائنٹر اور ایک نوٹ بک نکالی اور اس پر تیزی سے کچھ لکھتے ہوئے مزید کہا۔ "میری نیک خواہشات تمہارے اور تمہاری فیملی کے ساتھ ہیں۔" اس نے کاغذ پھاڑ

کر میر تاج کی طرف بڑھایا۔ ”بہتر ہے آج ہی سے جوائن کر لو!“ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوبارہ جیبیں ٹٹول کر اس نے کچھ ریزگاری نکالی تو میر تاج، اس کا ارادہ بھانپ گیا۔

”رہنے دو! کافی میری طرف سے تھی۔“

اس کا انداز اتنا قطعی تھا کہ سائرہ کے ہاتھ ساکت رہ گئے۔ ”یہ مناسب نہیں ہے...... تمہارے حالات......“

میر تاج نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اتنے بُرے بھی نہیں ہیں کہ اپنی محسن کو کافی بھی نہ پلاسکوں۔“

مسکراتے ہوئے اس نے ریزگاری واپس جیب میں ڈالی۔ ”میں چلتی ہوں اور میری ایک درخواست ہے کہ صبح ہی دستانے خرید لینا۔“

میر تاج نے اس کی شستہ تحریر پر نظر ڈالی۔ ”ٹھیک ہے مگر میں دوبارہ بھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے ترچھی نظروں سے میر تاج کو دیکھا۔

میر تاج قدرے مضبوط ہو چکا تھا۔ ”کیا اس میں کوئی قباحت ہے؟“ اس نے الٹا سوال کر دیا۔ ”کیا ہم دوست نہیں ہو سکتے؟“

”بالکل ہو سکتے ہیں۔“ اس نے بشاشت سے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مرمریں سادہ ہاتھ دستانے کی قید سے آزاد تھا۔ میر تاج نے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ تھاما مگر اگلا پل اس کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ وہ ہاتھ سرد تھا۔ کسی بھی قسم کی گرم جوشی و جذبات سے عاری۔ سائرہ نے جلدی سے ہاتھ کھینچا اور میز پر پڑے دستانے پہننے لگی۔

میر تاج نے جلدی سے کہا۔ ”کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟ ڈپارٹمنٹ تمہارا کون سا ہے؟“

”واللہ اتنی تیزی......“ ساتھ ہی وہ ہنسی۔ ”سب بتا دوں گی فی الحال مجھے جانا ہے۔“

وہ جاتے جاتے مڑی۔ ”ویسے ایک بات پوچھ لوں؟ سچ بتاؤ گے؟“ اس کا لہجہ لودینے لگا تھا۔

اس کے انداز نے میر تاج کو چونکایا مگر اسے اثبات میں سر ہلانا پڑا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سائرہ گھوم کر اس کے قریب آگئی۔ آبشار کو ٹوپی میں مقید کرتے ہوئے اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

”اس وقت کیا دیکھ رہے تھے؟“

حوصلے کی ایک لہر سی میر تاج کو بھگو گئی۔ ”تمہارے بال بے حد خوب صورت ہیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے میں مبہوت سا ہو گیا تھا۔“

سائرہ کے چہرے پر سرخی چمکی، اگلے ہی لمحے وہ واپسی کے لیے مڑ چکی تھی۔

میر تاج اسے دور تک نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

پڑھائی اور نوکری کے چکر میں میر تاج ایک لمحے کے لیے بھی سائرہ کو نہیں بھولا تھا۔ یونیورسٹی آتے، جاتے ہوئے اس کی نگاہیں چہرے ٹٹولتی تھیں مگر وہ نظر نہیں آئی تھی۔ چوتھے دن اس کا ایک پیریڈ اتفاق سے خالی تھا۔ وہ، سائرہ کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا...... یونیورسٹی بہت بڑی تھی اور وقت محدود...... اس نے بھرپور کوشش کی...... چند ایشیائی اسٹوڈنٹس سے بھی پوچھا مگر سبھی نے کندھے اچکا دیے۔

یونیورسٹی سے واپسی کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ میر تاج کی اچانک ہی نگاہ امید کے مینار پر پڑی۔ وہ غیر ارادی طور پر اس کی طرف چل دیا۔ مینار کے گرد ایک پتھریلا دائرہ تھا جو سنگ سرخ سے بنا تھا۔ اس پر طالب علم بیٹھے رہتے تھے۔ میر تاج بھی اس پر جا بیٹھا اور آتے جاتے چہرے دیکھنے لگا۔ ایک آس سی تھی کہ وہ یہیں ملے گی۔ اسے زیادہ دیر بیٹھے نہیں ہوئی تھی کہ اچانک ہی دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ وہ سامنے سے چلی آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا شاپر تھا جسے وہ لاابالی انداز میں جھلا رہی تھی۔ وہ اسی لباس میں ملبوس تھی جو پہلے دن پہنے سامنے آئی تھی۔

میر تاج اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ قریب آکر شوخ انداز میں بولی۔ ”میں اس سے زیادہ خفا ہوں، جتنے تم نظر آرہے ہو۔“

”میرے خفا ہونے کی بڑی معقول وجہ ہے۔“

”میری وجہ اس سے بھی زیادہ معقول ہے۔“ سائرہ نے ہاتھ میں تھاما شاپر اس کے سینے پر دے مارا۔ ”مجھے یقین تھا تم نے دستانے نہیں خریدے ہوں گے۔“

ننگے ہاتھوں سے شاپر تھامتے ہوئے میر تاج کی ساری خفگی ڈھل گئی۔ ”سوری!“

”سوری کے بچے! تمہاری یہی سزا ہے کہ میں اپنے بارے میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ واپسی کے لیے مڑی۔

میر تاج جلدی سے گھوم کر اس کے سامنے آگیا اور اپنے کان پکڑ لیے۔ ”معافی کی مؤدبانہ گزارش ہے۔“

سائرہ نے شاہانہ انداز میں ناک چڑھائی۔ ”ایک

شرط پر۔“

”غلام کو بنا سنے ساری شرطیں منظور ہیں۔“

”نہیں، غلام ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دینے کا عادی ہے۔“

”یہ بات ہے تو پھر ارشاد فرمایا جائے۔“ میر تاج نے ایک کان میں انگلی ٹھونسی تو وہ بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

”تم، مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

میر تاج نے فوراً کان سے انگلی نکال لی۔ ”تم صحیح تھیں...... میں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دینے کا عادی ہوں۔“

سائرہ کا چہرہ سنجیدگی اوڑھ گیا۔ ”سمجھنے کی کوشش کرو، میری چھوٹی بہن اور منگیتر صاحب بھی میرے ساتھ ہی یونیورسٹی میں ہوتے ہیں۔ ان کی سوالیہ نظروں کا سامنا کرنا مجھے مناسب نہیں لگتا اور...... اور منگیتر صاحب سے میں پیار بھی کرتی ہوں۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی میر تاج نے افسردگی کو سردی کے ساتھ جسم میں سرایت کرتے محسوس کیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”منگیتر صاحب سے میں، تمہیں چھین تو نہیں رہا...... ہم صرف دوست ہیں۔“

سائرہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو میر تاج نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”لیکن میں مشرقی ہونے کے ناتے تمہاری فیلنگز سمجھ رہا ہوں۔ مجھے شرط منظور ہے مگر ملاقات کا کوئی طریقہ تو ہونا چاہیے۔ تم، میری اکلوتی دوست ہو اور ساری زندگی میں، میں نے چند ہی دوست بنائے ہیں۔“

سائرہ نے فوراً دلچسپی لی۔ ”تم فطرتاً بھی عبداللہ سے ملتے ہو...... اس کا بھی ابھی تک میں ایک ہی دوست دریافت کر پائی ہوں۔“

میر تاج نے پوچھا۔ ”یہ کون ذات شریف ہیں؟“

وہ ہنسی۔ ”منگیتر صاحب!“

”دھت تیرے کی...... ہم میں اور کیا مشترک ہے؟“

سائرہ سرخ پڑ گئی۔ ”اسے بھی میرے بال مبہوت کر دیتے تھے۔“

میر تاج کی نگاہ فر کی ٹوپی میں مقید آبشار کی طرف اٹھی۔ دل میں ہوک سی اٹھی اور وہیں کہیں دفن ہو گئی۔ وہ مصنوعی بشاشت سے بولا۔ ”میں نے ملاقات کی کوئی راہ نکالنے کی بات کی تھی، یہ منگیتر صاحب پھر درمیان میں کود پڑے۔“

سائرہ کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔ اس نے تیزی سے رخ موڑا۔ ”ہماری ملاقات یہیں ہوا کرے گی۔“

”یہ کیا بات ہوئی...... میں یہاں بیٹھا رہوں اور جناب صاحب، منگیتر کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہیں۔“

منہ پھیرے پھیرے سائرہ نے کہا۔ ”آزما لینا...... جب تک تم مضبوط نہیں ہو جاتے...... یونیورسٹی کے اوقات میں یہاں بیٹھ کر جب بھی مجھے یاد کرو گے، میں ملنے کے لیے آجاؤں گی۔“

میر تاج نے مصنوعی ٹھنڈی سانس لی۔ ”تم ٹال رہی ہو...... خیر آزما لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ سنگ سرخ کے تین فٹ اونچے دائرے پر جا بیٹھا۔

”ویک اینڈ کے لیے دماغ میں ایک پروگرام تھا۔ اسے لے کر میں بیٹھا تمہیں یاد کر رہا ہوں۔“

سائرہ نے دوبارہ اس کی طرف رخ کیا۔ وہ بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔ اس کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے وہ اٹھلائی۔ ”تم نے یاد کیا...... میں آ گئی...... لیکن کچھ بولنے سے پہلے دستانے پہن لو۔“

میر تاج کی توجہ سینے سے لگے شاپر کی طرف ہوئی۔ ”اوہ...... انہیں تو میں بھول گیا تھا۔“ اس نے جلدی سے شاپر کھولا۔ نفیس سی پیکنگ میں گہرے براؤن رنگ کے دستانے تھے۔ اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نے بالکل ایسے ہی دستانے خریدنے کے لیے منتخب کر رکھے تھے۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ سائرہ کی چمک دار آنکھیں اسی پر تھیں۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”پسند نہیں آئے کیا؟“

میر تاج نے دستانے ہاتھوں پر چڑھائے۔ وہ بالکل اسی کے ناپ کے تھے۔ ”میں حیران ہو رہا ہوں کہ تم چہرے تو پڑھ لیتی ہو مگر پسند سے کیسے واقف ہو جاتی ہو...... میں نے بالکل ایسے ہی دستانے منتخب کر رکھے تھے۔ ان کے لیے تمہارا شکریہ ادا کروں گا۔“

سائرہ بے طرح خوش ہو گئی۔ اسے خوش دیکھ کر میر تاج جو وزن محسوس کر رہا تھا، اسے دبا لیا۔ وہ ادائیگی کرنے کی بات کرتا تو وہ ضرور ناراض ہو جاتی۔ ویک اینڈ کو وہ، اس کے لیے کچھ خرید سکتا تھا۔ اس کی نظریں سائرہ کے خستہ حال اوور کوٹ پر تھیں مگر جیب ابھی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

سائرہ بولی۔ ”شکریے کو رہنے دو، تم ویک اینڈ کا کوئی پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔“

میر تاج سنجیدہ رہا۔ ''تمہارے ساتھ یونیورسٹی سے باہر جانے کا پروگرام تھا مگر اب سوچ رہا ہوں شاید یہ مناسب نہیں ہے۔''

''کیوں......؟اس میں نامناسب کیا گھس آیا ہے؟''

''بہن...... منگیتر صاحب اور سوالیہ نگاہیں۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر دن کے اوقات میں ہم جا سکتے ہیں۔ ویک اینڈ کو صبح سے ہی برف باری کی پیش گوئی ہے۔ مقامی افراد کے لیے یہ شاید بری خبر ہو مگر مجھے برف باری میں فرینکفرٹ کے فٹ پاتھ ناپنا پسند ہے۔ میں تو جاؤں گی...... تم نے چلنا ہے تو ٹھیک 11:am ملنا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ تیز قدموں سے واپسی کے لیے مڑ گئی اور میر تاج حسبِ سابق اسے نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ اوجھل ہوئی تو اس کی نگاہیں دستانوں پر جا ٹکیں۔ اس نے دل کو ٹٹولا...... دل خوشی سے عاری تھا۔ ایک کسک سی تھی جو بے حد دھیمے دل کو چل رہی تھی۔

☆☆☆

محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی کے عین مطابق صبح سے ہی برف باری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میر تاج نے کام سے واپسی کے بعد الارم لگایا ہوا تھا۔ مقررہ وقت پر وہ تیار ہو کر امید کے مینار کے پاس پہنچ گیا۔ آسمان سے برف روئی کے گالوں کے مانند نیچے گر رہی تھی۔ ویک اینڈ کے سبب یونیورسٹی ویران سی تھی مگر درجنوں ہاسٹلز ملحقہ ہی تھے۔ اسی سبب طالب علم خال خال نظر آ رہے تھے۔ میر تاج کو یہ موسم اچھا لگا۔ ہوا رکی ہوئی تھی اسی سبب سردی کا احساس قدرے کم تھا۔ وہ بھی پہاڑوں کا باسی تھا مگر برف باری سے کبھی پالا نہیں پڑا تھا مگر اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ ہوا کی سرد کاٹ ہی سردی کے احساس کو بڑھاتی ہے۔ فی الحال اسے یہ روئی کے گالے جیسی برف اچھی لگ رہی تھی۔

اُمید کے مینار کے پاس ابھی اس نے ٹوپی سے برف جھاڑی ہی تھی کہ وہ بغل میں چھاتا دبائے آتی نظر آئی۔ حسبِ معمول وہ پہلے والے لباس میں تھی۔ وہ قریب آئی تو میر تاج نے کہا۔

''کیا تمہارے پاس صرف یہی لباس ہے؟''

''نہیں، میں باہر آنے، جانے کے لیے عموماً یہی لباس استعمال کرتی ہوں۔'' ساتھ ہی اس نے آنکھیں گھمائیں۔

''ویسے کیا برائی ہے اس لباس میں؟''

''برائی تو کوئی نہیں مگر ایک ہی لباس میں دیکھ کر عجیب سا لگتا ہے۔''

''لگتا ہے بڑی جلدی اکتانے لگے ہو۔''

''اتنے اچھے موسم میں موڈ خراب نہ کرو، آؤ چلتے ہیں۔''

''ہائیں...... اچھا موسم......''

''بالکل...... مقامی لوگ شاید مسلسل برف باری دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہوں مگر مجھے تو یہ دھند میں ڈوبے مناظر اور روئی کے گالوں جیسی برف اچھی لگ رہی ہے۔ چہل قدمی کا مزہ آئے گا۔''

وہ کھل اٹھی۔ ''تو پھر آؤ۔''

وہ یونیورسٹی سے باہر آئے اور میٹرو بس میں بیٹھ کر شہر کے ایک معروف سیاحتی پوائنٹ ویسٹ ہارب پر اتر گئے۔ یہاں تھیٹر، سرکس، سینما ہالز، شاپنگ مالز اور سیاحوں کے لیے بہت کچھ تھا۔ ویسٹ ہارب پر خوب رونق تھی۔ منچلوں نے رونق میلا لگایا ہوا تھا۔ ان میں اکثریت سیاحوں کی تھی۔

میوزک کی تیز آواز نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا لی۔ نوجوان لڑکے، لڑکیوں کا ایک معروف یوٹیوبر گروپ تھا جو چارج ایبل جدید ترین اسپیکر لگائے ایک قدیمی فوارے کے سامنے محفل سجائے تھا۔ گروپ میوزک پر تھرک رہا تھا اور منچلے تالیاں پیٹ کر اور کچھ ناچ کر ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس ہنگامے سے کچھ دور وہ ایک عمارت کی سیڑھیوں پر چڑھے تو منظر نمایاں ہو گیا۔ سائرہ چند لمحے محویت سے اس گروپ کو دیکھتی رہی پھر میر تاج سے مخاطب ہوئی۔

''میوزک اور ناچ میں تمہاری دلچسپی ہے؟''

''پسندیدہ میوزک سنتا ہوں مگر ناچ مجھے پسند نہیں رہا اور فاسٹ میوزک کے بارے میں تو پوچھو ہی نا۔''

سائرہ خاموش رہی تو میر تاج نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اور تمہیں؟''

''تمہاری ہی ہم مزاج ہوں۔''

''تو پھر چلیں۔''

وہ سیڑھیاں اتر کر فٹ پاتھ پر ہو لیے۔ میر تاج نے پوچھا۔ ''تمہیں کیا سننا پسند ہے؟''

''مجھے ستر سے بیاسی کے دور کا فلمی میوزک اور گیت پسند ہیں۔ اس میں تمہاری فلمی صنعت بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ راجستھانی لوک گیت بھی پسند ہیں۔''

''کمال ہے...... اس کے بعد کا کچھ پسند ہی نہیں آیا؟''

لحظے بھر کو سائرہ کھو سی گئی۔ ''شاید کچھ دھیان سے سنا

ہی نہیں۔"

برف سے ڈھکے فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے میر تاج نے اس کی طرف دیکھا۔ "کبھی کبھی تم بڑی پُراسراری لگتی ہو۔"

ہنستے ہوئے اس نے اپنی ٹوپی سے برف جھاڑی۔ "اچھا...... وہ کیسے؟"

"بس، یہ محسوس کرنے کی بات ہے لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔"

وہ شرارت سے بولی۔ "کسی امتحانی پرچے میں سوال آ گیا تو......؟"

میر تاج نے لمحے بھر سوچا۔ "پھر تمہاری تصویر بنا دوں گا۔"

وہ ہنستے ہوئے دہری ہو گئی۔ "میرا پہلا اندازہ بالکل درست تھا۔"

میر تاج بے اختیار پوچھ بیٹھا۔ "کون سا؟"

"یہی کہ بڑے گھنے ہو...... دیکھ لو...... لفظوں کے طوطا، مینا کیسے بنا رہے ہو۔"

اسے مسلسل دیکھنے سے دل کی کسک سوا ہونے لگی تھی۔ میر تاج نے اس پر سے نظریں ہٹائیں۔ "میں بالکل ایسا نہیں ہوں...... تمہارا یہ اندازہ غلط ہے...... صرف تھوڑا مزاج شاعرانہ ہے۔"

"اوہو...... تو شاعرانہ مزاج والے صاحب سے ایک شعر کی گزارش ہے۔"

میر تاج نے دوبارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے شعر پڑھا۔

میں، تیری نہ نہ کو کیا سمجھوں!
دو نفی مل کر تو مثبت ہوتے ہیں!

"واہ......" اس نے بے اختیار سر دھنا۔ "بہت خوب صورت شعر ہے، مجھے اچھا لگا۔"

میر تاج نے اس کی آنکھوں میں جھانکا مگر وہاں اسے اپنے لیے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ مایوس ہو کر اس نے کہا۔ "شدید سردی میں ہم لوگ چکن سوپ وغیرہ پیتے ہیں...... یہاں اس سے ملتا جلتا کچھ مل سکتا ہے؟"

سائرہ کی آنکھیں چمکیں۔ "یہاں معروف جالندھر اسٹریٹ ہے۔ وہاں چلتے ہیں۔ امید ہے تمہیں چکن سوپ بھی مل جائے گا۔"

"یہ تو اچھی سنائی تم نے...... چکن سوپ نہ سہی...... میں دودھ، جلیبی سے بھی کام چلا لوں گا۔"

"تو پھر چلو۔"

سائرہ کی رہنمائی میں وہ ایک خوب صورت سی پتھریلی گلی میں داخل ہوئے جو بل کھاتے ہوئے دھیرے دھیرے سے بلند ہو رہی تھی۔ یہاں ایک جیسے دو منزلہ خوب صورت چھوٹے چھوٹے رہائشی گھر تھے جن کی مخروطی چھتوں پر برف گرتی تھی...... اٹکتی تھی اور پھر سفید چادر کے مانند نیچے گر جاتی تھی۔ بالکونیاں رنگ برنگے گملوں سے سجی تھیں جنھوں نے برف اوڑھ لی تھی مگر اندر سے رنگ جھلک رہے تھے۔

سائرہ ان مناظر میں کھو سی گئی۔ میر تاج نے اس کی محویت محسوس کرتے ہوئے قدم سست کر لیے...... پھر جب اس نے ایک ٹھنڈا سا سانس لیا تو وہ پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔

"اس افسردہ اور ٹھنڈے سانس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" یہ تقریباً وہی الفاظ تھے جو کبھی سائرہ نے ادا کیے تھے۔

سائرہ کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں کھنچے مگر چہرے کی اُداسی سوا ہو گئی۔ "نہیں......" اپنے انداز پر وہ زبردستی ہنسی تو میر تاج نے بگڑ کر کہا۔

"یہ کھلا تضاد اور بے ایمانی ہے...... تمہیں یاد ہو گا میں ایسے ہی ٹھنڈے سانس کی وجہ بتا چکا ہوں اور اب تم سے بھی پوچھ کر رہوں گا۔"

سائرہ نے اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی اور پھر پاؤں سے برف اڑاتے ہوئے بولی۔ "کبھی میری اس گلی میں گھر بسانے کی خواہش تھی۔"

"تو اس خواہش کو اب کیا ہو گیا ہے...... یہ کوئی بہت بڑا خواب یا خواہش تو نہیں ہے۔"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ "نہیں...... اب بہت سی چیزوں کے مانند اس خواہش کو بھی جالے لگ گئے ہیں۔"

میر تاج رک گیا۔

سائرہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"تمہیں معلوم ہے...... میں ڈرنے لگا ہوں تم سے۔"

وہ الجھ گئی۔ "کیوں؟"

"مجھے لگتا ہے کہ میں نے کھوجنے کی کوشش کی تو تمہیں کھو دوں گا...... اس لیے خواہشات کو جالے لگنے والی بات کی خود ہی وضاحت کر دو۔"

سائرہ نے قدم بڑھائے۔ "تمہارا خوف بالکل بجا ہے۔" اس کا انداز اتنا قطعی تھا کہ میر تاج واقعی ڈر گیا۔ ساتھ ہی انا آڑے آ گئی۔ وہ اپنی جگہ ٹھہرا منتظر رہا کہ سائرہ رکے گی مگر وہ مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں اتنا لرزنے لگی۔ وہ دھند لکے کا حصہ بنتی جارہی تھی۔ میر تاج نے دوڑ کر اسے جالیا اور ہانپتے ہوئے کہا۔ ''منگیتر صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتی ہو؟''

''نہیں...... میں اسی کے بدلے تم سے لے رہی ہوں۔''

اس کا موڈ خوشگوار محسوس کرتے ہوئے میر تاج نے قدرے اطمینان محسوس کیا۔ وہ خوب صورت سی گلی شیطان کی آنت کے مانند طویل ہوتی جارہی تھی۔ میر تاج کو چند بالکونیوں پر سرگرمیاں محسوس ہوئیں۔ خشک لکڑیاں آتش دانوں میں سجائی جارہی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکی فوم کے گدے کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش میں ہلکان ہورہی تھی۔ وہ پوچھ بیٹھا۔

''یہ لوگ برف باری میں بالکونیوں میں کس چیز کی تیاریوں میں مصروف ہیں...... شاید بون فائر...... مگر یہ فوم کا گدا......'' وہ الجھ گیا۔

سائرہ کا چہرہ حیا سے سرخ ہوگیا مگر اگلے ہی لمحے اس کا بولڈ انداز حاوی ہوگیا۔ ''یہ برف باری کو انجوائے کرنے کا ان لوگوں کا طریقہ ہے...... بالکونیوں میں ابھی سے شب بسری کی تیاریاں ہورہی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے منہ پھیر لیا تھا۔

میر تاج نے باقی جانے بغیر سب سمجھ لیا۔ اس کے کان بھی سرخ ہونے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔ ''یہ جالندھر اسٹریٹ کہاں مرگئی؟''

سائرہ کے لیے بھی آسانی ہوگئی۔ ''بس، تھوڑی ہی دور رہ گئی ہے۔''

سائرہ کی رفاقت میں باقی کا وقت میر تاج کے لیے یادگار تھا۔ سونے کے اوقات میں وہ بستر پر لیٹتا تو ہمیشہ کے برعکس نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے تصور میں کبھی سائرہ کا سرخ چہرہ آجاتا اور کبھی ریشمی اندھیرے اور برف کے دھندلکے میں چھپی بالکونیاں...... اور کبھی دونوں گڈمڈ ہوجاتے تھے۔

اس کا روم میٹ نمیبیا کا ایک نوجوان تھا جس کے بڑے اور سیاہ چہرے پر نظر کا مختصر سا چشمہ عجیب لگتا تھا۔ اس کا نام تو خاصا طویل تھا مگر مختصراً ڈوسا کہلاتا تھا۔ ڈوسا اس وقت بھی ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ ملگجے اندھیرے میں ڈوسا کی بھاری آواز ابھری۔ ''خیریت ہے...... پہلی دفعہ یہ بے چین کروٹیں سُن رہا ہوں۔''

میر تاج نے کمبل میں منہ دیے جواب دیا۔ ''تم نہیں سمجھو گے۔''

ڈوسا کا قلم رک گیا۔ ''زبردست...... مجھے ہر وہ بات سمجھنے میں دلچسپی ہے جو میں ابھی تک نہیں سمجھ پایا۔''

اس فلسفی کی دلچسپی محسوس کرکے میر تاج کا سر پیٹنے کو دل چاہا مگر روم میٹ کی ناراضگی بھی مول نہیں لی جاسکتی تھی۔ اس نے کمبل میں سے منہ نکالا۔ ''تم نے کبھی پیار کیا ہے؟''

ملگجے اندھیرے میں ڈوسا کے سفید دانت چمکے اور لہجے میں مخصوص ملائمت آگئی۔ ''ہاں، سیکڑوں بار۔''

اس دفعہ میر تاج نے حقیقتاً اپنا سر پیٹ لیا۔ ڈوسا، حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ میر تاج نے کہا۔ ''میں بس یہی جاننا چاہتا تھا اور اب میں سونے لگا ہوں۔'' وہ کمبل میں اوجھل ہوگیا۔ اس دفعہ اسے ڈوسا کی ناراضگی کی بھی پروا نہیں تھی۔

ڈوسا نے کندھے اچکائے اور دوبارہ سے قلم سنبھال لیا۔

☆☆☆

دو دن بعد میر تاج کو ایک کتاب چاہیے تھی، کتاب کے لیے اس نے لائبریری کا رخ کیا۔ یہ دنیا کی خاموش ترین لائبریریوں میں سے ایک تھی۔ یہاں خاموشی سرگوشیاں کرتی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں صرف ربڑ سول کے جوتے پہن کر آنے کی اجازت تھی۔

میر تاج نے مطلوبہ کتاب لی اور پھر ایک میز کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک پر ٹک گیا۔ اس میز کے گرد پہلے سے ہی ایک پروفیسر اور دو طالب علم لڑکیاں مطالعے میں غرق تھے۔

میر تاج کتاب سے نوٹس لکھنے میں اتنا محو ہوگیا کہ اردگرد کو بھی بھلا بیٹھا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر لکھتا رہا تھا کہ گردن اکڑ گئی اور انگلیاں جیسے ٹوٹنے والی ہوگئی تھیں۔ اچانک اسے نگاہوں کی چبھن سی محسوس ہوئی۔ چھٹی حس نے بتایا کہ وہ کسی کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ اس نے سر اٹھایا۔ دونوں طالبہ اور پروفیسر جاچکے تھے۔ ٹیبل کے گرد وہ تنہا تھا۔ گردن مسلتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وسیع ہال میں وہ تنہا رہ گیا تھا۔ صرف کاؤنٹر پر بے حد بوڑھا لائبریرین ہی بیٹھا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو بوڑھا خلیقانہ انداز میں مسکرادیا۔ میر تاج نے سمجھا کہ شاید وقت ختم ہوگیا ہے اسی سبب لائبریرین اسے گھور رہا ہے۔ اس نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی مگر لائبریری کا ٹائم ختم ہونے میں خاصا وقت تھا۔ وہ تھکی

دباتے ہوئے دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جلدی جلدی اس نے اپنا کام ختم کیا اور پھر لائبریری سے نکل آیا۔ لائبریرین کی نگاہوں سے اسے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ نہ جانے اس کے چہرے پر وہ کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید وہ خبطی تھا۔ میر تاج نے سوچا کہ ابھی تک یونیورسٹی والوں نے اسے ریٹائرڈ کیوں نہیں کیا۔ اس کی عمر کسی صورت بھی اسی سال سے کم نہیں تھی۔

کام اور پڑھائی کے درمیان بوڑھا تو اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا مگر سائرہ جیسے ہر طرف موجود تھی۔ اس نے سنجیدگی سے دل کو ٹٹولا۔ کہیں اس سلونی اور دبنگ سی لڑکی سے پیار تو نہیں ہو گیا۔ یہاں دل بے ایمانی پر اتر آیا تھا۔ مسلسل انکار کر رہا تھا مگر انکار کرتے ہوئے ڈوب ڈوب بھی جاتا تھا۔

میر تاج نے اس کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کی اور خود کو سرزنش کی۔ وہ صرف دوست اور محسن تھی...... اور سب سے بڑھ کر اس کی منگنی ہو چکی تھی اور منگیتر کو وہ پسند بھی کرتی تھی۔

میر تاج نے افسردہ سے انداز میں ٹھنڈی سانس لی اور پھر تکیے کے گرد بازو ڈال کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران ایک اور پریشانی نے سر اٹھایا تھا۔ جس زیرِ زمین میٹرو اسٹیشن پر اتر کر وہ اپنے کام پر جاتا تھا، وہاں عجیب و غریب حلیوں والے نوجوانوں کا ایک گروپ موجود تھا۔ اس گروپ میں چند لڑکیاں بھی تھیں۔ بظاہر یہ کوئی میوزک گروپ قسم کی چیز تھا۔ ایک لڑکی نے میوزک کی لے پر تھرکتے ہوئے اپنا کاؤ بوائے ہیٹ الٹا کر کے میر تاج کے سامنے پھیلایا تو وہ چونکا تھا۔ لڑکی نے لکنت زدہ لہجے میں کہا تھا۔

”خوب صورت مرد! اس دلنشین میوزک اور رقص کے بدلے کچھ ادائیگی کرتے جاؤ!“ لڑکی واضح طور پر نشے میں تھی اور تھرکتے ہوئے خطرناک حد تک اس کے قریب آ گئی تھی۔ اس کی سانسوں کی ناگوار مہک نے میر تاج کی طبیعت مکدر کر دی۔ اس نے لڑکی کو نرمی سے دور ہٹایا تھا۔

”مجھے اس میوزک اور رقص سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

اس کے لہجے نے لڑکی کو چونکایا۔ اس نے میر تاج کی طرف انگلی اٹھائی۔ ”تم ایشیائی ہو؟“

میر تاج نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس کی ٹرین آ چکی تھی۔ وہ تیز قدموں سے ٹرین کی طرف بڑھ گیا۔ عقب سے اس نے لڑکی کی ننگی گالیاں سنیں...... یہ گالیاں نسلی منافرت سے بھری ہوئی تھیں۔

یہ سلسلہ یہاں نہیں رکا تھا۔ اس کے بعد دو دفعہ پھر اس گروپ سے واسطہ پڑا تھا۔ ان کی بکواس کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ جاتا تھا۔

اگلے دن کام پر جاتے ہوئے وہ دعا کر رہا تھا کہ اس منحوس گروپ کا سامنا نہ ہو۔ پولیس سے مدد کی درخواست بھی فضول تھی۔ یورپی پولیس محض زبانی بدکلامی پر حرکت میں نہیں آتی تھی۔

برقی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی طویل سانس نکل گئی...... وہ لوگ موجود تھے۔ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے میر تاج چونکا...... وہ منحوس آج جیسے اس کے منتظر تھے۔ اسے دیکھتے ہوئے ان لوگوں کے درمیان چہ میگوئیاں ہوئی تھیں پھر میر تاج کے دماغ میں خطرے کا الارم بجا۔ ایک لمبا اور بے حد ڈبلا پتلا لڑکا لہراتا ہوا اس کی طرف آیا۔ یقیناً ان شیطانوں نے کسی شرارت کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ میر تاج محتاط ہو گیا۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ لڑکا اچانک ہی میر تاج سے آٹکرایا۔ میر تاج پہلے سے محتاط تھا اس نے کوشش کی مگر مکمل طور سے کامیاب نہیں ہو سکا۔ لڑکے نے کندھا مارا تھا مگر میر تاج کو گرانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

بدبو کے ایک بھبکے نے میر تاج کا دماغ خراب کر دیا مگر اس کے ردِعمل سے پہلے لڑکے نے اسے دھکا دیا اور کھڑکھڑاتی آواز میں چلایا۔ ”اندھوں کی طرح چل رہے ہو...... یہ تمہارے باپ کا ملک ہے...... دفع ہو جاؤ ہمارے ملک سے۔“

میر تاج لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ ”دیکھ کر تمہیں چلنا چاہیے اور یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟“

جواب میں لڑکے نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ میر تاج کوئی چھوٹی موٹی قسم کی چیز نہیں تھا۔ کھلے ہاتھ پاؤں کا مضبوط نوجوان تھا۔ اس کے دماغ میں بھی انگارا سا دہک اٹھا۔ اس نے گریبان ایک جھٹکے سے چھڑوایا تو نوجوان نے اسے تھپڑ مار دیا...... انگارا پھٹ گیا۔ میر تاج نے زوردار ٹھوکر لڑکے کی ناف پر ماری تو وہ بلبلاتا ہوا دہرا ہو گیا۔ اس کا گروپ اسی لمحے کا منتظر تھا۔ وہ لوگ چیختے، چلاتے بھوکی چیلوں کے مانند اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس تقریباً ویران اسٹیشن کے ایک گوشے میں زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میر تاج مار کھاتا رہا...... اس کے ہاتھ زن و مرد جو بھی لگا...... اسے ضرور دھو ڈالا تھا اس نے...... لیکن اس کی مزاحمت دم توڑنے لگی۔ وہ

نصف درجن سے بھی زیادہ تھے۔ میرتاج نیچے گر گیا۔ منہ میں، اسے خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہو رہا تھا پھر کسی نے پولیس ہیلپ لائن پر کال کر دی۔ پولیس نے آنے میں دیر نہیں لگائی تھی مگر ان کے روایتی سائرن سنتے ہی بدروحوں کا وہ گروپ وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میرتاج اسپتال میں تھا۔ اسے خاصی چوٹیں آئی تھیں خاص طور پر پسلیوں میں مگر وہ کسی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہا تھا۔ اس کے سارے ٹیسٹ وغیرہ ہو چکے تھے۔ پولیس بھی اپنی کارروائی مکمل کر چکی تھی۔ اس کے بیان کی روشنی میں پولیس نے بڑی سرعت سے کارروائی کی تھی۔ محض بارہ گھنٹوں میں بدروحوں کا وہ ٹولا سلاخوں کے پیچھے تھا۔

فائنل چیک اَپ کے بعد میرتاج کو تین دن مزید اسپتال میں رکھنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھی طالب علموں کا ایک گروپ ڈوسا کے ساتھ اس کی خیریت دریافت کر کے رخصت ہو چکا تھا۔ اس کے بستر کی سائڈ ٹیبل پر پھولوں کے گل دستوں کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔

میرتاج سوچ رہا تھا کہ سائرہ کو اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ نہیں...... ویسے یونیورسٹی میں اس واقعے کی خبر پھیل چکی تھی۔ اندازہ تو یہی تھا کہ اسے بھی خبر ہو گئی ہو گی۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے مختصر سے کمرے کا دروازہ بے آواز انداز میں کھلا اور وہ دروازے کے فریم میں نظر آئی۔ اس کے ہاتھوں میں سفید ٹیولپ کے پھول تھے اور چہرے پر اداسی اتنی واضح تھی کہ صاف نظر آتی تھی۔

میرتاج نے مسکرانے کی کوشش کی تو جبڑے دکھنے لگے۔ وہ قریب آ کر بولی۔ ''کیا ضرورت تھی...... ان کے ساتھ الجھنے کی؟''

''مجھے تو خاص ضرورت نہیں تھی مگر وہ لوگ مجھے نشانہ بنانے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔''

وہ اس کے قریب پڑے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ ''یہ تو سچ کہا تم نے...... تم، میں اور ہم جیسے سیکڑوں لوگ اس نسلی منافرت سے بچیں بھی تو کہاں تک۔'' وہ جیسے کھو سی گئی۔ لمحے بھر میں واپس آتے ہوئے نرمی سے مسکرائی۔

''اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ تم ٹھیک تو ہو نا؟ کوئی زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟''

''نہیں بالکل سلامت ہوں...... ثبوت کے طور پر ناچ کر بھی دکھا سکتا ہوں۔''

وہ ہنسی۔ ''تم بھول رہے ہو کہ تمہیں ناچنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''ایک تو تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔''

''اسی لیے یہ پھول تمہیں دینا بھول گئی ہوں۔'' اس نے بڑے انداز سے پھولوں کی دو ٹہنیاں آگے بڑھائیں۔ میرتاج نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پھول سرہانے کے پاس رکھ لیے۔ سائرہ دھیان سے دیکھ رہی تھی، بولی۔

''یہ پھول سائڈ ٹیبل پر کیوں نہیں رکھے؟''

''میری مرضی۔'' میرتاج نے نظریں چرائیں۔

اسپتال کے اس کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی در آئی تھی مگر یہ بڑی معنی خیز خاموشی تھی۔ پھر سائرہ نے اس خاموشی کو توڑا۔ ''ٹھیک ہونے کے بعد تم اس نوکری پر نہیں جاؤ گے۔''

''کیوں، جرمن چانسلر نے میرا وظیفہ مقرر کر دیا ہے کیا؟''

وہ اٹھلائی۔ ''نہیں جناب، مگر تمہارے لیے ایک زیادہ بہتر نوکری کا بندوبست ہو گیا ہے اور وہ بھی یونیورسٹی کے بالکل قریب......'' ساتھ ہی اس نے مزید تفصیل بتائی۔ وہ خاموش ہوئی تو میرتاج نے جذبات سے بوجھل انداز میں کہا۔

''تم، میرے لیے امید کا مینار ہو...... میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں؟''

وہ حسبِ عادت ہنسی۔ ''اپنی پٹیوں میں جکڑے منہ سے اور کیسے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے جانے کے لیے پر تولے اور اسٹول چھوڑ دیا۔

میرتاج نے بے چین ہو کر کہا۔ ''اتنی جلدی چل دیں؟''

اس نے اپنی ٹوپی اتار کر جھاڑی۔ ''جناب یہ اسپتال ہے...... ملاقات کا وقت اور اوقات طے شدہ ہیں۔''

میرتاج بھلا کہاں سن رہا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ تو سیاہ آبشار پر تھی۔ ساتھ ہی دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ بیمار پر خاص نوازش کی گئی تھی ورنہ بے وجہ ٹوپی اتار کر جھاڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

آبشار کو سمیٹ کر اس نے دوبارہ ٹوپی میں مقید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چلتی ہوں۔''

میرتاج خاموش رہا۔

وہ دروازے میں رک کر پلٹی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے میرتاج چونکا۔ آتے ہوئے وہاں جتنی اداسی تھی، جاتے ہوئے سوا تھی۔ لحظہ بھر وہ، میرتاج کو دیکھے گئی۔ میرتاج نے

بے چین ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوا......؟"

اس نے جیسے آنسوؤں کا گھونٹ بھرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

وہ تو چلی گئی تھی مگر میر تاج کے دل کو بے کلی سی لگ گئی۔ دروازے کے پاس رک کر اس کا پلٹنا، وہ آخری نگاہ...... اس نگاہ میں الوداعی سا تاثر تھا مگر میر تاج نے اس اندازے کو کھرچنے کی کوشش کی اور ٹیولپ کے پھول اٹھالیے۔

☆☆☆

میر تاج واپس یونیورسٹی آ گیا۔ نئی نوکری بھی اس نے جوائن کر لی، اب اسے سائرہ کا انتظار تھا۔ دن گزرنے لگے۔ وہ روزانہ امید کے مینار کے نیچے بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا اور رفتہ رفتہ یہ دورانیہ بڑھنے لگا مگر اس کی جھلک تک نظر نہیں آئی تھی۔ میر تاج کو آخری الوداعی نگاہ یاد آتی تھی اور سینے میں کچھ سلگنے لگتا تھا۔ ایک ہفتے سے زائد میں اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ دیوانوں کے مانند اسے یونیورسٹی میں ڈھونڈنا شروع ہو گیا مگر یہاں مایوسی اس کی منتظر تھی۔ بلا مبالغہ اگلے پندرہ دنوں میں اس نے پوری یونیورسٹی کا ہر ڈپارٹمنٹ چھان مارا تھا مگر سائرہ بانو کا کوئی نشان نہیں ملا۔ انڈین طلبہ اس سے تنگ آ گئے تھے۔ سبھی کا کہنا تھا کہ اس حلیے اور نام کی وہ کسی طالبہ کو نہیں جانتے جس کے ساتھ اس کی بہن اور منگیتر بھی زیر تعلیم تھے۔ رفتہ رفتہ وہ لوگ اب اس کا مذاق اڑانے لگے تھے۔

میر تاج کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں وہ ایک دن سرتھامے سنگ سرخ کے دائرے پر بیٹھا ہوا تھا کہ لاٹھی ٹیکتا ہوا کوئی اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ میر تاج نے سر اٹھایا۔ یادداشت نے جھماکا مارا۔ یہ وہی بوڑھا لائبریرین تھا جو اسے خبطی سا محسوس ہوا تھا...... وہ بوڑھا اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

میر تاج نے روکھے سے انداز میں کہا۔ "یہاں بیٹھنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

بوڑھے نے اس کا انداز نظر انداز کیا اور دھیرے دھیرے بمشکل سنگ سرخ پر ٹک ہی گیا۔ یہ اس کے لیے مشقت طلب کام تھا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ اس نے ان ہیلر لے کر سانس بحال کرنے کے بعد کہا۔

"بیٹے! شاید تمہیں میری قربت ناگوار گزرے مگر جسے ڈھونڈتے ہوئے تم دیوانے سے ہو گئے ہو...... میں اس کے بارے میں کچھ معلومات دے سکتا ہوں۔"

میر تاج کا وجود توانائی سے بھر گیا۔ لمحے بھر میں احساسات بدل گئے۔ وہ بوڑھا اچانک ہی اس کے لیے بے حد اہم ہو گیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر جذبات سے لرزتی آواز میں کہا۔ "اس احسان کے لیے میں ساری زندگی تمہارا مشکور رہوں گا...... تم...... تم سائرہ بانو کی ہی بات کر رہے ہونا؟"

بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "پہلے میں اپنے بارے میں بتا دوں...... میرا نام گیری کوپر ہے...... ریٹائرمنٹ کے بعد بھی میں بطور رضا کار لائبریری میں کام کر رہا ہوں۔ کیا کروں...... یہ کم بخت وقت گزارے نہیں گزرتا۔"

میر تاج کو اس کی ذات میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ "خدا کے لیے مجھے...... سائرہ کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ یونیورسٹی میں ہے تو کس کونے میں چھپی ہے؟" آخر میں وہ روہانسا ہو گیا۔

گیری کوپر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "صبر سے کام لو لڑکے! پہلے مجھے یہ بتاؤ، وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟ اس نے تمہاری ضرور مدد وغیرہ کی ہوگی۔"

میر تاج نے قدرے تفصیل بتانے کے بعد کہا۔ "مجھ سے صبر نہیں ہوتا...... مجھے بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ تم، اسے کیسے جانتے ہو؟" وہ بے ربط انداز میں پوچھے گیا۔

گیری کوپر نے اس کے سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی...... میرا مطلب ہے چومنے اور جسمانی تعلق بنانے کی؟"

میر تاج نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "تم وہ کیوں نہیں بتا رہے جو میں پوچھ رہا ہوں؟"

گیری کوپر قدرے سہولت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آؤ، تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔"

میر تاج کا دل مچل اٹھا۔ "اس کے لیے تمہارا بہت شکریہ!"

گیری کوپر کے ہمرکاب سست روی سے چلتے ہوئے گیری کوپر نے دھیمے انداز میں سوال، جواب کرتے ہوئے اس سے سائرہ اور اس کے تعلقات کے بارے میں بھی کچھ جان لیا۔ اس دوران میں وہ یونیورسٹی کے ایک خاص ہال کے باہر پہنچ گئے تھے۔ اس ہال میں تعلیم کے علاوہ یونیورسٹی کے لیے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دینے والے طلبہ و طالبات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی

تصویریں اور رضا کارانہ خدمات کو نمایاں طور پر آویزاں کیا گیا تھا۔

ہال کے دروازے کے قریب رک کر گیری کوپر نے کہا۔ ”وہ یہاں رہتی ہے۔“

میرتاج کو لگا...... اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس نے کہا۔ ”کیا کہا؟ میں ٹھیک سے سن نہیں پایا۔“

”جسے تم ڈھونڈتے پھر رہے ہو...... وہ یہاں رہتی ہے۔“

میرتاج کا پارا چڑھ گیا۔ بوڑھا واقعی خبطی تھا۔ جس نے اس کا وقت ہی برباد کیا تھا۔ اس نے بمشکل لہجے کی تپش پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

”بڑے صاحب! تم سے اس ناشائستگی کی امید نہیں تھی۔ تم نے میرے جذبات کا مذاق اڑایا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑا۔

بوڑھے گیری کوپر کی بلند آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ ”پچھلے سولہ سال میں تم تیسرے نوجوان ہو...... جو اسے ڈھونڈتے ہوئے میرے ساتھ اس ہال تک آئے ہو۔ پہلے والے دونوں نوجوانوں کے مانند تم بھی اس کے محبوب سے خاصی مشابہت رکھتے ہو...... اسی سبب وہ تمہارے قریب آئی تھی۔“

میرتاج کو گیری کوپر کے لہجے نے جکڑ کر گھومنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا دماغ سائیں، سائیں کرنے لگا تھا۔ گیری کوپر لاٹھی ٹیکے مضبوطی سے جما کھڑا تھا۔ اس نے مزید کہا۔

”ان دونوں نوجوانوں اور تمہارے میں فرق اتنا ہے کہ تم نے اس سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی...... اس لیے اس کے ساتھ خاصا وقت گزار پائے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے ہال کا دروازہ دھکیل کر کھول دیا۔

”آؤ...... وہ سامنے ہی ہے۔“

میرتاج کو جیسے کسی نے دھکیل کر آگے بڑھایا۔ ہال میں روشنیاں جل رہی تھیں مگر اندر کوئی نہیں تھا۔ اس طرف خال خال ہی کوئی آتا تھا۔ میرتاج اندر داخل ہو کر دیوانوں کے مانند ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر سائرہ اسے نظر آگئی۔ وہ ایک بغلی دیوار پر آویزاں تھی۔ وہی خدوخال، وہی خستہ حال اوور کوٹ اور فر کی ٹوپی۔

میرتاج سنسناتے دماغ کے ساتھ پورٹریٹ کی طرف بڑھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ”ہماری یونیورسٹی کا فخر...... سائرہ بانو جس نے 1982ء کی آتش زدگی کے دوران ساتھی طلبہ وطالبات کی جان بچاتے ہوئے اپنی زندگی ہار دی۔“

میرتاج کو بڑے زور کا چکر آیا اور وہ سائرہ کی تصویر کے نیچے ہی بیٹھ گیا۔

گیری کوپر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں سائرہ کی تصویر پر تھیں، گلوگیر لہجے میں بولا۔ ”وہ بڑی ملنسار اور ہمدرد لڑکی تھی۔ جس نے مرنے کے بعد بھی لوگوں کی مدد کرنا نہیں چھوڑا۔“ عینک اتار کر اس نے آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا محبوب ولیم سن تھا...... سائرہ کی خاطر اس نے عیسائیت چھوڑ دی تھی۔ درحقیقت اسی کی خاطر وہ بھڑکتے شعلوں میں گھسی تھی مگر ولیم کو نہ بچا سکی۔ ایک معذور لڑکی کو بچاتے بچاتے وہ خود شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔ آگ نے......“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

میرتاج کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

گیری کوپر نے دوبارہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”خدا سے دعا کرو! اس کی روح کو سکون نصیب ہو...... مم...... مجھے لگتا ہے کہ شاید اب تمہاری اس سے دوبارہ ملاقات نہ ہو۔“

میرتاج باقاعدہ سسکیاں لینے لگا۔

گیری کوپر چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”میری بات میں کچھ جھوٹ محسوس ہو تو آتش زدگی کے بعد کی تاریخوں کے اخبارات لائبریری سے مل جائیں گے۔ ولیم سن کی تصویر بھی ہے...... دیکھ لینا تم دونوں میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لاٹھی ٹیکتا ہال سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

گیری کوپر کی صحت اجازت نہیں دیتی مگر ہر سال چند مقررہ تاریخوں میں وہ ایک بھورے بالوں والے سوبر سے شخص کو ”امید کے مینار“ کے گرد سنگ سرخ والے دائرے پر گھنٹوں بیٹھے دیکھتا ہے۔ یہ شخص ہر سال پاکستان سے آتا ہے اور گھنٹوں بیٹھا خلا میں گھورتا رہتا ہے۔ اکثر اسے بڑبڑاتے بھی سنا گیا ہے۔

”آ کر دیکھ لو! میں ذرا سا بھی مضبوط نہیں ہوا۔ میں آج بھی تنہا ہوں اور کرچی کرچی ہو کر بکھر رہا ہوں۔ آ کر مجھے سنبھال لو! تم نے کہا تھا...... میں اس وقت تک ملنے آتی رہوں گی جب تک تم مضبوط نہیں ہو جاتے۔“

اس شخص کے جانے کے بعد گیری کوپر بھی رومال سے آنکھیں صاف کرتا گھر چلا جاتا ہے۔ اس دفعہ اپنی صحت کو دیکھتے ہوئے اسے یقین ہے کہ اگلے سال یہ شخص جرمنی آیا تو وہ اس شخص کو نہیں دیکھ پائے گا۔

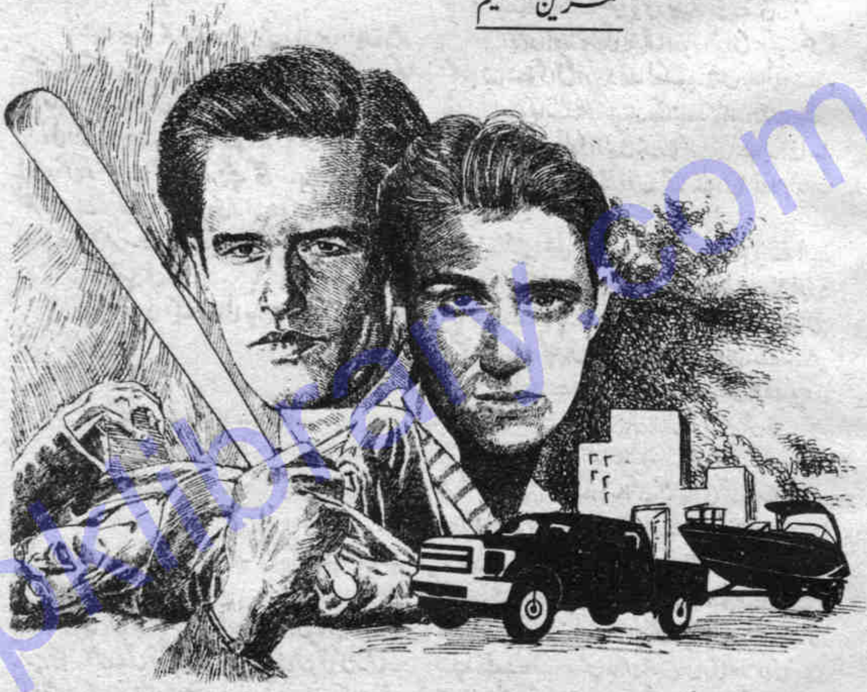
❖❖❖

فلمیں دیکھنے کے شوقین دو بھائیوں کی خوبصورت و یادگار سنگت... وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہتے تھے... فلمیں دیکھنے کی عادت اُن کی رگوں میں دوڑ رہی تھی اور یادداشت کا امتحان لے رہی تھی... بوجھنا، سمجھنا اور سلجھانا ان کا پسندیدہ کھیل تھا...

مشاہدے کی عادت اور تجربے کی نگاہ کا کارگر ہدف......

ہمدم

ثمرین شمیم



''روزبڈ۔'' میں نے کہا۔

میرا بھائی لیوک پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا اور عجیب سے چہرے بناتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کین کا شہری...... بہت ہی آسان ہے یہ تو......''

میں نے ریڈیو کو مغربی اسٹیشن پر ٹیون کر دیا۔ مجھے کنٹری میوزک بہت پسند ہے۔ ''لیٹرز آف ٹرانزٹ'' کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' گاڑی ایک میل فی گھنٹا کی رفتار سے چل رہی تھی اور کھڑکی کے باہر سرسبز باغ اور مسی سپی کا

دیہاتی علاقہ دوڑتا جارہا تھا۔

''کاسابلانکا۔ کیا یہ تھوڑا مشکل ہورہا ہے؟''

''او کے شرلاک۔'' میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔

''ایک بڑا ناز مرد۔''

''پتھروں سے محبت۔''

''خفیہ سرکاری دستاویزات کی مائیکروفلم، شمال سے شمال مغرب۔''

''ٹیٹو کیا ہوا ایک نقشہ، خشک زمین کی طرف۔''

لیوک کو میری اس پہیلی کے بارے میں کچھ دیر سوچنا پڑا۔ ''پانی کی دنیا یعنی واٹرورلڈ۔''

''ناٹ بیڈ۔'' میں کچھ دیر خاموش رہا۔ میرا دایاں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر تھا اور بایاں ہاتھ کار کی کھلی ہوئی کھڑکی پر رکھا ہوا تھا۔ یہ ستمبر کے اوائل کی صبح تھی، لیکن اتنی ہی گرم صبح تھی، جتنا کہ کوئی انجن روم ہوتا ہے۔ میں نے ریئر ویو میں اس کشتی پر نظر ڈالی، جس کو ہم اپنے ٹرک کے پیچھے کھینچ رہے تھے اور دوسری نظر میں نے سڑک پر مرکوز کر دی۔ اپنے ذہن میں، میں نے سوالات کی نئی فہرست کی طرف توجہ دی۔ ''خرگوش کا پاؤں۔''

''مشن امپاسبل III۔''

''اپارٹمنٹ کی ایک اضافی چابی۔ مرڈر کے لیے M ڈائل کریں۔''

''کوک کی بوتل۔''

''کیا؟'' لیوک نے جھکتے ہوئے پوچھا۔

''شیشے کی خالی کوک کی بوتل۔''

''یہ ٹھیک نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ میک گفن تو نہیں ہے۔''

میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ ''تم یہ اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم اس کا جواب نہیں جانتے۔''

''میں اس کا جواب جانتا ہوں۔ ''دی گاڈز مسٹ بی کریزی'' لیکن بوتل تو فلم کے آغاز میں ہی مل گئی تھی۔ ایک میک گفن کے پاس ایسی چیز ضرور ہونی چاہیے، جو ہر ایک تلاش کرتا پھرے، ہر وقت۔''

''یہ سچ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہچکاک کے مطابق، یہ صرف ایک عام چیز ہے، جو پلاٹ کو متحرک رکھتی ہے، کچھ ایسا جس کی کرداروں کو پروا بھی ہوتی ہے، لیکن سامعین اس کی پروا نہیں کرتے۔ جیسے پلپ فکشن میں وہ بریف کیس یا ونس اپون اے ٹائم میں ہارمونیکا۔ اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ تم کو تو یہ سب پتا ہی ہوگا نا۔ کیا مجھے تم کو سب کچھ سکھانا ہوگا؟''

''ارے میں تو وہ ہوں جس نے آپ کے اس گونگے کھیل سے کھیلنے سے اتفاق کیا اور میں نے آپ کے تمام سوالات کے جواب دیے ہیں۔ اب کتنے سوال ہو گئے؟ آٹھ؟''

میں جواب دینے ہی والا تھا کہ ریڈیو پر ایک گمبھیر آواز نے ٹیمی وینیٹی کی گائیکی کو روک دیا۔ ''بریکنگ نیوز'' اناؤنسر نے کہا۔ ''ایکرمین کے قریب ہائی وے 15 پر بارنیٹ کے منی پارٹ میں علی الصبح ہونے والی ڈکیتی میں ایک گیس اٹینڈنٹ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ کاؤنٹی کے شیرف کو اس وقت چالیس سالہ اور سنہرے بالوں والے سفید فام مرد کی تلاش ہے۔''

بریکنگ نیوز ختم ہوئی اور گانا دوبارہ شروع ہو گیا۔ ٹیمی کا گانا وہیں سے شروع ہو چکا تھا۔ لیوک پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ایکرمین اس جگہ سے زیادہ دور نہیں، جہاں ہم جارہے ہیں۔ ہماری زندگی میں کیا بس یہی ہے کہ چھٹی کے دن بھی ہم قاتلوں اور ڈاکوؤں کے لیے اپنا آرام خراب کریں۔''

''ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''وہ ہمیں صرف پریشان کرنا چاہتے ہیں، وہ بہتر طور پر اس سب سے نمٹنا چاہتے ہیں۔ اب سے ایک گھنٹے بعد میں اس کشتی میں بیٹھ کر مچھلیاں پکڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''اور گیم کے ان نئے اصولوں سے مجھے دھوکا دینے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔''

میں بے ساختہ مسکرا دیا۔ میرے اور لیوک کے درمیان اس قسم کا جھگڑا معمول کی بات تھی، شاید اس لیے کہ ہم دونوں ہی ابھی تک تنہا تھے اور بحث کرنے والا کوئی اور ہمارے درمیان نہیں تھا۔ لیوک عمر میں چھوٹا، قد میں لمبا اور تیز تھا، لیکن ہم سب ہی مور گنر ہوشیار تھے۔ وہ، میں اور ہماری بہن بوبی سو نے اسمتھ کاؤنٹی میں ویب ڈیزائننگ کا کامیاب کاروبار چلا رہے تھے۔ لیوک اور میں خاص طور پر ٹی وی اور مووی ٹریویا جیسے کم منافع بخش معاملات میں کافی باصلاحیت تھے۔ ہمارے مشاغل میں نیٹ فلکس اور مچھلی پکڑنا شامل تھے اور یہ کام اکثر ایک ہی وقت میں کیا کرتے تھے، ایک ساتھ۔

''یہ نئے اصول نہیں ہیں جو میں آپ کو سکھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ایک میک گفن ایک جگہ، ایک شخص، واقعہ، کوئی بھی چیز ہو سکتا ہے، جو غیر اہم معلوم ہوتی ہے، لیکن سازش کو آگے بڑھاتی ہے۔ عام طور پر پہلے ہی دکھایا جاتا ہے یا اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور پوری کہانی میں یہ چیز بار بار ظاہر ہوتی ہے۔''

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کیا اب میری باری ہے؟"

"مجھے لگتا ہے۔" میں نے ..... لیچ کی طرف دیکھا۔

ہم جنگل کے قصبے کے قریب ہائی وے 35 شمال کی طرف جا رہے تھے، ہماری رفتار مناسب تھی۔ ہم جنگلوں کے طویل حصوں سے ہوتے ہوئے جا رہے تھے۔ "ہمیں جلد ہی فیول بھروانے کی ضرورت ہے۔"

"آپ کو فلم کے سوالات کے جواب دینے کے لیے گیس کی ضرورت ہے؟"

"مجھے گاڑی کو جھیل تک لے جانے کے لیے گیس کی ضرورت ہے۔" میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ مچھلی کے شکار کے سفر پر جاتے ہوئے مجھے اچھا لگتا ہے، خواہ وہ صرف ایک ہی دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ "چلو، پوچھو۔"

لیوک نے دستانے کے خانے سے قلم اور نوٹ پیڈ نکالا اور کچھ لکھنے لگا۔ ہم اس بارے میں سنجیدہ ہو رہے تھے۔ ایک یا دو منٹ کے بعد اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، چلو شروع کرتے ہیں۔ بین مورگن کے بے وقوفانہ میک گفن کوئز کا دوسرا راؤنڈ۔" اس نے توقف کیا۔ "موسیقی کے ایک ٹکڑے میں کوڈ شدہ پیغام۔ دی لیڈی ویننشز۔ ایک سربراہی اجلاس کے لیے ایک تقریر کی آڈیو ٹیپ، نیو یارک سے فرار۔"

"چلو دیکھتے ہیں...... ٹرین سے ٹکرانے والے لڑکے کی لاش۔"

"میرے ساتھ رہو۔" میں چیخا۔ "اور آپ نے سوچا کہ میرے سوالات آسان ہیں؟"

"میں صرف آپ کا اعتماد بحال کر رہا ہوں۔"

"یقیناً!" میں نے اسٹیئرنگ وہیل کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "ارے دیکھو وہاں رکنا ہوگا آگے۔"

لیوک ہنوز اپنے نوٹ پیڈ کی طرف ہی دیکھتے ہوئے بولا۔ "نیلے دل کے ساتھ چاندی کا ہار۔"

"ورٹیگو۔" میں نے تیزی سے کہا، پھر فوراً کہا۔ "نہیں انتظار کرو۔ اس کی رنگت تو سرخ تھی اور وہ دھات چاندی نہیں سونا تھی۔ ٹائٹینک۔"

"ہوائی جہاز کے انجن کا منصوبہ، 39 قدم۔"

"ایک جیبی گھڑی، جو گھنٹی بجاتی ہے، چند مزید ڈالرز کے لیے۔"

"ٹھیک ہے، ہوشیار انسان، اب یہ آزماتے ہیں۔ ایک بچی کی ہیروئن سے بھری ہوئی گڑیا۔"

"اچھا! اندھیرے تک انتظار کرو۔"

اس نے آہ بھر کر مجھے دیکھا۔ "آپ جانتے ہیں کہ میں

ویزا

"میں کل دس دن کے لیے چین جا رہا ہوں۔"

"کیا ویزا آسانی سے مل گیا؟"

"ویزا کی کیا ضرورت ہے؟"

"مجھے ڈر ہے کہ تم ویزا کے بغیر چین میں داخل نہیں ہو سکو گے۔"

"ارے نہیں بھائی... میں تین دفعہ چین جا چکا ہوں۔ وہاں کسی نے مجھ سے ویزا کارڈ طلب نہیں کیا... سب امریکن ایکسپریس کا کریڈٹ کارڈ خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں۔"

تعریف

پہلی ملاقات میں شوہر نے بیوی کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "تم ہزار لڑکیوں میں ایک ہو۔"

بیوی نے یہ سنتے ہی رونا پیٹنا شروع کر دیا۔

"ارے ارے روتی کیوں ہو؟"

بیوی نے زوردار ہچکی لی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں سے ملتے رہے ہیں۔"

مبشر حسن ہیڈ بکائی

بولی سو کو سیج سوچنے لگا ہوں۔ شاید ہم بہت زیادہ فلمیں دیکھتے ہیں۔"

"زیادہ فلمیں دیکھنے جیسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ان دنوں یہ تمام معلومات تو بہت آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔" میں نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی۔ "بولتے رہیں۔ صرف ایک اور درست جواب اور کھیل ختم۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ ذرا مشکل ہے۔ شراب کی بوتلوں میں تابکار یورینیم۔"

میں نے گاڑی کو دو گیس پمپوں کے درمیان ڈرائیو وے کے نیچے پارک کرتے ہوئے انجن بند کر دیا۔

"آپ کے خیال میں ہمیں یہاں کسی اور چیز کی ضرورت ہے، شاید کولر کی؟"

"بالکل نہیں، لیکن چونکہ ہم یہاں ہیں، تو میں کینڈی بار ضرور لوں گا۔" اس نے سیٹ بیلٹ کھولی، پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا، میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ "کیا آپ نہیں جانتے؟ جانتے ہیں نا؟"

میں بھی باہر نکلا اور پمپ چیک کیا۔ اس پر ایک بورڈ لگا تھا۔ "ایندھن بھرنے سے قبل اندر ادائیگی کریں۔" میں مڑ کر

ساتھ والی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی دو کاریں اور بھی کھڑی تھیں۔

لیوک نے میرے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کو جواب نہیں معلوم تو میں جیت گیا۔'' میں دروازے پر رک گیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''بدنام۔''

ہم دونوں نے مسکراتے ہوئے دروازے کو ایک ساتھ دھکیلا۔ اندر اے سی چل رہا تھا۔ PA سسٹم وہی ریڈیو اسٹیشن چلا رہا تھا، جسے ہم ٹرک میں سنتے ہوئے آ رہے تھے۔ میں نے طویل چیک آؤٹ کاؤنٹر کے مختلف اطراف میں صرف دو اور لوگوں کو دیکھا۔ وہ دونوں ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ کاؤنٹر کی دوسری طرف ایک چھوٹا سیاہ فام آدمی کھڑا تھا، جس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ اس نے سینے پر ایسے ہاتھ باندھے ہوئے تھے، جیسے وہ بیعت کر رہا ہو۔ دوسری طرف ایک لمبا سفید فام آدمی کھڑا تھا، جس نے سنہرے بالوں والی کریوکٹ رکھی ہوئی تھی اور 38 بور کی گن پکڑ رکھی تھی۔

''خوش آمدید لڑکو!'' گن مین نے کہا۔ ''آپ بھی ہماری پارٹی میں شمولیت اختیار کریں۔'' لیوک اور میں دروازے کے بالکل اندر منجمد کھڑے تھے۔ لمبے قد والے نے گن لہرائی۔ ''جاؤ، گاندھی کے ساتھ وہاں کھڑے ہو جاؤ تاکہ میں تم سب پر نظر رکھ سکوں۔''

ہم نے اپنے ہاتھ اٹھا لیے۔ گولی مارنا ایک چیز ہے اور بلاضرورت گولی مارنا دوسری چیز ہے۔ یہ سوچ کر ہم بندوق بردار کے پاس سے احتیاط سے گزرے۔ کاؤنٹر کے پاس کیشئر کھڑا کانپ رہا تھا اور وہ واقعی ہندوستانی لگ رہا تھا۔ میں نے کسی قسم کے ہتھیار کی تلاش میں اردگرد نظریں دوڑائیں۔ میری بندوق، جو ہم سانپوں کو مارنے کے لیے استعمال کرتے تھے، باہر ہمارے ٹرک میں رکھی ہوئی تھی۔ لیوک اور کیشئر کے درمیان اپنی جگہ بناتے ہوئے میں نے کاؤنٹر کے دوسرے اندرونی کنارے پر ایک بیس بال بیٹ دیکھا، جو اس بندوق بردار کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ لیوک بھی اس بیس بال بیٹ کو دیکھ چکا ہے۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا اور دل کی دھڑکن میری سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔

لمبے قد والے نے کاؤنٹر کی طرف ایک قدم آگے بڑھایا۔ میں اس کی سانسوں کی بو سونگھ سکتا تھا۔ اس کی چال سے اس کی گن آگے پیچھے حرکت کر رہی تھی اور اس نے ہم تینوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔

''آج تم نے کتنے گیس اسٹیشنوں پر ڈکیتی ڈالنے کا ارادہ کیا ہے؟'' لیوک نے اس سے دریافت کیا۔

وہ اس کے اور قریب آتے ہوئے بولا۔ ''جس قدر میں لوٹنا چاہوں، ابھی جواب دینا قبل از وقت ہے۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔ ''او کے۔ چلو کام شروع کریں۔ ہر ایک اپنا بٹوا یہاں رکھ دے، جیسا کہ میں تم سب کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ تمام بلز رجسٹر میں رکھو اور ذرا جلدی کرو۔''

میں نے والٹ اپنی پینٹ کی پچھلی جیب سے نکالا اور اسی وقت لیوک اور میں نے نظروں کا تبادلہ کیا۔ وہ میرے بائیں طرف تھا، کیشئر میرے دائیں طرف کھڑا تھا۔ ایک لمحے میں میرے دماغ میں کئی چیزیں ایک ساتھ آئیں، لیکن ان میں سے کچھ بالکل واضح تھیں۔ نمبر ایک: ریڈیو کی خبر میں صرف ڈکیتی کی بات نہیں کی گئی تھی، بلکہ اس میں ایک قتل کا بھی ذکر تھا۔ نمبر دو: ہم سب ہی اس شخص سے صرف تین فٹ دور تھے، جس نے یہ سب کیا تھا اور نمبر تین: لیوک اور گن مین قد میں لمبے تھے اور میرے سمیت دونوں ہی دکاندار پستہ قد تھے۔ مجھے فیصلہ لینے میں پانچ سیکنڈز سے بھی کم وقت لگا۔

میں نے اپنی نظروں کا رخ گن مین کی طرف کرتے ہوئے سیدھا اس کو دیکھ کر کہا۔ ''ونڈر بوائے۔''

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا؟''

میں جانتا تھا کہ لیوک سمجھ گیا ہے۔ جیسے ہی مجھے احساس ہوا کہ اس نے اپنے پاؤں کا زاویہ تھوڑا سا تبدیل کیا ہے، میں نے اس ڈکیت کے کندھے کے اوپر سامنے کے دروازے کی طرف اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ میں نے اپنی آنکھوں میں حیرت کا تاثر دیتے ہوئے ان کو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''اوہ نو!''

میرے اس دھوکے میں آ کر اس نے وہی کیا، جو کوئی بھی دوسرا فرد کرتا۔ اس نے اپنا رخ دروازے کی طرف کیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ اور اپنی گن کا رخ بھی اسی طرف کر لیا اور اس دوران اس بھی کم وقت میں، میں نے کیشئر کو پکڑ لیا اور ان دونوں اسٹور کیپرز کو نیچے بیٹھنے پر مجبور کیا۔ اسی پل میں نے لیوک کو جھکتے اور دوبارہ اٹھتے ہوئے دیکھا، ہمیشہ کی طرح تیزی سے اور پھر میں نے اپنے اوپر سے کسی چیز کے گزرنے اور اس کے کسی سخت چیز سے ٹکرانے کی آواز سنی، جو اتنی سخت آواز نہیں تھی۔ میں دوبارہ کھڑا ہوا، جبکہ کیشئر ابھی تک نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کاؤنٹر کے اس پار نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ فرش کی طرف تھا۔ لکڑی کے بلے سے لیوک کی طرف سے لگائی جانے والی ضرب کے باعث اس کے سر پر انڈے کے سائز کا گومڑا نکل آیا تھا۔ وہ پٹھوں کو حرکت نہیں دے رہا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ مر گیا ہے۔

میں نے اپنے بھائی کو پیچھے سے دھکا دیا، کیونکہ وہ ابھی تک وہیں جما ہوا کھڑا تھا، جیسے کوئی بیس بال کارڈ کی تصویر کھینچ رہا ہو۔ میں نے اس کی گری ہوئی گن اٹھائی اور اس سے ڈکیت کے سر کا نشانہ لیا۔ مجھے شک تھا کہ وہ ہارر فلموں کے کرداروں کی طرح دوبارہ اٹھ کر لڑنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو میں بھی پوری طرح تیار تھا۔

"تم لوگ ٹھیک ہو؟" میں نے ان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔" لیوک نے کہا۔ وہ چلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ اسٹور کیپر نے کاؤنٹر کے اس پار جھانکا۔ وہ اب تک خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سیدھا کھڑا ہوا۔ مجھے اور لیوک کو دیکھنے لگا۔

"میں نے خبریں سنی ہیں، اس سے پہلے کہ ایسا کچھ بھی ہوتا۔" اس نے کہا۔ "تم نے آج میری جان بچالی۔"

لیوک نے بلے کے سرے سے فرش پر پڑے اس ڈکیت کے سر کو تھپتھپایا۔ "دراصل میں اس وقت اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔" اس نے کہا۔ ڈکیت کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ "ایسا لگتا ہے کہ وہ سانس لے رہا ہے۔"

کیشئر نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اب ہم کیا کریں؟"

"پولیس کو بلاؤ۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ یہ جاگ جائے۔"

"وہ کچھ دیر تک یونہی پڑا رہے گا، ہوش میں نہیں آئے گا۔" لیوک نے کہا، پھر اس نے کاؤنٹر کے پیچھے اس بلے کو رکھ دیا اور کہا۔ "معاف کیجیے گا، میں کینڈی بار لینے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

میں کھڑا اس بے ہوش ڈکیت کو دیکھتا رہا، جبکہ کیشئر نے فون کال اسپیکر پر رکھی۔ اگرچہ بہت زیادہ ہانپنے اور گہری سانسیں لینے کی وجہ سے اس کی آواز متزلزل تھی، لیکن اس نے اپنا کام پورا کیا۔ میں نے ڈسپیچر کو افسروں سے بات کرتے ہوئے سنا۔ ایک ایمبولینس بھی آ رہی تھی۔

فون بند کرنے کے بعد اس نے ایک طویل اور گہری سانس لی اور میری طرف سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ونڈر بوائے۔"

"کیا؟"

"اس ڈکیت کو تم نے ونڈر بوائے ہی کہا تھا نا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

میں خود کو مسکرانے سے روک نہیں سکا۔ پس منظر میں PA سسٹم پر مارٹی روبنس کا ال پاسو کے متعلق گانا چل رہا تھا، جس میں ایک خوب صورت، جوان مرد فرش پر مردہ بتایا گیا تھا۔ یہاں ہمارا اجنبی نہ ہی خوش شکل تھا اور نہ ہی مردہ، لیکن اس نے پھر بھی مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ تعلقات کہیں سے بھی نکل آتے ہیں، اگر آپ ان کو غور اور دھیان سے سنیں تو۔

"یہ ایک قسم کا اشارہ تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ اشارہ میں نے اپنے بھائی کو دیا تھا۔ دراصل ہم یہاں آنے سے پہلے ایک کھیل، کھیل رہے تھے۔"

"کھیل؟"

"ایک فلم تھی، جس میں ایک چھوٹا بچہ ایک درخت کی لکڑی کی مدد سے اپنا بیس بال بیٹ بناتا ہے اور اس کے اوپر "ونڈر بوائے" کندہ کرتا ہے۔ پھر وہ بچہ بڑا ہو کر رابرٹ ریڈ فورڈ بنتا ہے اور کئی لیگ گیمز میں اس نے وہ بیس بال بیٹ استعمال کیا اور فلم کے اختتام پر بھی وہ وہی بیٹ استعمال کرتا ہے، جس کی نقاشی ایک چھوٹے لڑکے نے کی، جو گھر سے بھاگا تھا اور اس نے پینٹ میں فتح حاصل کی۔"

"مجھے یاد ہے۔" اس نے کہا۔ "بال اسٹیڈیم کی لائٹس پر لگی تھی اور وہ سب آتش بازی کی طرح پاپ پاپ کر کے پھٹ گئی تھی۔"

"ہاں!"

"جیسے ہی لائٹس ٹوٹیں، ہر فرد پاگلوں کی طرح خوشی سے اچھل کود رہا تھا۔"

"ہاں بالکل وہی۔" میں نے کہا۔ "بہرحال! بلا تو صرف ایک اشارہ تھا، اس کا نام ہیک گفن تھا۔"

اسی لمحے لیوک اندر واپس آیا اور اس کے ہاتھ میں اس کا والٹ اور اسنیکر کینڈی بار تھا۔

کیشئر نے اس کو دیکھا اور پیسے اس کے سامنے لہرائے۔

"وہ تم کیا کہتے ہو؟ نو چارج۔" اس نے مزید کہا۔ "ویسے میرا نام سام پارٹسائی ہے۔"

"بین مورگن۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا بھائی لیوک ہے۔"

سام نے ہم سے ہاتھ ملایا۔ اس نے لیوک سے کہا۔ "دی نیچرل۔ ہے نا؟"

لیوک نے مسکرا کر سر ہلایا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہم بہت زیادہ فلمیں دیکھتے ہیں، میرا بھائی اور میں۔"

"ایسا نہیں ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں بھی شامل ہوں۔"

❖❖❖



قسط نمبر 20

دہر

حسام بٹ

کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانۂ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے ان مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحرِ بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصدِ حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزارِ فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیقِ سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش ربا حیلہ سازیاں



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

جاسم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ لڑکپن میں قدم رکھنا قیامتِ صغریٰ کا پیغام بر ثابت ہوا۔ اس کے والد قاسم باری نے مقامی غنڈوں کے خلاف پولیس کی مدد کی تو یہ چھوٹی سی فیملی طوفان کی زد میں آگئی۔ ایک رات اسی گینگ کے چند لوگوں نے گھر میں گھس کر جاسم کی والدہ اور والد پر قاتلانہ حملہ کر دیا جس میں ماں ہلاک ہوگئی اور شدید زخمی باپ کو پرائیویٹ اسپتال پہنچا دیا گیا۔ قاسم کا علاج شروع کرنے کے لیے پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ جاسم نے مدد کے لیے اپنے اکلوتے ماموں جلیل کی طرف دیکھا۔ جلیل نے اس شرط پر رقم کا انتظام کر دیا کہ جاسم کو ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کچھ عرصے کے لیے جیل جانا پڑے گا۔ جاسم کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ماموں کی بات مان لی۔ اپنے باپ کی زندگی بچانے کے لیے وہ تیرہ سال کی عمر میں آٹھ سال کے لیے جیل چلا گیا۔ قید و بند کی اس زندگی میں دو افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش مراد علی تھا جسے سب دادا کہتے تھے۔ دوسرا کارل مارکس کا پیروکار ایک صحافی انور بیگ تھا جو کامریڈ کہلاتا تھا۔ دادا اور کامریڈ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی کی جاسم پر گہری نگاہ تھی۔ وہ جاسم کی بپتا سے واقف تھے اس لیے وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں لگ گئے۔ کامریڈ نے جاسم کی زبان کو تلوار اور دادا نے اس کے ہاتھ پاؤں کو موت کی للکار بنا دیا۔
دادا نے اپنے بندوں کے ذریعے پتا لگا لیا تھا کہ جاسم کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے پیچھے راجو نامی ایک گینگسٹر کا ہاتھ ہے اور یہ بھی کہ جلیل ماموں نے جاسم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ اپنی جیب میں ڈالے اور قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ دادا اتنا طاقتور بدمعاش تھا کہ وہ جیل میں بیٹھ کر بھی باہر کے معاملات کو چلاتا رہتا تھا۔ جلیل تو منظر سے ہٹ چکا تھا لیکن راجو تک پہنچنے کے لیے دادا نے جاسم کی مدد کی۔ اسے اپنے معتمد خاص کامل کے ساتھ چند گھنٹے کے لیے جیل سے باہر بھیجا۔ جاسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجو کو زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنا دیا۔ دادا کا جیل سے باہر جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گیا تو اس کے ایک دیرینہ دشمن شعیب چاچا نے اسے اور اس کی بیٹی و بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دادا کی موت نے جاسم کو حد درجہ افسردہ کر دیا۔ بہرحال وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جیل سے باہر آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک تربیت یافتہ کڑیل جوان تھا اور اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا اور اسی آغاز پر ایک مہ جبیں سے اس کا تعارف ہوگیا۔ ناجیہ ایک پروڈکشن ہاؤس میں ایسوسی ایٹ پروڈیوسر تھی۔ وہ جاسم کی فائٹنگ اسکلز سے حد درجہ متاثر ہوئی اور اس نے جاسم کو رنگ و نور کی دنیا سے روشناس کرا دیا۔ جاسم کو پتا چلا کہ شعیب چاچا معاشرے میں ایک کامیاب ایکسپورٹر کی حیثیت سے عزت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن درپردہ وہ ڈرگز، ناجائز اسلحہ، انسانی اعضا کی فروخت اور نوعمر لڑکیوں کے اغوا جیسے مذموم کاموں میں ملوث ہے۔ اس مکروہ کاروبار میں بعض بااثر افراد اس کے ساتھ ہیں اور اسے بین الاقوامی کارٹلز کا تعاون بھی حاصل ہے۔
دونوں دوستوں نے مضبوط منصوبہ بندی سے شعیب چاچا کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دوسری سمت جاسم کا شوبز کا کام بھی جاری تھا اور اسے چند روز کے بعد ایک سیریل کے شوٹ کے لیے استنبول جانا تھا اس سے پہلے اس نے راجو کو بھی حسرت ناک موت سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ سنسنی خیز ہنگامے چل رہے تھے کہ کسی ڈیوڈ نامی شخص نے بڑے پُراسرار انداز میں جاسم سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کسی ری ایلیٹی ٹی وی میں، بھاری معاوضے پر شرکت کی دعوت دی۔ یہ وہی وقت تھا جب جاسم اپنے یونٹ کے ساتھ استنبول جانے والا تھا۔ ڈیوڈ کا رویہ اتنا پُراسرار اور خطرناک تھا کہ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ کوئی مخالف پروڈیوسر ڈیوڈ بن کر جاسم کو اپنے ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی جاسم کو اندازہ ہوگیا کہ ڈیوڈ ایک انتہائی طاقتور اور بااختیار شخص ہے۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کو اغوا کر کے جاسم کو اپنے ری ایلیٹی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ دونوں کی ملاقات استنبول میں طے ہوگئی۔ جاسم کا پروڈیوسر تمام حالات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے سیریل میں جاسم کا رول ایک دوسرے کردار رحیم کو دیا اور جاسم کو یونٹ کے ساتھ استنبول روانہ کر دیا۔ پروڈیوسر سرمد صدیقی ناجیہ کے باپ غفار داؤد کا دوست تھا اس لیے صدیقی کی نظر میں اپنے سیریل سے زیادہ ناجیہ کی زندگی اور اس کی محفوظ واپسی کی اہمیت تھی۔ ڈیوڈ نے جاسم کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ استنبول میں ری ایلیٹی ٹی وی کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دے گا تو اس کی دوست نما محبوبہ کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈیوڈ کا وہ ری ایلیٹی ٹی وی ایک میگا پروجیکٹ تھا جس کی تمام تر شوٹنگ پُراسرار سرزمین مصر میں ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، جاسم کو استنبول پہنچ کر اس کے خاص آدمی بن عرفات سے ملاقات کرنا تھی۔ جاسم استنبول کے ایک معروف مقام گلاٹا برج کے نیچے بنے ہوئے زینان نامی ایک یونانی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں بن عرفات ماسٹر شیف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بن عرفات نے جاسم کے خون سے مذکورہ کنٹریکٹ پر دستخط کرالیے اور وعدے کے مطابق، اسے ناجیہ کی رہائی کی خوش خبری سنا دی۔ جاسم نے فون پر ناجیہ سے بات کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ وہ بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ محفوظ سائڈ پر تھا لہٰذا اس نے ڈیوڈ کے پروجیکٹ میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ڈیوڈ نے بن عرفات کے توسط سے جاسم کو اناغفیل کر کے ایک کروز شپ پر پہنچا دیا۔ جب جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک

بڑے بحری جہاز پر پایا۔ بعدازاں ڈیوڈ نے ایک مرتبہ پھر جاسم سے پُراسرار انداز میں سیلولر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ کروز شپ استنبول سے مصر کی بندرگاہ، پورٹ سعید تک جائے گا۔ پھر اس کے آدمی جاسم کو پورٹ سعید سے بہ ذریعہ جیپ قاہرہ پہنچادیں گے جہاں پر اس ری ایلیٹی ٹی وی کی افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔ ڈیوڈ نے ری ایلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ سے پہلے ہی جاسم کے ساتھ شکار اور شکاری کا جو کھیل شروع کردیا تھا، جاسم اسے انجوائے کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ڈیوڈ کی ہوشیاری کے سبب جاسم اس کا کھیل سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈیوڈ نے ہرٹیم کو بریف کردیا تھا۔ مصر کے حرم سے انہیں ایک صندوق حاصل کرنا تھا۔ جاسم کی مدد ایک جن زادی کررہی تھی۔ کچھ ممبران زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور باقی ہارنے والے تھے۔ جاسم کا رخ استنبول کی جانب تھا۔ دورانِ سفر انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا جہاز ہائی جیک کرلیا گیا ہے۔ جاسم اس صورتِ حال سے نمٹنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہائی جیکرز کو زیر کرتے ہوئے صورتِ حال کو اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ ہائی جیکرز کا ٹارگٹ استنبول کے جسٹس طلال حسنی تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ لینا چاہتے تھے۔ استنبول میں جاسم کا جسٹس حسنی سے بہت گہرا تعلق بن گیا تھا۔ جاسم ان کے بیٹے کو بھی بازیاب کراچکا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی ایسا سبق دیا تھا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتے۔ سلور کوئن کی ہدایت پر ڈیوڈ کو اب جاسم کے خلاف حتمی کارروائی کرنی تھی کیونکہ جاسم ان لوگوں کے خلاف بہت کچھ کرچکا تھا۔ ڈیوڈ اور حواری اب جاسم کا تعاقب کرتے ہوئے جسٹس حسنی کے ولا تک پہنچ چکے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

غار کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ لینا نے اپنی انگلی کے اشارے سے اس کنگ سائز وزنی پتھر کو دوبارہ اس کے اصلی مقام پر پہنچایا تو تاریکی میں اور بھی گہرائی پیدا ہوگئی۔ گویا وہاں پر ”ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے“ والا معاملہ ہوگیا تھا۔ اس صورتِ حال نے جاسم کو ذرا سا بھی پریشان نہیں کیا کیونکہ ایشتار کے چمتکار کی آئی ڈراپس نے اس کی آنکھوں کو اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت عطا کردی تھی۔

ایشتار کا خیال آتے ہی جاسم نے اپنے مزاج میں ایک عجیب سی کوفت اور بیزاری محسوس کی۔ آخری ملاقات میں اس نے جاسم سے وعدہ کیا تھا کہ دو مارچ کا سورج غروب ہونے سے پہلے وہ اس کے پاس آئے گی اور اسے...... ٹائم ڈائلیشن کی سائنس کا استعمال کرتے ہوئے تین سال آگے یعنی دوہزار تئیس میں پہنچادے گی اور اب...... تین مارچ کی صبح ہوچکی تھی لیکن ایشتار کا کہیں پتا نہیں تھا۔

”ایش نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی......!“ اس نے بہ زبان خاموشی خود سے کہا۔ ”پھر اس کے پُراسرار غیاب کا کیا مطلب ہے......؟“

”اُمید ہے، تمہیں اندھیرے میں چلنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی کیونکہ تمہاری آنکھیں اینٹی ڈارک لینس والی خاصیت کی حامل ہیں۔“ لینا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”چپ چاپ میرے پیچھے چلتے آؤ......!“

”جب تم میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو اور میرے کسی سوال کا جواب دینے کی تمہیں توفیق نہیں تو پھر یہ نشترکاری کس لیے......!“ جاسم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اور میں تو چپ چاپ تمہاری ہی پیروی کررہا ہوں۔“

”ویری گڈ......!“ اس نے مختصراً کہا۔

جب لینا نے پہلی بار جاسم کو مخاطب کیا تھا تو اس نے گفتگو کے لیے عربی زبان کا سہارا لیا تھا لیکن جلد ہی وہ مکسالوجی اسٹائل پر آگئی تھی۔ اب وہ بات چیت کے دوران میں جاسم کی دیکھا دیکھی، انگلش کے الفاظ بھی استعمال کرنے لگی تھی۔ اگرچہ لینا نے اپنی انگلی کے اشارے سے، ایک دیوہیکل پتھر کو بہ سہولت حرکت دے کر قابلِ تعریف اور ناقابلِ یقین کارنامہ انجام دیا تھا لیکن جاسم اس کے ”کام“ سے کماحقہ متاثر نہیں ہوسکا تھا۔ اِن لمحات میں اس کا ذہن پراگندہ خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

اس تاریک غار کی پتھریلی زمین پر کم وبیش دوسو میٹرز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد لینا کی معیت میں جاسم ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں ملگجی روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ روشنی درحقیقت غار کے ایک ایسے حصے سے پھوٹ رہی تھی جسے عرفِ عام میں کوئی کمرا یا پھر کوئی ہال گمان کیا جاسکتا تھا۔ گمان اس لیے کہ وہ پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس، ایک معیاری دروازے کے سائز کا مستطیل شکل خلا تھا جو اِدھر سے اُدھر اور اِدھر سے اُدھر آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

مذکورہ ”خلا“ کے نزدیک پہنچ کر لینا نے جاسم سے کہا۔ ”اندر چلے جاؤ۔ بابا اور وہ ہستی تمہارا انتظار کررہے ہیں۔“

جاسم نے لینا سے کوئی سوال جواب نہیں کیا اور کسی معمول کے مانند اس کمرے میں داخل ہوگیا جس کی طرف لینا نے اشارہ کیا تھا۔ وہ ”جگہ“ اپنی پیمائش کے لحاظ سے کمرا کم

اور ہال زیادہ نظر آ رہا تھا۔ جاسم نے جیسے ہی اندر قدم رکھا، اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ ہال میں روایتی فرشی نشست کا انتظام تھا جہاں دو ذی حیات موجود تھے جن میں سے ایک کی عمر اسّی سے متجاوز تھی۔ وہ ایک روشن آنکھوں والا باریش شخص تھا۔ یقیناً وہ لینا کا دادا ابوریان تھا لیکن جاسم کی حیرت کا باعث وہ دوسری ذات تھی جو ابوریان کے سامنے باادب بیٹھی ہوئی تھی اور...... وہ کوئی اور نہیں بلکہ ایشتار تھی......!

''ایش!'' ایشتار پر نگاہ پڑتے ہی جاسم گویا پھٹ پڑا۔ ''تمہیں تو دو مارچ کا دن ڈھلنے سے پہلے میرے پاس آنا تھا۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''اور اس وقت تین مارچ کا آغاز ہو چکا ہے۔ تم آخر تھیں کہاں......؟''

''جاسم باری!'' ابوریان نے اپنی غلافی آنکھیں اٹھا کر نہایت ہی نرم لہجے میں جاسم کو اس کے اصلی نام سے مخاطب کیا۔ ''یہاں آ کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پھر تفصیلی بات کرتے ہیں۔''

ابوریان کی شخصیت اتنی متاثر کن اور سحر طراز تھی کہ جاسم نے اس کی بات کے جواب میں اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں کہا اور کسی سحر زدہ انسان کی طرح، فرمانبرداری سے ابوریان کے سامنے جا کر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ گویا اب جاسم اور ایشتار پہلو بہ پہلو، لینا کے دادا کے پیشِ نظر تھے۔

''ایشتار پچھلے بیس گھنٹے سے یہاں میرے پاس موجود ہے۔'' ابوریان نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا اسے کسی بھی طور قصوروار یا غافل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہم سب تمہارے بیدار ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔''

ابوریان کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی۔ اس کی باتیں سیدھی جا کر دل میں اپنی جگہ بناتی تھیں۔ جاسم کو ایسا محسوس ہوا، وہ معمر شخص روحانی علوم کا ماہر ہے۔ جب اس کی ہونہار پوتی لینا اپنی انگلی کے اشارے سے ٹنوں وزنی پتھر کو حرکت کرنے پر مجبور کر سکتی تھی تو اس کے بابا کی طاقت و اختیار کا اندازہ لگانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

''حضرت! اگر میں سو رہا تھا تو مجھے جگایا جا سکتا تھا۔'' جاسم نے ابوریان کی طرف دیکھتے ہوئے احترام بھرے لہجے میں کہا۔ ''میری نیند اس کام سے زیادہ ضروری اور اہم نہیں تھی جس کے لیے ایشتار کو، دو مارچ کا سورج غروب ہونے سے پہلے میرے پاس آنا تھا......'' وہ لمحے بھر کو تھما پھر اضطراری انداز میں اضافہ کر دیا۔

''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ میں تیس گھنٹے تک بے خبر سوتا رہا ہوں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔''

اس دوران میں ایشتار بہ صد ادب و احترام چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی جانب سے ساری صفائی اور وضاحت کی ذمّے داری ابوریان نے اپنے سر لے رکھی تھی۔

''اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ تم نے تیس گھنٹے کی ایک طویل نیند لی ہے اور تمہاری یہ نیند اتنی زیادہ گہری تھی کہ اگر کوئی تمہارے سر پر ڈھول بھی بجاتا تو تمہاری آنکھ کھلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔'' لینا کے بابا نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں نے اپنے ایک خاص آدمی جہانگیر کے ذریعے تمہیں ان مصیبت انگیز حالات سے نکال کر الزبیٹا کی اس مسطح چٹان تک پہنچایا تھا تا کہ تم ایک طویل، بے خبر نیند لے سکو۔ تمہیں ابھی ٹائم ڈائلیشن کے جن مراحل سے گزرنا ہے، اس کے لیے تمہارا ایک طویل نیند لینا ضروری تھا۔ کیا تم نے ''جیٹ لیگ'' کا نام سنا ہے......؟''

''ہاں، سنا ہے اور اس کے بارے میں جانتا بھی ہوں۔'' جاسم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جب کوئی شخص بائی ائر، بارہ گھنٹے سے زیادہ کا سفر کر کے کسی ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں کا مقامی وقت اس کے آغاز سفر کے مقام سے کم از کم آٹھ گھنٹے آگے یا پیچھے ہوتا ہے تو وہ ''جیٹ لیگ'' کا شکار ہو جاتا ہے۔ یعنی نئی جگہ پر، اس کا سونا اور جاگنا کئی روز تک اس کی پرانی روٹین کے مطابق ہی ہوتا ہے اسی لیے امریکا سے پاکستان یا سعودی عرب آنے والے افراد دن میں سوتے ہیں اور رات میں جاگتے ہیں کیونکہ سعودی عرب اور امریکا کے مقامی وقت میں نو گھنٹے سے زیادہ کا فرق ہے اور پاکستان تو سعودی عرب سے بھی دو گھنٹے آگے ہے۔''

''شاباش!'' ابوریان نے ستائشی نظر سے جاسم کی طرف دیکھا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اب تم آسانی سے میری بات سمجھ جاؤ گے۔ ٹائم ڈائلیشن کے پروسس میں تم چند گھنٹوں کا نہیں بلکہ پورے تین سال کا سفر کرنے والے ہو جس کے نتیجے میں ہو سکتا ہے تمہیں ''ٹائم لیپس'' کے باعث کئی دنوں یا دو، تین ماہ تک نیند ہی نہ آئے لہٰذا اس پروسس سے پہلے تمہارے لیے ایک بھرپور نیند لینا ضروری تھا تا کہ تمہاری جسمانی اور ذہنی صحت کسی بھی حوالے سے متاثر نہ ہو۔ جیٹ لیگ اور ٹائم لیپس اگرچہ دو مختلف کیفیات ہیں لیکن ان دونوں کا تعلق کسی بھی ذی روح (انسان یا جانور) کی مسافرت سے ہے......''

''بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تو مجھے اس پُراسرار عمل سے کب تک گزارا جائے گا؟''

"ناشتے کے فوراً بعد۔" ابوریان نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تم نے سینتیس گھنٹے پہلے ہوٹل مینا کے ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا تھا۔ میرے اس غریب خانے پر تم پہلی بار آئے ہو اور اتفاق سے غریب الدّیار بھی ہو۔ تمہاری خاطرداری کرنا مجھ پر واجب ہو چکا ہے۔"

"قبلہ! کیا آپ مجھے ایک غریب الوطن...... محض ایک بھولا بھٹکا مسافر سمجھتے ہیں؟" جاسم نے ٹھہرے ہوئے مؤدب لہجے میں سوال کیا۔ "اور آپ حقِ میزبانی ادا کر کے میرے موجودہ معاملات سے بری الذمہ ہو جانا چاہتے ہیں؟"

"ایسی بات نہیں ہے برخوردار!" ابوریان نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "بھولے بھٹکے مسافروں کو کھلا پلا کر صحیح سمت دکھا دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جائیں لیکن تمہارا معاملہ ویسا نہیں ہے......" لحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"تم ایک چُنیدہ نوجوان ہو، ایک مجاہد ہو۔ قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے اسی لیے تمہیں گاہے بگاہے درست راہ نمائی ملتی رہتی ہے تاکہ تمہارا وہ کام آسان ہوتا چلا جائے جس کے لیے قدرت نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ قدرت کی یہی مشیّت ہے کہ تمہارے مشن میں، میں بھی اپنا حصہ ڈالوں۔ ایشتار کی ذمّے داری جہاں پر ختم ہو رہی ہے، وہاں سے آگے مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ ہم سب اللہ کے تخلیق کردہ کردار ہیں جو اسی کے لکھے ہوئے اسکرپٹ کے مطابق اپنا اپنا رول کرنے پر مجبور ہیں۔ ہماری پرفارمنس ہی اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ ہماری کارکردگی کس معیار کی رہی۔ ایشتار تمہیں ٹائم ڈائلیشن پروسس سے گزارنے کے بعد، ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنی نئی دنیا یعنی "مریخ" پر چلی جائے گی۔ یہ فیصلہ ہنگامی بنیادوں پر کیا گیا ہے ورنہ یہ دسمبر دو ہزار تیئس تک ضرور ہماری دنیا میں موجود رہتی۔ خیر، تم ایشتار سے باتیں کرو۔ میں تمہارے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کراتا ہوں۔"

بات کے اختتام پر ابوریان اس طرح اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے وہ بیس، بائیس سال کا گبرو جوان ہو۔ قبل اس کے کہ وہ اس کمرے سے باہر نکلتا، جاسم نے ایک نہایت ہی اہم سوال کر دیا۔

"حضرت! میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اور آپ کی پوتی لینا بھی ایشتار کی طرح بادی مخلوق ہیں؟"

"نہیں!" ابوریان نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ "ہم تمہاری طرح خاکی مخلوق ہیں لیکن قدرت یہ چاہتی ہے کہ ہم ناری، بادی اور آبی مخلوقات کے ساتھ مل کر کام کریں۔ سو، وقتاً فوقتاً ہمارا ان لوگوں کے ساتھ رابطہ رہتا ہے۔ تم ابھی تک خاکی کے علاوہ صرف بادی مخلوق یعنی ایشتار اور ظل ہطیا ہی سے ملے ہو۔ آگے آگے دیکھتے جاؤ، ہوتا ہے کیا......"

ابوریان کے جانے کے بعد جاسم نے ایشتار سے پوچھا۔ "کیا تم ہمیشہ کے لیے پلینٹ ارتھ (زمین) کو چھوڑ کر مریخ پر جانے والی ہو؟"

"ہاں، تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ اور اسی طرح کے دیگر کئی ایک ہنگامی فیصلے ظل ہطیا کی وصیت سامنے آنے کے بعد کیے گئے ہیں۔"

"کیسی وصیت؟" جاسم نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"انہوں نے اپنے پیچھے جو وصیت چھوڑی ہے، اس کے مطابق، مجھے اور ہماری چند فیملیز کو فی الفور مارس (مریخ) پر شفٹ ہونا ہے۔ ان کی وصیت میں واضح طور پر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب بھی کسی سیارے پر بود و باش کے امکانات پیدا ہوں گے اور ہمیں وہاں جانے کی اجازت مل جائے گی تو ہمارے بیشتر افراد کو اس سیارے پر منتقل کر دیا جائے گا۔ میں نے پچھلی ملاقات میں تمہیں بتایا تھا کہ میں اسی سلسلے میں ایک خاص نوعیت کا اگریمنٹ کرنے مریخ پر گئی تھی۔ اس معاہدے کی رُو سے ہمارے زیادہ تر افراد کو مریخ پر شفٹ کر دیا جائے گا جن میں میرا نام بھی شامل ہے۔ جس طرح اس کرۂ ارض پر ظل ہطیا ہم سب کے سردار تھے، ویسے ہی مریخ پر میں اپنے لوگوں کی لیڈر رہوں گی۔ ہمارے جو لوگ تمہاری زمین پر رہ جائیں گے، وہ ظل ہطیا کی وصیت کے مطابق، ابوریان کے حکم کے تابع ہوں گے۔ میں نے وہ منقش صندلیں باکس بھی بابا (ابوریان) کے سپرد کر دیا ہے۔ وہی اس کی حفاظت اور استعمال کے ذمّے دار ہوں گے۔ یہودیوں کو اس مقدس باکس کی تلاش ہے کیونکہ "تابوتِ سکینہ" تک پہنچنے کے لیے وہ ایک "گیٹ وے" کی حیثیت کا حامل ہے۔ اگر مذکورہ باکس ان کے ہاتھ لگ گیا تو تابوتِ سکینہ تک رسائی حاصل کرنا بھی ان کے لیے بہت آسان ہو جائے گا۔ تم سمجھ لو کہ صندلیں باکس درحقیقت، تابوتِ سکینہ کی کنجی ہے۔ اس سے تم بہ خوبی یہ اندازہ لگا سکتے ہو کہ منقش صندلیں باکس کا معاملہ کس قدر حساس اور نازک ہے۔"

"میں نے تابوتِ سکینہ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔" جاسم نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے

کہا۔ ''لیکن اس میں کیا حقیقت اور کیا افسانہ ہے، اس کے بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ تاریخ پر میرا مطالعہ زیادہ گہرا نہیں ہے۔''

''ذہن کو اُلجھانے کی ضرورت نہیں......!'' ایشتار معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میرا کام شروع ہونے سے پہلے بابا تمہیں تابوتِ سکینہ اور تھرڈ ٹیمپل کے حوالے سے درست معلومات فراہم کر دیں گے۔ یہودی سوچ اور ان کے ازلی ابدی عزائم کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ان دو موضوعات کی تہ میں غوطہ لگانا بہت ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے......!'' جاسم نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''میں ضرور یہ غوطہ خوری کروں گا لیکن اس سے پہلے تمہیں میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔''

''کون سا سوال؟'' ایشتار نے اُلجھن زدہ نظر سے اسے گھورا۔

''میں پورے تیس گھنٹے تک اس چٹان پر بے خبری کی نیند سوتا رہا......'' جاسم نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ نیند اتنی ہی ضروری تھی تو تم مجھے اس محفوظ غار کے اندر بھی سُلا سکتی تھیں۔ اس ویرانے میں کوئی بھی وحشی درندہ یا جنگلی جانور میری چیر پھاڑ کرنے ادھر آ سکتا تھا۔ تمہیں میرا کچھ تو خیال کرنا چاہیے تھا......؟''

''میں نے ہمیشہ تمہارا خیال کیا ہے اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ جاسم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اور تمہیں اس مسطح چٹان پر سلانے کا فیصلہ میرا نہیں، بابا کا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی بابا کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ باقی جہاں تک تمہاری حفاظت کا معاملہ ہے تو وہ مسطح چٹان اس کمرے جتنی ہی محفوظ جگہ ہے......!''

''ایش! یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جاسم نے سوال کر دیا۔

''میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کر رہی ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تمہیں اس چٹان پر گہری نیند سلانے کے بعد بابا نے تمہارے گرد ایک حصار قائم کر دیا تھا۔ تم وہاں موجود انسانوں اور جانوروں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اس طرف آنے والا کوئی بھی جاندار تمہیں دیکھ نہیں سکتا تھا، سوائے لینا کے...... اور لینا نے تم پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ تم جیسے ہی بیدار ہوئے، وہ تمہیں اپنے ساتھ اس غار میں لے آئی......!''

ایشتار بھی لینا کی طرح ابوریان کو ''بابا'' ہی کہہ رہی تھی اور اس کی بات چیت میں لینا کے دادا کے لیے موجود ادب و احترام سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ دل و جان سے ابوریان کو اپنا ''گرو'' مان چکی ہے! جاسم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو ایشتار نے تنبیہی انداز میں کہا۔

''خاموش...... بابا آ رہے ہیں۔''

اور جاسم واقعتاً خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

تین مارچ دو ہزار بیس عیسوی، صبح نو بجے نشا صباحی، استنبول کے ڈسٹرکٹ ''بیلک دُوزو'' کے ''کورل سٹی'' پروجیکٹ میں واقع ''کورل ولاز'' میں موجود تھی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اپنی شفٹ سے فارغ ہوئی تھی اور ائرپورٹ سے ٹیکسی پکڑ کر سیدھی طلال حسنی کے ولا پہنچ گئی تھی۔ حسنی اس وقت نشا کے سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نشا ہیجانی کیفیت کا شکار نظر آتی تھی۔ حسنی نے اپنے گھریلو ملازمین سے کہہ کر نشا کے لیے ناشتا لگوا دیا تھا۔ اسی دوران میں ان کے بیچ سنجیدہ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

''تو تمہاری پریشانی کا باعث وہ اشتہار ہے جو کل کے اخبارات میں شائع ہوا ہے؟'' حسنی نے معتدل انداز میں استفسار کیا۔

''کیا وہ اشتہار ہم سب کے لیے پریشانی کا سبب نہیں ہے سر؟'' نشا نے الٹا حسنی سے سوال کر دیا۔ ''مجھے تو کل رات ہی اس اشتہار کے بارے میں پتا چلا ہے۔ ہر وہ شخص جو جاسم سے ذرا سی بھی دلی ہمدردی رکھتا ہے، اسے فکرمند تو ہونا ہی چاہیے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو نشا!'' حسنی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی جاسم کے بارے میں سوچ کر گہری تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ بہرکیف......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے کھوجنے والی نظر سے نشا کو دیکھا اور پوچھا۔

''تم تو کامل کے ساتھ استنبول سے کراچی چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد تمہارا کوئی اتا پتا نہیں اور یہ بھی بتاؤ، تم واپس کب آئی ہو۔ کل کامل سے فون پر میری بات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم کراچی میں زیادہ دن رکی نہیں تھیں۔''

''کامل نے آپ کو غلط نہیں بتایا سر......!'' نشا نے رسان بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ جاسم کے بغیر کراچی میں میرا بالکل جی نہیں لگا اسی لیے جلد ہی میں واپس آ گئی۔ یہاں آ کر میں اپنے آبائی شہر کونیا چلی گئی تھی جو کہ آپ کا بھی آبائی علاقہ ہے۔ کونیا سے میں استنبول لوٹی تو میری ڈیوٹی شروع ہو گئی۔ بس......!'' وہ بولتے بولتے

اچانک تھم گئی۔ اس کے چہرے پر ایسے آثار پیدا ہوئے جیسے وہ کسی اندرونی تکلیف سے گزر رہی ہو۔ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''میں پرسوں صبح سے ڈیوٹی پر ہوں۔ کل شام میں میری ایک کولیگ نے مجھے جاسم کی گمشدگی والے اشتہار کے حوالے سے آگاہی دی ہے۔ میری وہ کولیگ ائر ہوسٹس، ہمارے اس مشن سے واقف ہے جو میں نے جاسم کے ساتھ مل کر آپ کو اور ہوائی جہاز کو ہائی جیکرز کے قبضے سے بہ حفاظت نکالنے کی غرض سے کیا تھا۔ وہ ائر ہوسٹس جاسم کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' نشا کی بات کو پورے انہماک کے ساتھ سننے کے بعد حسنی نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پاکستان سے ترکی آئے تین چار دن تو ہو ہی گئے ہیں۔ اس دوران میں تم نے ایک بار بھی جاسم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا کوئی خاص سبب ہے کیا......؟''

''ہاں......!'' وہ ایک طویل پژمردہ سانس چھوڑنے کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سپاٹ آواز میں بولی۔ ''میں دراصل جاسم کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں!'' حسنی نے استعجابیہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے رابطہ کرنے سے، جاسم بھلا کیونکر ڈسٹرب ہو جاتا......؟''

''سر! آپ ایک جہاندیدہ انسان ہیں۔ اگر میں آپ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کسی قسم کی ریاکاری یا دروغ گوئی سے کام لوں گی تو میرا جھوٹ آپ کی بصیرت اور تجربے سے مخفی نہیں رہے گا لہٰذا میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''سچی بات یہ ہے کہ میں جاسم کو پسند کرنے لگی تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرا ہو جائے لیکن جب ناجیہ یہاں آئی اور مجھے معلوم ہوا کہ جاسم، ناجیہ سے انگیج ہے اور...... اور بہت جلد ان کی شادی ہونے والی ہے تو...... تو جاسم کو پانے کی میری تمنا چکنا چور ہو گئی اور میں نے کباب میں ہڈی بننے کے بجائے جاسم سے دور رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ از خود جاسم سے رابطہ نہیں کروں گی۔ ہاں، اگر وہ مجھے کال کرے گا یا مجھ سے ملنا چاہے گا تو میں ضرور اس کی یہ خواہش پوری کروں گی۔ آپ بتائیں سر، میں کہاں غلط ہوں......؟''

اپنی بات کے اختتام پر نشا صباحی نے ہائی کورٹ کے سینئر جج کے لیے خاصا اہم سوال چھوڑا تھا۔ طلال حسنی نے بُردباری سے جواب دیا۔

''میں تمہارے جذبات، احساسات اور مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہوں اور میرے خیال میں تم کہیں بھی غلط نہیں ہو۔ یہ سب نصیب کا کھیل ہے اور...... اسی کھیل نے جاسم کو کچھ عرصے کے لیے ہم سب سے دور کر دیا ہے۔''

''اس کا...... کیا مطلب...... ہوا...... سر؟'' نشا نے حد درجہ اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''جاسم کو کس نے ہم سے دور کیا ہے اور کیوں سر......؟''

جواب میں طلال حسنی نے اسے جاسم کی گزشتہ چند روز کی ہنگامی ''مصروفیات'' سے آگاہ کر دیا۔ اس مصروفیت کے دو اہم باب تھے۔ نمبر ایک، اسد حسنی کی بہ حفاظت بازیابی۔ نمبر دو، جاسم کا پرسوں صبح والا وہ خونریز معرکہ جس میں اس نے اپنے دشمنوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کیا تھا۔

''مجھے اس بات کا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ جاسم کے دشمن کوئی سڑک چھاپ غنڈے یا معمولی حیثیت کے جرائم پیشہ لوگ نہیں ہیں۔'' حسنی کے خاموش ہونے پر نشا نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ آئیڈیا نہیں تھا کہ ولن پارٹی اتنی اونچی پہنچ والی ہو گی۔ کیا ہم اس اشتہار میں دیے گئے فون نمبر پر رابطہ کر کے جاسم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں......؟''

''ہرگز نہیں!'' حسنی نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''میں یہ کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔''

''پھر...... کیا نتیجہ رہا؟''

''بہت ہی بھیانک......'' حسنی نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں؟'' نشا پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

آئندہ پانچ منٹ میں حسنی نے اسے تازہ ترین حالات سے آگاہ کر دیا مگر ڈیوڈ اور رجالی ٹولے کا ذکر کیے بغیر۔ مناسب الفاظ کے چناؤ کے ساتھ اس نے نشا پر واضح کر دیا کہ جاسم کتنے طاقتور اور خطرناک لوگوں سے نبرد آزما ہے۔

''اوہ......!'' نشا ایک تشویش بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ لوگ اتنے بااثر ہیں کہ ہماری حکومت بھی کھل کر جاسم کی حمایت نہیں کر سکتی حالانکہ جاسم اور کامل نے ہمارے ملک اور خاص طور پر آپ کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔''

''یہ تمام تر حقائق اپنی جگہ مگر جہاں تک جاسم کے دشمنوں کے اختیارات کا معاملہ ہے تو اس کرۂ ارض کے بیشتر ممالک ان کی طاقت کے سامنے بے بس اور لاچار نظر آتے

ہیں۔ ہمیں کچھ عرصے تک جاسم سے لاتعلق رہنا ہوگا......''
''آخر کب تک؟'' حسنی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی نشا پوچھ بیٹھی۔
حسنی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ''جب تک جاسم کی مرضی ہوگی۔''
''جاسم کی مرضی!'' نشا نے الجھن زدہ نظر سے حسنی کی طرف دیکھا۔ ''سر! آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟''
حسنی نے اسے، کابل سے ہونے والی اپنی گفتگو کے خلاصے سے آگاہ کرنے کے بعد معتدل انداز میں کہا۔ ''جاسم جب بھی اپنے دشمنوں کو کوئی بڑا نقصان پہنچاتا ہے تو اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے منظرِ عام سے غائب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنوں سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھتا مبادا اس کے دشمن ان کے لیے خطرناک ثابت ہوں۔ جب وہ حالات کو اپنے اور اپنوں کے لیے سازگار سمجھتا ہے تو خود ہی ان کے رابطے میں آجاتا ہے لہٰذا ہمیں انتظار کرنا ہوگا کہ کب جاسم ہم سے کانٹیک کرتا ہے......!''
''اگرچہ جاسم کو ایسے کڑے حالات میں تنہا چھوڑ دینا سراسر بزدلی اور بے غیرتی ہے لیکن آپ نے اس کے حالات کی جو تفصیل بتائی ہے، اس کے پیشِ نظر جاسم کے از خود منظر پر نمودار ہونے تک انتظار کرنا ہماری مجبوری ہے۔'' نشا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سو، ہم انتظار کریں گے۔''
''ہمارے پاس کوئی اور آپشن بھی تو نہیں ہے۔'' حسنی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم اگر ہر احتیاط اور ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر جاسم کی مدد کا فیصلہ کر بھی لیں تو ہمارے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ اس سوال کی صورت کھڑی ہوگی...... کیسے مدد کریں؟ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے، وہ اس وقت ہے کہاں......؟''
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر......'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت ہم واقعتاً بے بس ہیں۔ خیر، سب کا وقت آتا ہے...... ہمارا بھی آئے گا۔''
''اِن شاء اللہ!'' حسنی نے تہِ دل سے کہا۔
نشا صباحی نے مزید چند منٹ طلال حسنی کے ولا میں گزارے پھر یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔
''سر! میں پوری رات کی جاگی ہوئی ہوں۔ اس وقت مجھے بہت زور کی نیند آرہی ہے۔ میں اپنے ٹھکانے پر جا کر ایک بھرپور نیند لینا چاہتی ہوں۔''
''ٹھیک ہے...... کام کے ساتھ آرام بھی ضروری ہے۔'' حسنی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ہم رابطے میں رہیں گے۔ جیسے ہی کسی کو جاسم کی کوئی خبر ملے گی، وہ دوسرے کو اس سے آگاہ کرے گا۔''
''ڈیل سر!'' نشا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ سے بات چیت کے دوران میں ٹیکسی کو بلا لیا تھا۔ مذکورہ ٹیکسی آپ کے ولا کے سامنے پہنچ چکی ہے۔ اب مجھے جانا ہو گا۔ آپ سے رابطہ رہے گا۔''
حسنی بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نشا کو الوداع کرتے ہوئے اس نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''جاسم ہمارا ہیرو ہے۔ ہم اپنے ہیرو سے زیادہ عرصے تک دور نہیں رہ سکتے۔ ان شاء اللہ! اس سے بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی۔''
''اِن شاء اللہ!'' نشا نے بھی چٹانی لہجے میں کہا۔
نشا صباحی اپنی ایک اسکول ٹیچر دوست نورا کے ساتھ ''تقسیم اسکوائر'' کے علاقے میں رہتی تھی۔ ان کی مختصر سی وہ رہائش گاہ ''ٹائم اپارٹمنٹس'' نامی ایک رہائشی عمارت میں واقع تھی۔
کورل وِلا سے تقسیم اسکوائر کی طرف جاتے ہوئے وہ مسلسل جاسم ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسی دوران میں اسے خود پر غصہ بھی آیا کہ کراچی سے استنبول آنے کے بعد اس نے جاسم سے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا۔ جاسم اور ناجیہ کے رشتے کے بارے میں جان لینے کے بعد اس نے جاسم کی زندگی سے نکل جانے کا اصولی فیصلہ کیا تھا۔ حالات اور عقل مندی کا یہی تقاضا تھا لیکن دل کے معاملات سمجھ بوجھ اور قواعد ضوابط کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کے سامنے تمام اصولی فیصلے ریت کی دیوار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ان لمحات میں وہ بے حد جذباتی ہو کر دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی۔
''میرا یہ فیصلہ درست نہیں تھا کہ میں از خود جاسم سے رابطہ نہیں کروں گی۔'' اس نے بہ زبانِ خاموشی اپنے آپ سے کہا۔ ''اگر اس کی زندگی کی ساتھی ناجیہ ہی کو بننا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی دوسری عورت اس سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے بہت غلط کیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا، جاسم اور ناجیہ اس وقت کہاں ہیں اور وہ کب لوٹ کر استنبول آئیں گے اور...... اور کبھی وہ اس طرف آئیں گے بھی یا نہیں......!''
اس کی خود کلامی کے آخری حصے نے اسے افسردہ کر دیا۔ اس کے اندر کوئی آبگینہ ایک بے آواز ''چھناکے'' سے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا اور اس کی تلوار دھار نکیلی کرچیوں نے نشا کے اندرون کو لہولہان کر دیا تھا۔ جاسم سے مستقل جدائی کے تصور نے اس کی روح کو اذیت کے سوہان پر چڑھا دیا تھا۔ وہ سوچ کی اسی کشاکش میں الجھی ہوئی تھی کہ ڈرائیور نے ٹیکسی کو

سڑک کے کنارے لگادیا۔

ٹیکسی کو روکنا ڈرائیور کا ذاتی فیصلہ نہیں تھا۔ نشا نے دیکھا، ایک ٹریفک پولیس آفیسر نے باقاعدہ ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا تھا۔ ٹیکسی کے رکتے ہی وہ پولیس آفیسر ڈرائیونگ سائڈ پر آگیا اور اس نے ونڈو گلاس پر دستک دینے کے بعد ڈرائیور کو شیشہ گرانے کا اشارہ کیا۔

ڈرائیور نے فوراً سے پیشتر آفیسر کے حکم کی تعمیل کر دی۔ ونڈو گلاس کے ڈاؤن ہوتے ہی آفیسر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”مسٹر! تم نے سگنل توڑا ہے۔ اس قانونی خلاف ورزی کے لیے مجھے تمہیں جرمانے کا ٹکٹ دینا ہوگا۔“

اس وقت وہ لوگ استقلال اسٹریٹ سے نکل کر تقسیم اسکوائر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لگ بھگ سو گز پیچھے وہ ایک ٹریفک سگنل سے گزرے تھے اور نشا کو اچھی طرح یاد تھا کہ ڈرائیور نے مذکورہ سگنل پر ٹیکسی روکی تھی اور جب تک سگنل لائٹ گرین نہیں ہوگئی، ان کی ٹیکسی آگے نہیں بڑھی تھی۔ گویا، وہ آفیسر سراسر غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ یہی بات ڈرائیور نے بھی اس ٹریفک پولیس آفیسر کو بتائی۔

”سر! میں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی نہیں کی۔“ ڈرائیور نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ”شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”پیپرز......!“ وہ پولیس آفیسر سنی اَن سنی کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ”گاڑی سے باہر آجاؤ اور مجھے اپنا ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کے کاغذات دکھاؤ۔“

ڈرائیور کے پاس کوئی بھی پیپر کم نہیں تھا چنانچہ وہ کسی پریشانی کا مظاہرہ کیے بغیر انجن کو سوئچڈ آف کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔

آفیسر نے نشا سے سوال کیا۔ ”اس ٹیکسی والے نے آپ کو کہاں سے پک کیا تھا؟“

”کورل سٹی سے۔“ نشا نے معتدل انداز میں جواب دیا۔

”اور آپ کی منزل کون سی ہے......؟“ آفیسر نے پوچھا۔ ”میرا طلب ہے، یہ آپ کو کہاں ڈراپ کرے گا؟“

”ٹائم اپارٹمنٹس، تقسیم اسکوائر......!“

”او کے!“ آفیسر نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی اور ڈرائیور کو لے کر ٹیکسی سے تھوڑے فاصلے پر چلا گیا۔ وہ اپنی کارکردگی سے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے ٹیکسی اور ڈرائیور کے پیپرز کی چیکنگ کر رہا ہو لیکن اسی دوران میں وہ نگاہ اٹھا کر گاہے بہ گاہے ٹیکسی کی عقبی سمت بھی دیکھ رہا تھا۔ نشا کو آفیسر کا یہ انداز خاصا مشکوک لگا۔ اس کی چھٹی حس نے پکارا کہ وہ آفیسر گڑبڑ ہے۔ اس نے کسی خاص مقصد کی خاطر ان کی ٹیکسی کو وہاں رکوایا ہے۔ قبل اس کے کہ نشا اپنی چھٹی حس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے کوئی ہنگامی حفاظتی قدم اٹھاتی، اچانک وہاں کا نقشہ ہی بدل گیا۔

ٹیکسی کے عقب سے دو افراد کسی چھلاوے کے مانند نمودار ہوئے اور انہوں نے آن کی آن میں کسی آسیب کی طرح اس ٹیکسی کو اپنی ”تحویل“ میں لے لیا۔ ان میں سے ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور دوسرا عقبی نشست کا دروازہ کھول کر نہ صرف نشا کے پہلو میں آبیٹھا تھا بلکہ اس نے ایک گن کی سرد نال کو اس کی پسلیوں کے اندر گھساتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

”چپ چاپ بیٹھی رہو۔ اگر تم نے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو اس سائیلنسر لگی گن سے ایک خطرناک سُریلی آواز ابھرے گی اور نائن ایم ایم کی بے رحم گولی تمہاری پسلیوں کی دوسری طرف سے باہر نکل جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی تمہاری روح کو یہ خوب صورت بدن بھی چھوڑنا پڑے گا۔“

اس گن بردار کی دھمکی میں ایسی وحشت بھری ہوئی تھی کہ نشا عقبی نشست پر فریز ہو کر رہ گئی۔ اس دوران میں، ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے والا دوسرا غنڈا ٹیکسی اسٹارٹ کر کے وہاں سے آگے بڑھ چکا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوگیا تھا کہ باوجود کوشش کے بھی نشا کی سمجھ نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا اور اب تک وہ ایک بدمعاش کے گن پوائنٹ پر تھی اور دوسرا بدمعاش اس ٹیکسی کو کسی نامعلوم سمت میں اڑائے لیے جا رہا تھا۔

نشا کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسے اغوا کرنے والے کون لوگ تھے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس پولیس آفیسر نے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ بہرکیف، ایک بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں جگہ بنا چکی تھی کہ وہ ٹریفک پولیس آفیسر سراسر ایک فراڈ اور ان دونوں غنڈوں کا ساتھی تھا۔ اس نے سگنل توڑنے کا بہانہ کر کے ٹیکسی رکوائی تا کہ اس کے ساتھی بہ آسانی نشا کو اغوا کر سکیں اور وہ واقعتاً اغوا ہو چکی تھی۔

نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لینے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ والے اغوا کار نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے اپنی گن کو ائر ہوسٹس کی پسلیوں سے ٹکا رکھا ہے؟“

ڈرائیو کرنے والے اغوا کار نے اپنے ساتھی کو کسی نام

سے نہیں پکارا تھا لیکن اس کی زبان سے ''ائر ہوسٹس'' کے الفاظ سن کر نشا چونک اٹھی تھی۔ وہ ان دونوں غنڈوں کو نہیں جانتی تھی مگر یہ واضح ہو گیا کہ وہ دونوں اسے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔

''ہاں، بالکل!'' نشا کے پہلو میں موجود گن بردار نے قطعی انداز میں جواب دیا۔ ''میں اپنے کام سے غافل نہیں ہوں۔''

''تو پھر دیر کس بات کی؟'' ڈرائیور نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ہم چند منٹ میں اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ یہ ائر ہوسٹس استنبول کی ایک ایک سڑک سے اچھی طرح واقف ہے۔ اگر یہ اپنے ہوش و حواس میں رہی تو اسے ہمارے ٹھکانے کا علم ہو جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''سمجھ گیا!'' عقبی نشست پر موجود غنڈے نے مختصر جواب دیا۔

اپنی مختصر بات کو مکمل کرتے ہی اس بندے نے سائیلنسر لگی گن کا ٹریگر دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے نشا کو اپنے پہلو میں چبھن کا احساس ہوا جیسا کہ انجکشن لگواتے وقت سوئی کی چبھن محسوس ہوتی ہے۔ درحقیقت وہ کوئی سائیلنسر لگی گن نہیں تھی بلکہ گن کے سائز اور ساخت کی وہ انجکشن گن تھی اور اس کی مائیکرو نیڈل میں سے خارج ہونے والے زود اثر لیکویڈ نے نشا کے جسم میں داخل ہوتے ہی، بجلی کی سی سرعت سے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ اس لمحاتی چبھن کے احساس کے بعد اس کے حواسِ خمسہ ''لمبی تان'' کر ''سو'' گئے تھے۔

وہ اغوا کنندگان معمر یہودی جیکب کی ٹیم کا حصہ تھے۔ سلور کوئین نے آخری میٹنگ میں استنبول کے معاملات جیکب کے سپرد کر دیے تھے۔ جاسم، ناجیہ، نشا، قاموس اور حسنی...... سب اسی ٹیم کی نگرانی میں تھے۔ جاسم کو تو دیکھتے ہی اُڑا دینے کا حکم تھا اور جب تک وہ قابو میں نہیں آتا، اس کے ہمدرد ساتھیوں کو اپنی کسٹڈی میں لے کر کڑی تفتیش کے احکامات جاری کر دیے گئے تھے اور ان میں سے جو، جو بھی جاسم سے وفاداری نبھاتے ہوئے اپنی زبان کھولنے کو تیار نہ ہو، اسے بیدردی سے ''رت کے گھاٹ اتار دینے کا حکم تھا۔ جیکب خود تو ''آئل آف مین'' کے ایک قدیم شہر ''کاسل ٹاؤن'' میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کی ترتیب دی گئی ''ٹیم'' استنبول میں پوری طرح سرگرمِ عمل تھی۔ نشا صباحی کا پُراسرار اغوا بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

نشا کے حواس بحال ہوئے تو اس نے خود کو ایک عام سے کمرے میں پایا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی مگر اس کا یہ ''بیٹھنا'' بڑا اذیت ناک تھا۔ اس کے بدن کو نائیلون کی مضبوط ڈوری کی مدد سے، کرسی کے ساتھ اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کی گردن، کمر، بازو، ٹانگیں...... وغیرہ سب اس ظالم ڈوری کی جکڑ میں اس قدر مجبور اور لاچار تھے جیسے ایک انسان کی جان کسی منحوس صورت جادوگرنی کی مٹھی میں قید ہو۔ بس، وہ اپنی کھلی آنکھوں سے سامنے دیکھ سکتی تھی، کانوں سے سن سکتی تھی، ناک سے سونگھ سکتی تھی، زبان سے بول سکتی تھی اور دماغ سے سوچ سکتی تھی۔

اس نے اپنے سامنے کرسی پر ایک مسلح شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا اور سوچا کہ وہ اس کا کوئی دشمن ہی ہو سکتا ہے۔ نشا کا ذاتی دشمن تو کوئی بھی نہیں تھا۔ لہٰذا اسے سوچنا پڑا کہ وہ لوگ جاسم یا پھر طلال حسنی کے رقابت دار اور بدخواہ ہو سکتے ہیں۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ جاسم کے ''قرابت داروں'' نے ہی اسے اغوا کیا تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے ہمت کر کے، اپنے سامنے موجود شخص سے سوال کیا۔

نشا کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس مسلح شخص نے اپنا سیل فون اٹھایا اور نشا کے استفسار کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے کوئی نمبر ملایا اور دوسری جانب رابطہ ہونے پر اس نے مؤدب لہجے میں بتایا۔

''میڈم! وہ بیدار ہو گئی ہے۔''

اس بندے کی اس مختصر اطلاع میں ''وہ'' تو یقیناً نشا ہی تھی لیکن ''میڈم'' کے حوالے سے نشا کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکی۔ اس مسلح آدمی نے اپنی میڈم کو اطلاع دینے کے بعد سیل فون ایک طرف رکھ دیا تھا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے......'' نشا نے اس بندے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سوال کو بہ انداز دیگر دہرایا۔ ''تم لوگوں نے مجھے کیوں اغوا کیا ہے۔ تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے......؟''

نشا کو کوئی لولا لنگڑا یا صحت مند جواب دینے کے بجائے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنی نگاہیں کمرے کے دروازے پر جما دیں۔ اسی لمحے نشا نے کمرے کے باہر قدموں کی آواز سماعت کی۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا اور قدموں کی چاپ اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ کوئی عورت ہے جس نے اپنے پاؤں میں ہیل والی سینڈل پہن رکھی ہے۔ سو، اس مسلح شخص کی ''میڈم'' اس کمرے کی طرف آ رہی تھی۔

جب وہ عورت سامنے آئی تو نشا کے دماغ کو حیرت کا

ایک جھٹکا سا لگا اور اس کا دھیان آپوں آپ کئی روز پہلے کے اس خوں چکاں واقعے کی طرف چلا گیا جب طلال حسنی کو ریسکیو کرنے کے لیے اس نے جاسم کے ساتھ مل کر ٹرکش ائر لائنز کے ہوائی جہاز میں لرزہ خیز خون خرابا کیا تھا۔ اسی مار اماری اور خوں ریزی میں جاسم نے ہائی جیکرز کی ایک ساتھی کے کندھے کو محض ایک فٹ کے فاصلے سے نشانہ بناتے ہوئے گولی چلا دی تھی۔ اس حسین و جمیل مگر شقی القلب عورت نے اسی ہاتھ میں پکڑی ہوئی سائیلنسر لگی گن سے طلال حسنی کو اپنے نشانے پر لے رکھا تھا۔ انتہائی نزدیک سے کیے گئے فائر نے اس عورت کے شانے کے پرخچے اُڑا دیے تھے۔ بعدازاں اس مجرم ذہن دلکش عورت کو اس کے ایک گھائل فرید نامی ہائی جیکر ساتھی سمیت سائپرس پولیس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

وہ سفاک عورت پولیس کی تحویل سے کیسے چھوٹی، اس بارے میں نشا کو کچھ معلوم نہیں تھا البتہ وہ پہلی ہی نظر میں اسے پہچان گئی تھی۔ جاسم نے اس کے شانے کے ساتھ جو حشر خیز سلوک کیا تھا، اس کی یادگار نشانی باقی رہ گئی تھی۔ اس کے چکنا چور کندھے کی ''مرمت'' نہ ہوسکنے کے باعث مجروح بازو کو ہی بدن سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس کی شرٹ کی دونوں آستینیں اپنی جگہ پر موجود تھیں مگر ندارد بازو والی آستین اپنے خالی پن پر پشیمانی بھرے انداز میں اِدھر اُدھر جھول رہی تھی......

وہ دُختِ فتن و فتور لیلیٰ حسینی تھی۔

☆☆☆

چار روز تک سرکاری اسپتال میں زیرِ علاج رکھنے کے بعد پولیس نے شعیب چاچا کو ضروری بندوبست کے ساتھ استنبول سے کراچی روانہ کر دیا تھا۔ جب تک وہ استنبول کے جنرل اسپتال میں ایڈمٹ رہا، وہاں کے ڈاکٹرز صرف اس کی بلیڈنگ ہی کو روک پائے تھے اور وہ بھی سو میڈیکل جتن کے بعد کیونکہ جاسم اور کامل نے اسے جس انتقامی سلوک سے ''گزارا'' تھا اس کی ''برکات'' سے وہ ایک ''سند یافتہ'' لاعلاج مریض بن چکا تھا۔ عرفِ عام میں اسے جیتا جاگتا ایک نمونۂ عبرت کہا جاسکتا تھا۔

جاسم اور کامل کے دل و دماغ میں اس نجس انسان کے لیے نفرت، غصے اور انتقام کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان کے ہتھے کیا چڑھا کہ پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ان دونوں نے بڑی کاری گری سے اپنے شکار کو ناکارہ کر دیا تھا۔ شعیب چاچا اپنی اس بھیانک حالت کے علاوہ اپنے حواسِ خمسہ میں سے چار (دیکھنے، سننے، بولنے اور چھونے) حسیات کو سدا کے لیے کھو چکا تھا۔ بس، اس کی ناک سلامت تھی، اپنی پانچویں سونگھنے کی حس کے ساتھ۔ یہ وہی ناک تھی جس پر وہ مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا اور اب اس کا سارا غرور خاک میں مل چکا تھا اور اس کا شمار مُردوں سے بدتر زندوں میں ہونے لگا تھا۔ اس کے دریدہ اور بُریدہ جسدِ خاکی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا کہ اس بدبخت کو آخر زندہ کیوں چھوڑا گیا تھا......؟

اس سنسنی خیز سوال کا جواب صرف دو افراد کو معلوم تھا یعنی جاسم اور کامل کو...... اور کامل اس وقت ایس پی احسان الحق کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ان کی دوسری ملاقات تھی۔ پہلی بار ناجیہ کے توسط سے کامل ایس پی صاحب سے ملا تھا اور اسے شعیب چاچا کے بارے میں خاصی تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا۔

ایس پی احسان الحق اگرچہ ایک دیانت دار اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ وہ مرحوم سرمد صدیقی کا بہت گہرا دوست بھی تھا۔ وہ استنبول میں شعیب کے ساتھ پیش آنے والے اس لرزہ خیز واقعے سے بھی بہ خوبی آگاہ ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود بھی کامل نے کچھ اہم معاملات کو صیغۂ راز ہی میں رکھا تھا اور کمشنر پولیس قاموس ترک کی اس کہانی کی تصدیق کر دی تھی جو قاموس نے اَنیشنل میڈیا اور پریس کو سنائی تھی یعنی وہ خوں چکاں اور عبرت ناک واقعہ بین الاقوامی مجرموں اور شعیب چاچا کے آپسی تنازعات کا شاخسانہ تھا۔ کامل فی الحال خود کو اور جاسم کو پوری طرح ایس پی پر عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کوئی بھی شخص پہلی ملاقات میں قابلِ اعتبار نہیں ٹھہرتا، چاہے وہ کسی ڈپارٹمنٹ کا سربراہ ہو یا پھر کسی ملک کا۔ اعتبار، اعتماد اور بھروسے کا تعلق انسان کے مقام اور رتبے سے نہیں بلکہ اس کی اوقات اور نیت سے ہوتا ہے اور ان چیزوں کو سمجھنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔

کامل نے ایس پی احسان الحق سے چھوٹا یا بڑا کوئی بھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ہاں البتہ، اس نے سچ کے ایک حصے کو اس سے چھپایا ضرور تھا اور یہ سب مصلحت اور نظریۂ ضرورت کا تقاضا بھی تھا۔ ویسے کامل نے وحیدالدین نام کے ایک فرضی شخص کی طرف سے، شعیب چاچا کے لیے ہوٹل ''دی رٹز کارلٹن'' کے ریسیپشن پر جو خط چھوڑا تھا، اس کو بنیاد بنا کر قاموس ترک نے ایک ایسی سنسنی خیز اور قابلِ ہضم کہانی بنی تھی جس پر دوسرے لوگوں کے علاوہ ایس پی احسان الحق کو بھی یقین آ گیا تھا اس لیے ایس پی نے اس حوالے سے کامل کو زیادہ کُریدنے کی کوشش نہیں کی تھی اور...... آج تین مارچ کی صبح ان کی دوسری ملاقات ہو رہی تھی۔

''گزشتہ روز دو اہم واقعات رونما ہوئے ہیں......!'' احسان الحق نے کامل کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اسی لیے میں نے تمہیں آج صبح ہی اپنے آفس میں بلا لیا ہے تاکہ اس ایشو پر کھل کر بات ہو سکے......!'' لمحے بھر کو رک کر اس نے کامل سے پوچھا۔ ''میں تمہارے لیے ''آپ'' کے بجائے ''تم'' کا صیغہ استعمال کر رہا ہوں۔ تم اسے مائنڈ تو نہیں کر رہے ہو نا......؟''

''نو سر!'' کامل نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور آپ کا شمار صدیقی صاحب کے مخلص دوستوں میں ہوتا ہے جو قضائے الٰہی سے اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ صدیقی صاحب مجھے اور جاسم کو ''تم'' اور ''بیٹا'' کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتے تھے۔ آپ کے مجھے ''تم'' کہہ دینے سے میرے لیے کوئی ایشو نہیں ہے سر، بلکہ اس سے اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ خیر...... آپ دو اہم واقعات کا ذکر کر رہے تھے......''

کامل نے اپنی بات کو یاددہانی کرانے والے سوالیہ انداز پر ختم کیا تو ایس پی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پہلا اہم واقعہ تو شعیب چاچا کی واپسی کا ہے۔ کل شام میں ایف آئی اے والوں نے اس کے آدھے ادھورے جسم کو ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ استنبول سے کراچی پہنچنے کے بعد اسے ''ایف آئی اے'' نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ انہوں نے اپنی ضروری کارروائی کرنے کے بعد شعیب کو ہمارے سپرد کر دیا ہے۔ میں چونکہ پہلے ہی اس کیس پر کافی کام کر چکا ہوں اس لیے اس معاملے کو آگے بھی مجھے ہی دیکھنا ہے۔ ویسے استنبول پولیس نے شعیب کے ساتھ ہی اس کے کالے کرتوتوں کے اتنے زیادہ ثبوت بھی بھیج دیے ہیں کہ میرا کام بہت آسان ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ تم نے بھی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس لعین کے خلاف ٹھوس ثبوت فراہم کرو گے...... ہیں نا؟''

اپنی بات مکمل کرنے سے پہلے ہی اس نے سوالیہ نظر سے کامل کی طرف دیکھا تو کامل نے معتدل انداز میں جواب دیا۔

''سر! مجھے اپنا وعدہ یاد ہے اور میں آپ کے لیے ''بہت کچھ'' اپنے ساتھ بھی لایا ہوں جو آپ کے مشن کو فاسٹ ٹریک پر ڈال دے گا۔ آپ اپنا بیان مکمل کر لیں تو پھر میں آپ کو بریف کرتا ہوں۔''

''او کے......!'' احسان الحق نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''پہلا اہم واقعہ تو شعیب کی واپسی سے متعلق تھا اور دوسرے اہم واقعے کا تعلق براہِ راست تمہارے دوست سے ہے۔ تم نے کل کے اخبارات میں جاسم کی گمشدگی والا اشتہار تو دیکھا ہو گا......؟''

''یس سر! وہ اشتہار میری نظر سے بھی گزرا ہے۔'' کامل نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور میں سمجھتا ہوں، اس اشتہار نے آپ کے ذہن کو حد درجہ اُلجھا رکھا ہے لیکن جب میں اس کی وضاحت کروں گا تو آپ کی تسلی ہو جائے گی۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو......'' ایس پی اضطراری لہجے میں بولا۔ ''جاسم کا معاملہ میرے سر کے اوپر سے گزر گیا ہے۔ بھلا کسی گمشدہ نوجوان کی بازیابی کے لیے اتنا بھاری انعام کون رکھ سکتا ہے اور وہ بھی امریکی ڈالرز میں...... اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ڈھونگ محض جاسم کو سامنے لانے کی غرض سے رچایا گیا ہے۔ ون ملین یو ایس ڈی کوئی معمولی

رقم نہیں ہے۔ پھر اس اشتہار میں جاسم کو ایک ادرب پچ نوجوان بتایا گیا ہے جو کہ سراسر غلط بیانی ہے۔ اسی طرح جاسم کا ذہنی توازن ٹھیک نہ ہونے والی بات بھی میرے حلق سے نہیں اتری۔ مرحوم صدیقی صاحب کی زبانی میں نے جاسم کے بارے میں جو کچھ بھی سن رکھا ہے، وہ اشتہار والے جاسم پر پورا نہیں اترتا......!"

"سر! آپ کا دماغ بالکل درست سمت میں سوچ رہا ہے۔" کامل نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ اشتہار صرف کراچی ہی کے اخبارات میں شائع نہیں ہوا بلکہ کراچی کے علاوہ استنبول اور تبوک کے مقامی اخبارات میں بھی جاسم کی گمشدگی اور بازیابی کے لیے وہ ون ملین ڈالرز انعام والا پُرکشش اشتہار شائع کیا ہے۔ جاسم نے گزشتہ دنوں استنبول اور تبوک میں اپنے دشمنوں کو بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے بعد وہ منظر سے اس طرح غائب ہو گیا جیسے وہ کبھی اس کرۂ ارض پر تھا ہی نہیں۔ جاسم کے دشمن اسے پہلی فرصت میں موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ کراچی، استنبول یا تبوک میں کہیں پایا جاسکتا ہے۔"

"جاسم کے دشمن......!" ایس پی نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "آخر وہ لوگ ہیں کون اور جاسم کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ کیا تم مجھے اس بارے میں کھل کر بتاؤ گے؟"

احسان الحق کے سوال میں دلچسپی، حیرت، بے یقینی، تجسس، کھوج اور جانے کیا کیا کچھ پایا جاتا تھا۔ کامل کے انکشاف نے اسے سنسنی خیز اضطرابی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

"میں آپ کو سب کچھ کھل کر ہی بتاؤں گا سر!" کامل نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک چھوٹی سی تصحیح کے بعد......!"

"کیسی تصحیح؟" ایس پی نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"آپ کے بیان کی تصحیح سر!" کامل نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "آپ نے فرمایا، کل دو اہم واقعات رونما ہوئے ہیں مگر آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ گزشتہ روز دو نہیں بلکہ تین اہم واقعات کا ظہور ہوا ہے......"

"تیسرا واقعہ......!" بے ساختہ ایس پی کے منہ سے نکلا۔ "تمہارا اشارہ کس واقعے کی طرف ہے؟"

"میں شادمان ٹاؤن کے ایک بنگلے میں ہونے والی خونریزی کی بات کر رہا ہوں سر!" کامل نے حد درجہ سنجیدہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "گزشتہ روز رات کے



"احمق اسے نکالنے کے لیے کس نے کہا ہے یہ تو انجن ہے"

ابتدائی حصے میں وہاں دو انسانوں اور ایک وفادار جانور کو بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے اور بدقسمتی سے وہ بنگلا آج کل میرے استعمال میں تھا۔ ہلاک ہونے والے دونوں افراد میرے جاں نثار ساتھی تھے اور "رستم" نامی پالتو کتا میرا محافظ اور چوکیدار۔ میں نے جن دو انسانوں کی ہلاکت کا ذکر کیا ہے، ان کے نام عتیق اور اعجاز ہیں......!"

"اوہ......!" ایس پی نے افسوس بھری نظر سے کامل کی طرف دیکھا اور ہمدردی آمیز لہجے میں بولا۔ "مجھے اس خوں چکاں واقعے کی خبر ہو گئی تھی لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ یہ اندوہناک سانحہ تمہارے اپنوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ آئی ایم سوری کامل بیٹا!"

کامل نے گزشتہ رات والے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے دانستہ ان چار مسلح حملہ آوروں کا ذکر نہیں کیا تھا جن میں سے تین اس کے ہاتھ سے واصلِ جہنم ہوئے تھے اور ایک کو عتیق نے گولی مار کر دوزخ کی فلائٹ پر سوار کرایا تھا۔ اس صرفِ نظر کا بنیادی ٹھوس سبب یہ تھا کہ کامل کے وثوق کے مطابق، وہ چاروں افراد ڈیوڈ کے بھیجے ہوئے تھے اور ان کے بیک اَپ کے لیے دو بڑے سائز کی ایمبولینس میں، نصف درجن پیشہ ور خطرناک مجرم، میڈیکل اور پیرامیڈیکل اسٹاف کی شکل میں، اپنے ان ساتھیوں کو "ریسکیو" کرنے وہاں پہنچے تھے جنہوں نے پولیس کی آمد سے قبل ہی اس بنگلے کی "سچویشن" کو اپنے حق میں ہموار کر لیا تھا۔ حالانکہ کامل نے اس بنگلے کی چھت پر کھڑے ہو کر اپنے کسی آدمی کو حکم دیا تھا کہ وہ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے کر فوراً وہاں پہنچنے کے

لیے کہے لیکن حالات وواقعات نے جائے وقوعہ کا جو خلاصہ کیا، اس کے مطابق جب پولیس "متاثرہ" بنگلے پر پہنچی تو انہیں بنگلے کے اندر عتیق، اعجاز اور رستم کے سوا اور کسی انسان یا جانور کی لاش نہیں ملی تھی البتہ بنگلے کے باہر گلی میں، آتش زنی کا شکار وہ سوختہ، اماں کوریئر دین، مشل کو ملہ چند افراد کی "معیت" میں اپنی تباہی اور بربادی کا خاموش ماتم کرتی پائی گئی تھی۔

کامل کا ڈیوڈ کی اس دشمنانہ کارروائی کے بارے میں سوچنا تکنیکی لحاظ سے درست نہیں تھا کیونکہ جاسم کا معاملہ ڈیوڈ سے کہیں سینئر افراد کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ یہ کیا دھرا دراصل مسٹر نارمن کی ٹیم کا تھا۔ بہرکیف، کامل کو اس تبدیلی کی خبر نہیں تھی۔ ڈیوڈ ہو یا پھر نارمن...... یہ سب کمینے ایک ہی دجالی شطرنج کے پیادے تھے۔ اس زاویے سے کامل کی سوچ کو سرے سے غلط بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں کامل کے ذہن سے پاس آؤٹ ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایس پی کی دلی ہمدردی کے جواب میں کہا۔

"سوری کی ضرورت نہیں سر...... قدرت کو جو بھی منظور تھا، وہی ہوا ہے۔ میں نے وہ بنگلا اپنی ایک ٹرکش مہمان کے لیے کرایے پر لیا تھا۔ چند روز پہلے میری وہ مہمان تو واپس چلی گئی لیکن عتیق اور اعجاز رستم کے ساتھ ابھی وہیں رہ رہے تھے۔ میں نے تو انہیں اپنی مہمان کی حفاظت کے خیال سے وہاں رکھ چھوڑا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ بے گناہ اور معصوم میری دشمنی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ جانی اور مالی نقصان میرا ہوا ہے سر...... اور رات سے پولیس نے اس واقعے کے حوالے سے سوال کر کر کے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔"

کامل نے اپنے "مقدمے" کو ایسے حقیقی جذباتی رنگ میں ایس پی احسان الحق کے سامنے پیش کیا تھا کہ وہ اس کی دردبھری کہانی سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

"پولیس کی تم فکر نہ کرو۔ میں انہیں سمجھا دوں گا کہ وہ تمہیں پریشان نہ کریں۔" ایس پی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم مجھے صرف اپنے دشمنوں کے بارے میں بتاؤ۔ اس کے بعد ہم دوبارہ شعیب چاچا کے معاملے کو ڈسکس کریں گے۔"

کامل نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فکرمند لہجے میں اچانک پوچھ لیا۔ "سر! آپ ایک سینئر پولیس آفیسر ہیں۔ آپ کی مصروفیات کا مجھے اندازہ ہے۔ میں کہیں خواہ مخواہ آپ کا وقت تو ضائع نہیں کر......!"

"ایسی بات نہیں ہے کامل!" وہ کامل کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "یہ ایک گھنٹا میں نے خاص طور پر، تم سے ملاقات کے لیے فکس کر رکھا ہے جس میں سے ابھی صرف بیس منٹ ہی گزرے ہیں۔ ہمارے پاس، ایک دوسرے کے معاملات کو سمجھنے کے لیے چالیس منٹ باقی ہیں۔ جب تک میں نہیں چاہوں گا، کوئی ہمیں ڈسٹرب کرنے کمرے کے اندر داخل نہیں ہوگا۔ تم پورے اطمینان کے ساتھ مجھ سے بات کر سکتے ہو۔"

"تب تو ٹھیک ہے سر!" کامل نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "بات دراصل یہ ہے جناب کہ میرے اور جاسم کے دشمنوں میں زیادہ تر مشترک ہیں لیکن گزشتہ رات جن لوگوں نے میرے شادمان والے بنگلے پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا، ان لوگوں کا تعلق خالصتاً جاسم کے دشمنوں سے ہے کیونکہ جاسم نے یکم مارچ کی صبح استنبول میں اور اگلے روز تبوک میں اپنے دشمنوں کو بہت بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ مجھ پر ہونے والا اٹیک انہی واقعات کی بازگشت ہے۔ ان لوگوں نے جاسم کے ڈیتھ وارنٹ جاری کر رکھے ہیں۔ تلاشِ گمشدہ والا وہ اشتہار بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ وہ جاسم کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں کیونکہ اسے دوست بنانے کی، ان کی تمام تر کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔ جاسم کے قریبی لوگوں کو وہ صرف اس لیے ٹارگٹ کر رہے ہیں تاکہ ان کی زبان سے جاسم کا پتا ٹھکانا اگلوا سکیں۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" احسان الحق نے مطمئن انداز میں کہا۔ "لیکن ابھی تک تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں جاننا چاہوں گا کہ اتنے بااختیار لوگ ہیں کون؟ کیا وہ ڈرگز ڈیلرز ہیں یا کارپوریٹرز......؟"

"وہ ان سے بھی اوپر کی شے ہیں سر!" کامل نے سنسنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ پھر مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے دجالیوں سے متعارف کرانے کے بعد ان کلمات میں اضافہ کر دیا۔

"وہ خود کو ایٹرنل آئی یعنی غیر فانی آنکھ کہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ آنکھ زمین و آسمان میں موجود ہر چیز کو دیکھ سکتی ہے لیکن کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ لوگ کائنات کی ہر شے سے بالاتر ہیں...... وغیرہ ہم!"

"یہ تو سیدھا سیدھا خدا ہونے کا دعویٰ ہے۔" ایس پی نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "غیر فانی ذات تو صرف اللہ کی ہے۔ دوام اور ہمیشگی اسی کا خاصہ ہے۔ باقی ہر چیز آنی، جانی اور فانی ہے۔ اگر وہ خود کو قادرِ مطلق سمجھتے ہیں تو ان کی یہ سوچ سراسر کفریہ ہے۔"

’’تو آپ کیا سمجھتے ہیں سر......!‘‘ کامل نے انتہائی کڑوے لہجے میں کہا۔ ’’شیطان مردود نے دجالیوں کی صورت میں جو انڈے بچے دے رکھے ہیں، ان کی سوچ حمدیہ اور نعتیہ ہوگی؟ جناب! میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو اپنے مسیحا دجال کی آمد کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی سلسلے میں، تبوک کے ویرانوں میں میگا سٹی ’’نی یوم‘‘ کی تعمیر کا کام شروع ہونے جا رہا ہے تا کہ وہ یک چشم فرزندِ ابلیس، وہاں کی سب سے بلند عمارت میں رہائش اختیار کر سکے اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ اس کی نگاہ میں رہیں اور وہ وہاں ہونے والی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کی اپنی سی کوشش کر پائے......!‘‘

’’ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔‘‘ ایس پی نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ’’ان حالات میں تو تمہارا دوست جاسم واقعتاً طاغوت کے خلاف جہاد کر رہا ہے۔ کیا وہ تم سے رابطے میں ہے؟‘‘

بات کے اختتام میں احسان الحق نے ایک ایسا سوال کیا جس کی کامل کو توقع تھی لہٰذا اس نے بڑا متوازن جواب دیا۔ اس کا یہ جواب مبنی بر سچ تھا۔

’’آخری بار جاسم سے میری بات یکم مارچ کی شام میں ہوئی تھی۔‘‘ کامل نے معتدل انداز میں کہا۔ ’’اس وقت وہ تبوک سٹی کے ہوٹل ’’مینا‘‘ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے کب اور کیسے نکلا یا اس وقت وہ کہاں ہوگا، یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد کچھ عرصے کے لیے منظر سے غائب ہو جاتا ہے اور جب وہ مناسب سمجھتا ہے، دوبارہ رابطے میں آ جاتا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ ایس پی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ’’وہ جب تمہارے رابطے میں آئے تو اس سے میری بات بھی کرانا...... مجھے خوشی ہوگی۔‘‘

’’او کے سر!‘‘ کامل نے فرمانبرداری سے کہا۔

’’اب ہم شعیب چاچا کے بارے میں بات کریں گے۔‘‘ ایس پی نے کامل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’مگر اس سے پہلے میں تم سے ذاتی نوعیت کا ایک سوال کرنا چاہوں گا، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو......؟‘‘

’’نو آبجیکشن سر!‘‘ کامل نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ’’آپ مجھ سے کچھ بھی پوچھ سکتے ہیں۔‘‘

’’جاسم کی مجاہدانہ مصروفیات کا تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔‘‘ وہ بدستور کامل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ’’کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ تمہارا شغل کیا ہے...... میرا خیال ہے، تم میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو......؟‘‘

’’آپ میرے کام دھندے سے واقفیت چاہتے ہیں تو سنیں ....!‘‘ کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ’’میں قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے کئی ایک ایسے فلاحی اور سماجی کام کرتا ہوں جن کی قانون کھلے عام اجازت نہیں دیتا۔ ان میں سب سے اہم کام مجبور، لاچار اور مظلوم شخص کو انصاف دلاتا ہے۔ اس مشن میں اکثر ہمارا واسطہ جرائم پیشہ افراد ہی سے پڑتا ہے جنہوں نے کئی انسانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہوتی ہے۔ شعیب چاچا بھی اسی ذیل میں ہم سے ٹکرایا تھا۔ بس، پھر ہم اس کے شیطانی سیٹ اَپ کے اندر گھستے چلے گئے۔‘‘

’’مجھے اس کے سیٹ اَپ کے بارے میں بتاؤ۔‘‘ ایس پی نے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں کافی عرصے سے اس کے تعاقب میں ہوں۔ میں نے اسے قانون کی گرفت میں لانے کے لیے اپنا انسپکٹر لیول کا ایک ذہین پولیس آفیسر بھی کھویا ہے۔ اگر تم مجھ سے تعاون کرو تو ہم اس کے سیٹ اَپ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ وہ بدبخت خود تو اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے لیکن جرائم کے اس برگد کی جڑیں پتا نہیں، زمین کے اوپر اور نیچے کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ کینسر کے مانند اس معاشرے کے اندر بہت دور تک سرایت کر چکا ہے۔‘‘

’’آپ بے فکر ہو جائیں سر!‘‘ کامل نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ’’میں آپ کے محکمے کے ساتھ مل کر اس ناسور کی ایسی کیمو اور ریڈیو تھراپی کروں گا کہ اس کے سیٹ اَپ کی جڑوں کی جڑیں بھی تلف ہو جائیں گی۔ بس مجھے فری ہینڈ چاہیے۔‘‘

’’تمہیں فری ہینڈ ملے گا۔‘‘ احسان الحق نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن تم ہمارے ڈپارٹمنٹ کی سرویلیس میں بھی رہو گے۔ تم سے ہر شے کا حساب پوچھا جائے گا۔‘‘

’’مجھے منظور ہے۔‘‘ کامل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ’’اور مجھے سیکیورٹی کی ضرورت نہیں۔ مجھ پر آپ سرویلینس ضرور رکھیں مگر کوئی میرے کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔ ہاں، البتہ میں اپنے کیے کا ذمّے دار اور اس کے لیے جواب دہ ہوں گا۔‘‘

’’ڈیل......!‘‘ ایس پی نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بڑے عزم سے کہا۔

کامل نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

ناشتا، خوش ذائقہ اور غذائیت سے بھرپور تھا لیکن اس فرشی نشست پر ایشتار دسترخوان سے غائب تھی۔ ویسے بھی جاسم جب سے ایشتار کے رابطے اور تعلق میں تھا، اس نے کبھی اسے، خاکی مخلوق کی طرح کھاتے پیتے نہیں دیکھا تھا۔ جاسم کا گمان تھا کہ اس بادی مخلوق کا محض باد (ہوا) پر ہی گزارہ ہوگا۔

ابوریان، لینا اور جاسم نے ناشتا ختم کیا تو ایشتار دوبارہ وہاں حاضر ہوگئی۔ لینا کھانے کے برتن اٹھا کر چلی گئی تو ابوریان نے ایشتار سے استفسار کیا۔

''تمہارے پاس کتنا وقت ہے؟''

''پندرہ سے بیس منٹ۔'' وہ سپاٹ انداز میں بولی۔

''ٹھیک ہے، تم تیاری کرو۔'' ابوریان نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''جب تک میں جاسم سے چند اہم باتیں کرلیتا ہوں۔''

''جی بابا!'' ایشتار اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

جاسم کو ایشتار نے بتایا تھا کہ ابوریان اسے تابوتِ سکینہ اور تھرڈ ٹیمپل کے بارے میں بریف کرے گا اور اس کے علاوہ چند خاص الخاص نصائح سے بھی سرفراز فرمائے گا لہٰذا وہ ''بابا'' کے اشارے پر وہاں سے اٹھا اور اس کی معیّت میں ایک دوسرے نسبتاً چھوٹے کمرے میں پہنچ گیا۔

''میری یہ اقامت گاہ ایک غار کی صورت اس کوہی سلسلے ''الزیتا'' کے اندر واقع ہے جو مختلف سائز اور ساخت کے متعدد سنگی کمروں پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر کمرا کسی خاص مقصد کے لیے ہے۔'' ابوریان نے مذکورہ چھوٹے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ......!''

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ پناہ گاہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے؟'' جاسم نے سنگی فرش پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''اب تک تو ایسا ہی ہے اور بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔'' ابوریان نے ایک دیوار گیر الماری کی جانب بڑھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ''تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ میری پوتی لینا نے کس طرح ایک وزنی پتھر کو اپنی انگلی کے اشارے سے حرکت دے کر اس غار کا داخلی راستہ کھولا اور تمہیں غار کے اندر پہنچانے کے بعد دوبارہ اس بھاری پتھر کو غار کے منہ پر فٹ کردیا۔''

ابوریان سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو جاسم نے کہا۔ ''ہاں، میں نے یہ چمتکار دیکھا ہے اور میرے پوچھنے پر لینا نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے کتاب کے علم سے، اس ٹنوں وزنی پتھر کو اِدھر اُدھر سرکنے پر مجبور کردیا تھا۔''

''لینا نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔'' ابوریان اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''آخری مقدس آسمانی کتاب قرآن مجید معلومہ وغیر معلومہ، مبینہ وغیر مبینہ علوم وفنون کا ایک حسین اور لازوال مرقع ہے۔ اس کائنات کا کوئی بھی ایسا اسرار، معما اور بھید نہیں ہے جس تک رسائی اور جس پر دسترس حاصل کرنے کے لیے اس کتاب کے اندر کوئی نسخہ موجود نہ ہو۔ یہ ہر عقدۂ لاینحل کی عقدہ کشائی کرتی ہے مگر افسوس کہ ہم مسلمانوں نے اس عظیم المرتبت کتاب کو اوراد و وظائف، تلاوت اور برکات تک ہی محدود کر رکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ایسا کرنا غلط ہے مگر اس سے آگے نہ سوچنا اور یہیں پر ٹھہر جانا اس کتاب کے نزول کے مقاصد کو پورا نہیں کرتا۔ اس کتاب کے اندر وہ راز اور نشانیاں چھپی ہوئی ہیں جو صرف غور وفکر کرنے والوں ہی کو دکھائی دیتی ہیں۔ ہم محض قرآن مجید کو زبان سے پڑھتے ہیں، اپنی فہم وفراست کو استعمال کر کے اس بحرِ بے کراں کے اندر غوطہ لگانے کا ہمیں خیال نہیں آتا...... پتا نہیں کیوں!''

''بابا! میں سمجھ سکتا ہوں۔'' جب وہاں سب ابوریان کو بابا کہہ رہے تھے تو جاسم نے بھی اسے اسی نام سے مخاطب کرتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''لوگ عموماً تن آسان ہوتے ہیں اور مسلمان تو خاص طور پر دنیا کے بکھیڑوں میں اس قدر غرق ہو چکے ہیں کہ انہیں حق تک رسائی حاصل کرنے کا خیال ہی نہیں آتا۔''

''جس نے حق کو پہچان لیا، اس نے گویا اپنے خالق کو پہچان لیا اور حق کی پہلی نشانی یہ ہے کہ عموی طور پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے جس کی کوئی مخالفت نہیں، وہ قطعاً حق نہیں......'' ابوریان دیوار گیر الماری کی جانب سے مڑا تو اس کے ہاتھوں میں وہی صندلیں منقش باکس تھا جس کی کہانی ''ویلی آف دی کنگز'' کے ریگ زار میں واقع عامنک پیرامڈ کے تہ خانے سے چل کر تبوک کے صحرا تک پہنچ چکی تھی۔ ابوریان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے جاسم کی طرف بڑھا۔

''ہمارے بزرگوں نے ہمیں یہی بتایا ہے کہ جانور میں صرف خواہش اور فرشتے میں صرف عقل ہوتی ہے مگر انسان کے اندر یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اگر انسان عقل کو دبا کر اپنی خواہش کی غلامی اختیار کرلے تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا لیکن اس کے بالعکس اگر انسان اپنی خواہشات کو کچل کر صرف عقل سے کام لینے لگے تو اس کا شمار فرشتوں میں ہونے لگتا ہے لیکن ہمیں ان دونوں انتہاؤں کو چھونے کے بجائے میانہ روی اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔''

"میانہ روی سے آپ کی کیا مراد ہے بابا؟" ابوریان لمحے بھر کو تھما تو جاسم نے مؤدب انداز میں استفسار کیا۔

اس دوران میں ابوریان، جاسم کے سامنے بیٹھ چکا تھا اور صندلیں مقدس باکس کو اس نے اپنے پہلو میں رکھ دیا تھا۔ اس کمرے میں بیٹھنے کے لیے صوفے، کرسیاں یا اسٹول، بینچ نام کی کوئی نشست گاہ موجود نہیں تھی۔ اول آخر وہاں پر "فرشی نشست" کی حکمرانی تھی۔

"میانہ روی کا مطلب ہے اعتدال پسندی یعنی انسان کے قول وفعل میں کسی نوعیت کی زیادتی ہو اور نہ ہی کسی قسم کی کمی......!" ابوریان نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "اپنی نیت اور عمل میں توازن قائم رکھنا ہی انسان اور انسانیت کی معراج ہے۔ اپنی عقل کے ذریعے خواہشات کو دبانا نہیں بلکہ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ مقابلہ کر کے نصرت حاصل کرنا ہی اصل مردانگی ہے اور ایک مسلمان کو بہرحال مردِ مومن اور مردِ حق تو ہونا ہی چاہیے......" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر رسان بھرے لہجے میں بولا۔

"جاسم بیٹا! تم سے کرنے کے لیے ڈھیروں باتیں ہیں مگر وقت کی کمی کے باعث میں اصل موضوع کی طرف آنا چاہوں گا۔"

"بس، آخری دو سوال......!" جاسم نے منت ریز انداز میں کہا۔ "یہ دم غنیمت ہے پھر پتا نہیں، آپ سے کب ملنا ہو اور شاید...... ہو بھی کہ نہیں!"

"آنے والے وقت کے بارے میں دعوے سے کچھ کہنا مناسب نہیں ہوتا کیونکہ میرا تجربہ گواہ ہے کہ مستقبل کے حوالے سے کی جانے والی اکثر پیش گوئیاں غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔" ابوریان نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہرکیف، تم دو سوال پوچھ سکتے ہو۔"

ان لمحات میں جاسم کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابوریان اس کی سوچ کو پڑھ رہا ہو۔ وہ دانا و بینا شخص اپنے اندر پتا نہیں، کون کون سے اسرار و رموز چھپائے بیٹھا تھا۔ جاسم اس سے جو دو سوال کرنے کا متمنائی تھا، ان میں سے ایک کا تعلق مستقبل بینی ہی سے تھا۔

"ایشتار نے مجھے بتایا تھا کہ ہماری اس زمین کے تباہ ہونے میں صرف تین سو پچیس سال باقی ہیں۔" جاسم نے سوالیہ نظر سے ابوریان کی طرف دیکھا۔ "کیا دو ہزار تین سو پینتالیس عیسوی میں واقعی یہ کرۂ ارض ہمارے نظامِ شمسی کا حصہ نہیں رہے گا؟"

"میں یہ تو مانتا ہوں کہ مادی مخلوق خصوصاً آنجہانی ظل ہطیا اور ایشتار ریاضی، الجبرا، جیومیٹری اور علمِ ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں۔" ابوریان نے جاسم کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ "لیکن میں تم سے پھر یہی کہنا چاہوں گا کہ مستقبل کا درست علم صرف اللہ کو ہے۔ لہٰذا آنے والے وقت کے بارے میں حسابی اندازے لگانے کو میں ٹھیک نہیں سمجھتا۔"

ابوریان کے اس قطعی اور دوٹوک جواب کے بعد اس موضوع پر کسی بحث یا جرح کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی چنانچہ اس نے دوسرا سوال کر دیا۔

"بابا! ایک اچھے اور بُرے انسان کے درمیان کس قدر تفاوت ہوتا ہے۔ ہم ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کس طرح پہچان سکتے ہیں؟"

"بنیادی طور پر دو نمایاں فرق ہیں۔" ابوریان نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک سوچ کا فرق اور دوسرا عمل کا۔ میں مثال دے کر تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آ جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا......!"

"جی بابا!" جاسم نے جلدی سے کہا۔

"بلاتفریق مذہب وملت اس روئے زمین پر انسانوں کی دو ہی اقسام آباد ہیں۔ ایک اچھا انسان اور دوسرا برا انسان۔" ابوریان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب کوئی اچھا انسان نیکی اور بھلائی کا کام کرتا نظر آئے تو برا انسان اس کے بارے میں یہی سوچتا ہے کہ اس بندے کا کوئی بڑا کام کہیں اٹکا ہوا ہے اس لیے وہ اللہ کی نصرت کے لیے وہ سب کر رہا ہے یعنی کہ اپنے مطلب کی خاطر لیکن جب ایک برا انسان تباہی اور بربادی کے کسی کام میں مشغول ہو تو اس کے بارے میں ایک اچھے انسان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ اس بندے سے نادانستگی میں خطا سرزد ہو رہی ہے۔ امید ہے، وہ اپنی اس غلطی سے سبق سیکھے گا اور آئندہ اس نوعیت کا معیوب کام نہیں کرے گا۔ یہ تو ہو گیا، سوچ کا فرق۔ اب میں تمہیں ان دونوں انسانوں کے عمل کا فرق بتاتا ہوں......" وہ لمحے بھر کو رکا، ایک گہری سانس خارج کی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"جب بھی اور جہاں کہیں بھی انسان اور انسانیت کی بھلائی کا کام ہو رہا ہو تو ایک اچھا انسان، کام کرنے والے لوگوں کی قطار میں سب سے آگے کھڑا نظر آئے گا اور جب اس کام کی تکمیل کے بعد کریڈٹ کی تقسیم کا مرحلہ آئے گا تو وہ اچھا انسان کہیں دکھائی نہیں دے گا یا پھر آپ اسے کریڈٹ سمیٹنے والوں کی قطار میں سب سے پیچھے کھڑا دیکھیں گے جبکہ ایک

بُرے انسان کو آپ اس کے بالعکس پائیں گے یعنی وہ اس کام کے وقت آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا اور تقسیم انعامات کے موقع پر وہ سب سے آگے کھڑا دکھائی دے گا۔"

"بہت شکریہ بابا!" جاسم نے تہ دل سے کہا۔ "آپ نے میرا کانسیپٹ کلیئر کر دیا ہے۔"

"اسرائیلیات کا کانسیپٹ کلیئر ہونا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے میرے بچے!" ابوریان نے مقدس صندلیں باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ "کیونکہ یہ وہ کمبل ہے جسے اوڑھنے کے بعد تم اسے چھوڑنا چاہو گے تو یہ تمہیں نہیں چھوڑے گا۔"

جاسم نے اُلجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی سوال نہیں کیا۔ ابوریان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے ڈیوڈ کے ری ایلیٹی ٹی وی میں شامل ہو کر ان لوگوں سے گہری "رشتے داری" کر لی ہے اور یہودی آخری سانس تک رشتوں کو "نبھاتے" ہیں، اس بات سے قطع نظر کہ وہ رشتہ دوستی کا ہے یا پھر دشمنی کا......!"

"اس منحوس ری ایلیٹی ٹی وی میں شمولیت اختیار کرنا میری خواہش نہیں، مجبوری تھی بابا......!" جاسم نے سپاٹ آواز میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" ابوریان گہری سنجیدگی سے بولا۔ "کسی نہ کسی کو تو بھاری پتھر اٹھانا ہی پڑتا ہے ورنہ طویل و عریض تاریک غار کے اندرون تک رسائی ممکن نہیں ہو پاتی۔"

ابوریان نے معنی خیز انداز میں جاسم کی طرف دیکھا تو وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ "سمجھ گیا بابا......!"

"جب تم نے یہ بھاری پتھر اٹھا ہی لیا ہے تو تمہیں یہودیوں کی ذہنیت اور عزائم سے کامل واقفیت بھی ہونا چاہیے۔"

"ذہنیت...... ذہن اور نیت کا مرکب!" جاسم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "یعنی ان کی فکر اور ارادہ......!"

"بالکل درست!" ابوریان نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس وقت ان کے پیشِ نظر دو بڑے اہم کام ہیں۔ نمبر ایک، تابوتِ سکینہ تک رسائی حاصل کرنا اور نمبر دو، تھرڈ ٹیمپل کی تعمیر۔ تمہیں یہودیوں کے ان دو مقاصد کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔ میں تمہیں مختصراً بریف کر دیتا ہوں۔ آگے تمہارا کام......!"

"میں ہمہ تن گوش ہوں بابا!" جاسم نے جلدی سے کہا۔ "میں خود بھی یہ سب جاننا چاہتا ہوں۔"

"یہ جو پُراسرار صندلیں باکس ہے، اس کی مدد کے بغیر وہ لوگ تابوتِ سکینہ کا سراغ نہیں لگا سکتے اسی لیے وہ اسے حاصل کرنے کے لیے مرے جا رہے ہیں۔ تم نے ان کی تڑپ اور بےقراری تو دیکھ ہی لی ہے۔"

"جی بابا!" جاسم نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "اس تابوت کے اندر کون سا خزانہ چھپا ہوا ہے؟"

"تم نے "خزانہ" کا لفظ بالکل مناسب اور موزوں استعمال کیا ہے۔" ابوریان نے معتدل انداز میں کہا۔ "تابوتِ سکینہ دراصل لکڑی کا ایک بڑا سا مضبوط صندوق ہے جس کے اندر حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے صاحب زادے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پُراسرار علوم اور آفاقی تصرفات سے متعلق گراں قدر معلومات قلمی نسخہ جات کی صورت رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت موسیٰ السلام کے کئی ایک معجزہ جات بھی اس صندوق میں موجود ہیں جن میں عصائے موسیٰ بھی شامل ہے۔ وہی عصا جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں، سامری جادوگر کے تخلیق کردہ سانپوں پر پھینکا تھا اور وہ لاٹھی اژدر بن گئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سامری کے سانپوں کو نگل لیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ دس سنگی تختیاں بھی اسی چوبی صندوق کے اندر، دیگر تبرکات کے ساتھ موجود ہیں جنہیں "ٹین کمانڈمینٹس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ دس احکاماتِ الٰہی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے جب وہ جبلِ موسیٰ (کوہِ طور) پر، اپنے معبود سے ہم کلام ہونے گئے تھے۔ بات سمجھ میں آرہی ہے نا......؟"

ابوریان نے سوالیہ جملے پر بات ختم کی تو جاسم نے اثبات میں گردن ہلانے کے بعد سوال کر دیا۔

"یقیناً تابوتِ سکینہ کئی لحاظ سے اہم، محترم اور متبرک ہے لیکن میں جاننا چاہوں گا کہ یہودی اپنے کس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اتنی شد ومد سے اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ دراصل، میں اس حوالے سے جو بھی معلومات رکھتا ہوں، آپ کا جواب اس کی تصدیق یا تردید اور یا پھر تصحیح کر دے گا!"

"یہودیوں کی مقدس کتاب "تالمود" کا ذکر یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے۔" ابوریان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تالمود درحقیقت، یہودی ربیّن کی قدیم تحاریر کا مرقع ہے جس کے دو حصے ہیں جن میں سے ایک "مشناہ" اور دوسرا "جیمارا" کہلاتا ہے۔ مشناہ کے اندر تورہ (توریت) کی

تشریح اور وضاحت کی گئی ہے جبکہ جیمارا یہودی انبیاؑ کی مختلف چنیدہ احادیث پر مبنی ہے۔ سادہ الفاظ میں ''تالمود'' کو یہودی تہذیب، مذہبی قوانین اور بشارت و پیش گوئی کی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہم صرف دو پیش گوئیوں (بشارتوں) کا ذکر کریں گے جن میں سے ایک کا تعلق تابوتِ سکینہ سے ہے اور دوسری کا تعلق تھرڈ ٹیمپل یعنی ''ہیکل سلیمانی'' سے ہے اور یہی صحیح معنوں میں ہمارا موضوع بھی ہے......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''تالمود کی بشارت کے مطابق، تابوتِ سکینہ جس قوم کے پاس ہوگا، وہی پوری دنیا پر حکمرانی کرے گی۔ یہودی چونکہ عالم گیر حکمرانی کا خواب دیکھ رہے ہیں اس لیے وہ تابوتِ سکینہ کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں اور تابوت سکینہ اس وقت اللہ کے حکم سے، ملائک کی تحویل میں ہے لیکن یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ مذکورہ مقدس صندوق مسجد اقصیٰ کے نیچے ایک سرنگ میں دفن ہے اسی لیے وہ مسجد اقصیٰ کو شہید کر کے اس کی تہ میں موجود سرنگ تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن فلسطینی مسلمان ان کے مذموم عزائم کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔''

''کیا یہودی تابوتِ سکینہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟'' ابوریان لمحے بھر رکا تو جاسم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''مستقبل بینی صرف اسی ذات پاک کا وصف ہے!'' ابوریان نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں اندازوں اور دعووں پر یقین نہیں رکھتا۔ اگر اللہ کو منظور ہوگا تو یہود اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں گے ورنہ ہرگز نہیں۔ مشیتِ الٰہی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے اور...... جو انسان مشیتِ ایزدی کو سمجھ جاتا ہے، اس کی بھیدی زبان کو خاموشی کی مہر سے مقفل کر دیا جاتا ہے!''

ابوریان، جاسم کی توقع اور اندازے سے بہت آگے کی شخصیت تھا۔ اس کے فرمودات میں تحت الثریٰ کی گہرائی اور فولاد ایسی گیرائی تھی۔ جاسم کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی کہ ابوریان سے زبردستی کسی سوال کا جواب نہیں لیا جا سکتا۔ وہ شکست خوردہ مگر احترام بھری نظر سے لینا کے دادا اور سب کے ''بابا'' کو تکنے لگا۔

''پانچ سو چھیاسی قبل مسیح میں جب بیبلون (قدیم عراق کے شہر بابل) کے بادشاہ نیبوکدنظر (بخت نصر) نے یروشلم پر چڑھائی کر کے ہیکل سلیمانی (سولومن ٹیمپل اول) کو شہید کیا تو اس وقت تابوتِ سکینہ اس ٹیمپل کے تہ خانے میں رکھا ہوا تھا۔ اس خوف ناک انہدام اور مسماریت کے دوران میں یہودیوں کی لاشوں کے ساتھ ہی تابوتِ سکینہ بھی ٹیمپل کی تہ میں کہیں دب گیا۔ بخت نصر نے تابوتِ سکینہ کو حاصل کرنے کی غرض سے فلسطین (یروشلم) پر حملہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں نے احکاماتِ الٰہی کی غلط تعبیرات کر کے مذہب کو مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ بخت نصر نے تابوتِ سکینہ کو تلاش کرنے کے بجائے یہودیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ اس وقت یروشلم میں لگ بھگ بارہ لاکھ یہودی آباد تھے جن میں سے تقریباً چھ لاکھ یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ مرنے والوں میں ایک اچھی خاصی تعداد یہودی ربیین (مذہبی رہنماؤں) کی تھی۔ فرسٹ ٹیمپل کی تباہی نے یہودیوں کی کمر توڑ دی تھی لیکن انہوں نے اس بربادی کا جشن منایا تھا۔ سیکنڈ ٹیمپل تعمیر کرنے میں انہیں کم و بیش ساڑھے چھ سو سال لگ گئے مگر اس ٹیمپل کا انہدام بھی قدرت کے پروگرام کا حصہ تھا۔ ستر صدی عیسوی میں جب رومی ملٹری کمانڈر ٹائٹس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجائی تو سیکنڈ ٹیمپل کو بھی شہید کر دیا گیا اور پورے شہر میں قتل و غارت گری کے بعد ایسی آگ لگائی کہ دیگر چیزوں کے ساتھ ہی تمام کتب خانے بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ یہودیوں کی اکثریت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا جو زندہ بچ گئے، وہ نقل مکانی کر کے دوسرے ملکوں کی طرف نکل گئے اور اس موقع پر بھی بچے کھچے یہودیوں نے ہیکل سلیمانی دوم کی مسماریت کا جشن منایا تھا۔

''ہیکل سلیمانی'' یہودیوں کے لیے اسی اہمیت کا حامل ہے جیسا کہ ہمارے لیے خانہ کعبہ۔ تم یقیناً یہ سوچ کر پریشان ہو رہے ہو گے کہ کوئی اپنے کعبے کی تباہی اور بربادی کا جشن کیونکر منا سکتا ہے...... ہیں نا؟''

''جی بابا! یہ بات واقعی سمجھ میں آنے والی نہیں!'' جاسم نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''یہ سب اسی پیش گوئی کا نتیجہ ہے جس میں یہودیوں کو بشارت دی گئی ہے کہ ان کا کعبہ دوبارہ اجڑے گا لیکن جب وہ تیسری مرتبہ اسے تعمیر کریں گے تو یہ ان کے دیرینہ خواب کے پورا ہو جانے کی دلیل ہوگی اسی لیے وہ حجت تمام کے سلسلے میں ''تھرڈ ٹیمپل'' کی تعمیر کے لیے بے چین اور مصروفِ عمل ہیں......''

''اوہ......!'' جاسم ایک طویل گہری سانس خارج کرتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''اسی لیے یہ لوگ کنگ ڈیوڈ ایمپائر (گریٹر اسرائیل) کے قیام کے لیے کوشاں ہیں۔''

"یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے جتنا وہ سمجھ رہے ہیں۔" ابو ریان نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "ڈیوڈ کنگڈم" کے قیام کے لیے یروشلم کے علاوہ اردن، شام، لبنان کو مکمل طور پر اور عراق، سعودی عرب، مصر، ترکی کو جزوی طور پر اپنے زیرِ نگیں لانا ہوگا تبھی سلطنتِ داؤدی کی جغرافیائی سرحد کا تعین ہو پائے گا اور اس سے پہلے انہیں تابوتِ سکینہ تک رسائی حاصل کرنا ہوگی اور کسی ایسے معمار کو بھی تلاش کرنا ہوگا جو ایک ذرا سی بھی آواز پیدا کیے بغیر عظیم الشان عمارت تھرڈ ٹیمپل (ہیکل سلیمانی سوم) کو مکمل کر سکے۔ یہی سولومن ٹیمپل کی پہلی تعمیراتی شرط ہے کہ اینٹ پر اینٹ رکھنے جتنی آواز بھی نہیں ابھرنا چاہیے۔ یہ کام وہی معمار کر سکتا ہے جسے آواز پر قدرت حاصل ہو، جیسا کہ داؤد علیہ السلام کو تھی یا پھر یہودیوں کے مسیحا دجال کو ہوگی۔ حضرت داؤد علیہ السلام تو اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں اور دجال کا ابھی خروج نہیں ہوا۔ سب سے اہم اور دلچسپ بات یہ کہ جب رومی فوجی جنرل "ٹائٹس" نے یروشلم پر یلغار کر کے سیکنڈ ٹیمپل کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا تو وہ تھرون آف ڈیوڈ (تختِ داؤد) اپنے ساتھ لے گیا تھا جو اس وقت لندن کے علاقے "ویسٹ منسٹر ایبی" کے معروف گوتھک چرچ "سینٹ پیٹر" میں رکھا ہے۔ عیسائی اپنے مسیحا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق، حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اسی تخت پر جلوہ افروز ہو کر پوری دنیا پر حکمرانی کریں گے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے نزول اور دجال ابن عزازیل لعنت اللہ کے خروج تک سب کچھ ایسا ہی چلتا رہے گا......"

"صادقین اور کاذبین کا فیصلہ وقت نے کرنا ہے۔" جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری سمجھ میں تو صرف یہی آیا ہے بابا......!"

ابو ریان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جاسم کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے اس نے معتدل انداز میں کہا۔

"ایشتار اس کمرے کے باہر بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ جانا ہوگا۔"

"کہاں؟" بے ساختہ جاسم کے منہ سے نکلا۔

"جہاں وہ لے جائے......" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اس کے بعد ایشتار اپنا کام کرے گی اور پھر...... اس کے بعد تمہارا کام شروع ہو جائے گا۔"

"کوئی نصیحت کریں بابا......" جاسم نے کہا۔

"جب کوئی مرد یا عورت بالغ اور عاقل ہو جائے تو اسے پہلی فرصت میں شادی کر لینا چاہیے۔ رشتۂ ازدواج ایک ایسا بندھن ہے جو انسان کو برائیوں اور متعدد اقسام کے گناہوں سے بچاتا ہے۔ نیکی کرنا بہت اچھا کام ہے اور گناہ سے بچنا اس سے بھی کہیں زیادہ مستحسن عمل......!"

جاسم نے اثبات میں گردن ہلائی اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔ ابو ریان کے اندازِ تکلم سے اسے پتا چل گیا تھا کہ اس خصوصی ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

وہ سنگی کمرے سے نکلا اور ایشتار کی معیت میں ایک جانب بڑھنے لگا۔ وہ سمت جو اسے تین سال آگے، دو ہزار تیئس عیسوی میں پہنچانے والی تھی۔ اس سنسنی خیز، حیرت آمیز، ولولہ انگیز اور خوش آئند سفر کے بارے میں سوچ کر وہ دل خوش کن کیفیت سے گزر رہا تھا......

☆☆☆

پیپرز کی "چیکنگ" کے بہانے وہ ٹریفک پولیس والا ٹیکسی ڈرائیور کو تھوڑے فاصلے پر لے گیا تھا اور اسی دوران میں دو افراد نے اس ٹیکسی کو پسنجر (نشا) سمیت "اغوا" کر لیا تھا۔ اپنی ٹیکسی کو یوں "جاتے" دیکھ کر ڈرائیور نے اس پولیس والے سے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"آفیسر! کوئی میری کار چُرا کر لے جا رہا ہے۔ آپ اسے پکڑنے کی کوشش کریں۔ میری پسنجر بھی گاڑی کے اندر موجود ہے۔ یہ ایک سنگین واردات ہے سر......!"

"تم یہ کاغذات پکڑو۔ ہم اغوا کنندگان کو خود ہی دیکھ لیں گے۔" اس پولیس والے نے ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کے پیپرز ڈرائیور کی جانب بڑھاتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

"اسی لمحے ایک موٹر سائیکل آ کر پولیس والے کے نزدیک رکی۔ پولیس والا اس موٹر سائیکل پر سوار ہونے لگا تو ڈرائیور نے برہمی سے کہا۔

"سر! آپ یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔ میں اپنی کمپنی میں آپ کی شکایت کروں گا۔"

پولیس والے نے پیپرز کو ڈرائیور کے منہ پر مارتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔ "بھاڑ میں جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی وہ بائیک وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ ڈرائیور کو یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ پولیس آفیسر کے بھیس میں وہ شخص انہی لوگوں کا ساتھی تھا جو اس کی گاڑی چُرا لے گئے تھے اور یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے

تحت کیا گیا تھا۔

ان لمحات میں ڈرائیور کا دماغ ٹھیک سے کام کر رہا تھا اور وہ پوری طرح اپنے حواس میں تھا۔ وہ جو ٹیکسی چلا رہا تھا، وہ ایک معروف ٹرکش کمپنی کی تھی۔ اس نے فوراً اپنے آفس فون کر کے متعلقہ آفیسر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ دوسری جانب موجود شخص نے توجہ سے اس کی بات سنی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا تمہاری ٹیکسی میں نصب جی پی ایس ٹریکر آن ہے؟''

''یس سر!'' ڈرائیور نے جواب دیا۔ ''میں رائیڈ کے وقت ہمیشہ اسے آن ہی رکھتا ہوں۔''

''ویری گڈ!'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''یہ حادثہ کس مقام پر پیش آیا ہے؟''

ڈرائیور نے وقوعہ کی لوکیشن بتادی۔

''تم نے پسنجر کو کہاں سے اٹھایا تھا؟''

''کورل سٹی کے ایک ولا سے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا پھر طلال حسنی کے ولا کا ایڈریس بتانے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''پسنجر کا نام نشا صباحی ہے اور اس نے اپنے اکاؤنٹ ہی سے رائیڈ بک کرائی تھی۔ میں اسے تقسیم اسکوائر کے ''ٹائم اپارٹمنٹس'' لے کر جا رہا تھا۔''

''ٹھیک ہے، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......'' دوسری جانب بولنے والے شخص نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہم اس ٹیکسی اور اسے چُرانے والوں کو ٹریس کر لیں گے۔''

''شکریہ سر۔'' ڈرائیور نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا میں واپس کورل سٹی جا کر اس ولا کے مکین کو اس سانحے کی اطلاع دوں؟''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''ہم سب سنبھال لیں گے۔ تم جا کر آرام کرو۔''

اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہوگئی۔

ڈرائیور سے بات کرنے والا کار کمپنی کا وہ مستعد کارکن فوراً ہی حرکت میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنے سسٹم پر مذکورہ ٹیکسی کا سراغ لگا لیا لیکن وہ ٹیکسی میں موجود پسنجر سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا کیونکہ اس کا سیل فون مسلسل سوئچڈ آف آ رہا تھا۔

ٹیکسی کی لوکیشن کا پتا چل جانے کے بعد اس تک رسائی اور اس کا حصول آسان ہو گیا تھا۔ اس سے آگے پولیس کا کام شروع ہوتا تھا۔ وہ ٹیکسی ایک مقام پر رکی ہوئی تھی۔ جب تک اس کے اندر نصب جی پی ایس ٹریکر آن تھا، وہ کہیں ٹھہری رہے یا پھر محوِ سفر، اس کی تازہ ترین لوکیشن کمپنی کے ریڈار سسٹم پر مسلسل دیکھی جا سکتی تھی۔ پولیس کو انفارم کرنے سے پہلے اس شخص نے ایک بار پھر نشا صباحی کا نمبر ٹرائی کیا۔ اس مرتبہ بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ نشا کا سیل فون ابھی تک بند ہی آ رہا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو نشا نے خود سیل فون کو آف کر رکھا تھا اور یا پھر اسے اغوا کرنے والوں نے اس سے سیل فون چھین کر آف کر دیا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انہوں نے نشا کے سیل فون کو چھیننے کے بعد ٹیکسی سے باہر پھینک دیا ہو تاکہ کوئی اس کی تازہ ترین پوزیشن سے واقف نہ ہو سکے اور ان لوگوں تک رسائی ممکن نہ رہے۔

ایک فوری خیال کے تحت ''ٹیکسی سروس'' کے اس نمائندے نے کورل ولاز سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں، ڈرائیور کے بتائے ہوئے ''پک اَپ'' پوائنٹ کے ایڈریس کی مدد سے اس ولا کے مالک یعنی طلال حسنی کا کانٹیکٹ نمبر اور دیگر ڈیٹیلو بھی حاصل کی جا چکی تھیں۔ طلال حسنی کا نام سامنے آتے ہی اس شخص کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ پولیس کو مطلع کرنے سے پہلے اسے حسنی سے ضرور بات کرنا چاہیے۔ وہ طلال حسنی کو، ہائی کورٹ کے ایک سینئر جج کی حیثیت سے بہ خوبی جانتا تھا۔

''سر! میں اس پرائیویٹ کار سروس کمپنی کے آفس سے بات کر رہا ہوں جس کی ایک ٹیکسی نے تھوڑی دیر پہلے آپ کے ولا سے ایک رائیڈ اٹھائی تھی۔'' حسنی سے رابطہ ہونے پر اس شخص نے مؤدب انداز میں کہا۔ ''پسنجر کا نام نشا صباحی ہے اور وہ تقسیم اسکوائر کے ''ٹائم اپارٹمنٹس'' جانا چاہ رہی تھی۔ مجھے اس پسنجر کے بارے میں آپ کو ایک اہم ا..ع دینا ہے۔''

''سب خیریت تو ہے نا آفیسر......!'' حسنی نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''نشا صباحی میری ایک معزز مہمان ہے۔ اس کے بارے میں مجھے کوئی بُری خبر نہیں سنانا آفیسر......!''

''خبر کے اچھی یا بُری ہونے کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا سر......!'' اس شخص نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے حسنی کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ ''چند منٹ پہلے اس ٹیکسی کے ڈرائیور نے فون کر کے ہمیں بتایا ہے کہ کسی نقلی ٹریفک پولیس والے نے چیکنگ کے بہانے ٹیکسی رکوائی اور اسے باہر نکلنے کو کہا۔ ہمارے تمام

ڈرائیورز ہر حال میں قانون کا احترام کرتے ہیں۔ سو، وہ ڈرائیور بھی ٹیکسی کو سڑک کے کنارے لگانے کے بعد باہر آگیا۔ اسی وقت دو افراد ٹیکسی کے اندر گھسے اور وہ پسنجر سمیت اس ٹیکسی کو لے اُڑے۔ بہرکیف......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''ہم نے اپنے ٹریکنگ سسٹم کی مدد سے مذکورہ ٹیکسی کا سراغ لگا لیا ہے۔ ہمارا کام یہاں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس ٹیکسی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں پولیس کا تعاون چاہیے ہوگا۔ پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے میں نے آپ کو فون کیا ہے اور اس کا ایک خاص مقصد ہے سر......!''

''اب وہ مقصد بھی بیان کر دیں۔'' حسنی نے کہا۔

''اگر وہ لوگ محض کار لفٹر (کار چور) ہوتے تو ٹیکسی پر قابض ہوتے ہی یا پھر چند قدم آگے جا کر وہ پسنجر کو نیچے اتار دیتے۔'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''اس صورت میں آپ کی معزز مہمان اور ہماری کمپنی کی پسنجر نشا صباحی فوری طور پر آپ سے رابطہ کر کے اس واقعے کے بارے میں بتاتی لیکن ایسا نہیں ہوا اور پسنجر کا سیل فون بھی مسلسل آف آرہا ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اغوا کنندگان کو ہماری کمپنی کی ٹیکسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انہوں نے یہ تمام تر کارروائی نشا صباحی کے لیے کی ہے۔ میری اس تھیوری کی تصدیق اس امر سے بھی ہو جاتی ہے کہ مذکورہ ٹیکسی اس وقت ایک اوپن ایریا میں کھڑی ہے اور یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ چوری شدہ کاروں کو خفیہ مقامات پر چھپا کر رکھا جاتا ہے۔''

''آپ کی تھیوری میں وزن ہے آفیسر......'' حسنی نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں بڑی حد تک آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس ٹیکسی کی لوکیشن کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔ اس سے ہم سب کا کام آسان ہو جائے گا۔''

''ٹیکسی کی لوکیشن میں آپ کو بتا دیتا ہوں سر!'' اس شخص نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''آپ ایک زیرک اور تجربہ کار قانون داں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس معاملے میں فوری طور پر پولیس کو شامل کرنا کتنا اہم اور ضروری ہے۔''

''میں یہ سب پولیس کی شمولیت کے لیے ہی پوچھ رہا ہوں جناب!'' حسنی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''استنبول پولیس کمشنر قاموس ترک میرا گہرا دوست ہے۔ میں پہلی فرصت میں قاموس کو اس واقعے سے آگاہ کرنا چاہوں گا۔ جب آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک منجھا ہوا قانون داں ہوں تو پھر آپ مجھ سے کسی غیر قانونی اقدام کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟''

''آئی ایم سوری سر......!'' دوسری جانب بولنے والے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ تو واقعی ہمارا کام آسان کرنے جا رہے ہیں...... ٹیکسی کی موجودہ لوکیشن نوٹ کر لیں سر!''

اس پرائیویٹ کار سروس کے ریڈار سسٹم کے مطابق، نشا صباحی کو حسنی کے ولا سے پک کرنے والی ٹیکسی اس وقت گلاٹا برج کے نواحی سلم ایریا (جھونپڑ پٹی) کے ایک خستہ حال مکان کے سامنے کھڑی تھی۔

پچھلے دنوں جاسم اور کامل نے گلاٹا برج کے سلم ایریا میں جو ''کارروائی'' کی تھی، اس کی تفصیل حسنی کو معلوم تھی اور نہ ہی قاموس اس بارے میں کچھ جانتا تھا لیکن ان دونوں کو اس بات کا اندازہ تھا کہ ان پاکستانی جاں بازوں نے وہاں کوئی امن وامان کا ''تحریکی جلسہ'' تو نہیں کیا ہوگا۔ بہرحال وہ جاسم کے دشمنوں سے بہ خوبی واقف ہو چکے تھے۔

حسنی نے قاموس کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد جذباتی لہجے میں کہا۔ ''نشا میرے گھر کی بچی ہے۔ میں نے اسے بیٹی کہا ہے۔ اس کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہونا چاہیے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو حسنی! نشا میرے لیے بھی دیریا ہی کی طرح ہے۔'' قاموس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں ایک جھٹکے میں تمہیں خوش خبری سناتا ہوں۔ میں نشا کے اغوا کی وجوہات سمجھ چکا ہوں۔''

حسنی پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کون سی وجوہات؟''

''پچھلے دنوں آدھی رات کے وقت، تمہیں یاد ہوگا کہ جاسم نے مجھ سے پولیس کے تعاون کے لیے مدد مانگی تھی۔'' قاموس نے جواب دیا۔ ''اس وقت وہ اپنے جگری دوست کامل کے ساتھ گلاٹا برج کی نواحی جھونپڑ پٹی میں کسی دشمن کو عبرت ناک سبق سکھانے میں مصروف تھا۔ مجھے یقین ہے کہ نشا کا اغوا اسی دشمن کا ردِعمل ہے بہرحال......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے رکا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''حسنی تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں نشا کی لوکیشن کا پتا چل چکا ہے۔ میں ابھی اس علاقے کو مکمل طور پر کارڈن آف کروا دیتا ہوں۔ میرے جوانوں کے سوا کوئی بندہ سلم ایریا کے اس حصے میں داخل نہیں ہو سکے گا جہاں نشا کو رکھا گیا ہے اور نہ ہی اندر سے کسی شخص کو باہر آنے کی اجازت ہوگی۔ ہم بہ آسانی نشا کو ریسکیو کر لیں گے اور جو بھی ہمارے

راستے کی رکاوٹ بنے گا، مارا جائے گا۔ مجرموں کے لیے ہمارے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔''

حسنی کو مطمئن کرنے کے بعد قاموس، پولیس ڈپارٹمنٹ کے مستعد افراد کو مختلف ہدایات جاری کرنے لگا۔ ان دنوں ویسے بھی استنبول کے تمام سلم ایریاز میں پولیس کا کریک ڈاؤن چل رہا تھا اس لیے ''پولیس والوں کی بھاری نفری ہر وقت وہاں موجود رہتی تھی۔ یہی صورتِ حال گلاٹا برج کی نواحی جھونپڑ پٹی کی بھی تھی۔

قاموس ترک کا اندازہ صد فیصد درست تھا۔ نشا کے اغوا والی کارروائی اسی عمل کا ردِعمل تھا جو جاسم نے کامل کی موجودگی میں راشد فیضی کے ساتھ کیا تھا اور وہ بھی اسی کے گھر کے اندر۔ کامل نے اس رات جاسم کے مجرم بن عرفات کو ایک یادگار ''سبق'' سکھایا تھا اور اسی رات جاسم نے کامل کے ایک دوست نما دشمن راشد فیضی کو اذیت کی ان منازل سے گزارا تھا کہ وہ بیڈ روم کے فرش پر پڑا ماہی بے آب کے مانند تا دیر تڑپتا رہا تھا۔ وہ تکلیف تو اسے جھیلنا ہی تھی علاوہ ازیں جاسم کی اس ''آرتھو پیڈیکل تھراپی'' نے راشد فیضی کو عمر بھر کے لیے مردوں کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔

نشا صباحی اس وقت واقعتاً راشد فیضی کے مکان کے ایک کمرے میں کرسی پر اس طرح بندھی (''بیٹھی'') تھی کہ وہ اپنے بدن کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کا سامنا ہائی جیکرز کی ایک خوب صورت ساتھی لیلیٰ حسینی سے ہوا تھا۔ جب سے سلور کوئین نے جاسم کو اپنے قابو میں لانے کی مہم کو تیز کیا تھا، اس پروگرام میں جاسم کے ان بدخواہوں کو بھی شامل کر لیا تھا جو اپنے دل و دماغ میں اس کے لیے بے پناہ نفرت رکھتے تھے۔ لیلیٰ حسینی اور راشد فیضی ایسے ہی دو مختتم کردار تھے جو ان لمحات میں خصومت (دشمنی) نکالنے کے لیے بڑے بے چین نظر آ رہے تھے۔

لیلیٰ حسینی کو تو دیکھتے ہی نشا نے فوراً پہچان لیا تھا مگر اس کے بعد کمرے میں داخل ہونے والے راشد فیضی کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا تاہم جاسم اور کامل کی زبانی اس نے راشد فیضی کو دی جانے والی انوکھی ''سزا'' کا ذکر سنا تھا، خصوصاً کراچی میں قیام کے دوران میں کامل نے اسے بتایا تھا کہ جاسم نے ایک اسپیشل تیکنک کے ذریعے راشد فیضی کو کس طرح مخنث بنا دیا تھا۔

''میں نے تمہارے سیل فون کو اچھی طرح کھنگال ڈالا ہے۔'' لیلیٰ حسینی نے نشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نفرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اس میں جاسم کا جو کانٹیکٹ نمبر فیڈ ہے، وہ ہمارے کسی کام کا نہیں۔ بتاؤ، تمہارا وہ یار اس وقت کہاں ہے؟''

''میں جاسم کی موجودہ لوکیشن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' نشا نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا بھی تو تمہیں ہرگز نہیں بتاتی......''

لیلیٰ غصیلے انداز میں آگے بڑھی اور اس نے نشا کے گال پر ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کرنے کے بعد خونخوار لہجے میں کہا۔

''اس خوش فہمی میں نہیں رہنا کہ تمہارا وہ ہیرو تمہیں بچانے یہاں آئے گا۔ اگر تم نے زبان نہیں کھولی تو میں تمہارا جو حشر کروں گی، اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔''

لیلیٰ کا دایاں بازو تو جاسم کے ''جادوئی کمال'' سے ٹرکش ائر لائنز کے اس جہاز ہی میں ناکارہ ہو گیا تھا اور اب وہ اپنی جڑ (شانے) ہی سے غائب تھا۔ اس کی ناکاری ایسی لاعلاج ثابت ہوئی تھی کہ ناچار معالجین کا کوئی بھی چارہ اور معالجہ کارگر نہیں ہوا تھا اسی لیے لیلیٰ کے متاثرہ بازو کو کندھے سے الگ کر دیا گیا تھا مگر یہ ماننا پڑے گا کہ لیلیٰ حسینی ''لیلیٰ مجنوں'' والی چھوئی موئی لیلیٰ نہیں تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ کے تھپڑ نے نشا کے گال کو سرخ انگارا کرنے کے ساتھ ہی اس کے بالائی ہونٹ سے خون بھی چھڑا دیا تھا۔

''میں تو اس وقت اس حشر نشر کا تصور کیے ہوئے ہوں جب جہاز کی فرسٹ کلاس میں، جاسم نے تمہارے دائیں کندھے کا سوا ستیاناس مار کر تمہیں زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔'' نشا نے زخمی شیرنی کے مانند غراتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''تم اپنے ہی خون میں لت پت گھائل بلکہ تباہ و برباد شانے کو تھامے فلک شگاف چیخیں مار رہی تھیں۔ جاسم اگر چاہتا تو اسی وقت ایک گولی کھوپڑی میں اتار کر تمہیں جہنم واصل کر سکتا تھا مگر اس نے جاں بخش کر تمہیں سدھرنے کا ایک سنہری موقع دیا تھا جو تم نے گنوا دیا اور دوبارہ برائی کی راہ پر چل نکلی ہو۔ تمہیں اچھی طرح یاد ہوگا کہ جب جہاز کا عملہ میڈیکل اسٹاف کی مدد سے تمہیں اسٹریچر پر ڈال کر وہاں سے جا رہا تھا تو جاسم نے کیا نصیحت کی تھی......''

''بھاڑ میں گیا وہ نقلی ایرو ناٹیکل انجینئر اور لعنت ہو اُس کی نصیحت پر......'' لیلیٰ قطع کلامی کرتے ہوئے برہمی سے بولی۔ ''میں نے تمہاری بکواس سننے کے لیے یہاں نہیں بلایا۔ سیدھی طرح بتا دو کہ جاسم کہاں ہے؟ ورنہ مجھے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو تمہاری برداشت سے باہر ہوگا۔''

''تم میری نہیں، اپنی برداشت کو ذہن میں تازہ کرو

تاکہ تمہیں، تمہاری اوقات کا درست اندازہ ہو جائے۔'' نشا نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کندھے کے درد اور اذیت کو برداشت کرنا تمہارے بس میں نہیں تھا اسی لیے تم کسی خارش زدہ گھائل پاگل کتیا کی طرح چیخ چلا رہی تھیں۔ تمہارا سارا غرور خاک میں مل چکا تھا۔ تم دو کوڑی کی بھی نہیں رہی تھیں۔ باقی جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے تو میں اس کا جواب دے چکی ہوں۔ اگر میرا یہ جواب تمہیں پسند نہیں آیا تو ایک اور بھی جواب ہے میرے پاس......''

''کون سا جواب؟'' نشا نے معنی خیز انداز میں اپنی بات نامکمل چھوڑی تو لیلیٰ نے بے ساختہ پوچھ لیا۔ ''جو بھی کہنا ہے، جلدی سے کہہ ڈالو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''تو تم کیا سمجھ رہی ہو، میرے پاس تمہاری بک بک سننے کے لیے ڈھیروں فالتو وقت ہے۔'' نشا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے پچھلی پوری رات جاگ کر ڈیوٹی کی ہے اور اب مجھے بہت زور کی نیند آرہی ہے لیکن سونے سے پہلے میں تمہیں وہ جواب ضرور دے دوں گی......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر لیلیٰ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''جاننا چاہتی ہو، جاسم اس وقت کہاں ہے اور اس کی مصروفیات کیا ہیں؟''

''اب بھونکو بھی......!'' لیلیٰ حسینی بیزاری سے بولی۔

''دو روز پہلے جاسم نے ناجیہ سے شادی کر لی ہے۔'' نشا نے کمالِ اعتماد کے ساتھ لیلیٰ کو اُلو بناتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس وقت وہ دونوں ٹِٹ بِٹ آئی لینڈ پر ہنی مون منا رہے ہیں۔''

''ٹِٹ بِٹ......!'' لیلیٰ بگڑے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''یہ کون سا جزیرہ ہے۔ میں نے یہ نام پہلی بار سنا ہے۔ تم مجھے بتاؤ گی کہ ٹِٹ بِٹ آئی لینڈ کہاں پر واقع ہے؟''

''تمہارے پاس سیل فون تو ہو گا۔'' نشا نے بے پروائی سے کہا۔ ''گوگل کر کے دیکھ لو......''

اِدھر نشا کی بات مکمل ہوئی اُدھر لیلیٰ کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ لیلیٰ نے فوراً سے پیشتر کال اٹینڈ کر لی اور مؤدب لہجے میں کہا۔

''یس سر!''

دوسری جانب موجود شخص، جیکب کی ترتیب دی ہوئی ٹیم کا ایک اہم رکن تھا۔ ''یہ ائر ہوسٹس تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے۔'' اس بندے نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اول تو یہ کہ وہ جاسم یا ناجیہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور دوم...... جس کا امکان بہت کم ہے کہ...... اگر وہ ان دونوں یا کسی بھی ایک کے حوالے سے معلومات رکھتی ہے تو تمہیں ہرگز نہیں بتائے گی۔ وہ اپنی جان دے دے گی مگر زبان نہیں کھولے گی۔''

جیکب کا وہ بندہ ''آڈیو لنک'' پر وہاں ہونے والی تمام تر گفتگو سن رہا تھا۔ نشا کو اس کمرے میں لانے سے پہلے یہ سارا بندوبست کر دیا گیا تھا یعنی وہ کمرا مکمل طور پر ''بگ'' تھا۔

''تو پھر اس کا کیا کرنا ہے سر؟'' لیلیٰ نے نشا پر حقارت بھری نظر ڈالنے کے بعد اس شخص سے پوچھا۔

''وہ زندہ یا مردہ ہمارے کسی کام کی نہیں ہے۔'' دوسری طرف بولنے والے شخص نے سفاکی سے کہا۔ ''اب اس کی قسمت کا فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہو گا۔''

''میں اس سے نمٹ لوں گی سر......'' لیلیٰ نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''اس کمینی کی طرف اچھا خاصا حساب نکلتا ہے۔ بس، آپ کی اجازت کی ضرورت تھی...... تھینک یو سر!''

''تمہیں اس کے ساتھ جو بھی کرنا ہے، وہ ضرور کرو مگر اس سے قبل وہ ٹیکسی ٹھکانے لگانا زیادہ ضروری ہے جس میں اسے وہاں پہنچایا گیا ہے۔'' اس بندے نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ اس ٹیکسی کی وجہ سے تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ ابھی ہمیں ساتھ مل کر اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔ کم از کم جاسم کی گرفتاری یا موت تک تو ہمارا یہ جوائنٹ وینچر جاری رہے گا۔''

''سمجھ گئی سر!'' لیلیٰ نے فرمانبرداری سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی سیلولر رابطہ موقوف ہو گیا۔

فون پر بات کرتے وقت لیلیٰ، نشا سے تھوڑے فاصلے پر چلی گئی تھی۔ نشا نے وہ سب سنا جو لیلیٰ کی زبان سے ادا ہوا لیکن دوسری جانب بولنے والا کیا کہہ رہا تھا، اس بارے میں نشا کو کوئی اندازہ نہیں تھا۔ لیلیٰ کی بات ختم ہوتے ہی اس پُراسرار سیلولر گفتگو کی بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔

''اوپر والوں نے اس خوب صورت چڑیل کو مکمل طور پر ہمارے حوالے کر دیا ہے۔'' لیلیٰ نے نشا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے راشد فیضی سے کہا۔ ''ہم اس عیار لومڑی کا وہ حشر کریں گے کہ جاسم اور کامل کے مارے دہشت کے

رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے تو بتاؤ......"

"اس ائر ہوسٹس کے ساتھیوں جاسم اور کامل نے چند روز قبل ایک بے رحمانہ منصوبے پر عمل کر کے مجھے اور ہمارے "سر" کے ایک بندے بن عرفات کو جس بہیمانہ انتقام کا نشانہ بنایا تھا، ہم اسی کا جواب دیں گے......" راشد فیضی نے حد درجہ غصیلے لہجے میں کہا۔ "اس طرح تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتی کا حساب بھی چکتا ہو جائے گا۔"

"میں تفصیل جاننا چاہوں گی......"

"میں نے اپنی حفاظت کی خاطر اس گھر میں ایک تیز دھار تیغہ رکھا ہوا ہے۔" فیضی نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں اس تیغے کے ایک وار سے ائر ہوسٹس کا دایاں بازو، کندھے سے کاٹ کر تمہارے بازو کے ساتھ ہونے والے ظلم کا انتقام لے لوں گا اور تم کو میرے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینا ہے...... اس کی نسوانیت چھین کر...... اسے بانجھ بنا کر!"

"تمہارا یہ آئیڈیا مجھے پسند آیا۔" لیلیٰ کی آنکھوں میں حیوانی چمک پیدا ہوئی پھر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس آپریشن سے پہلے تمہیں ایک اہم کام کرنا ہوگا۔"

فیضی نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جس ٹیکسی میں اس ائر ہوسٹس کو یہاں تک لایا گیا ہے، وہ ابھی تک باہر کھڑی ہے اور ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ ایک ٹرانسپورٹ سروس کمپنی کی گاڑی ہے۔" لیلیٰ نے معتدل انداز میں کہا۔ "اگر ڈرائیور نے ہمارے خلاف رپورٹ درج کروا دی تو اس ٹیکسی کی لوکیشن کو ٹریس کر لیا جائے گا لہٰذا اس کی وجہ سے کسی مشکل میں پڑنے سے پہلے ہی ہمیں اس کا کوئی مناسب انتظام کرنا ہوگا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟"

"ہاں، بالکل......" فیضی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں کسی سے کہہ کر فوراً اس ٹیکسی کو یہاں سے دور کسی علاقے میں بھجوا دیتا ہوں۔"

"اسی میں ہماری بچت ہے اور موجودہ حالات کا تقاضا بھی یہی ہے۔" لیلیٰ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

فیضی مکان کے بیرونی کمرے میں آیا اور اپنے ایک آدمی کو ٹیکسی کے حوالے سے ہدایات دینے لگا۔ یہ وہی بندہ تھا جو مذکورہ ٹیکسی کو ڈرائیو کر کے سلم ایریا کے اس گھر تک لایا تھا۔ فیضی، ٹیکسی کے معاملے سے مطمئن ہونے کے بعد اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا اور وہ بندہ اس کے حکم کی تعمیل کے لیے ٹیکسی کی جانب بڑھ گیا جو اس مکان سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

گلاٹا برج کے نواح میں واقع وہ سلم ایریا، استنبول بلکہ ترکی کی دیگر جھونپڑ پٹیوں سے قدرے مختلف اور بہتر حالت میں تھا۔ راشد فیضی کا فلیٹ ایک بوسیدہ اور ویران عمارت میں واقع تھا۔ بلڈنگ سے باہر آنے کے بعد اس شخص نے محتاط نظر سے دائیں بائیں دیکھا پھر سبک قدموں سے ٹیکسی کی سمت بڑھنے لگا۔

چند روز قبل جب جاسم نے قاموس سے مدد مانگی تھی تو قاموس کے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ وہ اور کامل، راشد فیضی نامی ایک دغاباز شخص کو سبق سکھانے کی غرض سے وہاں موجود ہیں۔ راشد فیضی کا نام قاموس کے ذہن میں محفوظ تھا لہٰذا جو پولیس پارٹی نشا کو ریسکیو کرنے اس سلم ایریا کی طرف بھیجی گئی تھی۔ اسے راشد فیضی کے حوالے سے معلومات فراہم کر دی گئی تھیں۔ لیلیٰ اور اس کے بڑوں (جیکب کی ٹیم) کو بہت دیر سے اس ٹیکسی کو وہاں سے ہٹانے کا خیال آیا تھا۔ اس دوران میں استنبول کی مستعد پولیس اپنے ٹارگٹ کا محاصرہ کر چکی تھی چنانچہ فیضی کا بھیجا ہوا وہ بندہ جیسے ہی مذکورہ ٹیکسی میں آ کر بیٹھا، وہ لوگ حرکت میں آ گئے۔

پولیس کے چار مسلح جوانوں نے اس ٹیکسی کو اپنے گھیرے میں لے کر ڈرائیور کو نشانے پر رکھ لیا۔ وہ چاروں دراصل فیضی کے فلیٹ پر ریڈ کرنے کی غرض سے آگے بڑھے تھے۔ اگر وہ شخص ٹیکسی کے اندر داخل نہیں ہوتا تو مسلح پولیس والوں نے سیدھا جا کر فیضی کی رہائش گاہ پر دھاوا بولنا تھا اور ان کے دیگر ساتھیوں نے ٹیکسی کے معاملے کو سنبھالنا تھا۔ اس بندے کے وہاں آ جانے سے پولیس کا کام کافی آسان ہو گیا تھا۔

"باہر آ جاؤ......!" ایک پولیس والے نے ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص پر گن تان کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "فوراً آؤٹ...... آؤٹ...... اور ہاتھ سر سے اوپر......!"

اس صورتِ حال نے ڈرائیور کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ پولیس والوں کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ٹیکسی سے باہر آ گیا۔

دو پولیس والوں نے اسے ٹیکسی کے بونٹ پر جھکا کر اس کے دونوں ہاتھوں کو الٹی ہتھکڑی لگا دی پھر کرخت لہجے میں استفسار کیا۔

''کون ہو تم اور اس ٹیکسی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''سر! میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔'' موقع محل کی مناسبت سے اس نے ایک موثر جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے اُلجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک پسنجر کو یہاں ڈراپ کرنے آیا تھا اور اب واپس جا رہا ہوں۔''

''کیا تم اپنے تمام پسنجرز کو ان کے گھر کے دروازے تک چھوڑنے جاتے ہو یا یہ مہربانی خصوصاً نشا صباحی کے لیے تھی؟'' ایک پولیس والے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے اس ائر ہوسٹس کو راشد فیضی کے فلیٹ کے اندر پہنچایا ہے۔ پرائیویٹ کیب چلانے والے اس قسم کی پبلک سروس کب سے کرنے لگے......''

پولیس والے کی زبان سے نشا صباحی اور راشد فیضی کا نام سن کر وہ بندہ بُری طرح بوکھلا گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''آپ...... نشا اور فیضی کو...... کیسے جانتے ہیں......؟''

''ویسے ہی جیسے ہم یہ بھی جان چکے ہیں کہ دو گھنٹے پہلے ائر ہوسٹس نشا صباحی اس ٹیکسی میں بیٹھ کر گورل ولاز سے تقسیم اسکوائر کی طرف جا رہی تھی تو راستے میں فیضی کے دو غنڈوں نے اسے ٹیکسی سمیت اغوا کر کے اس سلم ایریا میں پہنچا دیا۔'' پولیس والے نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کرخت لہجے میں جواب دیا۔ ''تم ہمیں راشد فیضی کے فلیٹ تک پہنچا کر اپنی سزا میں کمی کرنا چاہتے ہو یا زندگی بھر جیل میں سڑنے کا ارادہ ہے؟''

ترکی کی کسی جیل میں سڑنے کا ارادہ کوئی احمق ہی باندھ سکتا ہے۔ ذی ہوش اور سمجھ دار مجرم یہ رسک اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے کیونکہ یہ ''گوانتانا موبے'' سے بھی دس ہاتھ آگے کی چیز ہے۔ گوانتانا موبے میں تو امریکا کا قانون نافذ ہے اور نہ ہی بین الاقوامی قوانین کا کوئی عمل دخل مگر ترکی کی جیلوں میں ایسے قانون کی حکمرانی ہے جو بے گناہ کو مارتا نہیں...... اور گناہ گار کو چھوڑتا نہیں۔

فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ راشد فیضی اور لیلیٰ حسینی کے حکم کا غلام وہ بُرا آدمی اس وقت ''پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی صورتِ حال کا شکار تھا لہٰذا وہ گردن جھکا کر پولیس والوں کے آگے چل پڑا۔ پولیس کے مسلح جوان ایک دم چوکنا تھے اور انہوں نے اس بندے کو اپنے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ اِدھر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی، اُدھر انہوں نے اسے آئندہ کسی حرکت کے قابل نہیں چھوڑنا تھا۔

استنبول پولیس نے سلم ایریا کے اس حصے کی کچھ ایسے انداز میں قلعہ بندی کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر وہاں انسان کیا، کسی جانور کی آمد و شد بھی ممکن نہیں تھی۔ گویا بقول کسے، پولیس کے محاصرے کے اندر کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا اور اسی کارڈن آف ایریا میں واقع ایک خستہ حال فلیٹ کے اندر اس وقت نشا صباحی اپنی زندگی کے مشکل ترین لمحات سے گزر رہی تھی۔

نشا کی تمام بندشوں کو کھول کر اسے کرسی پر اس طرح بٹھا دیا گیا تھا کہ لیلیٰ نے اسے اپنی گن کے نشانے پر رکھا ہوا تھا اور فیضی تیز دھار تیغہ تھامے اس کے نزدیک کھڑا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد نشا نے جس مسلح شخص کو اپنے سامنے کرسی پر بیٹھے دیکھا تھا، اب اسی بندے نے اس کے دائیں بازو کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا تاکہ فیضی کو وار کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو اور تیغے کی ایک ہی ''حرکت'' سے نشا کا وہ بازو شانے سے جدا ہو جائے۔ ان کے علاوہ اس مکان میں ایک اور مسلح شخص بھی موجود تھا۔ یہ وہی بندہ تھا جو ٹیکسی میں نشا کے پہلو میں آ بیٹھا تھا اور اسی نے نشا کو انتا عفیلی حالت میں پہنچایا تھا۔ یہ بندہ اس وقت گھر کے بیرونی کمرے میں پہرے داری کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

''میں تم سے آخری بار پوچھ رہی ہوں......'' لیلیٰ نے نشا کی طرف دیکھتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ، جاسم کہاں ہے؟ اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو اپنے دائیں بازو سے محروم ہو جاؤ گی۔ مجھ سے کسی اچھے برتاؤ کی امید نہیں رکھنا۔''

''آلِ ابلیس سے اچھائی کی توقع رکھنا اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔'' نشا نے کمالِ جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''میں واقعی جاسم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ ایک میں ہی کیا...... آج صبح حسنی سر نے بھی مجھے یہی بتایا ہے کہ یکم مارچ علی الصباح جاسم چپ چاپ، انہیں کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ یہی ٹھوس حقیقت ہے۔ تم اگر میرے بدن کے ایک ہزار ٹکڑے بھی کر ڈالو تو تمہارے اس قسائی عمل سے حقیقت میں کوئی بدلاؤ نہیں آئے گا۔''

''ٹھیک ہے......'' لیلیٰ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری مرضی......!''

فیضی نے سوالیہ نظر سے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بے رحمانہ لہجے میں بولی۔ ''فیضی! ڈوارٹ......!''

فیضی کے ہونٹوں پر حیوانی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کسی خون آشام بھیڑیے کے مانند بھوکی نظر سے نشا کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ہر طرف انتقام ہی انتقام تھا...... ایک لرزہ خیز بھیانک انتقام۔

قبل اس کے کہ فیضی کا تیغے والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوتا اور نشا کے دائیں بازو کو اس کے جسم سے جدا کر دیتا، بیرونی دروازے پر تیز دستک سنائی دی۔

فیضی اور لیلیٰ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیلیٰ نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ”یہ کون ہوسکتا ہے؟“

فیضی کے جواب دینے سے پہلے نشا بے ساختہ بول اٹھی۔ ”تم دونوں کی موت۔ جاؤ، باہر نکل کر اپنی عبرت ناک موت کا استقبال کرو......“

”تم اپنی چونچ بند رکھو......“ فیضی نے ٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”موت صرف تمہاری ہوگی اور وہ بھی میرے ہاتھوں، اگر تم نے خاموشی اختیار نہیں کی تو......“ پھر لیلیٰ وہ حسینہ سنگل بازو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”لیلیٰ! تم اس کمینی اثر ہوسٹس پر دھیان دو۔ میں پتا لگا کر آتا ہوں کہ یہ غیر متوقع دستک کس سلسلے میں ہے۔“

اس دوران میں ایک بار پھر، پہلے سے بھی زیادہ زور سے اس فلیٹ کا داخلی دروازہ دھڑ دھڑایا جا چکا تھا۔ بیرونی کمرے میں ان کا ایک مسلح ساتھی موجود تھا۔ وہ فیضی کے کسی استفسار سے پہلے دروازے کے نزدیک جا کر دریافت کر چکا تھا۔

”کون...... کیا چاہیے...... دروازہ توڑنے پر کیوں تلے ہوئے ہو......؟“

”نقاش! دروازہ کھولو۔ یہ میں ہوں، احمر......!“ الٹی ہتھکڑی لگے احمر نے گن پوائنٹ پر، پولیس کی کڑی ہدایت کے مطابق کہا۔ ”میں اس منحوس ٹیکسی کی چابی اندر بھول آیا تھا۔ وہی لینے آیا ہوں......!“

احمر کی آواز نقاش کے علاوہ فیضی کی سماعت تک بھی پہنچی تھی کیونکہ اس اثنا میں وہ اندرونی کمرے سے بیرونی کمرے میں آچکا تھا۔ نقاش نے سوالیہ نظر سے فیضی کی طرف دیکھا تو فیضی نے سر کی اثباتی جنبش سے اسے دروازہ کھولنے کی اجازت دے دی اور خود بے پروائی سے چلتے ہوئے واپس ایمرجنسی روم کی جانب بڑھ گیا جو آنے والے لمحات میں او ٹی (آپریشن تھیٹر) بننے جا رہا تھا۔

نقاش نے فلیٹ کا داخلی دروازہ کیا کھولا کہ اس کے دماغ کے سارے دروازے یکا یک بند ہو گئے۔ احمر کی آواز نے اسے اطمینان دلا دیا تھا کہ باہر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے اور یہی اطمینان اسے بہت مہنگا پڑا۔ دروازے کی کنڈی گرتے ہی دو پولیس والوں نے طوفانی انداز میں دروازے پر ککس رسید کر دی تھیں۔ نتیجتاً دروازے کا پٹ سیدھا جا کر نقاش کے تھوبڑے پر لگا۔ اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ خارج ہوئی اور وہ ریورس گیئر میں ہوائی سفر کرتے ہوئے کئی فٹ پیچھے، پشت کے بل زمین پر گرا۔ چار میں سے تین مسلح پولیس والے بھرا مار کر اندر داخل ہو گئے۔ چوتھا پولیس والا گرفتار شدہ احمر کے ساتھ باہر ہی رک گیا تھا۔

نقاش چونکہ باہر کی صورتِ حال سے پوری طرح مطمئن تھا اس لیے گن کو ہاتھ میں رکھنا اس نے ضروری نہیں جانا تھا اور اب ذلت آمیز انداز میں زمین بوس ہونے کے بعد اسے اپنی گن کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی مگر جو لوگ نشا کو ریسکیو کرنے آئے تھے، انہوں نے نقاش کی ”ضرورت“ کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے اس کے جسم کے زیریں حصے پر بے دریغ فائرنگ کر دی۔

دروازہ کھلنے کی دھماکے دار آواز، نقاش کا زمین بوس ہو کر کرب ناک انداز میں چلانا اور اس فائرنگ کے نتیجے میں اس کی فلک شگاف چیخیں...... ایسے غیر متوقع اور سنسنی خیز عوامل تھے کہ اندرونی کمرے میں موجود راشد فیضی اور لیلیٰ حسینی کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ ایسی کسی ایمرجنسی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے اور اب ایسی کسی تیاری کا وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ وہ اضطراری ردِعمل کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

لیلیٰ نے میکانکی انداز میں پلٹ کر بیڈ روم کے دروازے کی جانب فائر کر دیا اور فیضی نے بجلی ایسی سرعت سے آگے بڑھ کر نشا کو اپنے بائیں بازو کی لپیٹ میں لینے کے بعد دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا خطرناک تیغہ اس کی گردن پر اس طرح جما دیا کہ تیغے کی ظالم دھار نشا کی شہ رگ کو بوسہ دے رہی تھی۔ اگر فیضی اپنے تیغہ بردار ہاتھ کو ذرا سی بھی حرکت دیتا تو نشا کی گردن کو تن سے جدا ہو جانا تھا۔

لیلیٰ کی چلائی ہوئی گولی ایک پولیس والے کے کندھے پر لگی لیکن اسے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ اس دوران میں دوسرے دونوں پولیس والوں نے اپنی گنز کے دہانے کھول دیے تھے۔ پولیس والے نشا کو فیضی کی مسلح اور مہلک ”کسٹڈی“ میں دیکھ چکے تھے لہٰذا ان کی گنز کا رخ صرف لیلیٰ اور اس کے ایک مسلح آدمی کی طرف تھا اور

انہوں نے واقعتاً ان دونوں کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ پانچ سیکنڈ سے بھی کم مہلت میں لیلیٰ اور اس کے وفادار کو دوسرے جہان کے ویزاز جاری کر دیے گئے تھے۔ ان کے چھلنی بدن اتنی تیزی سے خون اگل رہے تھے کہ بادی النظر میں وہ اپنے ہی لہو میں نہائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''لڑکی کو چھوڑ دو......!'' ایک پولیس والے نے فیضی کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اگر تم اس تلوار کو پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دو گے تو ہم تمہارے معاملے میں خصوصی نرمی سے کام لیں گے۔''

پولیس والوں کے علاوہ اب اس بیڈروم میں صرف دو ہی زندہ افراد موجود تھے۔ ایک فیضی اور دوسری نشا۔ نشا اس وقت اپنی زندگی کے سنگین ترین لمحات سے گزر رہی تھی۔ اس کی شہ رگ فیضی کے تیغے کی دھار پر تھی اور فیضی کی اپنی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ اپنے بچاؤ کے لیے کسی وقت کچھ بھی کر سکتا تھا......

''کیا تم لوگوں نے مجھے اُلو کا پٹھا سمجھ رکھا ہے جو میں اس ائر ہوسٹس کو چھوڑ دوں......؟'' فیضی نے ہیجانی انداز میں کہا۔ ''یہ بدبخت اس وقت میرے لیے انشورنس پالیسی اور لائف لائن کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں اسے اِدھر ہی کاٹ ڈالوں گا۔''

''اس لڑکی کو مارنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' پولیس والے نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس پورے علاقے کو پولیس نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ باہر نکلتے ہی تمہاری موت پکی ہے۔ اگر تم سرنڈر کر دو تو تمہاری سزا میں اچھی خاصی کمی ہوجائے گی۔''

''مجھے گیان دینے کے بجائے اس لڑکی کے بارے میں سوچو جس کی زندگی اس وقت مکمل طور پر میرے ہاتھ میں ہے۔'' فیضی نے وحشیانہ انداز میں کہا۔ ''میں اپنے اچھے بُرے کا خود ذمے دار ہوں۔ میں کسی محفوظ مقام پر پہنچنے کے بعد اسے چھوڑ دوں گا۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔''

''ہم تمہارے وعدے پر بھروسا نہیں کر سکتے۔''

''تو مجھے کیا کسی پاگل کتے نے کاٹا ہے جو تمہاری جھوٹی تسلی کا یقین کر کے خود کو مصیبت میں ڈال لوں؟'' فیضی نے کڑوے لہجے میں کہا پھر ان دھمکی آمیز الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''میں اب تم لوگوں سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ اگر تم نے مجھے سیف پیسج نہیں دیا تو میں اس حسین بلا کو اِدھر ہی ذبح کر ڈالوں گا۔ اس کے بعد میرا جو بھی حشر ہو، مجھے پروا نہیں ہے۔''

اگرچہ مسلح پولیس والوں نے فیضی کو اپنے نشانے پر لے رکھا تھا مگر اس نشانے کے بیچ میں، ہر زاویے سے نشا بھی حائل تھی۔ وہ لوگ ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے جس میں فیضی کا شکار کرتے ہوئے نشا کی جان کو ایک ذرا سا بھی خطرہ لاحق ہو لہٰذا وہ فیضی کا ناجائز مطالبہ ماننے پر مجبور ہو گئے۔

اس دوران میں چوتھے پولیس والے نے زخمی شانے والے اپنے ساتھی کی مدد سے نقاش کو بھی آہنی زیور پہنا دیا تھا۔ بہرکیف، ان لمحات میں وہ دو پولیس والے بہت ہی آزردہ نظر آرہے تھے جو فیضی کو ختم کرنے یا اسے روکنے اور یا پھر نشا کو ریسکیو کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے سینئر سے رابطہ کرنے کے بعد مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

''سر! لیلیٰ اور ایک مجرم مارا گیا ہے جبکہ دو مجرموں کو ہم نے حراست میں لے لیا ہے مگر افسوس کہ وہ مردود فیضی، نشا صباحی کو تلوار کی دھار پر رکھ کر فلیٹ سے نکل گیا ہے۔ ہم نے نشا کی سلامتی کی خاطر اس پر گولی نہیں چلائی۔''

''افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں......'' سینئر نے متحمل انداز میں کہا۔ ''فیضی ہمارے اسنائپر کی پکڑ میں ہے۔ ہم اسے دیکھ لیں گے۔ تم لوگ کرائم سین کی ضروری کارروائی نمٹانے کی کوشش کرو۔ باقی نشا کی سیفٹی کے لیے فیضی کو شوٹ نہ کرنے کا فیصلہ صد فیصد درست تھا۔ ہمارے نزدیک نشا کو بچانا، فیضی کو مارنے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ تم لوگوں نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔''

''تھینک یو سر......!'' پولیس والے نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

اسنائپر والا آئیڈیا قاموس ترک کا تھا۔ پولیس کی ٹیم کو اس سلم ایریا کی طرف بھیجتے ہوئے اس نے ایک شارپ شوٹر کو فیضی کے فلیٹ کی سامنے والی بلڈنگ کی چھت پر تعینات کرنے کے احکامات صادر کر دیے تھے اور وہ بھی مکمل معلوماتی ہدایات کے ساتھ۔ مذکورہ اسنائپر اس سینئر پولیس آفیسر سے مسلسل لائیو رابطے میں تھا۔

''سر! میرے لیے کیا حکم ہے؟'' شوٹر نے پوچھا۔

آفیسر نے سوال کیا۔ ''تازہ ترین پوزیشن کیا ہے؟''

''وہ دونوں برابر میرے نشانے پر ہیں سر......!''

''فیضی کو شوٹ کرنے کے کتنے امکانات ہیں؟''

آفیسر نے استفسار کیا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ نشا کو ایک کھرونچ بھی آئے۔ میں نے اپنے باس قاموس کے دوست طلال حسنی سے اس کی سلامتی کا وعدہ کر رکھا ہے......''

''بے فکر ہو جائیں۔ آپ کا وعدہ ہر حال میں ایفا ہوگا سر!'' شوٹر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''وہ کمینہ نشا کو اپنی گرفت میں لیے، محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہا ہے۔ میں نے اس کے بدن کی ایک ایک جنبش پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے وہ اگلے دس سیکنڈ میں وہ جیسے ہی گلی کے نکڑ پر پہنچے گا، مجھے ایک سیف شوٹنگ اینگل مل جائے گا۔ اس مقام پر فیضی کی پشت میری طرف ہوگی۔ میرے ٹریگر دباتے ہی انگشت بھر لمبی گولی اس نامراد کی کھوپڑی کے عقبی حصے سے گھس کر پیشانی سے باہر نکل جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی نشا صاحبہ اس کے شر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گی۔''

''گڈ آئیڈیا......'' آفیسر نے ستائشی لہجے میں کہا۔

شوٹر گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''سر! وہ نکڑ پر پہنچ رہا ہے۔''

''او کے...... ڈو اٹ!'' آفیسر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

لحاتی توقف کے بعد شوٹر کی فاتحانہ آواز، آفیسر کی سماعت تک پہنچی۔ ''سر! آئی ہیو ڈن!''

''ویل ڈن!'' آفیسر نے ایک گہری اور آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''دی ڈرٹی گیم از اَپ......!''

اپنی کھوپڑی میں ہوادان بنوانے کے بعد فیضی مردہ چھپکلی کے مانند ''پٹ'' سے منہ کے بل پختہ زمین پر گرا تھا اور گرتے ہی بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ اس کی بھیانک موت میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ پولیس سے تھوڑے فاصلے پر آجانے کے بعد فیضی کی رفتار میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا اور اس نے خنجر کو بھی نشا کی گردن سے دور کر دیا تھا۔ اس کی یہی بے احتیاطی نشا کی زندگی کا سبب بن گئی۔ فیضی کو جیسے ہی گولی لگی، نشا پر اس کی گرفت ختم ہو گئی تھی اور شوٹر کے کہنے کے مطابق نشا سدا کے لیے اس جنونی شیطان کے چنگل سے آزاد ہو گئی۔

کسی مجبور اور بے بس عورت کو ڈھال بنا کر اپنی حفاظت کرنا مردانگی نہیں، بے غیرتی ہے تاہم اس حوالے سے کلی طور پر فیضی کو الزام دینا سراسر ناانصافی ہوگی کیونکہ اس سے مردانگی کی توقع کرنا بنتا نہیں۔ جاسم نے اسے مردوں کی فہرست سے خارج کر کے، وقت کے محل سرا میں، خواجہ سرا کے مقام پر فائز کر دیا تھا۔

یہی نیرنگیِ وقت ہے، یہی انقلابِ زمانہ ہے اور یہی دستور منصفانہ ہے۔ اس خوں ریز بکھیڑے میں واقعتاً نشا کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہوا تھا حالانکہ اس نے موت کو روبرو دیکھا تھا۔ ایسے ہی معجزنما واقعات کو ظہور پذیر ہوتے دیکھ کر بے ساختہ زبان بول اٹھتی ہے...... جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے......؟

☆☆☆

طلال حسنی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ نشا کی باعزت اور باحفاظت واپسی کے اعزاز میں اس نے اپنے ولا پر ایک عالی شان ڈنر کا اہتمام کر ڈالا تھا جس میں قاموس ترک اور اس کی فیملی کو خصوصاً مدعو کیا گیا تھا۔ قاموس تو نشا کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا لیکن جب اس کی بیوی آکسن کو نشا کے ماضی اور حال کا علم ہوا تو اس نے نشا کے مستقبل کو ذہن میں رکھتے ہوئے حسنی سے کہا۔

''بھائی! نشا کو اب آپ مستقل طور پر اپنے پاس ہی رکھ لیں۔ اس طرح آپ کے گھر کی رونق میں اضافہ ہو جائے گا اور آپ کا دل بھی لگا رہے گا۔''

''بھابی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' حسنی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''نشا کے لیے میرے دل میں جگہ کی کمی ہے اور نہ ہی گھر میں کوئی تنگی۔ جب میں نے اسے زبان سے بیٹی کہہ دیا تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ آج سے یہ اسی ولا میں رہے گی...... اسد کی بڑی بہن اور دریا کی نند کی حیثیت سے اور جاسم کی ایک سچی اور وفادار دوست ہونے کے ناتے بھی۔ اس کے علاوہ نشا کا تعلق بھی میرے آبائی علاقے کو نیا ہی سے ہے اور اس نے ہوائی جہاز میں میری جان بچانے میں جو کردار ادا کیا تھا، اس کا وہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا......!''

بات کے اختتام پر حسنی خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ بھرّائی ہوئی آواز کے ساتھ جب وہ خاموش ہوا تو نشا نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سر! آپ کے اندر مجھے اپنے مرحوم باپ کی صورت نظر آتی ہے۔ اُس روز میں نے جہاز میں اپنے باپ کو بچانے کی کوشش کی تھی جو خوش قسمتی سے کامیاب رہی۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ اگر آپ میرے اس عمل کو احسان سمجھ بھی رہے ہیں تو پھر آپ کو آج ہی وہ احسان بھولنا ہوگا کیونکہ آپ نے بھی آج میری جان بچا کر حساب برابر کر دیا ہے۔''

''باپ اور بیٹی کے رشتے میں کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا۔'' قاموس ترک نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ دونوں نے اپنے اپنے وقت پر، اپنا اپنا فرض نبھایا ہے اس لیے کسی کا کسی پر کوئی احسان نہیں......'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر نشا کی طرف دیکھتے ہوئے اِن الفاظ

میں اضافہ کر دیا۔

''پاگل لڑکی! ایک طرف تم حسنی کو اپنے باپ کی جگہ سمجھتی ہو اور دوسری جانب انہیں ''سر'' کہتی ہو۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟''

''آئی ایم سوری پاپا......!'' نشا نے حسنی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب میں آپ کو کبھی ''سر'' نہیں کہوں گی۔''

حسنی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے وارفتگی کے عالم میں نشا کو اپنے سینے سے لگالیا۔ وقت گویا ایک مقام پر تھم کر رہ گیا تھا۔ کئی لمحات اسی بے نام خاموشی میں گزر گئے۔ اس سنسنی خیز سناٹے کو نشا کی بلکتی ہوئی آواز نے پاش پاش کر دیا۔ وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔ اس کے سینے میں، بے آواز اور پُرسکون بہنے والی جذبات کی ندی ایکا یک باڑ پر آگئی تھی۔ اس کے کناروں سے چھلکنے والے منہ زور سیلِ آبی ریلوں نے اس کی آنکھوں کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ وہ تادیر آنسوؤں کی شکل میں اپنے دماغ کا بخار اور دل کا غبار نکالنے میں مصروف رہی......!

حسنی نے بہ وقت تمام تھپک تھپک کر نشا کو نارمل کیا پھر حاضرینِ مجلس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میری بیٹی پچھلی رات کی جاگی ہوئی ہے اور آج کا دن کیسا قیامت خیز اور اعصاب شکن گزرا ہے، یہ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسے ایک طویل اور پُرسکون نیند کی اشد ضرورت ہے۔''

ڈنر ختم ہو چکا تھا۔ شرکائے محفل نے حسنی کی تجویز پر صاد کیا۔ جب قاموس اپنی فیملی کے ساتھ رخصت ہونے لگا تو طلال حسنی نے اس سے معانقہ کرتے ہوئے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''قاموس......! تم نے کر دکھایا......!''

''میں نے نہیں میرے اللہ نے نشا کی جان بچائی ہے۔'' قاموس نے حسنی کے کان میں سرگوشی کی۔ ''باقی جہاں تک کچھ کر دکھانے کی بات ہے تو وہ بھی میں نے نہیں، میرے ڈپارٹمنٹ کے چند مستعد افراد نے کیا ہے۔ بہرکیف...... اس وقت تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔ دیگر باتیں بعد میں کریں گے...... یار زندہ، صحبت باقی!''

قاموس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ان لمحات میں حسنی واقعتاً خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر نشا کو پیش آنے والے اس ناخوشگوار واقعے نے اسے اندر باہر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ وہ سونے کے لیے جیسے ہی بستر پر دراز ہوا، اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون اٹھا کر ڈسپلے پر نگاہ ڈالی تو وہاں کامل کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کرتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہیلو مائی سن......!''

''تمہارے اس منہ بولے سن (بیٹے) کی زندگی کا سن (سورج) غروب ہونے والا ہے......!'' کامل کے بجائے دوسری جانب کسی اور شخص نے سنگین لہجے میں کہا۔ ''صرف تم ہی اسے بچا سکتے ہو......''

''کون ہو تم؟'' حسنی نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''میں کون ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا......!'' اس شخص نے دوٹوک اور سفاک لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اپنے اس پاکستانی سن کی فکر کرنا چاہیے جو اس وقت مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر ہے۔ تمہارے لیے میرے پاس ایک ڈیل ہے، اگر تم واقعی اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو......!''

''تم کس ڈیل کی بات کر رہے ہو؟'' حسنی پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اس شخص نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔ ''جاسم دو...... کامل لو!''

''یہ عملاً ناممکن ہے......!'' حسنی نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ جاسم میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میں اُس کے بارے میں کچھ جانتا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا لہٰذا ایسی کسی ڈیل کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ تمہیں میری بات کا یقین کرنا چاہیے اور ہاں...... کامل سے میری بات تو کراؤ......!''

''استنبولی بُڈھے!'' دوسری جانب بولنے والے بدتمیز شخص نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ تمہارا ہائی کورٹ نہیں، ہماری عدالت ہے جہاں پر ہر فیصلہ ہمارے قانون اور قاعدے کے مطابق ہوتا ہے۔ میں ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ فون کروں گا۔ اس ڈیل کے بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دینا...... ہاں یا نہ...... تمہارے پاس...... اور کوئی تیسرا آپشن نہیں ہے!''

قبل اس کے کہ حسنی اس نامعلوم شخص کے ناممکن مطالبے کے جواب میں کچھ کہہ پاتا، لائن بے جان ہوگئی......

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے

لکی اسٹار ہوٹل امجد کے لیے بیڈلک ثابت ہوا۔ وجہ یہی تھی کہ جس بدمعاش ٹائپ آدمی کو اس نے دھواں دھار انداز میں اندر داخل ہوتے دیکھا تھا، اسے دیکھ کر اس کی طبیعت مالش کرنے لگی تھی۔

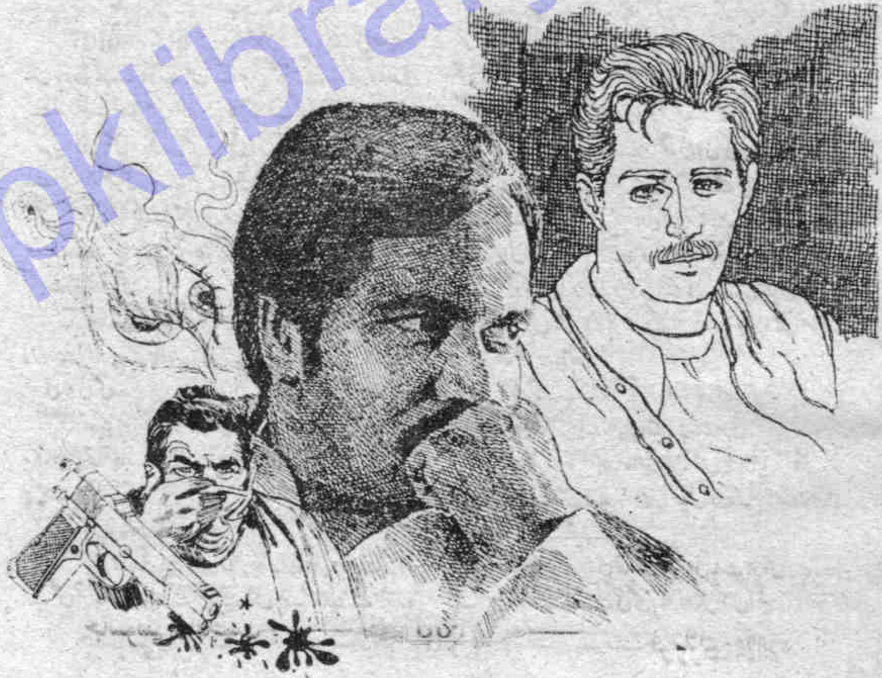
وہ سیدھا اندر داخل ہوا، ویٹر اسے روکنے یا کچھ پوچھنے کے لیے لپکا ہی تھا کہ اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر ایک طرف زور سے دھکا دیا، وہ بے چارہ ایک بھرے برتنوں والی میز پر جا پڑا۔ ہلچل مچی، بیٹھے ہوئے لوگ اس کی طرف گردن

مہارت

اے آر راجپوت

ہر شخص اپنے اندر کوئی نہ کوئی مہارت رکھتا ہے... کچھ کو اپنے اس ہنر کا ادرک ہوتا ہے... اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سامنے والے کو کسی قابل نہیں سمجھتے اور نہ ہی اُن کی صلاحیت و ہنر کو اہمیت دیتے ہیں... ایک ایسے ہی فنکار کی مشکل... اس کی خواہش تھی کہ لوگ اس کے فن کو پہچانیں اور اسے بطور آرٹسٹ قبول کریں...

ہلکے پھلکے مزاح کے رنگ میں ڈوبی ایک ماہرِ فن کی فنکارانہ مہارت کے داؤ پیچ......



موڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ شاید اندر داخل ہوتے ہی امجد کو ایک میز پر بیٹھے دیکھ چکا تھا۔

وہ تیر کی طرح اس کی جانب بڑھا۔ امجد نے اس کے قریب پہنچتے پہنچتے اپنی کرسی چھوڑنی چاہی لیکن اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

''بیٹھے رہو۔'' اس نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''کیا تم نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا؟''

امجد کو اس پر شائبہ تو اسی وقت ہو گیا تھا جب وہ اندر داخل ہوا تھا۔ وہ اس کا دوست رفیق رستم تھا۔ رستم کا لاحقہ دوستوں نے لگا رکھا تھا۔ اس کے ڈیل ڈول پر پہلوان کا گمان ہوتا تھا۔ فلموں اور ڈراموں میں منفی کردار ادا کیا کرتا تھا اور زیادہ مقبول نہیں ہو سکا تھا۔ شکل و صورت عام بدمعاشوں جیسی تھی۔ وہ رہتا بھی اسی طرح تھا۔ طبیعت کا غصہ ور تھا۔

''او ہو تم......!'' امجد نے اچنبھے سے کہا۔ ''یہاں کیسے؟ بیٹھو......'' طوعاً و کرہاً امجد نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود ایک چھوٹی موٹی اشتہاری ایجنسی کا مالک تھا۔ رستم کو وقت بے وقت اُدھار مانگنے کی عادت تھی اسی لیے ہر کوئی اس کی بدتمیزی غصہ ور طبیعت کی وجہ سے نالاں تھا۔

''میں سیدھا ''آنکھوں سے گولی مارے......'' کے سیٹ سے آرہا ہوں۔'' اس نے امجد کے سامنے والی سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''حامد درانی نے جواب دے دیا ہے۔''

اسی دوران میں دو تین ویٹر ہوٹل کے مالک کی معیت میں مارچ کرتے ہوئے ان کے سر پر پہنچ گئے۔ امجد کو جلدی سے مداخلت کرنا پڑی اور اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ آدمی یعنی رفیق رستم...... ٹی وی آرٹسٹ ہے اور سیٹ سے سیدھا ادھر ہی آیا ہے، قریب ہی شوٹنگ چل رہی تھی۔

ہوٹل کا مالک یا منیجر اور ویٹرز منہ بناتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ ''ٹی وی آرٹسٹ'' والی بات کو انہوں نے مطلق اہمیت نہیں دی تھی۔

''کھانے کو کچھ منگواؤ، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' اس نے امجد پر حکم چلایا۔ امجد نے دیکھا کہ اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔

''یہ کیا ہوا، کیا شوٹنگ کے دوران میں سچ مچ ہیرو نے مکا مار دیا تھا تمہارے چہرے پر؟'' امجد نے مصنوعی پن سے پوچھا۔

''ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔''

''بہتر ہو گا تم پہلے واش روم جا کر اپنا حلیہ درست کر لو، اب بھی تم بدمعاشوں کے ہی حلیے میں ہو۔'' امجد نے مشورہ دیا۔

''یہ میک اپ تو اب اسٹوڈیو جا کر ہی اُترے گا۔''

''ہیرو کے ساتھ تو پھر تمہاری سچ مچ لڑائی ہو گئی ہو گی؟ کون تھا، اعظم؟''

''ہاں۔'' رستم نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''کیا تم نے ''آخری دروازہ'' میں میرا کام دیکھا تھا؟ قطع نظر کہانی کے تمہیں ماننا پڑے گا کہ میں نے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا تھا۔ ہر شخص نے میرے اس کردار کی تعریف کی تھی۔''

''ہاں، تم نے ایک وحشی انسان کا کردار ادا کیا تھا۔''

''شعیب رمزی ایک ایسا شخص ہے جو بہت کم کسی کردار کی تعریف کرتا ہے، اس نے بھی میرے اس کردار کی تعریف کی تھی۔ اکثر فلم اور ٹی وی مبصروں کا کہنا ہے کہ میں خوف ناک انسان کا پارٹ بڑی عمدگی سے ادا کرتا ہوں اور...... تم جانتے ہو جمی (وہ امجد کو جمی ہی کہتا تھا، لیکن صرف وہی، کیونکہ امجد کو اپنا نام 'جمی' کہلوانا سخت ناپسند تھا)'' کہ میں اپنا میک اپ خود ہی کرتا ہوں، لیکن کچھ لوگوں کو یہ بات پسند نہیں ہے۔''

''اعظم خاں سے تمہارا کس بات پر جھگڑا ہوا ہے؟'' امجد جان چکا تھا کہ اعظم خاں کا مکا بہرحال ڈرامے کا حصہ نہیں ہو سکتا تھا۔

''اُسے بھی یہی شکایت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ میرا میک اَپ اچھا نہیں ہوتا۔ میں کردار نگاری نہیں کر سکتا۔ بقول اس کے میں ایک چھ سال کے بچے کو بھی بے وقوف نہیں بنا سکتا، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں اعظم کی توقعات سے بہت بڑھ کر کردار نگاری کر سکتا ہوں۔ حال ہی میں اس نے میرے ساتھ ٹی وی کی ایک سیریز کے لیے بات چیت کی ہے۔ اس سیریز میں مجھے ایک پُراسرار اور خوف ناک قسم کے ڈاکٹر کا کردار ادا کرنا ہے۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ فلموں میں کام کرنے والے اداکار ٹی وی میں نہیں جاتے۔ کیونکہ ایسا کرنے والوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ فلموں میں ناکام ہو گئے ہیں۔ یہ معاہدہ میں صرف اعظم کی خاطر کر رہا تھا۔''

''پھر تو اسے تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے۔''

''یقیناً، بشرطیکہ درمیان میں رینا نہ ہوتی۔''

''رینا......؟'' امجد سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔ ''پہلی بار ہی یہ نام سنا ہے میں نے...... میرا خیال ہے کہ تم نادرہ نام کی لڑکی سے عشق کرتے تھے۔''

''اس کا نام روزی تھا، بہت پرانی بات ہو چکی ہے۔ وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے لیے گئی تھی، پھر واپس نہیں آئی۔''

''ہم......ہم......'' امجد کے منہ سے نکلا۔ ''تو آج کل تم رینا سے محبت کررہے ہو۔ یہ وہی رینا تو نہیں جو کچھ عرصہ قبل ٹی وی کمرشل میں آیا کرتی تھی۔ غالباً ٹوتھ پیسٹ اور صابن وغیرہ کے اشتہاروں میں؟''

''یقیناً وہی ہے۔ اس وقت وہ سلور اسکرین سمیت مختلف ٹی وی چینلز کی گرم ترین پراپرٹی ہے۔''

''اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

''بات یہ ہے کہ میں نے کئی لڑکیوں کے ساتھ دوستی کی ہے مگر اس لڑکی کے معاملے میں، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ میں اس سے سچی محبت کرتا ہوں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اعظم بھی اس لڑکی کے معاملے میں سنجیدہ ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ رینا کس کے معاملے میں سنجیدہ ہے؟''

''سر دست تو وہ دونوں کا دل رکھنے کی کوشش کررہی ہے۔''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ وہ اعظم کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوسکتی، کیونکہ اعظم نے حال ہی میں ایک بھورے بالوں والی لڑکی سے شادی کی ہے۔''

''تمہاری زندگی دراصل ایک پسماندہ قسم کے گاؤں گوٹھ میں گزری ہے۔'' اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہاں شہروں......اور خصوصاً شوبز کی دنیا کے لوگ ہمیشہ ایک آدھ لڑکی ویٹنگ لسٹ میں رکھتے ہیں، جیسے ہی بیوی سے معاملہ خراب ہوا، انہوں نے اس کا حساب بے باق کیا اور دوسری لڑکی کو میدان میں لے آئے۔''

''یہ تبدیلی اتنی بھی تیز نہیں ہوسکتی۔ ایک لڑکی سے جی بھرنے میں کچھ تو وقت لگتا ہے۔ چند روز قبل اعظم نے اپنی نئی نویلی دلہن کو ایک جڑاؤ نیکلس تحفے میں دیا ہے۔''

''بھئی وہ اعظم ہے۔ اداکاری اور ہدایت کاری کے علاوہ پورے دس سال اشتہاری ایجنسی سے بھی وابستہ رہا ہے۔'' رستم نے کہا۔ ''اس کے پاس روزانہ درجنوں کے حساب سے ماڈل بننے کی شوقین لڑکیاں آتی ہیں۔ ہر قسم کی لڑکیاں، حسین، نوخیز، خوب صورت، تیز طرار، معصوم اور ایسی بھی جو فن کے نام پر اپنا سب کچھ لٹانے پر تیار ہوتی ہیں۔ ایسے شخص کی نظروں میں لڑکی کی قدر و قیمت وہ نہیں ہوتی ہے۔''

''تو پھر رینا کے معاملے میں وہ اتنا سنجیدہ کیوں ہو رہا ہے؟''

''محض ضد کی وجہ سے، غالباً رینا نے اس کے ساتھ چند ملاقاتیں کی تھیں، لیکن جب اسے پتا چلا کہ رینا مجھ سے بھی ملتی ہے تو وہ برہم ہوگیا۔ اس نے رینا کو اپنی نئی فلم میں کام بھی دیا ہے اور اسے ملاقاتوں پر مجبور بھی کررہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، وقتی طور پر رینا اس کے دباؤ میں آگئی ہوگی، لیکن اب تو اس کی مارکیٹ ویلیو بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ جب چاہے اعظم کو کھری کھری سنا سکتی ہے۔''

''یقیناً سنا سکتی ہے، لیکن آج کل میں ان کے باہمی تعلقات کے بارے میں قطعاً کچھ نہیں جانتا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اعظم سے ملتی بھی ہے یا نہیں۔''

''تم اس سے پوچھ کیوں نہیں لیتے؟'' اس اثنا میں امجد ویٹر کو کھانے کا آرڈر دے چکا تھا۔ کھانا میز پر لگا دیا گیا اور وہ اس پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔

''میرے بھائی!'' وہ جواب میں بڑا سا نوالہ نگلتے ہوئے بولا۔ ''یہ عشق و محبت کے معاملے اتنے سہل نہیں، جتنا تم سمجھتے ہو۔ اگر میں نے رینا سے یہ سوال کرلیا تو اس کی انا کو سخت ٹھیس پہنچے گی اور وہ یہ سمجھے گی کہ میں اس کے کردار پر شک کرتا ہوں۔ اگر وہ اس سے ملتی ہے تو کبھی اقرار نہیں کرے گی اور اگر نہیں ملتی تو اس کے دل میں گرہ پڑ جائے گی۔ وہ یہ سوچنا شروع کردے گی کہ میں اس پر اعتماد نہیں کرتا۔''

''تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ دورخی پالیسی چل رہی ہے۔ مجھ سے بھی ملتی ہے اور اعظم خاں سے بھی۔ میرے ساتھ اسے جذباتی لگاؤ ہے اور اعظم کے ساتھ کاروباری۔''

ویٹر جو کافی دیر سے ان کی میز کے گرد منڈلا رہا تھا، قریب آکے کے بولا۔ ''صاحب! اور کچھ چاہیے؟''

''چاہیے ہوگا تو بتا دیں گے اب تم دور ہو جاؤ، ہم ضروری باتیں کررہے ہیں۔'' رستم نے حسبِ مزاج روکھے پن سے کہا۔ وہ چلا گیا۔

''اگر اعظم نے تمہیں ذاتی وجوہات کی بنا پر جواب دے دیا ہے تو تم متین گروپ سے بات کرو۔''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مجھے کسی متین شتین کی ضرورت نہیں ہے۔'' رستم اکھڑپن سے بولا۔ ''اور...... سچ پوچھو تو متین گروپ والے اعظم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس شخص کا فلم انڈسٹری میں زبردست اثر و رسوخ ہے۔''

''تو گویا تم نے ہتھیار ڈال دیے ہیں؟''

''رفیق رستم نے کبھی ہتھیار ڈالنا نہیں سیکھا۔ اس وقت تو اعظم نے میرے فن اور میری محبت کو چیلنج کیا ہے۔ بڈھا بگلا کہتا ہے کہ مجھے میک اپ نہیں کرنا آتا اور میں یہ بات ثابت

کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے بہترین میک اَپ کوئی نہیں کرسکتا۔“ پھر اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

”ویٹر! مٹن کڑاہی کی ایک پلیٹ اور لے آؤ اور چکن کے دو تکّے، ایک سینے کا اور دوسرا لیگ پیس، جلدی، شاباش۔“

☆☆☆

اگلے دن امجد کو غیر متوقع طور پر جہان آباد جانا پڑا۔ وہاں ایک ٹی وی کمرشل کے سلسلے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دو تین روز میں واپس آجائے گا لیکن پورے تین ہفتے لگ گئے۔ واپس آیا تو پتا چلا کہ رفیق رستم نے اپنے منصوبے پر باقاعدہ کام شروع کر دیا تھا۔ وہ مختلف قسم کے بھیس بدل کر اعظم کے اسٹوڈیو اور سی ویو میں واقع اس کے مکان کے گرد گھومتا رہتا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ رینا اور اعظم کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔

مثلاً...... دونوں دن میں کتنی بار ملاقات کرتے تھے اور کہاں کہاں جاتے تھے۔ ایک بار وہ ایک بوڑھے اور معذور شخص کے بھیس میں اعظم کے سامنے گیا۔ اعظم اس وقت اسٹوڈیو جانے کے لیے اپنے گھر سے نکل رہا تھا۔ رستم نے اسے سلام کیا اور کہا کہ وہ کسی کام سے وہاں آیا ہے۔ اعظم نے اس کے ہاتھ میں پچاس کا ایک نوٹ رکھتے ہوئے کہا کہ اس عمر میں اسے کام کی تلاش کرنے کے بجائے کسی بوڑھوں کے مرکز میں جانا چاہیے۔ رستم اس کامیابی پر بہت خوش ہوا تھا۔

یوں اعظم کا تعاقب کرتا ہوا وہ رینا کے خوب صورت اپارٹمنٹ تک جا پہنچا۔ بقول اس کے رینا نے سرتاپا مسکراہٹ کے ساتھ اعظم کا استقبال کیا تھا۔ گویا رینا ضرورت سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئی تھی۔ یہ بات رستم کے سینے میں رقابت کی آگ بھڑکانے کے لیے کافی تھی۔ تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اعظم کو ہمیشہ یاد رہنے والا سبق سکھائے گا۔

یہ ساری باتیں اس نے امجد کو بیچ ریسٹورنٹ کے ایک پُرسکون گوشے میں بتائی تھیں۔ اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے اور وہ دونوں چائے اور سینڈوچز کھانے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ رستم نے اپنے چہرے پر مختصر سا میک اپ کر رکھا تھا۔ مونچھیں نقلی تھیں اور ناک کچھ بڑی نظر آرہی تھی۔ اگر کوئی شناسا اسے دیکھ لیتا تو رستم کی حیثیت سے نہیں پہچان پاتا اور یہی اس کا مقصد بھی تھا۔

”میری بات سنو رستم!“ امجد نے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا۔ ”جہاں تک میک اَپ کی مہارت کا تعلق ہے اسے تم ثابت کر چکے ہو۔ اب میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کام سے دستبردار ہو جاؤ۔ سمجھ لو کہ دوسری بہت سی لڑکیوں کی طرح رینا بھی تمہاری زندگی میں آئی اور چلی گئی۔ اس بات کو اپنے وقار اور انا کا مسئلہ نہیں بناؤ۔ تمہیں فن کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس چکر میں تم اپنا کیریئر تباہ کرلو گے۔“

”میرے دوست! جس شخص کو اپنے وقار کا احساس نہیں وہ ایک اچھا فنکار نہیں بن سکتا۔“

”میری رائے میں یہاں وقار کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ امجد نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ رینا اپنی خوشی سے اعظم سے ملتی ہے۔“

”ناممکن، کوئی لڑکی اس مینڈک سے مل کر خوش نہیں ہو سکتی۔ رینا بہت حساس لڑکی ہے۔ یقیناً اعظم اس کے ساتھ فریب کر رہا ہے۔“

”کیا تم اس دوران میں رینا سے ملے ہو؟“

”نہیں، سرِ دست میں صورتِ حال کا جائزہ لے رہا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں رینا سے ملا تو کوئی تلخ بات میرے منہ سے نہ نکل جائے۔ آج کل اعظم میرے خلاف باقاعدہ مہم چلائے ہوئے ہے۔ اس نے دوسرے پروڈیوسروں سے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مجھے کام نہ دیں۔ واضح طور پر وہ مجھے فلم انڈسٹری میں بلیک لسٹ کرنا چاہتا ہے۔ اب میرے سامنے اعظم کا مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور تم دیکھتے جاؤ، میں ایسا انتقام لوں گا کہ اعظم کو دوبارہ ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔“

”بہرحال میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔“ بالآخر امجد نے کہا۔ ”میں ہر اس معاملے میں تعاون کرنے کو تیار ہوں جو اعظم کو نقصان پہنچا سکتا ہو۔“

اور...... امجد کی اس بات میں حقیقت بھی تھی، کیونکہ اعظم نے اپنے رسوخ کی وجہ سے اس کی اشتہارات کی ایجنسی کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔

☆☆☆

چند روز بیت چلے۔ امجد ایک فلم فیسٹول میں شرکت کے لیے شہر سے باہر چلا گیا۔ یہ فیسٹول ایک چھوٹے سے شہر پہاڑ گنج میں منعقد کیا جا رہا تھا۔ پانچ روز بعد جب وہ واپس لوٹا تو اس کی خوب صورت سیکریٹری نے اسے مطلع کیا کہ بعض پُراسرار قسم کے اجنبی اس سے ملنے کے لیے آتے رہے تھے۔

یہ سن کر پہلے تو امجد کو حیرت ہوئی پھر وہ ہنس دیا۔ اس کی ایجنسی میں کام کرنے کی غرض سے آنے والے عموماً اسی طرح کا گیٹ اپ اور تعارف کے ساتھ آیا کرتے تھے، لیکن پھر بھی غور کرنے اور متواتر سوچنے کے بعد اس کا ذہن ”کلک“ ہوا۔

”رستم...... رفیق رستم۔“ کا نام اُبھرا اس کے ذہن

میں۔ پھر یہی وہ وقت تھا جب اس کی سیکریٹری حسینہ نے تقریباً چلا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

''ایک اور آ گیا۔ اُف میرے خدا! میں ان لوگوں سے عاجز آ گئی ہوں۔ روز ہی ایک نیا چہرہ چلا آ رہا ہے۔''

امجد نے دروازے میں داخل ہونے والے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی گندمی رنگ کا آدمی تھا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے اور میلے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زیادہ خوش حال شخص نہیں ہے۔ چہرے پر چند روز کی بڑھی ہوئی شیو بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

''محترم گرامی! کیا میں آپ کے چند قیمتی لمحات حاصل کر سکتا ہوں؟'' اس نے کتابی اردو میں کہا۔

امجد اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''تم ساری دنیا کو دھوکا دے سکتے ہو لیکن مجھے نہیں...... سمجھے۔ پولیس کو مطلع کر دوں؟''

''فی الحال چائے کے دو کپ اور ایک انڈے والا کا برگر منگوا دو یار!''

اس کے بعد امجد، رستم کی رہنمائی کرتا ہوا اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہ اس کی میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑاتا ہوا بولا۔ ''جناب! میں اس شہر میں پہلی بار آیا ہوں اور......''

''نوکری کی تلاش میں ہوں۔'' امجد نے اس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''سناؤ، کیسے جا رہے ہو؟''

''اچھا جا رہا ہوں۔''

''فیسٹول کیسا رہا؟''

''بہت خوب رہا۔ ہم نے شیمپو کا ایک ٹی وی کمرشل بنایا تھا۔ اس پر ہمیں ایوارڈ ملا ہے۔ تمہارے رقیب کا کیا حال ہے؟''

''میں اس کے گرد اپنی گرفت سخت کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے منصوبے میں اعظم کے پارٹنر نعمان نومی کو بھی شامل کر لیا ہے۔''

''کیا نومی بھی تمہارے رقیبوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے؟''

''نہیں، وہ کیکڑے کی اولاد کیا رقابت کرے گا۔ میں ان دونوں کو ایک قتل کے الزام میں پھانسنا چاہتا ہوں۔''

امجد نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔ ''قتل کے الزام میں؟ کیا ان دونوں نے رینا کو قتل کر دیا ہے؟''

رستم نے امجد کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے کبھی ضیغم رجال کا نام سنا ہے؟''

''وہ خبطی بڈھا تو نہیں جو شہر سے باہر جنگل میں قلعہ نما مکان کے اندر تنہا رہتا ہے؟''

''وہی۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن وہ خبطی ہرگز نہیں ہے۔ اپنے وقت کا سب سے کامیاب بزنس مین تھا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا، اس میں خوب کماتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت بھی اس کے پاس بے پناہ دولت ہے۔''

''لیکن...... ضیغم رجال کا یہاں کیا ذکر آ گیا؟''

''سنتے جاؤ...... ضیغم رجال کے پاس چار کروڑ نقد موجود تھے، جنہیں اس نے شاید ٹیکس یا ایف بی آر وغیرہ کے شکنجے سے بچنے کے لیے ایک ٹرنک میں بند کر کے مکان کے اندر چھپا رکھا تھا۔ نوٹوں کی گڈیوں کی صورت میں۔''

کہتے ہوئے رستم نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور امجد کی آنکھوں کے سامنے لہراتا ہوا بولا۔ ''اس قسم کے نوٹوں کی گڈیاں......''

''کھل کر بات کرو رستم!'' امجد نے بدستور حیرت سے کہا۔ ''کیا تم نے بوڑھے رجال کے مکان پر ڈاکا ڈالا ہے؟''

''یہ نیک کام اعظم اور نومی نے کیا ہے۔ میں یہ گڈی بہ طور نمونہ لے کر آیا ہوں۔''

''میں ابھی تک تمہاری بات نہیں سمجھا۔''

''ابھی سمجھ جاؤ گے۔'' اس نے کہا۔ ''اب میں آسان اور عام فہم زبان میں بات کرتا ہوں۔''

اس کے بعد اس نے جو ''آپ بیتی'' سنائی، اس کا خلاصہ یہ تھا۔

اعظم کے تعاقب کے دوران رستم پر یہ عقدہ کھلا کہ دوسرے روز ضیغم رجال سے ملنے جاتا ہے۔ اس موقع پر اس کا پارٹنر نومی بھی ضرور اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، رجال شہر سے باہر جنگلاتی مضافات میں ایک قلعہ نما عمارت میں تنہا رہتا تھا۔ اس کی کئی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ سخت مردم بیزار تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کے مینشن میں کوئی ملازم نہیں تھا اور شاید ہی کبھی کوئی شخص اس سے ملنے جاتا تھا۔ ایک کتا ہے، وہ بھی لولی، گوشت کے پارچے پر خاموش ہو کر بیٹھ جاتا ہے، اسے نیند آور دوا کی ضرورت رہتی ہے۔ باقی ضیغم رجال کے پاس اتنی دولت تھی کہ اگر اسے ایک زندگی اور مل جاتی تو جب بھی ختم نہ ہوتی۔

تاہم اس کے باوجود اس کے اندر مزید دولت کی

زبردست حرص پائی جاتی تھی۔ اگر اعظم اور نومی صرف ملاقات کی غرض سے اس کے پاس جاتے تو یقیناً انہیں مینشن کے صدر دروازے سے ہی واپس لوٹنا پڑتا، لیکن اعظم کو اس کی کمزوری کا علم تھا۔

اس نے اسے بتایا کہ وہ ٹی وی کے لیے ایک نئی فلم سیریز شروع کررہا ہے جس کے لیے اسے سرمائے کی ضرورت ہے۔ یہ بات ضیغم رجال کے لیے بڑی پُرکشش تھی۔ لہٰذا اس نے اعظم اور نومی کو ملاقات کی اجازت دے دی۔

اگرچہ اعظم اور نومی کی کاروباری شہرت بہت اچھی تھی اور انہوں نے بڑی اچھی فلمیں وی ٹی سیریل بنائی تھیں لیکن اندرونی طور پر ان کی کمپنی دیوالیا ہوچکی تھی۔ اعظم کی ساری دولت سابقہ بیویوں کے واجبات ادا کرنے اور نئی نئی عورتوں اور لڑکیوں سے دوستیاں گانٹھنے اور انہیں ''بھگتنے'' پر صرف ہو گئی تھی۔ اس نے تین شادیاں کی تھیں۔ موجودہ بیوی اس کے ساتھ تھی جس کا نمبر چوتھا تھا۔ کم و بیش یہی حال نعمان نومی کا تھا، جس کی دولت جوئے، شراب اور ریس کے گھوڑوں کی نذر ہوگئی تھی۔ اگر انہیں رجال کے چار کروڑ مل جاتے تو وہ اپنے کاروبار کو دیوالیا ہونے سے بچاسکتے تھے۔

چنانچہ وہ دو ہفتے تک باقاعدہ رجال سے ملتے رہے اور اسے فلم اور میگا ٹی وی سیریلز کے کاروبار میں سرمایہ لگانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رجال پوری طرح ان کی باتوں میں آگیا۔

ایک روز باتوں کے دوران اعظم نے بوڑھے رجال کے بازو پر کسی نشہ آور دوائی کا انجکشن لگادیا۔ پھر نشے کی حالت میں انہوں نے اس سے رقم کے بارے میں تمام باتیں اگلوا لیں۔ انجکشن خاصا پاورفل تھا۔ بوڑھا رجال اس کی تاب نہ لاسکا اور دنیا سے ہی کوچ کرگیا۔

رفیق رستم یہ سارا منظر روشن دان سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ صرف میک اَپ میں ماہر تھا بلکہ بہترین اسٹنٹ مین بھی تھا۔ ادھر اعظم اور نومی نے جب یہ دیکھا کہ رجال مرگیا ہے تو دونوں گھبرا گئے۔ انہوں نے اس کی لاش تہ خانے میں چھپادی اور نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق کار میں ڈال لیا۔ انہیں یقین تھا کہ دو چار ہفتے تک کسی کو ضیغم رجال کی موت کے بارے میں پتا نہیں چلے گا۔ کیونکہ نہ تو اس کے پاس کوئی ملازم تھا اور نہ ہی کوئی دوست اور رشتے دار اس سے ملنے آتا تھا۔

جب اعظم اور نومی نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق کار میں ڈال کر روانہ ہوئے تو رستم ان کے تعاقب میں تھا۔ اعظم کے پاس شہر کے مشرقی مضافات میں ایک قطعہ زمین تھا جہاں ہنوز ڈویلپمنٹ نہیں ہوئی تھی۔ دونوں نے تین چار گھنٹے لگا کر ایک گہرا گڑھا کھودا اور صندوق کو وقتی طور پر اس کے اندر دفن کردیا۔ ان کے جانے کے بعد رستم نے گڑھا دوبارہ کھودا اور صندوق کو وہاں سے نکال کر ایک دوسری جگہ دبا دیا جو وہاں سے خاصی دور تھی۔

صندوق کو دفن کرنے سے پہلے سے اس نے کچھ رقم نکال لی۔ رقم اس کے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے کافی تھی۔

اس کی بات مکمل ہونے کے بعد امجد نے کہا۔ ''قانون کی نظر میں تم بھی مجرم ہو کیونکہ تم نے ایک طرح سے مجرموں کی معاونت کی ہے۔''

''یہ خدا میں خود کو سلطانہ ڈاکو محسوس کررہا ہوں۔''

''دیکھو برخوردار! تم نے بیک وقت دو جرم ہوتے دیکھے ہیں۔'' امجد نے کہا۔ ''قتل اور ڈکیتی۔ تمہارا فرض تھا کہ فوراً پولیس کو اطلاع کرتے، جرم کرنا اور جرم کی پردہ پوشی کرنا دونوں قابلِ گرفت قانون ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔ جب وقت آئے گا تو میں ضرور سیٹی بجاؤں گا۔ سرِدست تو میں تھوڑی ڈھیل دینے کے موڈ میں ہوں۔''

''اگر انہیں پتا چل گیا کہ تم ان کے اس جرم کے چشم دید گواہ ہو تو سمجھ لو کہ وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ جو شخص ایک قتل کرتا ہے وہ اپنی گردن پھندے سے بچانے کے لیے دو چار اور قتل بھی کرسکتا ہے۔''

''اسی لیے تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''کیا میں شکل سے احمق نظر آتا ہوں۔'' اس نے دانت نکالتے ہوئے سوال کیا۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ ''نہیں، میں احمق نہیں ہوں۔ جب سے اعظم کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے، میں اپنی اصلی شکل میں گھر سے باہر نہیں نکلا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے میک اپ کے فن میں کتنی مہارت رکھتا ہوں اور یقین کرو ابھی تک مجھے مایوسی نہیں ہوئی اور ہاں آج کل میں اعظم اور نومی کی راتوں کی نیندیں حرام کررہا ہوں۔''

''کیا کوئی عملیات کا سلسلہ شروع کردیا ہے؟''

''عملیات کا سلسلہ تو شروع نہیں کیا۔ البتہ دونوں کو عالم ارواح کی سیر ضرور کروا رہا ہوں۔ آج کل میں ضیغم رجال کے بھیس میں گھر سے نکلتا ہوں اور اعظم کو ایک جھلک دکھا کر غائب ہوجاتا ہوں۔ پہلی مرتبہ میں نے ایک فنکشن کے دوران اعظم کو رجال کی جھلک دکھائی۔ وہ خاصا بڑا فنکشن تھا۔ اس میں کم از کم دو تین سو خواتین و حضرات شریک تھے۔ کھانے کے

بعد ڈانس کا پروگرام تھا۔ اعظم ایک نرم و نازک لڑکی کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے میں مصروف تھا اور بات بات پر دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔ میں ہال کے عقبی دروازے کے قریب بھاری پردے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ پھر جب اعظم کا رخ میری طرف ہوا تو آہستہ سے اپنا چہرہ سامنے کر دیا۔ یقین کرو امجد! مجھ پر اس کی نظر پڑتے ہی اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے والی لڑکی بھی چکرا گئی تھی۔ میں ہولے سے پیچھے ہٹا اور باہر نکل کر غائب ہو گیا۔''

چند لمحے کے لیے وہ تھما اور پھر مزے لے کر دوبارہ کہنا شروع ہوا۔ ''دوسری مرتبہ میں نے ایک پُرہجوم فٹ پاتھ پر اسے رجال کے چہرے کی جھلک دکھائی اور اب تک میں چار پانچ مرتبہ اسے یہ جھلکیاں دکھا چکا ہوں۔ ان چند دنوں کے دوران اس کا رنگ پیلا پڑ چکا ہے اور کم از کم بیس پونڈ کم ہو گیا ہے۔''

''اور اُسے ایک مرتبہ بھی شک نہیں ہوا کہ یہ سارا ڈراما تم کھیل رہے ہو؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ پہچان لیتا تو میں میک اَپ کے فن سے دستبردار ہو جاتا۔ اب اگر میں اسے بتا دوں کہ یہ ساری کارروائی میں کر رہا ہوں تو یقیناً وہ میری میک اَپ کی مہارت کا قائل ہو جائے گا۔''

''قائل بعد میں ہو گا۔ پہلے تمہارے سر میں سوراخ کرنے کی فکر کرے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس حرکت سے تمہارا مقصد کیا ہے؟''

''میں اسے حیات بعد الموت کا قائل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے دل میں خوفِ خدا پیدا کرنا چاہتا ہوں اور اس حد تک یہ خوف پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ وہ فرصت کے اوقات رینا کی صحبت میں گزارنے کے بجائے یادِ خدا میں گزارنا شروع کر دے۔''

''یوں رینا دوبارہ تمہاری پناہ حاصل کرنے پر مجبور ہو جائے۔ دیکھو بندہ پرور! تم بہت پچھتاؤ گے۔ تم پر اخلاقی پابندیاں بھی عائد ہوتی ہیں۔''

''اخلاقی پابندیاں! بہت خوب۔ تم میرے پرانے دوست ہو، میں نے تمہیں صرف اس لیے اپنا راز بتایا ہے کہ تمہاری شخصیت اخلاقیات سے بالاتر ہے۔''

''اس کے باوجود......''

''اس کے باوجود میں اس مینڈک اعظم کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔''

''رینا کے بارے میں تمہارے کیا تاثرات ہیں؟''

اس ہنگامے کے دوران میں نے اس سے ملاقات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تاہم میں اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعظم سے اس کا تعلق محض وقتی مجبوری کے باعث ہے۔ وہ اسے بھی پسند نہیں کر سکتی۔''

☆☆☆

چونکہ امجد نے اخلاقیات کا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس لیے رستم نے اس سے ملنا جلنا تقریباً ترک کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ کاروباری مصروفیات میں الجھ گیا تھا۔ اس کے بعد امجد کو رستم اور اعظم کے بارے میں مختلف ذرائع سے معلومات حاصل ہوئیں، جس کے مطابق کچھ باتیں قیاس آرائیوں پر مبنی تھیں اور کچھ باتیں ایسی بھی تھیں جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں، مثلاً...... رستم نے جیسا کہ کہا تھا کہ وہ برابر اعظم کا تعاقب کرتا رہا اور گاہے بگاہے اسے ضیغم رجال کے چہرے کی جھلکیاں دکھاتا رہا۔ اس چیز نے اعظم کا ذہنی اور اعصابی طور پر بیڑا غرق کر دیا۔ وہ ذرا سی بات پر چونک پڑتا تھا۔

بالآخر ایک روز اعظم، نومی کو ساتھ لے کر رجال کے مینشن پہنچ گیا۔ اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ رجال درحقیقت مرا نہیں تھا اور اپنی رقم لینے کے لیے اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ پولیس کے پاس اس لیے نہیں گیا تھا کہ اس چھپی ہوئی دولت پر اس نے انکم ٹیکس نہیں ادا کیا تھا۔

دونوں رات کے وقت وہاں پہنچے تھے۔ اعظم خاصا خوف زدہ تھا۔ تاہم نومی دلیری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کر بھی سکتا تھا کیونکہ اس نے بقول اعظم، رجال کی روح کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ رات خاصی گرم تھی۔ مینشن کے قرب و جوار میں گرم اور خشک ہوا چل رہی تھی۔ دونوں نے اپنی کار صدر دروازے کے باہر کھڑی کر دی اور ٹارچ کی روشنی میں تہ خانے کے اندر پہنچ گئے۔

رجال کی لاش عین اس جگہ پر موجود تھی جہاں وہ اسے چھوڑ گئے تھے۔ حسبِ معمول رفیق رستم بھی ان کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا اور خفیہ طور پر ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ رجال کے میک اَپ میں تھا۔ لاش دیکھ کر اعظم کے چہرے پر خوف کے تاثرات مزید گہرے ہو گئے۔ اس نے سوچا کہ وہ پاگل ہو گیا تھا یا رجال کی بھٹکی ہوئی روح اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔

نومی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا وہ سب اس کے وہم کی کرشمہ سازی تھی لیکن جب وہ عمارت سے نکل رہا تھا تو اعظم کو ایک بار پھر رجال کا خوف ناک چہرہ دکھا دیا۔ اس نے نومی کا بازو پکڑ لیا اور اس طرف اشارہ کیا

جہاں وہ چہرہ نظر آیا تھا، لیکن جب نومی نے اس طرف دیکھا اس وقت وہ چہرہ غائب تھا۔ تاریکی اور سناٹے کی وجہ سے انہیں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بہرکیف دونوں بڑی عجلت میں وہاں سے نکل کر اس مقام کی طرف روانہ ہوگئے جہاں انہوں نے نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق دفن کیا تھا۔

وہاں پہنچ کر جب انہوں نے گڑھا کھودا اور صندوق کو غائب پایا تو اُن پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اعظم کو یقین ہوگیا کہ صندوق نومی نے غائب کیا تھا۔ اس پر جنون طاری ہوگیا۔ اس نے پوری قوت سے چیخ کر نومی سے مطالبہ کیا کہ اگر اس نے رقم کے بارے میں صحیح صحیح جواب نہ دیا تو وہ اس کو شوٹ کردے گا۔ نومی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اعظم کا غصہ قابو سے باہر ہو چکا تھا اس نے زمین پر پڑا ہوا پھاؤڑا اُٹھالیا اور پے در پے وار کر کے نومی کو ہلاک کردیا۔ پھر اس نے نومی کو اسی گڑھے میں دفن کردیا اور وہاں سے واپس روانہ ہوگیا۔ راستے میں وہ چار کروڑ کی پُراسرار گمشدگی پر افسوس کرتا رہا۔

اگلے روز ٹی وی کمرشل ایوارڈز کی سالانہ تقریب منعقد ہو رہی تھی جس میں بہترین ٹی وی کمرشل والے پروڈیوسروں کو انعامات دیے جارہے تھے۔ وہ ایک رنگارنگ تقریب تھی جس میں ٹی وی کے علاوہ فلمی دنیا کی تمام نامور شخصیتوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ تقریب براہِ راست تمام اسٹیشنوں سے ٹیلی کاسٹ کی جارہی تھی۔

اعظم اپنی تازہ ترین بیوی کے ہمراہ تقریب میں موجود تھا۔ اس نے ہلکے آسمانی رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی جس کے اندر بھرا ہوا پستول صاف نظر آرہا تھا۔ جب سے اُسے رجال کی "روح" نظر آنی شروع ہوئی تھی اس وقت سے اس نے بھرا ہوا پستول رکھنا شروع کردیا تھا۔ تاہم اپنے دوستوں کو اس نے یہی بتایا تھا کہ اُسے بعض لوگوں سے جان کا خطرہ تھا لیکن اصل حقیقت تو امجد اور رستم کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

سرسری نظروں سے دیکھنے پر اس کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نظر نہیں آتی تھی۔ وہ مہمانوں کے ساتھ باتوں کے دوران بڑی خوش گوار مسکراہٹیں بکھیر رہا تھا لیکن درحقیقت وہ خاصا نروس تھا اور گاہے گاہے ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر دیکھتا تھا۔

اس وقت تک کوئی شخص نعمان نومی کے المناک انجام سے آگاہ نہیں تھا۔ امجد بھی اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ اعظم نے گزشتہ رات اپنے پارٹنر کو قتل کردیا ہے۔ اس کی میز اعظم کی میز سے چند قدم کے فاصلے پر تھی اور وہ یہی سوچ رہا تھا کہ شاید رستم اس تقریب میں بھی کوئی ڈراما کرنے کی کوشش کرے۔ غالباً یہی خدشہ اعظم کے دل میں بھی تھا۔ اس کی طرح امجد کی نظریں بھی چاروں طرف گردش کر رہی تھیں لیکن رستم جو اپنے اصلی یا نقلی روپ میں کہیں نظر نہیں آیا۔

ایوارڈ کی تقریب شروع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر امجد کو تعجب ہوا کہ رینا اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ وہ باری باری انعام پانے والے کا نام پکارتی اور مذکورہ شخص مسکراتا ہوا اسٹیج پر جاتا اور اپنا انعام لے کر واپس آجاتا۔

"خواتین و حضرات" رینا نے اپنی خوب صورت اور مترنم آواز میں اعلان کیا۔ "اب میں بہترین جاسوسی سیریز پیش کرنے پر مسٹر اعظم اور مسٹر نعمان نومی کو پہلا انعام پیش کرتی ہوں۔ مسٹر اعظم اینڈ مسٹر نعمان۔"

امجد نے دیکھا، یہ اعلان سنتے ہی اعظم کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ اپنی سیٹ سے اُٹھا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا اسٹیج پر پہنچ گیا۔ تمام ٹی وی کیمرے اس کا کلوز اَپ پیش کر رہے تھے۔ اعظم نے اپنی گھبراہٹ پر کافی حد تک قابو پالیا تھا۔ اس نے مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

"خواتین و حضرات! یہ انعام میرے لیے انتہائی مسرت اور عزت افزائی کا باعث ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرا پارٹنر اور شریکِ کار مسٹر نعمان نومی ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا ہے اسی لیے وہ اس تقریب میں شامل نہیں ہوسکا۔"

لیکن پھر یہی وہ وقت تھا کہ تمام حاضرین نے نعمان نومی کو اسٹیج پر نمودار ہوتے دیکھا۔ تمام ٹی وی کیمروں کا رخ اس کی طرف ہوگیا۔

"افسوس کی ضرورت نہیں اعظم!" اس نے کہا۔ "میں واپس آگیا ہوں۔"

نومی کی طرف دیکھتے ہی اعظم دم بخود رہ گیا۔ اس کے ہاتھ کپکپانے شروع ہوگئے۔

"تت...... تم......" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "تم نومی نہیں ہو۔ نومی کو میں نے قق...... قتل کردیا تھا۔ اُسے مم...... میں نے دفن کردیا تھا۔ تت...... تم اس کی روح ہو۔ میں...... میں تمہیں...... بھی قتل کردوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے پستول نکالنے کی کوشش چاہی مگر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے اس پر قابو پالیا۔

"میں نعمان نومی نہیں بلکہ رفیق رستم ہوں۔" رستم نے اپنا میک اَپ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ میں بہترین میک اَپ کرسکتا ہوں۔"

❖❖❖

مرگ مفاجات

عائشہ نصیر

سچ کی کھوج و تلاش میں مصائب اٹھانے پڑتے ہیں... دوسروں کی کیفیات اور دکھوں کو محسوس کرنا پڑتا ہے... مغربی ماحول میں پرورش پانے والے نوجوانوں کے طور و اطوار... وہ من کے سچے تھے... مگر ان کے بڑے برسوں ساتھ رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھتے... بلکہ اپنے اندر کی نفرت سے دوسروں کی زندگی کا چراغ بجھا دینے میں دیر نہیں کرتے...

دو محبت کرنے والوں کے درمیان حائل سیاہ و سفید کی لکیر کا شاخسانہ......

سچ تو یہ ہے میں دولھا کے اتنے قریب نہیں تھا۔ میں دراصل آخری لمحات میں اس کا بیسٹ مین بنا، کیونکہ اُس کا اصل بیسٹ مین شادی کے بالکل قریب فلو اور بخار کا شکار ہو کر بستر پہ جا پڑا۔

گورڈن گروور، ایک بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کا کوئی بھائی ، کزن، یا چچا نہیں تھا جو آخری لمحات میں مدد کر سکے۔ اس کے بہت زیادہ دوست بھی نہیں تھے۔ ایسا نہیں کہ وہ آدم بیزار تھا ہاں دوست بنانے کے معاملے میں وہ ذرا کنجوس تھا۔



تاہم میرے ساتھ اس کی کافی اچھی جمنے لگی تھی۔

اور اس کی منگیتر میلینی پن فیلڈ...... مجھے ماننا پڑے گا کہ گورڈن نے اپنی محتاط پسند طبیعت کے باوجود جتنی جلدی اس سے اپنے معاملات شادی تک پہنچا دیے، یہ میرے لیے سمجھنا تھوڑا مشکل تھا۔

میلینی، گورڈن کے برعکس انتہائی چنچل، خوش مزاج اور گھلنے ملنے والی لڑکی تھی، میں انہیں تب سے جانتا تھا جب ہم ہائی اسکول میں ایک ساتھ تھے۔ ان میں کچھ بھی ایک جیسا نہیں تھا پھر بھی شادی کرنے جا رہے تھے۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں، تضاد میں کشش ہے۔

یہ جوڑا مختلف یونیورسٹیوں سے ڈگری لینے کے بعد دوبارہ ملا تھا۔ برسوں بعد ایک اتفاقی ملاقات ہوئی جہاں وہ دونوں کام کرتے تھے۔ وہ ایک وکیل کے طور پر اور میلینی ایک بیرسٹر کے طور پر۔ جلد ہی آنے والے دنوں میں وہ یک جان دو قالب بن گئے۔

میلینی کچھ عرصے میری بھی گرل فرینڈ رہ چکی تھی، ہمارے تعلق کا وہ عرصہ کافی مختصر تھا۔ مجھے شک تھا کہ گورڈن شاید ہی اس بارے میں کچھ جانتا ہو خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گورڈن ایک اچھا آدمی تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اسے میلینی کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔

لیکن پھر، وہ اچھا آدمی شادی سے ٹھیک ایک دن پہلے مردہ حالت میں ملا۔ اس کی لاش ایک پہاڑ کے دامن سے ملی تھی۔ پولیس نے پہلے اس کی موت کو حادثہ سمجھا اور جلد ہی اسے خودکشی قرار دے دیا۔

مگر مجھے شک تھا کہ یہ خودکشی بھی نہیں تھی۔

شادی کا مقام ڈیون میں ایک سمندر کنارے ہوٹل تھا، ایک شاندار مقام جسے دلہن کی ماں نے چنا تھا۔ جہاں صرف فیری بوٹ کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا تھا۔

شادی کی تیاریاں ہفتوں سے جاری تھیں۔ دلہن کی والدہ، گلیڈیز پن فیلڈ، اپنی جوانی میں ویڈنگ پلانر رہ چکی تھی یہاں بھی اس نے تمام انتظامات کی کمان سنبھالی اور دولھا کی ماں، لوسی گرو ور کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔

تمام مہمانوں کو جمعہ کی دوپہر تک ان کے کمرے دکھا دیے گئے تھے، زیادہ تر لندن سے ٹرین کے ذریعے آئے تھے، ایک آدمی کافی دور آسٹریلیا سے تھا۔ شادی ہفتے کے روز ہوٹل کے ساتھ والے گاؤں کے چھوٹے چرچ میں مقرر کی گئی تھی، جس کے بعد لنچ کا اہتمام تھا۔ پلان یہ تھا کہ ہم سب اتوار کو چائے کے وقت گھر پہنچ جائیں گے، سوائے آسٹریلیائی کے۔

گورڈن کی لاش جمعے کی شام کو ملی تھی، اور اسے ماہی گیروں کے ایک جوڑے نے ہوٹل کی مشہور چٹانوں کے دامن کے قریب سے پایا تھا۔ دریافت کے بعد سے، ہم سب اپنے ہاتھ ملتے ہوئے پولیس کے انٹرویو کا انتظار کر رہے تھے۔

شام تک حکام گورڈن کی موت کو ایک گھبرائے ہوئے دولھے کی سیدھی سادی خودکشی کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ لفظ ”قتل“ تب تک کسی کے ذہنوں میں نہیں آیا تھا، سوائے میرے۔

مجھے بار میں گورڈن کا دوست ملا۔ اس کا نام فینیلو روبیو تھا، میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دولھا کے خاندان سے زیادہ دلہن کا دوست تھا، ورنہ میری جگہ اسے بیسٹ مین کے طور پر تیار کیا جاتا۔ میں اسے اسکول کے دنوں سے جانتا تھا، زیادہ نہیں کیونکہ وہ مجھ سے ایک سال سینئر تھا۔

اب ہم انتظار میں تھے، کم از کم اگلے دن تک جب فیری معمول کے مطابق اپنے صبح کے سفر کے لیے نکلتی۔ زیادہ تر لوگوں کو رکنے کو کہا گیا کہ ان سے مزید پوچھ گچھ کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ لیکن مجھے یوں لگا جیسے یہ قانونی تقاضے کے بجائے ایک تجویز ہو۔ اگر پولیس قتل کے بارے میں سوچ رہی ہوتی، تو اس درخواست کو ایک حکم کے طور پر پیش کیا جاتا۔

لاؤنج ایریا میں داخل ہوتے ہی روبیو نے مجھے اشارہ کیا۔

”تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“ بارٹینڈر کو دوبارہ گلاس بھرنے کا اشارہ کر کے اس نے مجھ سے پوچھا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی خود شروع ہو گیا۔ ”میں سمجھ سکتا ہوں کہ ایک آدمی شادی کرنے سے گھبرا رہا ہے، لیکن یہ مضحکہ خیز ہے۔“ روبیو ہر چیز کو مذاق میں بدلنے کا ٹیلنٹ رکھتا تھا، خاص طور پر سنجیدہ مواقع پر۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ بے چینی سے نمٹنے کا اس کا اپنا ایک طریقہ ہو لیکن دیکھا جائے تو ہم سب مختلف طریقوں سے غم اور تکلیف کا مقابلہ کرتے ہیں۔ میرے احساسات اس وقت جامد تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ میں گورڈن کے بہت قریب تھا، لیکن جب آپ ایک خوشی کے موقع پر اکٹھے ہوئے ہوں اور وہ خوشی اچانک تدفین کے انتظامات میں بدل جائے تو شاید ایسا ہی محسوس ہوتا ہوگا۔

میں نے صرف اتنا کہا۔ ”میلینی اپنے حواسوں میں نہیں ہے جب سے اُسے یہ خبر ملی ہے۔“

”میں نے اس دن گورڈن کو روز اینڈ کراؤن میں

دیکھا۔ میں اس کی صورت دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ یہ وہ لڑکا نہیں تھا جو اپنی شادی کی تیاریوں کے بارے میں سوچ رہا ہو بلکہ مجھے یوں لگا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ ایک جعلی پاسپورٹ کہاں سے خریدا جائے تاکہ وہ شادی سے پہلے پہلے کسی پسماندہ ملک میں غائب ہو جائے۔ جہاں میلینی یا اس کی ماں اسے ڈھونڈ نہ سکے۔ خاص طور پر اس کی ماں۔"

"سمجھ گیا۔ مسز پن فیلڈ زیادہ خوش مزاج عورت نہیں لگتی۔ لیکن تمہارے ذہن میں یہ بات کیوں آئی کہ وہ اس شادی سے بھاگنا چاہتا تھا؟ کیا گورڈن نے خود تم سے یہ کہا تھا؟ کیونکہ اس نے مجھ سے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔"

"نہیں......" روبیو نے سر ہلایا۔ "اس نے مجھ سے بھی کچھ نہیں کہا کم از کم، براہِ راست تو نہیں، یہ اس کا مزاج نہیں تھا۔ یہ میرا اپنا اندازہ ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہنی مون کا کیا پلان ہے تو وہ یوں غائب دماغی سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اسے 'ہنی مون' لفظ کا مطلب ہی پتا نہ ہو۔ بعد میں' میں نے اسے پب میں میلینی کے والد کے ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھا، وہ بحث کر رہے تھے اور کوئی عام سی بحث نہیں بلکہ وہ سنجیدہ اور غصے میں تھے۔"

"بحث کس بات پر تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں روم کے اس پار تھا۔ گورڈن ڈرنک لینے گیا تھا۔ وہاں کافی بھیڑ تھی، اس لیے میں سن نہیں سکا۔ لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک خاموش فلم میں دو آدمیوں کو گھونسوں کے وار کرنے کے لیے تیار ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ مگر یہاں ایک حقیقی لڑائی شروع ہو جاتی اگر گورڈن اچانک مڑ کر دروازے سے باہر نہ نکل جاتا۔ میرے خیال میں یہ تکنیک اس نے غالباً خود کو کنٹرول میں رکھو کلاسز میں سیکھی ہوگی۔"

"کیا یہ کوئی اور مذاق ہے؟" میں اسے گھورنے لگا۔

"کیا؟ وہ کلاسز؟ نہیں، وہ سچ میں یہ کلاسز لے رہا تھا۔"

"مگر کیوں؟" مجھے شدید حیرت تھی۔ "کیا یہ کوئی کورٹ آرڈرز تھے؟ کیا اسے غصے کے مسائل کا سامنا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم!"

"مجھے لگتا ہے اُسے جانے پر مجبور کیا گیا ہوگا، اور یہ صرف میلینی ہی کر سکتی ہے، شاید اس نے یہ شرط رکھی ہو۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ یہ شادی کرنا چاہتا تھا اس لیے......" وہ کہتے کہتے رکا۔

"اور شاید میں اس کی وجہ دیکھنا شروع کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے، وہ انکار کر سکتا تھا، میلینی کو سمجھا سکتا تھا، خودکشی کیوں؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ میلینی میں کچھ خامیاں تھیں، یہ ہم دونوں جانتے ہیں۔ لیکن گورڈن بھی کوئی فرشتہ نہیں تھا۔" اس نے پُرسوچ انداز میں کہتے ہوئے ڈرنک کا ایک اور گھونٹ لیا۔

"خامیاں ہم سب میں ہوتی ہیں، بات خامیوں کی نہیں ہے۔ بات ان کے مزاجوں کی ہے۔ میلینی، گورڈن کے بالکل برعکس تھی۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا......" میں کچھ کہنے جا رہا تھا پھر ارادہ بدل دیا۔ "خیر چھوڑو اب کیا؟"

"تمہارا کیا مطلب ہے، اب کیا؟ اب میں اپنی ڈرنک ختم کروں گا، کمرے میں واپس جا کر بیگ پیک کروں گا اور صبح نکلنے والی پہلی بوٹ پر سوار ہو جاؤں گا۔"

"لیکن پولیس۔"

"مجھے پروا نہیں ہے کہ پولیس کیا کہتی ہے۔" اس نے میری بات کاٹی۔ "میں انہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں جو میں جانتا تھا۔"

"تم جانتے ہو اور میں جانتا ہوں کہ گورڈن خودکشی کرنے والا انسان نہیں تھا، وہ بھی شادی سے ڈر کر تو بالکل نہیں، وہ میلینی سے مل کر اسے سمجھا سکتا تھا کہ وہ شادی نہیں کر سکتا، جو شاید اس نے کیا بھی۔ اس نے میلینی کے لیے ایک نوٹ چھوڑا تھا۔" پولیس نے مجھے وہ نوٹ دکھایا بھی کہ شاید میں اس کی ہینڈ رائٹنگ پہچان سکتا ہوں لیکن میں نہیں پہچان پایا۔"

روبیو نے آہستہ سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ "نوٹ چھوڑو اور یہاں سے بھاگو۔ میں تو یہی کرنے والا ہوں۔"

"نہیں میری بات سنو۔ گورڈن نے اس نوٹ میں میلینی کو ملنے کے لیے بلایا تھا۔ شاید وہ اسے اس کے والد سے ہونے والی لڑائی کے بارے میں بتانا چاہتا ہو۔ کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا، کہ ہمیں اس بارے میں جاننے کی کوشش کرنی چاہیے؟"

"ہمیں؟" روبیو یہ سنتے ہی بدکا۔ "ہمیں نہیں صرف تمہیں...... مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تمہاری دلچسپی اس میں کیا ہے؟"

میں اُسے کیا بتاتا میری دلچسپی کتنی پیچیدہ تھی۔ مجھے خود یقین نہیں تھا کہ کیا میں میلینی کے ساتھ اپنا افیئر گورڈن سے چھپانے پر شرمندہ تھا یا میں گورڈن کے لیے ایک آخری نیکی کرنا چاہتا تھا۔ بیسٹ مین کے طور پر اپنا فرض پورا کرنا چاہتا تھا، چاہے اس کے لیے مجھے اس کی باڈی کا پوسٹ مارٹم ہی

کیوں نہ کرنا پڑتا۔ ممکنہ طور پر میں جانتا تھا کہ یہاں ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات ڈھونڈنے کی ضرورت ہے اور یہ صرف میں ہی کرسکتا تھا۔

"وہ گورڈن کے بہت زیادہ دوست نہیں تھے۔" میں نے روبیو کو بتایا۔ "لیکن اب اس کے پاس ہم تھے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں، اس کے ساتھ کچھ غلط ہوا ہے۔ پولیس اس کیس کو بند کرنے کے لیے بس ایک بہانہ ڈھونڈ رہی ہے، یہ ان کے فضول سوالات سے پتا چلتا ہے۔ کیا گورڈن شراب پیتا تھا؟ کیا وہ ڈپریشن میں تھا؟ کیا اس نے تکلیف اٹھائی تھی؟"

"کیا وہ ڈپریس تھا؟" روبیو نے سوال کیا۔

"مجھے کیسے پتا ہوگا؟ بہرحال، وہ اسے ایک حادثے کے طور پر درج کرکے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ میلینی کو چھوڑنے والے اس کے نوٹ کی وجہ سے ایسا نہیں کرسکتے۔ شادیوں کے لیے مشہور اس ہوٹل کی ساکھ بھی خودکشی سے تباہ ہو گئی ہے۔ لیکن اگر یہ قتل ہوا تو کیا ہوگا؟"

"مجھے اسے قتل کے طور پر دیکھنے میں دشواری ہو رہی ہے۔" روبیو نے کہا۔ "لیکن جہاں تک ہوٹل کا تعلق ہے، شاید وہ شادیوں سے کرائم ویک اینڈ میں تبدیل ہو جائے۔ چلو معلوم کرتے ہیں میلینی کا باپ کتنے غصے میں تھا، شاید میلینی نے اسے بتایا ہو کہ گورڈن پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اپنی ڈرنک اٹھالو۔" اس نے مجھے اشارہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

مسٹر پن فیلڈ کو تلاش کرنا آسان تھا، وہ آرائشی لابی میں چمڑے کی کرسی میں دھنسا ہوا تھا، اس کے سامنے میز پر ایک ڈرنک تھی اور وہ اپنے موبائل اسکرین پر انگلی پھیر رہا تھا۔ جیسے ہی روبیو اور میں قریب پہنچے، اس نے ہمیں اپنے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"یہ تم دونوں کے لیے کافی مشکل وقت ہوگا۔" اس کی اس بات نے مجھے حیران کردیا۔ میں اس سے ہمدردی کی توقع نہیں کررہا تھا۔

"میں گورڈن کو بہت سالوں سے جانتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم ہائی اسکول میں ایک ساتھ تھے۔ یونیورسٹی جانے کے بعد ہم شاذونادر ہی ملے ہوں گے۔ اسے جاننا مشکل تھا لیکن میں نے ہمیشہ اس کا احترام کیا۔"

"میں بھی اسے پسند کرتا تھا۔ یہ صرف......" روبیو نے اپنے بالوں کو ہموار کرتے ہوئے تھوک نگلا۔ "میں نے اس سے کبھی یہ امید نہیں کی تھی۔"

"یہ پاگل پن ہے۔" میں بڑبڑایا، پھر مسٹر پن فیلڈ سے پوچھا۔ "میلینی؟ کیا وہ ٹھیک ہے؟"

"خود تصور کرو، وہ کس حالت میں ہوگی؟ جب سے یہ واقعہ ہوا ہے، وہ بے ہوش ہے۔" اس کا لہجہ افسردہ تھا۔

"کیا وہ اچھی طرح سے بات کرسکے گی...... ہم سے......؟" میں نے پوچھا۔

اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔" اس نے کہا۔ "ڈاکٹر کا حکم ہے، اور اگر ڈاکٹر اسے کلیئر بھی قرار دے دیتا تو میں اس کی اجازت نہ دیتا۔ وہ اس حالت میں نہیں کہ گورڈن کا ماتم کرسکے، اس نے میری بیٹی کو شادی سے ایک دن پہلے چھوڑا وہ بھی اس طرح؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا جناب۔" میں آہستگی سے بولا۔ اسی وقت ایک ویٹر نے اس کے سامنے ایک اور ڈرنک رکھی۔

"کیا آپ کے پاس کوئی آئیڈیا ہے جناب؟ کوئی نظریہ؟" روبیو پوچھ رہا تھا۔

"اس بارے میں کہ وہ خودکشی کیوں کرے گا؟ نہیں، بالکل نہیں۔ یہ بات اگر کسی کو معلوم ہونی چاہیے تو میرے خیال میں وہ تم دونوں ہی ہوگے۔" مسٹر پن فیلڈ نے گلاس اٹھاتے ہوئے ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اس آدمی کو بمشکل جانتا تھا اور اب مجھے پتا چل رہا ہے کہ میں واقعی میں اسے نہیں جانتا تھا۔ میلینی بھی یہی کہتی ہے کہ وہ آج تک اسے غلط ہی سمجھتی آئی تھی۔"

"لیکن میلینی کو کچھ تو آئیڈیا ہوگا کہ اس نے یہ کیوں کیا؟"

"اسے آئیڈیا کیوں ہوگا؟ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" مسٹر پن فیلڈ کا اچانک لہجہ تیز ہوا اور اس نے گلاس کو اس قدر مضبوطی سے جکڑ لیا تھا کہ مجھے اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہوا۔

"بس یہ کہ وہ اس کی منگیتر تھی۔" روبیو نے اطمینان سے کہا۔ "مرد اکثر اپنی عورتوں سے وہ باتیں کرتے ہیں جو ضروری نہیں کہ وہ اپنے مرد دوستوں کو بتائیں۔"

"وہ اس کی 'عورت' نہیں تھی۔" مسٹر پن فیلڈ نے اپنی بات پر زور دیا۔

میں نے روبیو پر ایک نظر ڈالی اور سر کو ہلکا سا ہلا کر اشارتاً کہا، جانے دو۔

پھر میں نے واضح لیکن نرم لہجے میں دوبارہ کہا۔ "ایک میلینی ہی ہوسکتی ہے جس کے پاس اس معمے کا حل ہو۔"

یہ بات کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے مجھے ڈر لگا کہ شاید وہ اپنی بھینچی ہوئی مٹھیوں کا استعمال کرکے مجھے یہ بتائے

کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں لیکن اس کے بجائے، اس نے تقریباً حیرت سے کہا۔

''اسے خود کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ یہ کیا ہوگیا۔ جب تک ڈاکٹر نے اسے سلانے کے لیے پلز نہیں دیں، وہ روتے ہوئے بس یہی کہتی رہی۔'' مجھے پتا تھا وہ سب خراب کردے گی۔''

میں چونکا۔''کوئی اندازہ ہے کہ وہ کس کی بات کررہی تھی؟''

''نہیں۔ میں امید کررہا تھا کہ تم لوگوں کو معلوم ہوگا۔'' اس نے ہم دونوں کو یوں دیکھا جیسے وہ یہ بات ہمیں بتا کر پشیمان ہورہا ہو۔

''آپ کے معاملات گورڈن کے ساتھ کیسے چل رہے تھے، سر؟ میرا مطلب ہے، کیا اس نے آپ کو کوئی اشارہ دیا تھا کہ وہ خودکشی کرنے والا ہے...... آپ جانتے تھے کہ وہ کسی پریشانی میں تھا؟''

''نہیں۔'' مسٹر پن فیلڈ اپنا گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔''میں اب اجازت چاہتا ہوں تاکہ جا کر دیکھوں گا کہ میری بیوی اور بیٹی کیسی ہیں۔''

ہم نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا، اس کے ہاتھ مٹھیوں کی صورت بھینچے ہوئے تھے۔

روبیو نے میری طرف دیکھا۔''میں جانتی تھی کہ وہ سب خراب کردے گی۔''

''وہ کون ہے؟''

''دلہن کی ماں اور دولھے کی ماں کے علاوہ، ایک دُلہن کی دوست اور ایک میٹرن آف آنر ہے، چلو اُن سے بات کرتے ہیں۔''

☆☆☆

میں اس عورت پیٹریس سے سرسری طور پر واقف تھا جو میلینی کی میٹرن آف آنر بنی تھی یا جسے بننا تھا مگر بن نہیں پائی۔ اس کا شوہر ایک چھوٹے لیکن مستند کرائم ناول پرنٹ کا ناشر تھا اور پیٹریس اس کے ساتھ مختلف کانفرنسوں میں جاتی اگر وہ جگہ اس کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتی۔

اس وقت وہ دُلہن کی سہیلی لوئیس برائس کے ساتھ پول کے کنارے تھی، اور دونوں نے جو لباس پہن رکھا تھا، وہ نہایت مختصر تھا۔ میں ان کے جسموں سے نظریں بچانے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ روبیو اسی چیلنج میں ناکام ہورہا ہے۔

یہ مئی کا مہینہ تھا اور باہر، ڈیون کے گہرے سمندر پر ہلکا

پسند اپنی اپنی

نتھو سنگھ اپنے ایک ذہنی روگ کا علاج کرانے ماہرِ نفسیات کے پاس گیا۔ ماہرِ نفسیات نے اس کا مسئلہ پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب...... میرا مسئلہ عجیب ہے؟''

ڈاکٹر نے کہا۔''کوئی مسئلہ عجیب و غریب نہیں ہوتا، میں اس کا حل بتاتا ہوں۔''

نتھو سنگھ کہنے لگا۔''مجھے اپنے پیروں کے لیے جوتے پسند نہیں، چپلیں اچھی لگتی ہیں...... مگر سب لوگ مل کے مذاق اڑاتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے نتھو سنگھ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔''یہ کوئی سنگین مسئلہ نہیں...... ہر ایک کی پسند اپنی اپنی ہوتی ہے، میں اپنی مثال دیتا ہوں، مجھے بھی بوٹ کی نسبت چپل زیادہ پسند ہے۔''

نتھو سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔''واقعی ڈاکٹر صاحب۔''

ڈاکٹر نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔''

نتھو سنگھ نے سوالیہ لہجے میں کہا۔''تسی میرے وانگوں لیٹ کے چپل کھاندے میرے بھرا وانگن کھلو کے سرائے۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احمد کی دُرگت

سرمئی آسمان چمک رہا تھا۔ گورڈن نے اپنے آپ کو اس سمندر میں پھینک دیا تھا، اس جگہ سے جہاں ہم کھڑے تھے۔ پھینک دیا گیا یا دھکیل دیا گیا۔ میں پولیس سے بات کرنے سے پہلے ہی جانتا تھا کہ جو کچھ ہوا اس کا کوئی گواہ نہیں تھا۔

''گورڈی کے ساتھ بُرا ہوا۔'' لوئیس نے ہمیں دیکھتے ہی اپنے سنہرے بالوں کو پیچھے جھٹکا۔

پیٹریس نے تائید میں سر ہلایا۔''ذرا دیکھو تو شادی مکمل تباہی میں بدل گئی۔''

''تم نے اسے آخری بار کب دیکھا تھا؟'' روبیو نے پوچھا۔

لوئیس نے پیٹریس کی طرف دیکھا۔''کل شام؟ یہاں پول پر؟''

''یہ ٹھیک ہے۔'' پیٹریس نے کہا۔''اس کے ہاتھ میں

گلاس تھا اور اس نے کافی پی رکھی تھی۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہم نے میلینی کو دیکھا ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ اسے ابھی میلینی سے نہیں ملنا چاہیے، شادی کے دن سے پہلے دلہن کو دیکھنا بیڈلک ہوتا ہے۔"

"اس نے کیا کہا؟" روبیو نے پوچھا۔

"وہ بس ہنسا مگر وہ ہنسی اچھی نہیں تھی۔ عجیب سی ہنسی تھی وہ، سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہی ہوں۔" اس نے تصدیق کے لیے ہماری سمت دیکھا۔

ہم نہیں سمجھے تھے مگر ظاہر نہیں کیا۔

"اور کچھ نہیں؟" میں نے اشارہ کیا۔ "کیا اس نے اور کچھ نہیں کہا......؟"

"اس نے کہا کہ وہ سوری فیل کر رہا ہے۔"

"سوری؟ کس لیے؟ وہ کس کی بات کر رہا تھا؟" میرا لہجہ تیز ہوا۔

"ہاں وہ کس کی بات کر رہا تھا؟" روبیو نے میرا سوال دہرایا۔

"میری، جہاں تک مجھے لگتا ہے۔" پیٹریس نے کہا اور وہ میگزین پڑھنے لگی جس میں بنیادی طور پر چمک دار تصاویر اور بڑی سرخیاں شامل ہوتی ہیں۔ ان کے لیے جن کی ذہنی سطح کسی چار سالہ بچے جتنی ہو۔"

پیٹریس اب صفحہ پلٹنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے گلابی رنگ کے ناخن اتنے لمبے تھے کہ اسے صفحے کے اوپری حصے کو چٹکی میں بھرنے میں چند منٹ لگے۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟ وجہ بتانا پسند کرو گی؟"

اس نے کندھے اچکائے۔ "ضرور۔ میں نہیں سمجھتی کہ اب اس سے کوئی فرق پڑتا ہے۔ گورڈن اور میرے بیچ کچھ ہوا تھا۔ یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے، میری شادی سے پہلے۔ ہم ایک پارٹی میں تھے اور ہم نے زیادہ پی لی تھی۔ پھر ہم نے گھر جانے کے لیے ایک ٹیکسی شیئر کی بہرحال تم جانتے ہی ہو گے کہ یہ چیزیں کیسے ہو جاتی ہیں۔"

"ہاں...... وہ مجھ سے بھی معافی مانگ رہا تھا۔" لوئیس نے سوچا وہ کیوں پیچھے رہے، وہ بھی کود پڑی۔

پیٹریس اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کیا وہ تمہارے ساتھ بھی سویا تھا؟ یہ کب کی بات ہے؟"

"پچھلے سال۔ ومبلڈن کے بعد۔" جیسے ہی ہم تینوں نے اسے گھورنا شروع کیا، وہ بولی۔ "کیوں نہیں؟ ہم دونوں اس وقت سنگل تھے۔"

پیٹریس نے ہماری طرف رخ موڑا اور کہا۔ "جب میں اس کے ساتھ تھی، تب ہم دونوں بھی سنگل تھے۔"

"میلینی تو اس وقت کہیں دور دور تک گورڈن کی زندگی میں نہیں تھی۔" لوئیس نے کہا۔ "مجھ پر یقین کرو، ورنہ میں کبھی ایسا نہ کرتی۔"

میں نے محسوس کیا جیسے میرا منہ یہ سن کر کھلا رہ گیا ہو۔ گورڈن ایک اچھا نظر آنے والا آدمی تھا۔ وہ لڑکیوں میں گھرے رہنے والا یا پلے بوائے قسم کا لڑکا نہیں تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ گزرتے وقت نے اسے اتنا بدل دیا ہے۔

میں نے اپنی پسلیوں میں روبیو کی کہنی کا ٹھوکا محسوس کیا اور میں اپنے آپ میں واپس آ گیا۔

"تو اس سب کے باوجود تم دونوں کو شادی کی تقریب کا حصہ بننے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی؟"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر میری طرف۔

"یقیناً نہیں۔" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"ہمیں کیوں پریشانی ہو گی؟" پیٹریس بولی۔ "دلہن کے ساتھ میرے...... پہلے کے تعلقات ہیں۔ پھر مفت بیوٹی ٹریٹمنٹ اور میک اپ کے ساتھ۔"

"کیا میلینی کو معلوم تھا؟" روبیو نے پوچھا۔

انہوں نے دوبارہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" پیٹریس نے کہا۔ "شاید نہیں۔"

"مجھے پورا یقین نہیں ہے۔" لوئیس نے کہا۔

"تو سب کچھ ٹھیک تھا، ہے نا؟" میں اپنی آواز کی تندی پر قابو نہیں رکھ پایا۔

"کہہ سکتے ہیں۔" لوئیس بولی۔ "شادی بھی نہیں ہوئی اور ہم اب وہ کپڑے بھی واپس نہیں کر سکتے، اور وہ اتنے گھٹیا ہیں کہ خدا کی پناہ۔ ایک سنہرے بالوں والی کے لیے نیلا لباس؟ اس میں تو میں نمونہ لگتی، چاہے میری آنکھیں نیلی ہی کیوں نہ ہوں، جو کہ ہیں بھی نہیں دیکھو۔" اس نے ہمیں دکھانے کے لیے اپنی آنکھیں مزید پھیلائیں۔

"ہم واپس نہیں کر سکتے؟" پیٹریس حیران تھی۔

"یقیناً کر سکتی ہو۔" میں نے روبیو کی طرف دیکھا۔ یقیناً یہ ابھی اہم نہیں تھا۔

"نہیں۔" لوئیس نے بے اختیار کہا۔ "میں نے آج صبح چیک کیا۔ میلینی نے ہمیں جس ویب سائٹ سے خریدنے کے لیے کہا تھا، وہ مکمل طور پر بند ہو گئی ہے۔ تھائی لینڈ یا کمبوڈیا یا کہیں کوئی مینوفیکچرر غالباً یہ چائلڈ لیبر والے تھے۔ مجھے لگتا ہے بچے یا تو اندھے تھے۔ یا، پھر ان سے ایک تاریک،

کھڑکیوں کے بغیر کمرے میں کام کروایا گیا تھا۔''

''اس نے مجھے تین سو پاؤنڈ واپس کر دیے۔'' پیٹریس خوش تھی۔

''یہ اصلی نیلا بھی نہیں ہے۔'' لوئیس اسی بات میں اٹکی ہوئی تھی۔ ''یہ آئس بلیو ہے۔''

''میلینی نے کہا کہ یہ رنگ اس کی ماں نے چنا کیونکہ یہ گورڈن کی آنکھوں کے نیلے رنگ سے میل کھاتا ہے۔'' پیٹریس نے بتایا۔

''ہاں لیکن صرف اس صورت میں نا کہ یہ شادی ہوتی، گورڈن دولھا بنتا اور میں برائیڈ میڈ بن کے یہ لباس پہنتی، اب میں اس منحوس لباس کا کیا کروں۔'' لوئیس سخت چڑی ہوئی تھی۔

''میں نے تو سوچا تھا کہ دلہن کی سہیلی کے لباس کے لیے ہمیشہ دلہن ادائیگی کرتی ہے۔ تمہارے پیسے بچیں گے۔'' پیٹریس حیران تھی۔

''ہونہہ...... مسز۔پن فیلڈ نے کہا کہ یہ ایک نئی روایت ہے، جو امریکا سے درآمد کی گئی ہے، اور دولھا، دُلہن کا پہلے ہی کافی خرچہ ہوگیا ہے، تو اپنے لباس کی ادائیگی مجھے خود کرنی چاہیے ویسے بھی وہ لباس پھر رکھوں گی تو میں ہی۔''

''ام......'' میں نے کھنکھارتے ہوئے ان کی گفتگو میں خلل ڈالا۔ ''کپڑوں کے علاوہ، کیا کچھ اور چیز تھی جو تم نے دیکھی ہو، ان دنوں میں؟ سوائے......''

''سوائے اس کے کہ تم دونوں دولھے کے ساتھ سوئی ہو اور میں دُلہن کے ساتھ...... اوہ خدا......'' میں تو سوچ کر ہی پریشان ہوگیا تھا۔

انہوں نے سر ہلایا۔

''میلینی نے کہا کہ شادی کو مختصر رکھنا بھی ایک کام ہے، وہ مہمانوں کی لسٹ بھی مختصر رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا مقام کافی دور ہے اور پہنچنے میں کافی مشکل بھی۔ اس لیے جو لوگ شامل نہیں ہوں گے، انہیں وہ بعد میں سمجھا لے گی۔''

''کیا شادی کی تقریب میں کوئی اور 'عورت' یا لڑکی ہے؟'' میں نے پوچھا، یاد کرتے ہوئے کہ میلینی کے والد نے ہمیں اس کی بیٹی کے بارے میں کیا بتایا تھا۔

''نہیں تو۔'' پیٹریس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمارے علاوہ صرف دولھا اور دلہن کی مائیں تھیں۔''

''کوئی ویڈنگ پلانر نہیں؟''

''کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کردار مسز پن فیلڈ نے ادا کیا۔''

''کیا دولھا کی ماں اس سے خوش تھی؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ تمہیں اس سے پوچھنا پڑے گا۔''

یقیناً ہمیں اس سے پوچھنا پڑے گا، لیکن یہ آخری چیز تھی جو میں کرنا چاہتا تھا۔ عورت، جو پہلے سے ہی بیوہ تھی، اب اپنا اکلوتا بیٹا بھی کھو چکی تھی۔ کوئی بھی سوال اس کے لیے ایک دخل اندازی سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتا۔

کیا وہ جانتی تھی کہ اس کے بیٹے کے دماغ میں کیا تھا؟

چنانچہ جب ہم پول سے دور چلے گئے، میں نے روبیو سے کہا کہ ہمیں وہ چٹان دیکھنا چاہیے جہاں سے گورڈن نے چھلانگ لگائی تھی۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے آج صبح پولیس کو وہاں پر کرائم سین ٹیپ اتارتے ہوئے دیکھا تھا جو وہ علاقے کو بند کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ہوٹل۔منیجر ان کے ساتھ تھا، مجھے لگتا ہے اسی کے کہنے پر پولیس نے وہ ٹیپ اتاری ہے کیونکہ یہ پیلی اور سفید ٹیپ دور سے ہی حادثے کی تشہیر کرتی ہے۔''

''ہمیں جیکٹ کی ضرورت پڑے گی۔'' میں نے کہا۔

''وہاں سردی ہوگی۔''

''اچھا خیال ہے۔''

ہمارا رخ کوریڈور میں اپنے کمروں کی طرف تھا جب ہم نے ڈاکٹر کو دیکھا، وہ اس کمرے سے نکل رہا تھا جو گورڈن کی ماں مسز گروور کا تھا۔

ہم دونوں ہی اُس کے پاس پہنچے جب اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔

''مسز گروور کیسی ہیں؟'' میں نے پوچھا، پھر مزید کہا۔ ''ہم شادی کی پارٹی کے ساتھ ہیں۔ مجھے گورڈن کا بیسٹ مین بننا تھا۔ اور یہ میرا دوست روبیو۔ یہ ڈاکٹر بھی ہے۔''

میں روبیو کی طرف سے آنے والی حیرت کی لہروں کو محسوس کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے سامنے والے ڈاکٹر کو یہ نہیں بتایا کہ روبیو دراصل ایک پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہے۔

اس گول مٹول میڈیکل ڈاکٹر نے اپنا تعارف ڈاکٹر بونر کے طور پر کرایا اور کہا۔ ''وہ ٹھیک ٹھاک ہے اور فی الحال کوئی بھی دوا لینے سے انکار کر رہی ہے، لیکن میں اسے دوبارہ چیک کروں گا۔ صدمہ ایک عجیب چیز ہے۔ یہ کسی بھی صورت میں ظاہر ہوسکتا ہے۔ پھر بھی، وہ کافی مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔''

''تو کیا ہم اس سے بات کر سکتے ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''جب تک وہ خود آپ سے بات

کرنے کے لیے نہیں کہتی، ڈاکٹر روبیو۔'' اس کی آواز میں زیادہ مضبوطی نہیں تھی، ہم اصرار کر کے اپنی منوا سکتے تھے لیکن ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے مڑ رہے تھے جب دروازہ کھلا اور ایک عورت کا گھونگھریالی سرمئی بالوں والا سر باہر نکلا۔

''مسز گرودر۔'' میں نے کہا۔ ''میں ول سمپسن ہوں۔ مجھے آپ کے بیٹے کے لیے بہت افسوس ہے۔''

''میں جانتی ہوں کہ تم کون ہو۔ میں نے دروازے میں سے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔ کیا تم دونوں اندر آؤ گے؟ میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا چاہوں گی جو میرے بیٹے کو جانتے ہیں۔''

میں نے ابرو اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر بونر پر ایک جتاتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اندر آ گیا۔ روبیو نے اپنے پیچھے دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا تھا۔

اس کا کمرا، پرانے دنوں کی یادگار تھا، جب عورتیں خواتین نوکرانیوں کے ساتھ سفر کرتی تھیں۔ دیواروں پر دھاری دار وال پیپر لگے ہوئے تھے اور فرانسیسی طرز والی بالکونی سے سمندر کا شاندار نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھنے کا انتظام بھی تھا، مسز گرودر نے ہمیں صوفے کے پار دو کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ساٹھ کی دہائی میں ایک پُرکشش عورت تھی، چھوٹے سرمئی بالوں اور نیلی آنکھوں کے ساتھ۔ وہ سیاہ سلک اور ہلکے گلابی سویٹر میں ملبوس تھی۔ کمرے میں کچھ ذاتی اشیاء ڈھیلے پر تھیں: موم بتیاں، پلاسٹک کے فریموں میں خاندانی تصاویر کا ایک چھوٹا سا مجموعہ۔ ایک چھوٹے سے گلدان میں کسی قسم کی سمندری گھاس رکھی ہوئی تھی جس پر سیپیوں اور کنکروں کا ڈھیر تھا۔ جنہیں شاید ساحلِ سمندر پر چہل قدمی کے دوران جمع کیا گیا تھا۔

اس نے میری نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور کہا۔ ''میں تیس سال سے فلائٹ اٹینڈنٹ تھی، ہوٹل کے کمروں میں رہی۔ میں ہمیشہ اپنے ساتھ تھوڑا سا سامان گھر لانے کی کوشش کرتی ہوں۔ جب میں نے یہ سیپیاں اکٹھی کیں تو گورڈن میرے ساتھ تھا۔ کیا ہوا؟''

''ہم بھی یہی سوچ رہے تھے۔ گورڈن کبھی بھی اپنے ساتھ یا آپ کے ساتھ یا ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی ایسا نہیں کرے گا۔''

''یہ اس کا انداز بالکل نہیں تھا۔'' روبیو نے کہا۔

''یہ کہنے کے لیے شکریہ۔ میں جانتی ہوں کہ یہ سچ ہے لیکن پولیس کہتی ہے کہ کچھ لوگ آخر تک کوئی اشارہ نہیں دیتے کہ وہ ایسا کچھ کرنے والے ہیں۔ لیکن میں اپنے بیٹے کو جانتی ہوں۔''

''وہ شادی کا منتظر تھا؟'' میں نے اس کے جواب کو غور سے سنتے اور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' لوسی گرودر نے کہا۔ ''وہ دوسری سوچوں میں مبتلا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر اسے لگتا ہے کہ وہ ابھی شادی کے لیے تیار نہیں، تو اسے میلینی کو بتانا ہوگا۔''

''تو کیا اس نے بتایا؟'' ہم دونوں نے ایک دم پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ اس نے کہا کہ وہ اس کے بارے میں سوچے گا، اپنے جذبات کا جائزہ لے گا، اور پھر ایک باعزت فیصلے پر پہنچے گا۔ لیکن اس نے مجھے بتایا کہ وہ میلینی سے محبت کرتا ہے۔ اس کے باوجود.....''

''کے باوجود؟'' میں منتظر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''وہ بہت الگ مزاج کی ہے، تم اُسے جانتے ہو۔ گورڈن نے سوچا کہ کیا وہ ہمیشہ اس سے یونہی محبت کرے گی۔ میرا بیٹا وقتی رشتوں پر یقین رکھنے والا نہیں تھا۔''

ہم نے تقریباً دس منٹ اور بات کی۔ وہ اپنے یقین پر اٹل تھی کہ گورڈن کبھی خودکشی نہیں کرے گا۔

''وہ ایک مضبوط اور خوددار انسان تھا۔ ہم نے اسی طرح اس کی پرورش کی تھی۔ اس کے والد کے مرنے کے بعد بھی میں نے اسے کبھی کوئی کمی نہیں ہونے دی۔''

میں نے اس تصویر کا جائزہ لیا، جو میز پر آویزاں تینوں میں سے سب سے بڑی تھی، جس میں پارک کے بینچ پر بیٹھے تین افراد پر مشتمل ایک خوبصورت خاندان نظر آرہا تھا۔ تقریباً تین سال کا ایک بچہ، واضح طور پر گورڈن، اپنے سیاہ فام خوب صورت باپ کے بازوؤں میں تھا، اور لوسی فخر سے کیمرے کے لینس میں دیکھ رہی تھی۔ وہ سب بہترین لباس پہنے ہوئے تھے۔

''مجھے آپ کے نقصان کے لیے بہت افسوس ہے۔ آپ کے دونوں نقصانات کے لیے۔''

''میں بھی معافی چاہتا ہوں۔'' روبیو نے کہا۔ ''گورڈی بہت اچھا آدمی تھا۔''

تصویر کی طرف مڑتے ہوئے، اس نے کہا۔ ''پہلے مجھے دکھ تھا کہ اس کے والد اس کی شادی میں شریک نہیں لیکن اب مجھے لگتا ہے اچھا ہی ہوا کہ وہ یہ دن دیکھنے کے لیے زندہ نہیں۔'' وہ ٹوٹنے کے قریب ترین تھی۔

میں نے تسلی آمیز انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ

رکھا۔ پھر اپنا کارڈ ساتھ والی میز پر رکھ دیا۔
روبیو نے بھی ایسا ہی کیا۔
''آپ ہمیں کال کرسکتی ہیں کسی بھی وقت۔ ہم کمرا 201 میں ہیں۔''

☆☆☆

جیکٹس پہننے کے بعد، ہم پہاڑ کی اس چوٹی کی طرف آئے، جہاں ہمیں دلہن مل گئی، وہ کسی طرح ڈاکٹر بونزا اور.... اپنے والدین ..... کے چنگل سے بچ کر باہر نکل آئی تھی اور اب اس چٹان پر کھڑی پانی کی طرف گھور رہی تھی۔
اسے اس طرح کھڑا دیکھ کر ہم بُری طرح گھبرا گئے کہ کہیں وہ کنارے پر کھڑی گورڈن کی پیروی کرنے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہی، ہم چلاتے ہوئے اس کی سمت بڑھنے لگے۔
اس نے ہماری آوازوں پر مڑ کر دیکھا اور بالکل نہ کانپی، سرتی ہوئی باڑ سے لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے ہٹی، اس باڑ کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا پھر بھی پولیس کا قیاس تھا کہ گورڈن نے چھلانگ لگانے کے لیے پہلے اس باڑ کو پھلانگا ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا، وہ باڑ پر کیوں چڑھا؟ سمندر کے بہتر نظارے کے لیے؟ ایک بار وہاں پہنچنے کے بعد، اگر کوئی اس کے پیچھے ہوتا تو کسی کو اسے دھکیلنے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ گھٹنے کے پچھلے حصے پر ایک معمولی سی ٹھوکر بھی اسے سمندر میں گرانے کے لیے کافی تھی۔
میلینی کا چہرہ آنسوؤں میں تر تھا، میں جونہی اس کے قریب پہنچا، وہ روتی ہوئی میرے سینے سے لگ گئی۔ یہ عجیب تھا، لیکن میں تب تک اس کے شانے تھپکتا رہا جب تک اس کی سسکیاں تھم نہیں گئیں۔
''میں کیا کروں؟'' وہ لرز رہی تھی۔ اس کی تکلیف بھی مجھے حقیقی لگ رہی تھی۔ ''وہ میرے لیے سب کچھ تھا۔'' وہ پیچھے ہٹی، اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''اس نے ایسا کیوں کیا؟''
باڑ کی طرف دیکھتے ہوئے، میں نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا۔''
''کیا اس نے تم دونوں سے کچھ کہا؟''
ہم دونوں نے نہیں میں سر ہلایا۔
''کیا اسے پیسوں کی فکر تھی؟ کیا اس پر کسی کا قرض تھا؟ کیا اس کی زندگی میں کوئی اور لڑکی تھی؟ دیکھو اگر تمہیں کچھ پتا ہے تو خدا کے لیے مجھے بتاؤ، مجھے اس عذاب سے باہر نکالو، مجھے یہ جاننے کا حق ہے۔''

''جہاں تک ہم جانتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی بات نہیں تھی۔'' میں نے اسے گورڈن کے شادی کے فیصلے پر نظر ثانی کے بارے میں نہیں بتایا اور نہ ہی لوئیس اور پیٹریس کا ذکر کرنے کا یہاں کوئی فائدہ تھا ویسے بھی وہ بات پرانی ہو چکی تھی۔ اس کے بجائے میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے کچھ غلط محسوس کیا؟''
سر ہلانے کی باری اُس کی تھی۔
''وہ گھبرا گیا تھا۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''لیکن یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ ہم دونوں کے لیے ایک بڑا قدم تھا۔ میں بھی گھبرائی ہوئی تھی۔ اور میری ماں، وہ کوئی مدد نہیں کر رہی تھی۔ وہ ایک ویڈنگ پلانر رہ چکی ہے اسے بس چیزیں بڑھانا آتی ہیں۔'' وہ اپنی آنکھیں اور ناک پونچھنے کے لیے رکی۔ ''اسے بس ایک پرفیکٹ شادی پلان کرنی تھی۔ اسے کوئی مطلب نہیں تھا کہ میں اور گورڈن یہ شادی کیسے چاہتے ہیں...... اسے مہمانوں کی لسٹ میں بھی کٹوتی منظور نہیں تھی۔ اور ہاں، اس سب میں کسی وقت، گورڈی نے ہنس کر یہ کہہ دیا کہ اسے یہ شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔'' اس نے ایک پھر ناک پونچھی تو میں نے اپنی جیب سے صاف ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔
''گورڈی کو غصے کے مسائل درپیش تھے۔'' اس نے شکریہ کے ساتھ ٹشو کو قبول کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ اس کے والد کے مرنے کے بعد شروع ہوا تھا۔ اور شاید اسی لیے گورڈی کے ساتھ اس کی کوئی بھی گرل فرینڈز زیادہ عرصے نہیں تک پائی۔ مگر میرے ساتھ اس کا غصہ کم ہو رہا تھا۔ گورڈی نے اعتراف کیا، کہ وہ اس پر کام کر رہا تھا، وہ میری خاطر خود کو بدلنے کے لیے تیار تھا۔''
میں دیکھ سکتا تھا کہ گورڈن نے میلینی کے لیے خود کو کیوں بدلا۔ میلینی کے پاس خوبصورتی اور سمجھداری دونوں خوبیاں تھیں، اس کی شخصیت میں وہ طاقت تھی کہ وہ کسی کو بھی بہ آسانی زیر کر سکتی تھی۔
''میری ماں چاہتی تھی کہ اس کے تمام دوستوں کو مدعو کیا جائے، اور قیمت ادا کرنے کی پیشکش کی، چاہے کوئی بھی قیمت کیوں نہ ہو۔ اسے بہت فخر تھا کہ میں نے ایک وکیل کو چنا، کوئی ایسا شخص جو میرے والد کی طرح تجارت میں نہ ہو۔''
اس کی ماں کے ساتھ میرا ایک دو بار ہی ٹاکرا ہوا تھا مگر اس مختصر واقفیت نے ہی اس کی بدتمیز اور گھمنڈی شخصیت کا پول کھول دیا تھا۔ جس انداز میں شور مچاتے ہوئے قلم اور نوٹ بک ہاتھ میں پکڑے اور ہوٹل کے کچھ بے بس ملازمین پر

احکامات جاری کر رہی تھی۔ یہ بالکل بھی ایک اچھی تصویر نہیں تھی، اپنی برتری کے زعم میں ناکامی سے خوفزدہ ایک خود پسند عورت۔

میلینی بھی گورڈن کی طرح، اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی، مجھے لگا، میلینی اگر کبھی دوبارہ شادی کرے گی بھی تو کبھی بھی اس کا انتظام اپنی ماں کو نہیں سونپے گی۔

"گورڈن کی ماں ایک اچھی خاتون ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں، وہ بہت اچھی ہے۔ وہ میری ماں کے ساتھ بھی بہت اچھی ہے۔ وہ کل صبح بھی ساتھ تھیں، پھولوں کے انتظامات کے بارے میں بات کر رہی تھیں، اور......"

ہماری گفتگو میں خلل قدموں کی آواز سے پڑا تھا، مسز پن فیلڈ چٹان کی سمت آ رہی تھی۔ میں اس کی مدد کرنے کے لیے نیچے اترا۔

"میں چل سکتی ہوں۔" اس نے میرا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ایک ہاتھ میں اس نے سمندری گھاس کی ایک ٹوکری پکڑی ہوئی تھی جسے نیلے ربن کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔

"کم از کم یہ ضائع نہیں جائیں گے۔ آج شام کو رات کے کھانے کے بعد ہم یہاں گورڈن کے لیے الوداعی تقریب کریں گے۔" اس نے میلینی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم فوٹوگرافر کو تصاویر لینے کے لیے آس پاس رکھ سکتے ہیں۔ ویسے بھی شادی کی فوٹوز کے لیے گورڈن انہیں پہلے ہی ادائیگی کر چکا تھا۔ الوداعی تقریب کے بعد تمہیں بھی اپنا سوگ ختم کرنا چاہیے۔"

عجیب عورت تھی شادی کے لیے ہائر کیے گئے فوٹوگرافر سے وہ اسی دولھا کی الوداعی تقریب کی تصویریں کھنچوانا چاہتی تھی۔

"میں اسے ختم نہیں کرنا چاہتی۔" میلینی سلگ کر چیخی۔

"میں جاننا چاہتی ہوں، گورڈی کے ساتھ کیا ہوا۔"

"ذہنی بیماری۔" مسز پن فیلڈ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ہاں یہی سچ ہے۔ میرے ایک انکل تھے۔ ان کا دماغ بھی ایسے ہی خراب ہوا تھا۔ بس شراب پیتے اور جُوا کھیلتے۔ ہمیں بھی وقت پر گورڈن کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا۔"

"پتا ہے کیا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنے دوست میں ایسی کوئی علامات نہیں دیکھیں۔ وہ ایک اعتدال پسند شراب پینے والا تھا اور کبھی بھی سنجیدہ جواری نہیں رہا۔"

"بارش کی طرح خالص تھا وہ۔" روبیو نے وفاداری سے کہا۔ "ہمارا خیال ہے کہ یہ قتل تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میلینی نے کہا۔

"بے وقوف نہ بنو۔" اس کی ماں نے اسے گھرکا۔

"گورڈن کا تمہارے باپ سے جھگڑا ہوا تھا، کیا تم یہ بات جانتی ہو؟" میں نے میلینی سے پوچھا۔

"میں جانتی تھی...... وہ شادی کے اخراجات میں شامل ہو رہے نئے نئے خرچوں سے پریشان تھا، اس نے مطالبہ کیا کہ مجھے اس پر روک لگانی چاہیے، لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں اپنی ماں کے ساتھ یہ نہیں کر سکتی۔" میلینی کی آنکھیں پھر سے بھرنے لگیں۔

"اس نے یہ سن کر کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

میلینی نے کہا۔ "وہ سمجھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ شادی میری ماں کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ ویسے بھی یہ صرف ایک دن کے لیے تھا، پھر ہماری ساری زندگی ایک ساتھ...... ایک ساتھ ہی......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہنی میری بات سنو......" اس کی ماں نے اسے شانوں سے جکڑا۔ "یہ دنیا کا خاتمہ نہیں ہے۔ تم جیسی لڑکی کے لیے لوگ قطار میں کھڑے ہوں گے۔"

"میں جانتی ہوں کہ آپ نواسے نواسیوں کے لیے کتنا پُرجوش تھیں۔" میلینی روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں جانتی ہوں کہ یہ آپ کے لیے بھی بہت بڑا دھچکا ہے۔"

"ہم اسے اگلی بار ٹھیک کر دیں گے۔" اس کی ماں نے شاید سنا بھی نہیں کہ میلینی نے کیا کہا۔ وہ اس ربن کو سہلا رہی تھی جس میں سمندری گھاس قید تھی۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے چونک پڑا۔ "اگلی بار کیا ٹھیک کر دیں گے؟"

وہ ہچکچائی۔ "آئس بلیو ربن نہیں ہوگا، میرا مطلب ہے۔ لیونڈر یا نیوی، شاید اگلی بار کے لیے۔"

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے، بچ رہی ہے۔

"ہاں۔ یا کسی اور شیڈ کا بلیو...... لیکن براؤن نہیں...... براؤن کبھی بھی نہیں۔" ان کے انداز میں قطعیت تھی۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" میلینی اسے دور دھکیلتے ہوئے ہسٹریائی ہو کر چلائی۔ "وہ مر گیا ہے، وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور آپ کو ربن کے رنگ کی پڑی ہے۔"

میلینی نے بالکل نہیں دیکھی اپنی ماں کی آنکھوں میں

دیوانگی کی وہ جھلک جو ہم دیکھ رہے تھے۔ یا شاید وہ اس کے ساتھ رہتی رہی تھی اس لیے اس نے کبھی یہ نوٹس ہی نہیں کیا ہو گا۔

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ روبیو نے میری تقلید کی۔

”مجھے نہیں لگتا کہ یہ ربن کے رنگ کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ اور مسز پن فیلڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”جب آپ نے شادی کے لیے پھولوں کے بارے میں یہ گفتگو کی تھی، کیا تب آپ مسز گرِوور کے کمرے میں تھیں؟“

”ہاں“ وہ خوش مزاجی سے بولی۔ ”یہ آخری لمحے کا خیال تھا۔ پہلے میں نے للی کا آرڈر دیا تھا لیکن پھر میں نے اس سمندری گھاس کو دیکھا جو مسز گرِوور نے اپنے چھوٹے گلدان میں جمع کی تھی۔ یہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا ساحل پر شادی کے لیے اس سے پرفیکٹ اور کیا ہو سکتا ہے۔“

”آپ اس سے پہلے کبھی اس کے کمرے میں نہیں گئی تھیں، ہے نا؟ نہ ہی اس کے گھر میں؟“

اس کی آنکھوں میں ایک زہریلا تاثر ابھرا۔ ”وہ دور رہتی ہے۔ مجھے کبھی اس کے گھر جانے کا موقع نہیں ملا۔“

”آپ نے گورڈی کے باپ کی تصویر دیکھی؟“ یہ سوال نہیں تھا۔ میں بس ان کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

اب شاید میلینی بھی کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔

”ہاں وہ سیاہ فام شخص۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”ہاں وہ گورڈی کے والد تھے بلیک برٹش۔“ میلینی نے آہستہ سے کہا۔

مسز پن فیلڈ اپنی بیٹی کا سامنا کرنے کے لیے گھوم گئی۔

”اوہ، کیا سچ میں؟“ ان کی خوش مزاجی ہوا ہو چکی تھی۔

”تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا۔ تم مجھے یہ بات کب بتانے والی تھیں...... ہاں؟“ ان کا لہجہ کافی بلند تھا۔

”اس میں بتانے جیسا کیا تھا مام، اور آپ کیا کرتیں؟“ میلینی ان کے بلند لہجے پر اچھل کر پیچھے ہٹی۔

”میں یہ شادی روک دیتی، میں نے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیا ہوتا۔ لیکن تم نے میرے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ شادی میں چند گھنٹے باقی تھے، تمام انتظامات مکمل تھے، رقم کی واپسی ناممکن تھی۔“

”کون سا راستہ، پیاری مام؟“ میلینی سفید پڑتا چہرہ لیے یک ٹک انہیں تک رہی تھی۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی دل دوز انکشاف کی زد میں ہے۔

”ان تمام سالوں میں میں نے بس نواسے نواسیوں کی خواہش کی تھی۔ تم جانتی ہو؟“

”اور میں آپ کو وہ دیتی۔“ میلینی چلائی۔

”اور میں سیاہ فام نواسے نہیں چاہتی تھی، بیوقوف لڑکی۔“ وہ میلینی سے زیادہ بلند آواز میں چلّائی۔ ”مجھے...... مجھے گورڈن سے جان چھڑانی پڑی۔“

اگر مسز پن فیلڈ کی آنکھوں میں اتنی نفرت نہ ہوتی اگر یہ بات کرتے ہوئے اس کے انداز میں اتنی شدت نہ ہوتی تو میرے لیے اس کی یہ بات کسی لطیفے سے کم نہیں تھی مگر اس وقت وہ خوفناک حد تک سنجیدہ تھی اور آنکھوں میں عجیب ہی جنون تھا۔

میلینی لڑکھڑائی۔ میں نے گھبرا کر اس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی، اس نے میرا ہاتھ جھٹکا اور اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑے ہوتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔

”جاؤ اور پولیس کو لے کر آؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میری ماں گورڈن کے قتل کا اعتراف کرنا چاہیں گی۔ تم دونوں جاؤ۔“

میں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، لیکن اس کے لہجے میں اتنی سختی تھی کہ میں مزید کچھ نہیں کہہ پایا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ جانتی ہے کہ انہیں کس طرح سنبھالنا ہے۔

جب ہم ایک پولیس والے کے ساتھ مسز پن فیلڈ کو تلاش کرنے کے لیے واپس آئے تو وہ وہاں نہیں تھی۔

بالکل گورڈن کی طرح وہ بھی ہمیں چٹانوں کے بیچ مردہ حالت میں ملی۔

مجھے کبھی بھی مکمل یقین نہیں ہوا کہ اس عورت نے خود چھلانگ لگائی یا اس کا پیر پھسلا، یا پھر اسے دھکا دیا گیا۔

اور سچ کہوں تو مجھے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

تقریباً ایک سال بعد اب جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ میلینی اور میں پندرہ دن میں شادی کرنے والے ہیں۔ گورڈن کی یاد کے احترام میں رجسٹری آفس میں یہ ایک چھوٹی سی شادی ہوگی، اس کے بعد چند دوستوں کے ساتھ ریسٹورنٹ میں ڈنر......

اور جیسے کہ کہاوت ہے۔ ”ہم بچے چاہتے ہیں، جتنے خدا بھیجتا ہے۔“ میں اور میلینی بھی بچّے چاہتے ہیں۔ حالانکہ میں وقتاً فوقتاً میلینی کے خاندان میں پاگل پن کی لہر پر سوچتا رہتا ہوں۔ لیکن جتنا مجھے اس سے پیار ہے تو میرا اندازہ ہے کہ میں خوشی خوشی یہ رسک لینے کے لیے تیار ہوں۔

❖❖❖

تیسری قسط

قاتل مسیحا

طاہر جاوید مغل

بدلتے حالات و اطوار کے موجودہ سنگم پر یہی کہانی کہنے کا وقت ہے... ایسی گھڑیوں میں وہی کہانی کار کہانی لکھ سکتا ہے جس کا کہانی میں گہرا ایمان ہو... یہ ایمان کہ راہِ نجات ہے تو کہانی میں ہے... یہ ایمان آج کا کہانی کار کہاں سے لائے... آج کا زمانہ تو ایمان سے خالی ہے... اس کڑے وقت میں انسانیت گردوپیش سے دور کھڑی ہو کے لوگوں کی قیامت خیز چالوں کو دیکھتی ہے... طاہر جاوید مغل کے قلم سے شادابیاں ہی نہیں تلخیاں بھی صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہیں... خصوصاً عمران اور تابش یکجا ہوں تو ہوش اڑا دینے والی ہنگامہ خیزیاں رونما ہوتی ہیں کہ رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو جائے...

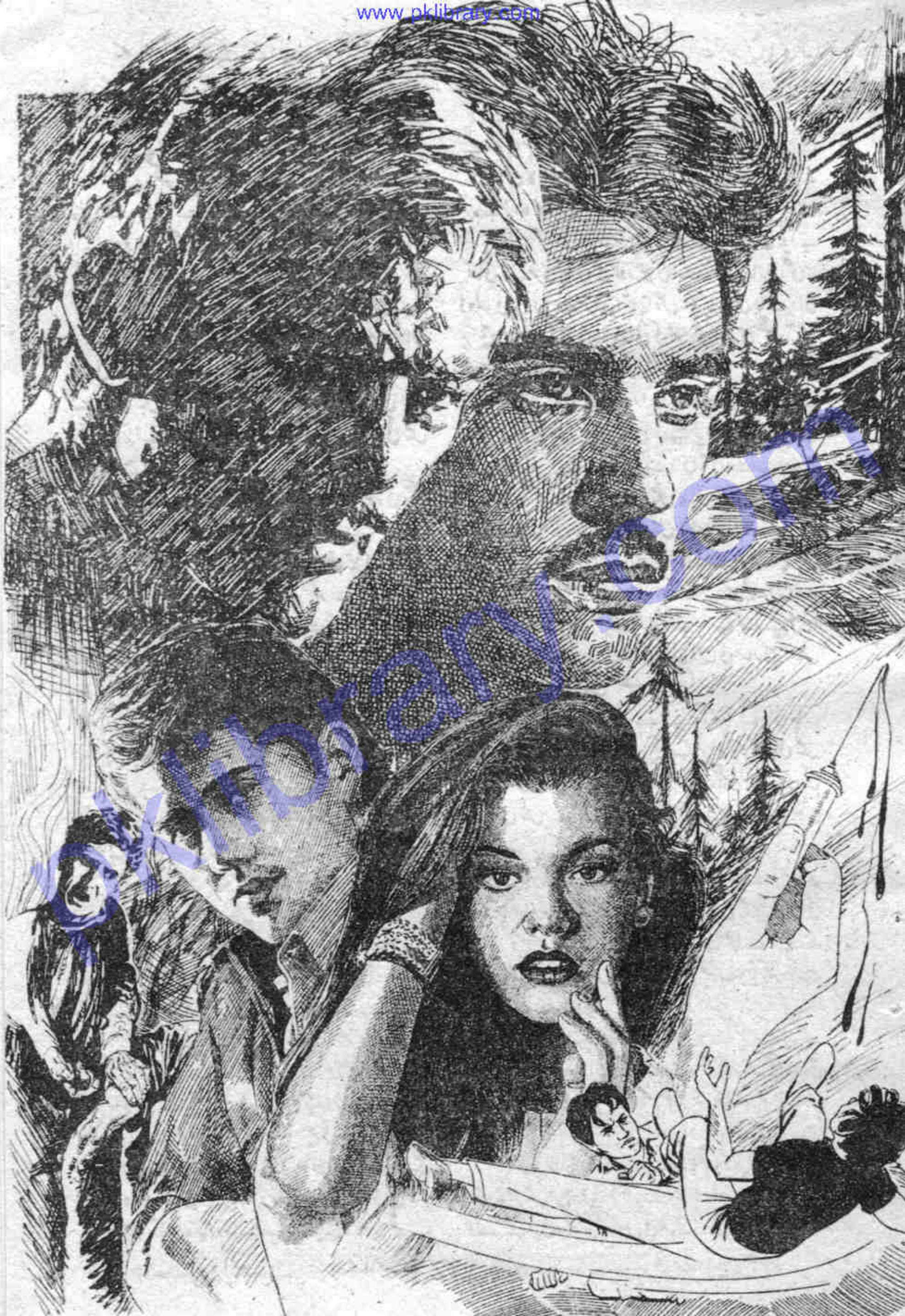
طلب و ہوس میں مبتلا ایک وحشی مسیحا کی قاتلانہ جرّاحی

دو تین منٹ میں روشنیاں ہمارے بالکل قریب پہنچ گئیں۔ یہ کوئی بیس کے قریب افراد تھے۔ سب کے سب بھاری سموری کپڑوں میں لپٹے ہوئے، سروں پر بڑی بڑی اونی ٹوپیاں تھیں۔ ان میں سے اکثر کے ہاتھ میں گیس لیمپس تھے۔ مجھے چار عدد بھیڑیے نظر آئے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ ان بھیڑیوں کے گلے میں زنجیریں تھیں۔ تاریکی میں ان کی آنکھوں میں ایک گرسنہ چمک لشکارے مار رہی تھی۔ آنے والوں میں سے زیادہ تر کلہاڑیوں اور کٹاروں سے مسلح تھے، صرف دو تین کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ان میں زیادہ تر عورتیں ہیں۔“

مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا پھر ایک نہایت چوڑی چکلی عورت آگے بڑھی۔ اس نے اپنی آٹومیٹک رائفل ہماری طرف سونت رکھی تھی۔ اس نے برف پر پڑی ان دو عورتوں کی لاشیں دیکھ لی تھیں جو کھائی میں گری ہوئی جنگجو عورت کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تھیں۔ وہ شعلہ فشاں لہجے میں گرجی۔ الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔

میم مائرہ نے سوالیہ نظروں سے میرے قریب کھڑے منوہر سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ”میم جی! یہ ہمیں ان دونوں عورتوں کا قاتل سمجھ رہی ہے اور بہت زیادہ غصے میں ہے...... بلکہ یہ سب ہی بہت غصے میں ہیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“



میم مائرہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے میں بول پڑا۔" منوہر، ان سے کہو، ہم نے کچھ نہیں کیا...... بلکہ انہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ انہیں مارنے والی وہاں نیچے کھائی میں پڑی ہے۔"

منوہر سنگھ نے میری بات چوڑی چکلی عورت تک پہنچائی۔ وہ تیزی سے گھوم کر کھائی کی طرف گئی۔ گیس لیمپ والے دو نوجوان بھی اس کے پیچھے گئے۔ میم مائرہ نے ٹارچ کی روشنی نیچے کھائی میں پھینکی۔ یکایک میں نے چوڑی چکلی عورت کے تاثرات بدلتے دیکھے۔ اونی ٹوپی میں بس اس کا چہرہ ہی نظر آتا تھا جس پر کلہاڑی کے کسی پرانے زخم کا نشان پیشانی سے شروع ہو کر بائیں آنکھ تک چلا گیا تھا۔ وہ تیزی سے کھائی میں اترنے لگی۔ یوں لگا کہ بھیڑیے بھی اپنی زنجیریں تڑانے کی کوشش کر رہے ہیں اور برفیلی کھائی میں اترنا چاہتے ہیں۔

چند منٹ بعد لاش کا معائنہ کرنے کے بعد چوڑی چکلی عورت باہر آئی تو اس کے غیظ و غضب کی جگہ ایک طرح کی حیرت اور سنسنی نے لے لی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے کچھ پوچھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ منوہر سنگھ سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا ساتھی کہاں ہے؟ میم کی اجازت سے منوہر سنگھ اس کو خیمے میں لے گیا، جہاں واویلا کرتے ہوئے بیس اکیس سالہ نوجوان کو رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر نوجوان کی آنکھوں میں خوف اُمڈ آیا جبکہ چوڑی چکلی عورت بہت پُرجوش نظر آنے لگی۔

یکایک اس کا لہجہ منوہر سنگھ سے دوستانہ ہو گیا۔ اس نے اپنی زبان میں منوہر سے پوچھا کہ کھائی میں پڑی ہوئی بدمعاش عورت کیسے مری...... اسے کس نے مارا؟

اس سے پہلے کہ منوہر سنگھ کچھ کہتا یا میری طرف اشارہ کرتا، اس کے پہلو میں کھڑی میم مائرہ نے اس کے بازو پر چٹکی کاٹ کر اسے خاموش رکھا...... اور سامنے کھڑے جادو رائے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "یہ حملہ آور عورت ان کے ہاتھوں ماری گئی ہے۔ یہ باس ہیں ہمارے۔"

منوہر سنگھ چند لمحے تذبذب میں رہا پھر اس نے میم مائرہ کی ترجمانی کرتے ہوئے وہی بات چوڑی چکلی عورت تک پہنچا دی۔ وہ پُرجوش انداز میں جادو رائے کی طرف مڑی...... اس کی بدنمائی دیکھ کر تھوڑا سا چونکی لیکن پھر دوستانہ انداز میں اس کا کندھا دبایا۔ تب وہ تیز تیز کچھ بولتی چلی گئی۔ وہ کچھ بتا رہی تھی اور غالباً کچھ سوال بھی کر رہی تھی۔

اس کے اور جادو رائے کے درمیان، منوہر سنگھ کے تعاون سے جو گفتگو ہوئی، اس سے یہ بات تصدیق پا گئی کہ یہ اسی برادری کے لوگ ہیں جن کے بارے میں ہم بات کرتے رہے ہیں۔ ان کو ترما دل کہا جاتا تھا۔ جو عورت ہم سے ہم کلام تھی، اس کی حیثیت اس گشتی پارٹی کے لیڈر کی تھی۔ اس کا نام "ڈولما" تھا۔ اس کی پارٹی میں بارہ کے قریب لڑاکا عورتیں اور سات آٹھ مرد تھے۔ ایسی ہی دو تین اور پارٹیاں بھی اس عورت کی تلاش میں نکلی ہوئی تھیں جو اب کھائی میں مری پڑی تھی اور تیزی سے اکڑتی جا رہی تھی۔ ڈولما کی باتوں سے صرف اتنا پتا چل سکا کہ ماری جانے والی ہریتی اس قبیلے کی سردار مایارانی کی مجرم تھی اور کسی سنگین غلطی کی مرتکب ہوئی تھی۔

ڈولما نے جو کچھ جادو رائے سے پوچھا، جادو رائے نے اس کا جواب منوہر کے ذریعے یہ دیا کہ ہمارا تعلق انگریزی دوائیں بنانے والی ایک بڑی کمپنی سے ہے اور ہم ایک خاص قسم کے زہر کی تلاش میں یہاں پہنچے ہیں۔ یہ زہر سفید رنگ کے کسی مقامی سانپ میں پایا جاتا ہے۔

جادو رائے کی اس بات پر ڈولما کے چہرے پر پہلی بار ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوئی۔ اس نے منوہر کے ذریعے کہا۔ "جسے آپ لوگ سانپ کہہ رہے ہیں، وہ سانپ نہیں کچھ اور ہے۔ بہرحال اس کی ساری تفصیل آپ کو مایارانی کی زبانی معلوم ہو سکے گی۔"

اس کے فوراً بعد ڈولما نے اپنے ساتھ آنے والی چاق چوبند عورتوں کو حکم دیا کہ وہ ہریتی کے مردہ جسم کو کھائی میں سے نکالیں۔ مرنے والی باقی دونوں عورتیں ڈولما ہی کی ساتھیوں میں سے تھیں، تیسری ابھی تک خیمے میں بے ہوش پڑی تھی۔

کھائی سے ہریتی نامی جنگجو عورت کا اکڑا ہوا جسم باہر نکالا گیا تو ڈولما اس کے چہرے پر جھکی۔ یوں لگا جیسے اس کی پیشانی کو بوسہ دینا چاہتی ہو مگر بوسے کے بجائے اس نے نہایت نزدیک سے اس کے چہرے پر تھوک دیا پھر رائے سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔

اس کا ترجمہ کرتے ہوئے منوہر بولا۔ "جناب! یہ کہہ رہی ہے کہ مرنے والی بے شرم بدمعاش عورت تھی، رانی صاحبہ نے اس کے سر پر انعام مقرر کر رکھا تھا جو یقیناً دیا جائے گا۔"

اس اطلاع پر جادو رائے اور میم مائرہ نے انکساری کے انداز میں سر جھکایا۔ آثار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب یہ لوگ ہمیں اپنی رہائش گاہوں کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔

ہم سب تجسس کی ایک لہر سی محسوس کررہے تھے۔ میں نے کن انکھیوں سے ماہین کی طرف دیکھا۔ غضب ناک انداز میں گھومتے چکراتے بھیڑیوں کی دید اسے سہارہی تھی۔ وہ ہمارے پیچھے کھڑے ہونے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کے گال کا خوب صورت ڈمپل جو ہر نگاہ کو اپنے اندر جذب کر لیتا تھا، مرجھایا ہوا سا نظر آتا تھا۔

ہمیں مہمان نوازی کے انداز میں اپنے حصار میں لیا گیا اور گیس لیمپس کی روشنی میں ہم ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ برف باری تھم چکی تھی مگر ہلکی ہوا نے سردی کو ناقابل برداشت کردیا تھا۔ ہمارے صرف چہرے ننگے تھے اور وہاں برچھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایک جگہ ہمیں ایک طویل قطار کی صورت میں چلنا پڑا۔ منوہر سنگھ نے بتایا کہ یہ لوگ جانوروں کے شکار کے لیے برف کے اندر خاص طرز کے پھندے چھپاتے ہیں جو گڑھے میں اوپر سے نظر نہیں آتے۔ اسی لیے ہم اس محفوظ راستے پر قطار کی صورت جارہے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد برفیلی ڈھلوان پر چند بڑے بڑے سیاہ سوراخ نظر آئے۔ یہ درحقیقت برفانی غاروں کے دہانے تھے۔ کہیں اندر مدھم روشنی بھی پھوٹ رہی تھی۔ بھاری سموری لبادوں میں لپٹی ہوئی چند پہریدار عورتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو یکدم سردی میں نمایاں کمی محسوس ہوئی۔ یہاں ایک اور ہی دنیا آباد تھی۔ غار کی چھوٹی چھوٹی ذیلی شاخیں تھیں اور ان کے اندر سے مزید شاخیں پھوٹتی تھیں۔

جگہ جگہ لیمپ روشن تھے، ان میں سے کچھ چربی کے تیل کے تھے اور فضا میں چربی کی باس محسوس ہوتی تھی۔ پہریداروں میں زیادہ تر عورتیں ہی تھیں مگر ان میں سے ایک آدھ کے سوا مجھے کسی کے پاس آتشیں ہتھیار نظر نہیں آیا۔ ہاں کلہاڑیاں اور کٹاریں وغیرہ دکھائی دیتی تھیں۔ اب رات بہت ہوچکی تھی۔ بچے وغیرہ تو کہیں نظر نہیں آئے البتہ شوروغل سن کر بہت سے مردوزن جاگ چکے تھے اور حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ یہ زیادہ تر تبتی خدوخال والے لوگ ہی تھے۔ ان کی زیادہ توجہ کا مرکز جادورامے ہی تھا۔

عمران میرے پہلو میں چل رہا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ ”دیکھ لیں جی، آپ کے کارنامے کا کریڈٹ یہ مینڈک کی آنکھوں والا رامے لے گیا۔ یقیناً لوگ سمجھ رہے ہیں کہ جنگجو ہرتی کا شکار اسی نے کیا ہے۔ کتنی توجہ مل رہی ہے اس ڈڈو (مینڈک) کو۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے...... لیکن یہ بھی تو ہے کہ مخصوص شکل صورت کی وجہ سے ہر کوئی اسے توجہ سے ہی دیکھتا ہے۔ باقی رہی بات کریڈٹ والی تو مجھے اس سے کوئی مسئلہ نہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ جس وقت آپ نے ہرتی کو جہنم واصل کیا اس کے شوہر کو میں نے دبوچ رکھا تھا اور اس کا رخ بھی دوسری طرف تھا۔ اسے بھی معلوم نہیں کہ ہرتی کو کس نے مارا؟“

ہرتی کے مبینہ شوہر کا نام ہمیں سکامر معلوم ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر چمڑے کی رسی سے بندھے تھے۔ اس کے گلے میں موجود گلوبند میں ایک زنجیر سی ڈال دی گئی تھی اور اسے کسی جانور کی طرح گھسیٹتے ہوئے لایا جارہا تھا۔ اس کا سرخ وسپید چہرہ بتارہا تھا کہ بیوی کے مرنے کا غم اب بتدریج خوف وہراس میں ڈھلتا جارہا ہے۔ یقیناً یہ جلد ہی پیش آنے والی صورت حال کا خوف تھا۔

برف کے ایک بڑے محرابی در پر چمڑے کا دبیز پردہ تھا۔ اس پردے کو ہٹا کر ہم ایک گول کشادہ جگہ پر داخل ہوئے۔ یہاں دوتین رنگوں کے لیمپس تھے اور ان کی روشنی برف پر منعکس ہوکر عجب دلکش منظر تخلیق کررہی تھی۔ اس ہال نما جگہ کی چھت بھی یہاں کی دیگر چھتوں کی طرح ہموار نہیں تھی۔ برف نے یہاں چھوٹے بڑے بے شمار ابھار سے بنا رکھے تھے۔ کہیں کہیں برف کی منجمد قلمیں بھی لٹکی نظر آتی تھیں۔ سب سے انوکھا منظر ایک برفیلے چبوترے کا تھا جس پر ایک قالین نما شے بچھی تھی اور عجیب وضع کی ایک کرسی پر ایک جوان تبتی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر اصلی شیر کی کھال کا لبادہ دور ہی سے پہچانا جاتا تھا۔ اس کی گول ٹوپی بھی غالباً اسی کھال کی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال مینڈھیوں کی شکل میں تھے اور جھالر کی طرح گول ٹوپی کے اردگرد جھول رہے تھے۔ اس لڑکی کے اردگرد کوئی نصف درجن مزید عورتیں مؤدب کھڑی تھیں۔ ہمیں یہاں لانے والی چوڑی چکلی ڈولما بھی ان میں شامل ہوگئی۔ کرسی پر بڑی تمکنت سے بیٹھی ہوئی لڑکی یقیناً وہی تھی جسے ڈولما نے مایارانی کہا تھا۔ مایارانی کے قریب کوئلوں کی جو انگیٹھی دہک رہی تھی، اس کی سرخ روشنی میں مایا کا چہرہ کچھ اور بھی پُرطیش دکھائی دینے لگا تھا۔

ایک پہلوان نما عورت نے پکڑے جانے والے سکامر کے گلے کی زنجیر کو یکایک زور سے کھینچا، وہ اوندھے منہ برفیلے چبوترے کے پاس مایا کے قدموں میں جاگرا......

اور مقامی زبان میں پتا نہیں کیا فریادیں کرنے لگا۔

منوہر سنگھ ہمارے قریب کھڑا غور سے سب کچھ سن رہا تھا۔ اسی دوران میں مایا کے پہلو میں کھڑی تنومند ڈولما نے جادورامے کی طرف اشارہ کیا اور مایا سے مؤدب انداز میں مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ مایا اپنی عجیب وضع کی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور تکریم کے انداز میں کچھ کہہ کر جادورامے کو اوپر چبوترے پر بلا لیا۔ بعدازاں میم مائرہ کو بھی اوپر بلا لیا گیا۔ دو مزید کرسیاں مایا رانی کے قریب رکھ دی گئیں اور وہ دونوں ان پر بیٹھ گئے۔

چبوترے کے اردگرد جانوروں کی نرم گرم کھالیں اور غالیچے، نمدے وغیرہ بچھے تھے۔ ہمیں ان پر بیٹھنے کا کہا گیا۔

چبوترے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے سکا مر کی فریادیں ایک بار پھر شروع ہو گئیں...... مایا کڑے لہجے میں اس سے سوالات کرنے لگی۔ ایک موقع ایسا آیا کہ سکا مر تڑپ کر اٹھا اور اس نے آگے بڑھ کر مایا کے پاؤں چومنا چاہے، مایا نے اسے ٹھوکر مار کر دور ہٹا دیا۔

''یہ کیا ڈراما چل رہا ہے برادر؟'' عمران نے منوہر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی۔

منوہر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی...... یہ سکا مر مایا رانی کے تین باکروں میں سے ایک ہے۔ باکر یہاں پتی کو کہتے ہیں، یہ سکا مر سب سے چھوٹا باکر تھا اور مایا کو سب سے پیارا بھی...... لیکن کوئی ایک سال پہلے وہ عورت سکا مر کو اپنے ساتھ بھگا کر لے گئی جس کا نام ہر یتی ہے اور جو آج ماری گئی ہے۔''

یہ ایک سنسنی خیز صورتِ حال تھی، میں نے منوہر سے پوچھا۔ ''اب اس سکا مر کا کیا ہوگا؟''

''لگتا تو یہی ہے کہ اچھا نہیں ہو گا۔ آگے واگرو جانے۔''

ایک دراز قد محافظ ہمارے قریب آن کھڑی ہوئی تھی لہٰذا ہمیں خاموش ہونا پڑا۔

کچھ ہی دیر بعد یہ محفل برخاست ہو گئی۔ دو عورتیں اور ایک مرد، سکا مر کو گلے کی زنجیر سے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ وہ آخر تک روتا اور فریادیں کرتا رہا۔

''کیا اسے مار دیں گے؟'' میں نے منوہر سے پوچھا۔

''ابھی شاید نہیں۔'' وہ بولا۔

کچھ ملازمین بڑی بڑی طشتریوں میں بھاپ دیتے ہوئے پیالے لیے اندر داخل ہوئے اور ہمارے سامنے چننے لگے۔ خوشبو سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مچھلی اور کسی قسم کے اناج کا سوپ ہے۔

ماہین چار پانچ روز سے ٹھیک سے کچھ کھا پی نہیں رہی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری بھوک بھی تقریباً اڑی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ وہی چھوٹا سا لیکن مہلک بم تھا جو مسلسل ماہین کی ران سے بندھا ہوا تھا...... اور کسی بھی وقت کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہمارے لیے قیامت برپا کر سکتا تھا۔ اب بھی ماہین میرے قریب بیٹھی سوپ کے پیالے میں بس چمچ ہلانے لگی۔

''کیا بات ہے ماہین، پریشان ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ زبردستی مسکرائی۔ ''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں انکل تابی۔''

''مجھے پتا ہے جو چیز تمہارے جسم سے باندھ دی گئی ہے وہ خطرناک ہے۔ اس کی جتنی تشویش تمہیں ہے، اتنی ہی ہم سب کو بھی ہے مگر زیادہ پریشانی کی بات اس لیے نہیں ہے کہ میں نے اس کے دونوں ریموٹ کنٹرول دیکھے ہیں۔ ان میں سیفٹی لاک لگے ہوئے ہیں اور بٹن کے اوپر حفاظتی Cover بھی ہے تاکہ غلطی سے بٹن نہ دب سکے پھر بھی ہماری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ کسی طرح میم اور رامے کو قائل کیا جائے کہ وہ یہ چیز تمہارے جسم سے علیحدہ کر دیں...... بلکہ میں آج ہی اس بارے میں میم سے بات کرتا ہوں۔''

ماہین نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اپنی آواز کو مزید دباتے ہوئے بولی۔ ''انکل! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اکیلے میں، میں خود کوشش کروں کہ یہ میری ٹانگ سے علیحدہ ہو جائے۔''

''یہ غضب نہیں کرنا...... میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ ایسی ڈیوائسز کو اگر خود سے چھیڑا جائے تو یہ بلاسٹ ہو جاتے ہیں...... تم زیادہ اسٹریس نہ لو، میں چند گھنٹوں کے اندر ہی میم ماہرہ سے اس بارے میں بات کرتا ہوں۔''

وہ سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔ ہمیں وہیں ہال نما گول کمرے میں ہی ایک پُرتکلف کھانا کھلایا گیا۔ اس میں مچھلی اور بھیڑ وغیرہ کا گوشت تھا اور مقامی طرز کے چاول تھے۔ کھانا ''سرو'' کرنے والے زیادہ تر مرد ہی تھے۔ ان میں سے اکثر کے جسم کے کھلے حصوں پر نیلے پیلے نقش و نگار نظر آتے تھے۔

میم مائرہ اور رامے کا کھانا چبوترے پر ہی ایک بڑی میز پر چنا گیا۔ کھانے کے بعد ہمیں شب بسری کے لیے چھوٹے چھوٹے حجرے نما کمروں میں بھجوا دیا گیا۔ یہ پتھر

جیسی برف کے ..... بنے ہوئے گول چھتوں والے کمرے تھے۔ حیرت انگیز طور پر یہاں سردی بہت نہیں تھی۔ جانوروں کی کھالیں اور موٹے موٹے نرم نمدے فرشوں پر بچھے تھے۔ گاہے بگاہے کہیں دور سے بھیڑیوں کی ''ہاؤلنگ'' بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ایک کمرے میں عمران اور میں تھے...... ایک میں میم مائرہ، ماہین اور ہما عروج...... اسی طرح باقی افراد بھی قریبی حجرے نما کمروں میں تھے۔ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ صبح سب سے پہلے میں میم مائرہ سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ہوا یہ کہ وہ خود ہی مجھ سے بات کرنے پہنچ گئی۔ اس کے تراشیدہ بال، اونی ٹوپی کے نیچے سے جھانک رہے تھے اور آنکھوں میں کچھ تشویش جھلک دکھاتی تھی۔

وہ چھوٹتے ہی بولی۔ ''دیکھو ڈپٹی تابش! ہمیں یہاں باہمی مشورے سے چلنا ہوگا۔ بالکل ایک جان ہوکر...... اسی صورت میں ہمیں کامیابی مل سکتی ہے اور ہم خیر خیریت سے واپس جاسکتے ہیں۔ یہ خطرناک لوگ ہیں، مگر شکر ہے کہ اس جھگڑی عورت کے مرنے کی وجہ سے ان لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ دوستانہ ہے۔ ایک بات یاد رکھو کہ اس عورت کی موت کے حوالے سے ہم سب کا موقف وہی ہونا چاہیے جو میرا اور رائے کا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''سمجھ تو رہا ہوں مائرہ مگر ہمارا آپس کا یہ کیسا ''مہربان'' تعلق ہے کہ ہماری ایک ساتھی کے جسم سے تم نے بم باندھ رکھا ہے......؟''

''میں اسی بارے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''جو ریموٹ کنٹرول بہروز کے پاس تھا، وہ ہم نے واپس لے لیا ہے۔ رائے صاحب والا ریموٹ کنٹرول بھی میں نے ان سے لے لیا ہے اور دونوں کنٹرول فی الحال آف بھی کر دیے ہیں۔ یہ تم لوگوں کو میری طرف سے پوری گارنٹی ہے کہ ماہین کے لیے اب کوئی خطرہ نہیں ہے، مگر شرط یہی ہے کہ تمہاری طرف سے بھی کسی طرح کی بدعہدی نہ ہو اور مشترکہ فیصلے کے مطابق چلا جائے۔''

مائرہ نے اپنے موٹے اونی کوٹ کی اندرونی جیب سے وہ دونوں چھوٹے ریموٹ کنٹرول مجھے نکال کر دکھائے، جن پر اب کوئی اسپارکنگ نہیں تھی۔

اسی دوران میں کہیں قریب سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے یوں لگا جیسے ان آوازوں میں مصیبت میں پھنسے ہوئے گورے چٹے سکامر کی آواز بھی شامل ہے۔ اب تک اس بارے میں جو معلوم ہوا تھا، اس کے مطابق، مایا رانی کی سردار محافظ ہریتی نے مایا کے نئے نویلے شوہر سکامر پر ڈورے ڈالے اور پھر کوئی ایک برس پہلے اسے بھگا کر لے گئی۔ سکامر غیر معمولی طور پر مایا کا منظورِ نظر تھا۔ اس کی بے وفائی نے مایا کو توڑ کر رکھ دیا۔ اب تو یوں لگتا تھا کہ اسے مرد ذات سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ مایا کے دو اور باکر (شوہر) بھی موجود تھے مگر وہ ان کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ وہ ایک برس سے سکامر اور ہریتی کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ یہ صرف پانچ چھ روز پہلے کی بات تھی جب یہاں سے کوئی دس پندرہ کلومیٹر دور ایک گلیشیر کے دامن میں ان کا کھوج ملا مگر پکڑے جانے سے پہلے وہ دونوں بھاگ نکلے۔ مایا رانی کی جنگجو محافظوں کی ٹولیاں ان دونوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر کل رات ایک ٹولی کے ساتھ ان کا آمنا سامنا ہوا۔ ہم موقع پر نہ پہنچتے تو شاید ہریتی نام کی وہ سردار محافظ ان تینوں عورتوں کو مار ڈالتی اور ایک بار پھر سکامر کے ساتھ غائب ہوجاتی۔

ہم روٹی، میٹھے پنیر اور قہوے کے ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ نئی سردار محافظ ڈولما وہاں پہنچ گئی۔ مترجم منوہر بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہمارے دیگر ساتھیوں کی طرح اس نے مجھے اور عمران کو بھی بتایا کہ ہمیں طامبورہ میں بلایا گیا ہے، جہاں ہمیں کچھ دکھایا جانا ہے (طامبورہ دراصل اس وسیع گول برفیلے چیمبر کو کہا جاتا تھا جہاں کل مایا سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی)

ہم گول کمرے طامبورہ میں پہنچے۔ وہاں پچاس سے زیادہ مرد و زن موجود تھے۔ ہمارے ساتھ ماہین، ہما عروج، حسام، جہاناں اور بہروز کے علاوہ دوسرے گارڈز بھی شامل تھے۔ طامبورہ میں چند منٹ ٹھہرنے کے بعد ہمیں ایک طویل برفیلی سرنگ سے گزار کر کھلی جگہ پر لایا گیا۔ بلا کی ٹھنڈ تھی، گرد و پیش پر برف کی نئی تہیں چڑھی ہوئی تھیں، ہلکی دھند بھی تھی لیکن مطلع صاف تھا۔ یہاں کھلی جگہ پر دو تین سو کے قریب مزید مرد و زن موجود تھے۔ سب بھاری لبادوں میں لپٹے ہوئے اور منہ سے بھاپ خارج کرتے ہوئے۔ تاہم اس ہجوم میں ہمیں کوئی بچہ نظر نہیں آیا۔

کھلی جگہ کے بیچوں بیچ لوہے کے دو پول گڑے ہوئے تھے۔ ان کا قطر قریباً پانچ انچ اور بلندی سات فٹ ہوگی۔ ہمیں ایک جانب بھاری کپڑوں میں لپٹی ہوئی مایا رانی بھی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ویسے ہی بھاری قیمتی کپڑوں میں ملبوس ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ عورت بھی تھی۔ اس کی شکل سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ اس کی والدہ ہے۔ مائرہ اور رائے بھی مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے دائیں بائیں موجود

تھے۔

ایک جانب سے شور بلند ہوا۔ ہم نے دیکھا کچھ تنومند عورتیں سکامر کو گلے کی زنجیر سے گھسیٹتی ہوئی ہجوم کی طرف لارہی تھیں۔ ایک درمیانی عمر کی عورت کو بھی اسی طرح گھسیٹ کر لایا جارہا تھا۔

"لگتا ہے کوئی کڑی سزا دی جانے والی ہے ان کو۔" عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"مگر یہ دوسری عورت؟"

"ٹھہریں میں منوہر سے پوچھتا ہوں۔" عمران نے کہا اور منوہر کی طرف گیا جو کچھ فاصلے پر کھڑا سردار محافظ ڈولما اور دیگر مقامی افراد سے باتیں کررہا تھا۔ کچھ دیر بعد عمران، منوہر کو ہمارے پاس لے آیا۔ منوہر نے لرزاں آواز میں کہا۔ "سکامر کو سزائے موت دی جانے والی ہے...... اور یہ دوسری عورت اس جرم میں سکامر کی سہولت کار رہی ہے، یہ بھی ماری جائے گی۔ بلکہ ایک عورت اور بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟" عمران نے پوچھا۔

"وہ عورت بھی شریکِ جرم ہونے کی وجہ سے موت کی حق دار ٹھہری ہے مگر وہ چونکہ سات ماہ کی حاملہ ہے اس لیے وقتی طور پر اسے مارا نہیں جارہا۔ بچے کے جنم کے بعد اسے بھی ماردیا جائے گا۔"

پہریدار عورتیں روتے چلّاتے سکامر کو آہنی پول کے قریب لے آئی تھیں۔ درمیانی عمر کی عورت بھی ہمراہ تھی۔ اس کے تپتی خدوخال پر برف کی سی سفیدی تھی۔ تاہم وہ خاموش تھی۔ جیسے جانتی ہو کہ جو کچھ ہونا ہے، اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔

"ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟" میں نے منوہر سے پوچھا۔

"اس کی ٹھیک جانکاری تو ابھی مجھے بھی نہیں لیکن لگتا ہے کہ یہاں کوئی اگنی وغیرہ جلائی جائے گی۔"

ہم سکامر اور درمیانی عمر کی عورت کی طرف دیکھ رہے تھے جب اچانک ہماری نظروں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ سکامر کی ساتھی مجرمہ نے تڑپ کر ایک پہریدار عورت کی کمر سے تیز دھار کٹار کھینچ لی۔ وہ بہت تیزی سے اس کٹار کو اپنی گردن کی طرف لے کر گئی جیسے اپنی شہ رگ کاٹنا چاہتی ہو مگر اس کے عقب میں کھڑی پہریدار نے اس کی کلائی دبوچ لی پھر دیگر عورتوں نے بھی اسے دبوچ لیا اور اس کی گرفت سے "کٹار" نکالنے کے بعد اسے ایک پول کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔ شور مچاتے اور آہ و بکا کرتے سکامر کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

جس طرح عورت نے خودکشی کی سرتوڑ کوشش کی تھی، اندازہ ہوتا تھا کہ ان دونوں کو کافی سخت سزا ملنے والی ہے۔

ایک جانب سے پانچ چھ مرد پہریدار نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں موٹی اور پتلی خشک لکڑیاں تھیں۔ وہ ان لکڑیوں کو بڑی ترتیب سے سکامر اور عورت کے اردگرد چننے لگے۔ اب صورت حال سمجھ میں آرہی تھی۔ ایسے برفستان میں خشک لکڑیوں اور نارنجی آگ کی دید بڑی خوشنما ہوتی ہے، مگر یہاں یہ خوشنمائی کسی اور شکل میں ڈھلنے والی تھی۔ جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ ایک جیتے جاگتے انسان کو آہستہ آہستہ آگ میں جلتے، پگھلتے اور دم توڑتے دیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ تاہم لگتا تھا کہ یہاں کے لوگ ایسے مناظر کے عادی ہیں۔

لکڑیوں پر چربی کا تیل چھڑکا گیا۔ سکامر کی حالت دیدنی تھی۔ وہ اب تک مایا سے معافیاں مانگ رہا تھا اور التجائیں کررہا تھا۔ مایا کے چہرے پر بھوری چٹانوں کی سی سختی تھی۔ باندھنے سے پہلے سکامر اور درمیانی عمر والی عورت کے کپڑے اتار دیے گئے تھے۔ عورت کے بالائی اور زیریں جسم پر نہایت مختصر لباس تھا جبکہ سکامر کے نوخیز، سڈول جسم پر فقط چمڑے کا ایک لنگوٹ نظر آرہا تھا۔ کڑاکے کی سردی میں یہ نہایت ناکافی لباس تھا مگر ان نیم عریاں جسموں کو بہت جلد آگ کی حرارت ملنے والی تھی...... اور اتنی زیادہ حرارت کہ پھر ان کے ٹھٹھرے جسموں کو کسی شے کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ میں نے ایک اور چیز نوٹ کی۔ سکامر کے پورے جسم حتیٰ کہ ناف اور ٹانگوں پر بھی پختہ روشنائی سے بنائے گئے رنگین نقش و نگار نظر آرہے تھے۔ ایسے نقش و نگار اکثر مردوں کے جسم پر موجود تھے۔

کچھ ہی دیر بعد عمر رسیدہ عورت کے حکم پر خشک لکڑیوں کو آگ لگادی گئی۔ ان دونوں کے اجسام پہلے ہلکی آنچ پر تڑپے مچلے پھر آگ کے پھنکارتے ہوئے شعلے انہیں ڈھانپنے لگے۔

عمران نے کہا۔ "ماہین سے یہ سب برداشت نہیں ہو گا۔"

میں نے دیکھا، ماہین نے اپنا رخ پھیرلیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ دراز قد ہما عروج کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ میں نے ان دونوں کو ساتھ لیا اور موقع سے ہٹ گیا۔ مرنے والوں کی صدائیں

دل دوز تھیں۔ فضا میں سوختہ گوشت کی بدبو پھیلنے لگی تھی۔

غار کے اندرونی حصے میں داخل ہوتے ہی شدید سردی میں کمی محسوس ہوئی۔ ہما اپنے ساتھیوں کی طرف چلی گئی۔ میں ماہین کو اپنے حجرے نما کمرے میں لے آیا۔ وہ سرتاپا، ہرے رنگ کے بھاری بھرکم کپڑوں میں تھی۔ بس چہرہ نظر آتا تھا اور وہ سفید گلاب کی طرح تھا۔ جیسے سبز پتوں میں گھرا ہوا سفید پھول۔

''بہت ظالم ہیں یہ لوگ۔'' وہ منمنائی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے تم نے اپنے موبائل سے وڈیو بنائی ہے۔ سوشل میڈیا پر ڈالو گی تو تہلکہ مچ جائے گا۔''

''نہیں انکل، میں ڈیلیٹ کر دوں گی اسے۔ جب میں خود برداشت نہیں کر سکی تو میرے ویورز کیسے کریں گے۔ ایسی سستی اور دل خراش شہرت کی تمنا میں نے کبھی نہیں کی۔''

''مجھے تم سے ایسی ہی جواب کی توقع تھی۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ ہم کن لوگوں میں آ پھنسے ہیں انکل۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ لوگ بھی میم مائزہ اور راے سے کچھ کم سفاک نہیں ہیں اور پھر ان کا یہ رہن سہن۔ کہانیوں اور فلموں وغیرہ سے یہ جانا تھا کہ کچھ گروہ یا قبیلے ایسے ہوتے ہیں جن میں مردوں پر عورتوں کا غلبہ ہوتا ہے اور روز مرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وہی زیادہ جدوجہد کرتی ہیں۔ یہاں یہ سب کچھ حقیقت کی صورت میں نظر آ رہا ہے۔''

''اور اس کا ہمیں ایک فائدہ بھی ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور یہ فائدہ تمہاری نسبت سے ہے۔ لگتا ہے کہ یہاں کسی عورت پر ظلم کرنا کسی مرد کے لیے آسان نہیں ہے اور یہ بات یہاں آتے ہی جادو راے نے بھی سمجھ لی ہے۔''

''میں سمجھی نہیں انکل تابی؟''

''تمہاری سب سے بڑی پریشانی میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گئی ہے ماہین۔ جو دھما کا خیز ڈیوائس تمہاری ٹانگ سے باندھی گئی ہے، اس کے دونوں ''ریموٹ کنٹرول'' میم مائزہ نے اپنے پاس رکھ لیے ہیں اور فی الحال انہیں ڈس کونیکٹ بھی کر دیا ہے۔ اب تمہیں ایزی محسوس کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار دن میں عمران اور میں مائزہ کو قائل کر لیں کہ وہ ویسے ہی یہ منحوس شے تمہاری ٹانگ سے علیحدہ کر دے۔''

''اور آپ کا خیال ہے کہ یہ سب اس لیے ہوا ہے کہ راے اور مائزہ یہاں کے ماحول سے ڈر گئے ہیں؟''

''سو فیصد یہی بات ہے۔ مائزہ نے ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن میں سمجھ گیا ہوں کہ اسے مایا رانی کی ناراضگی کا ڈر ہے۔ شاید تم نے ایک اور بات نوٹ کی ہو۔ کل سے جادو راے کا رویہ نابینا ایلی سے بھی بدلا ہوا ہے۔ وہ اسے کسی زرخرید کنیز کی طرح اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا...... اس پر تشدد بھی کرتا تھا۔ میں نے خودرات کے وقت اس کے خیمے سے ایلی کے رونے کی آوازیں سنی ہیں۔ لیکن آج صبح وہ بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر گھوم رہا تھا۔''

''انکل جی، کیا یہ سب کچھ یہاں کے لوگوں کو بتایا نہیں جا سکتا؟''

''ابھی نہیں ماہین...... لیکن آگے جا کر ایسا موقع آ بھی سکتا ہے۔''

ماہین جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ شاید اس کے تصور میں پھر تھوڑی دیر پہلے کا وہ دل دوز منظر آ گیا تھا جب اس نے نوجوان سکامرا اور اس کی مددگار عورت کو زندہ جلتے دیکھا تھا۔

غالباً اپنا دھیان ہٹانے کے لیے اس نے موضوع بدلا۔ ''انکل اس سردار محافظ ڈولما نے کیا بات کہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جس سفید سانپ کی ہم بات کر رہے ہیں، وہ سانپ نہیں کوئی اور چیز ہے۔''

''ہاں اس کی بات سے تو یہی اشارہ ملتا ہے اور یہ بھی لگتا ہے کہ ماضی میں بھی اس شے کو ڈھونڈنے کے لیے کچھ لوگ یہاں آئے تھے۔''

اسی دوران میں عمران بھی واپس پہنچ گیا۔ جو دل دوز منظر وہ دیکھ کر آیا تھا، اس کا حزن اس کے خوب صورت چہرے پر موجود تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہونے کو تھا مگر پھر ماہین کو میرے پاس دیکھ کر ٹھٹکا۔

''نہیں، نہیں...... آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ کچھ جھجکتا ہوا چلا آیا۔ ''حسام کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ باہر ہی ہے، گونگے جہاناں کے ساتھ اشاروں میں باتیں کر رہا تھا۔ ایک مقامی عورت بھی اسی طرح اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔''

حسام کا دائیں بائیں ہونا مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اندیشہ رہتا تھا کہ وہ کوئی ایسی الٹی سیدھی بات نہ کر دے جو ہمارے مفاد کے خلاف جاتی ہو۔ عمران نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔ ''ابھی منوہر سنگھ نے بتایا ہے کہ پرسوں یہاں ایک تقریب میں آپ کو انعام دیا جائے گا۔''

''مجھے انعام؟ وہ کس بات کا؟''

''جناب! آپ نے یہاں کی کرتا دھرتا مایا رانی کی سب سے بڑی اور خطرناک رقیب ہر جی کو جہنم واصل کیا ہے۔ اس پر مایا کے شوہر سکا مر کو بھگانے کا ہی نہیں، کم از کم چار افراد کو قتل کرنے کا الزام بھی تھا۔''

''لیکن یہ انعام تو اب ظاہر ہے جادو رائے کو ہی ملے گا۔''

''رائے صرف انعام وصول کرے گا۔ اصل حق دار تو آپ ہی ہیں۔ جب رائے انعام وصول فرمائے گا تو ہم یک زبان ہو کر نعرہ لگائیں گے۔ چور ہے جی چور ہے...... اصل بندہ ہور ہے۔ یہ خوامخواہ کا ہیرو ہے...... زیرو ہے بس زیرو ہے۔''

''تمہارے یہ اردو پنجابی نعرے ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ یہی سمجھیں گے کہ تم رائے جی کی عزت افزائی پر خوش ہو رہے ہو۔''

''وہ منوہر سنگھ سے ترجمہ پوچھ لیں گے۔''

''اور منوہر بھی صحیح ترجمہ نہیں کرے گا۔ اسے بھی رائے کے ہاتھوں اپنی جان نہیں گنوانی۔'' میں مسکرایا۔

''مگر ایسا تو نہیں نا کہ یہاں صرف منوہر ہی ترجمانی کے فرائض انجام دے سکتا ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''جناب! ابھی کچھ دیر پہلے میں مایا رانی کی والدہ بوشال ماتا سے بات کر کے آیا ہوں۔ بہت اچھی عورت ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ ہندی، اردو سمجھ لیتی ہے۔ اس کی ایک ملازمہ بھی بری بھلی ہندی جانتی ہے۔ اس کے علاوہ مایا رانی بھی ہندی سے بالکل انجان نہیں ہے۔''

''بڑی جلدی بڑا کچھ جان لیا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کے اندازے سے زیادہ۔'' وہ بولا۔ ''بوشال ماتا اپنی بیٹی یعنی مایا رانی کے لیے بہت پریشان ہے۔ دراصل وہ اپنے تیسرے پاکر یعنی تیسرے شوہر سکا مر سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس کی بے وفائی نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ وہ کہتی ہے اسے مرد ذات سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ اپنے بقایا دونوں شوہروں کی طرف وہ مڑ کر بھی نہیں دیکھتی، پورا ایک سال ہو گیا ہے۔'' ہماری گفتگو کا رخ غیر ارادی طور پر نازک سمت میں مڑ گیا تھا۔ لہٰذا ماہین نے ہمارے پاس سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ ویسے بھی حشام آنے والا تھا۔ وہ ماہین کو میرے اور عمران کے پاس بیٹھے دیکھتا تو یقیناً اس کے موڈ پر منفی اثرات پڑتے۔

ماہین کے جانے کے بعد عمران بولا۔ ''میں کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا ہوں جی۔ سچی، میرا تو دل چاہنے لگا ہے کہ مایا رانی کے غم کا مداوا کروں۔ مرد ذات کے حوالے سے اس نے اپنے دل میں جو منفی جذبات پال لیے ہیں، ان کا قلع قمع کر دوں۔''

''وہ کس طرح؟''

''اپنی توجہ سے، پیار سے، اور خودسپردگی سے۔''

''خودسپردگی کے بچے...... تم نے دیکھ ہی لیا ہے نا، یہاں بے وفائی کی سزا کتنی خوفناک ہے۔ اول تو وہ تجھے منہ ہی نہیں لگائے گی، اور اگر لگائے گی تو ایسا کہ تجھے نانی یاد آ جائے گی۔ اگر تو نے حسب عادت کہیں غلطی سے اس کے سامنے مہوش حیات اور کترینہ کیف وغیرہ کا نام بھی لے لیا تو تیری چربی پگھلا کر یہاں کے چراغوں میں ڈال دے گی۔''

''بات تو...... آپ...... ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں...... میں اپنے گوہر عفت کی قربانی تو دے سکتا ہوں۔ مگر یہ چربی پگھلانے والا کام......'' اس نے سوچ میں پڑنے کی اداکاری کی، پھر لمبا سانس بھر کر بولا۔ ''سچ کہتا ہوں جی۔ بوشال ماتا اپنی بیٹی کی موجودہ حالت کے لیے بہت زیادہ دکھی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ وہ کہیں بستر پر ہی نہ پڑ جائے۔ یہ جو پرسوں تقریب کا اہتمام کیا ہے بوشال ماتا نے وہ بھی اس لیے کہ مایا رانی کا دل کچھ بہل سکے۔''

دو روز بعد تقریب واقعی شاندار تھی۔ یہ اسی ہال نما جگہ پر تھی جسے یہاں طامبورہ کہا جاتا تھا۔ خاص قسم کی خوشبو نے قرب و جوار کو معطر کر دیا تھا اور چربی کے تیل کی ہلکی سی باس جو ہر وقت قرب و جوار میں محسوس ہوتی تھی، اس خوشبو میں دب کر رہ گئی تھی۔ طامبورہ میں مختلف رنگوں کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ یہ روشنیاں برف پر منعکس ہو کر اور ہی سماں باندھ رہی تھیں۔ پتھر کی طرح سخت برف کے چبوترے پر موٹے نمدے اور قالین بچھے ہوئے تھے۔ بوشال ماتا کے علاوہ وہاں جواں سال مایا رانی اور دو تین مقامی معزز عورتیں کرسیوں پر موجود تھیں۔ ان میں میم مائرہ بھی شامل تھی۔ وہ عمر رسیدہ بوشال ماتا کے ساتھ بیٹھی تھی اور کسی وقت اس کے ساتھ سرگوشی بھی کر لیتی تھی۔

عمران کی لپ ریڈنگ والی صلاحیت اب ہر شک شبہے سے بالاتر ہو چکی تھی۔ وہ گاہے گاہے اس کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اب بھی وہ مخصوص انداز میں میم مائرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ ''پتا ہے، یہ باگڑ بلی مائرہ کیا کہہ رہی ہے؟ یہ عزت مآب محترم رائے صاحب کی شان میں قصیدے پڑھ

رہی ہے۔ بوشال ماتا کو بتارہی ہے کہ راے جی کا انڈیا اور پاکستان میں بہت اثر ورسوخ ہے۔ اس کے علاوہ وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں تو سونا بنتی ہے۔ وہ یاروں کے یار ہیں اور اپنے چاہنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتے۔''

اسی دوران میں میوزک اُبھرا اور ڈھول کی دھما دھم سنائی دینے لگی۔ پھر چبوترے کے سامنے کھلی جگہ پر رقص شروع ہوگیا۔ عورتیں اور مرد ناچنے لگے۔ سردی کے باوجود انہوں نے بھاری بھرکم کپڑے نہیں پہن رکھے تھے۔ ان کے جسمانی خدوخال نمایاں تھے۔ مردوں کے جسموں کے جو حصے عریاں تھے ان پر خوب صورت نقش ونگار بنے تھے۔ کچھ عورتوں نے بے باکی سے اپنے ہم رقص مردوں کو اپنے ساتھ چپکایا ہوا تھا۔ ان میں ہمیں سردار محافظ ڈولما بھی نظر آئی۔ اس نے ورزشی جسم والے ایک توانا مرد کو اپنا ہم رقص بنایا ہوا تھا۔ ڈولما کے چہرے پر زخم کا افقی نشان اس کے جنگجو ہونے کی نشاندہی کرتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ کئی دیگر عورتوں کے چہروں پر ایسے ہی چھوٹے بڑے نشان تھے۔ مردوں کے چہروں پر ایسے نشان نہ ہونے کے برابر تھے۔ دو تین خواتین واضح طور پر حاملہ تھیں مگر اسی جوش وخروش اور بے باکی سے ناچ رہی تھیں۔ قبول صورت مایارانی اپنی مخصوص نشست پر بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر نمایاں طور پر بیزار اور کھوئی کھوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی والدہ اس کوشش میں تھیں کہ مایا اس گہما گہمی میں دلچسپی لے۔ رقصاں افراد میں سے کچھ مردوں نے بازی گری کے کرتب دکھائے اور حاضرین کو محظوظ کیا۔

اس کے بعد دیدہ زیب پوشاکوں میں تین جنگجو ٹائپ عورتیں اندر داخل ہوئیں، منوہر نے بتایا۔ ''یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے سکامر اور ہرنی کی تلاش میں اہم کردار ادا کیا اور گھائل وغیرہ بھی ہوئیں۔'' مایارانی نے ان میں سے ہر ایک کو ایک خوب صورت بیلٹ تحفے میں دی۔ یہ زردی مائل بیلٹ کسی جانور کی کھال کی تھی۔

میں نے منوہر سنگھ سے کہا۔ ''یہ شیر کی کھال کی ہے شاید؟''

''شیر کی نہیں...... شیرنی کی کھال کی۔'' منوہر نے جواب دیا۔ ''رانی نے جو لبادہ پہن رکھا ہے وہ بھی شیرنی کی کھال کا ہے۔ شیرنی کی کھال کا پہننا یہاں بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔''

''ایسا کیوں ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس کا کارن یہ ہے جی کہ شیروں کے پریوار (خاندان) میں شیرنیاں ہی شکار کرتی ہیں اور کرتا دھرتا ہوتی ہیں۔ نرشیر تو بس کبھی کبھار ہی اپنے شریر کو تکلیف دیتے ہیں۔ یہاں بھی مشقت اور خطرے والے سارے کام عورتیں کرتی ہیں۔''

تین خوش پوش عورتوں کے بعد جادو راے کی باری آئی۔ وہ چبوترے کی بائیں جانب سے نمودار ہوا۔ وہ کالے رنگ کا ایک گولا سا نظر آتا تھا جس کی آنکھیں اس کے چہرے کے اوپر دھری تھیں۔ یقیناً حاضرین نے اسے دیکھ کر ایک بے ساختہ کراہیت محسوس کی ہوگی۔ جادو راے نے نابینا ایلی کا سرخ وسپید ہاتھ بڑی محبت سے تھام رکھا تھا۔ اپنے رویے سے وہ لیڈیز فرسٹ...... لیڈیز فرسٹ کی تصویر نظر آرہا تھا...... حالانکہ یہی راے تھا جس نے اپنی ہوس کی خاطر اسے بینائی سے محروم کیا تھا...... اور اس کے دکھ درد کی پروا کیے بغیر بیدردی سے اس کا جسمانی استحصال کرتا رہا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے میم مائرہ کی طرف دیکھا جو بوشال ماتا کے پہلو میں منقش کرسی پر براجمان تھی۔ وہ جب بھی نابینا ایلی کو دیکھتی تھی، اس کے چہرے پر ایک نفرت انگیز لیکن مطمئن تاثر ابھر آتا تھا۔ ارب پتی ڈیرن نے مائرہ کو طلاق دی تھی اور نوجوان ایلی سے عہد وپیمان باندھے تھے۔ اس کی سزا ایلی کو یہ ملی تھی کہ وہ آنکھیں گنوا کر راے کے بوجھ تلے روندی جارہی تھی۔

مایارانی نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر راے کا استقبال کیا۔ اس کے کالے کلوٹے ہاتھ تھامے اور اپنی زبان میں تعریف کے چند جملے بولے...... پھر ایک خوشنما گلوبند، راے کی گردن میں پہنایا۔ دور ہی سے نظر آتا تھا کہ اس پر قیمتی پتھر جڑے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اس ''بہادری'' کا تمغا تھا جو حقیقت میں راے نے دکھائی ہی نہیں تھی۔ تب ایک انگوٹھی، راے کی سب سے چھوٹی انگلی میں پہنائی گئی۔ حاضرین نے مقامی زبان میں نعرے لگائے اور خوشی کا اظہار کیا۔ تب جوابی کارروائی کے طور پر راے نے مایارانی اور اس کی والدہ بوشال ماتا کو ایک ایک جدید پسٹل کا تحفہ پیش کیا۔ یہ پسٹل چھوٹی چھوٹی صندوقچیوں میں تھے۔ ان پسٹلز کے کچھ حصے خالص سونے کے تھے۔ مقامی لوگوں کے پاس چونکہ آتشیں ہتھیار نہ ہونے کے برابر تھے لہٰذا ان چیزوں کی قدر تھی۔ مایارانی خوش نظر آئی اور اس نے راے کا شکریہ ادا کیا۔

تب مایارانی اپنی والدہ اور دونوں معزز مہمانوں یعنی

رائے اور مائرہ کے ساتھ اندرونی حصے میں چلی گئی اور طامبورہ میں کھانے پینے کا دور شروع ہوا۔ بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت، نمکین پنیر...... ساتھ مقامی طور پر بنائی گئی نارنجی رنگ کی شراب پی گئی اور اتنی پی گئی کہ سب بدمست ہو گئے۔ کئی عورتیں سرِعام اپنے باکروں (شوہروں) اور دوستوں کے ساتھ بوس و کنار میں مصروف رہیں۔ ایک جواں سال عورت نے اتنی پی کہ وہ ہنستے ہنستے شدتِ جذبات میں رونا شروع ہو گئی۔ تب وہ روتے روتے چبوترے پر چڑھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ''اِک تارا'' قسم کا ساز تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے تبتی زبان میں کوئی درد بھرا گیت گانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز میں واقعی سوز تھا۔ اس کا گیت سن کر چند اور مرد و زن بھی اشکبار ہو گئے۔

منوہر کچھ دیر مزید سنتا رہا تب بولا۔ ''جوانی میں یہ بہت خوب صورت تھی۔ ایک لداخی نوجوان سے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ بھی اسے چاہتا تھا۔ ایک عرصے تک وہ ایک دوسرے سے اظہارِ محبت نہ کر سکے۔ آخر ایک روز اس عورت نے جو تب لڑکی تھی، ہمت کی۔ اپنے محبوب کے پیچھے طویل سفر کر کے کارگل گئی۔ وہاں پہنچ کر اسے پتا چلا کہ وہ نوجوان اس کی جدائی میں چند ہفتے بیمار رہنے کے بعد صرف ایک روز پہلے آخری سانسیں لے چکا ہے۔ یہ اس کی یاد میں گاتی ہے۔ یہاں کے لوگ اسے شوق سے سنتے ہیں۔''

نجانے کیوں، عمران کی طرف دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ ایک دم چپ سا ہو گیا ہے۔ ایک گہرا کرب اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگا تھا۔ مجھے عمران کے رازداں دوست ضیا کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا...... کوئی نہیں جانتا کہ عمران، ماہین کو کتنی شدت سے چاہتا ہے......

عمران نے مجھے خود کو گھورتے دیکھا تو ایک دم نارمل نظر آنے لگا۔ اپنے تاثرات چھپانا اسے خوب آتا تھا۔

کچھ دیر بعد تقریب تو ختم ہو گئی مگر اس کے اثرات جابجا نظر آتے رہے۔ مقامی شراب کے نشے میں دھت ہو کر مرد و زن اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ کچھ جسمانی تقاضوں سے مجبور ہو کر کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ الکحل جیسی تیز بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ایک قدرے فربہ عورت دو مردوں کے کندھوں پر سوار تھی اور وہ تینوں ہی ناچ رہے تھے۔ ایک جواں سال لڑکی مستی میں آ کر کپڑوں سے بالکل باہر ہو گئی تھی۔ چار پانچ مرد اس کے اردگرد تھے اور جنس زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ منتظر تھے کہ وہ اس ''حالتِ مستی'' میں کس پر اپنی نگاہِ التفات ڈالتی ہے۔

ہم اپنے برفانی گھروندا نما کمرے میں واپس آ گئے۔ میں اور عمران ایک ہی جگہ سوتے تھے۔ عمران کچھ گم صم سا تھا۔ پڑتے ہی سو گیا۔ میں برفیلی دیوار پر لگے ایک غالیچے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ ہلکی غنودگی بھی تھی۔ ایک بار پھر وہی ہوا جو پہلے بھی ہوتا آیا تھا۔ عمران دانش ایک دم میرے سامنے آن بیٹھا۔ کاٹرائے کی گہری براؤن پتلون۔ آدھی آستینوں والی سفید شرٹ۔ کلیوں جیسے دانت لشکارے مارتے ہوئے۔ پچھلے پندرہ سولہ برسوں نے اس کا کچھ بھی تو نہیں بگاڑا تھا۔

''کیسے ہو جگر؟'' اس نے مخصوص لہجے میں کہا۔

میرے دل سے آہ سی نکلی۔ اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں گئے تھے تم؟ نہ جاتے۔ زخمی ہو گئے تھے تو سنبھل جاتے۔ واپس آ جاتے...... کتنا اچھا ہوتا، ہم دونوں آج بھی کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہوتے۔ ایک ساتھ خطروں سے کھیل رہے ہوتے۔ اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا رہے ہوتے۔ جیت رہے ہوتے اور مسکرا رہے ہوتے۔''

''تو اسی لیے تو بھیجا ہے تمہارے پاس اپنے بیٹے کو۔ سمجھو میری ہی تصویر ہے میری ہی روح ہے۔''

''نہیں عمران! بہت فرق ہے تجھ میں اور اس میں۔ وہ تیرا بدل نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، بدل نہیں ہے لیکن بہت فرق بھی تو نہیں اور جو فرق ہے وہ بھی نکل جائے گا۔ دیکھنا ایک دن، تم اسے مجھ جیسا ہی پاؤ گے...... تمہیں یہی اعتراض ہے نا کہ وہ ضرورت سے زیادہ جوشیلا ہے۔ لڑائی بھڑائی میں بہت طاق نہیں ہے اور پھر عشق بھی فرمانے لگا ہے۔''

''تو کیا، یہ سب غلط ہے؟''

''نہیں، بالکل ٹھیک ہے مگر یہ ایسی خامیاں نہیں جو دور نہ ہو سکیں۔ تیرے ساتھ رہے گا تو جوشیلا پن کم ہو جائے گا۔ لڑائی بھڑائی کی کمی تم پوری نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا؟ پیارے! دیے سے دیا جلتا ہے۔ تمہیں باروندا جیکی نے شیشے سے فولاد بنا کر اس فن میں طاق کیا، تم اپنے اس بھتیجے کو کرو۔ وہ بھی تم سے میری ہی طرح محبت کرتا ہے۔ تمہارے پسینے پر خون گرا سکتا ہے۔ میں نے کہا ہے نا وہ میری ہی روح ہے، میرا ہی ڈی این اے ہے۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے اس ظالم کو دیکھتا رہا جو میرے سامنے بیٹھا تھا لیکن درمیان میں لامحدود فاصلے حائل تھے۔

اس کے سرخی مائل ہونٹوں پر ایک موہوم، اداس مسکراہٹ ابھری بولا۔ ''رہی بات اس کے عشق و محبت کی..... تو جگر! یہ کوئی عام جذبہ نہیں ہے، اور نہ ہی سطحی ہے..... سچ پوچھو تو یہ اسی انمول جذبے کا پرتو ہے جو برسوں پہلے شبانہ کی نسبت سے میرے اندر آناً فاناً نمودار ہوا تھا۔ تو جانتا ہے کہ مجھے کبھی بھی لڑکیوں کی کمی نہیں تھی، ایک سے بڑھ کر ایک اردگرد گھومتی تھیں۔ ان میں سے کئی شبانہ سے کئی گنا بڑھ کر دلکش تھیں مگر جب شبانہ کو دیکھا تو یہی لگا کہ جنم جنم سے اس چہرے کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ من و عن یہی کچھ تیرے اس بھتیجے کے ساتھ ہوا ہے..... من و عن اور ہو بہو۔ بس دعا کر انجام ہو بہو نہ ہو۔''

میں نے موضوع بدلا۔ ''تجھے دنیا سے گئے برسوں بیت گئے مگر شاہین تجھے اب بھی یاد کرتی ہے۔ تیرے نام پر اس کے چہرے پر اداسیاں ڈیرے ڈالتی ہیں جس طرح مجھے ملتا ہے کیا کبھی اسے بھی ملا ہے؟''

وہ مسکرایا۔ کلیوں جیسے ہموار دانت چمک گئے۔ ''میں کوئی بھٹکی ہوئی روح نہیں ہوں کہ ہر جگہ جاتا پھروں۔ یہ تو تیرے ساتھ ایک انوکھا تعلق ہے..... ایک غیر مرئی رشتہ ہے..... جو تیرے سامنے لے آتا ہے۔''

میں عجب اُلجھن کے عالم میں تھا۔ اس سے پوچھا۔ ''کیا تم..... جو میرے سامنے ہو، صرف میرا تصور ہو؟''

وہ بلند آواز میں ہنسا۔ ''تصور ہوتا تو وہی کچھ کہتا جو تمہارے ذہن میں ہے۔ کیا میں تمہارے خیالات بول رہا ہوں۔''

میرے دل سے ہوک اٹھی۔ وہ آخری لمحے یاد آئے جب وہ بند آنکھوں کے ساتھ، تابوت میں لیٹا تھا۔ میرا دل چاہا آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لوں۔ اپنے ساتھ بھینچ لوں۔ اپنے بے پناہ جذبے کی حدت سے اس شہزادے کو زندہ کر دوں۔ ''کیا میں تمہیں چھو سکتا ہوں؟'' میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''یہ ممکن ہوتا تو میں کب کا تمہیں چھو چکا ہوتا۔''

میں جھلا کر اس کی طرف بڑھا..... وہ اوجھل ہو چکا تھا۔ میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ دیر تک اس پہیلی کے بارے میں سوچتا رہا جو گاہے بگاہے عمران دانش کے روپ میں میرے سامنے آتی رہتی تھی..... سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

رات تیسرے پہر آنکھ کھلی۔ کہیں دور حسب معمول پالتو بھیڑیوں کی ہاؤلنگ سنائی دے رہی تھی، کیروسین لیمپ کی مدھم روشنی میں مجھے لگا کہ عمران اپنی جگہ پر نہیں ہے۔

''عمران..... عمران.....'' میں نے دو تین بار آواز دی پھر اٹھ کر اسے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ میں نے اردگرد کے گھروندوں میں جھانکا۔ حشام، گونگا جہاناں، انچارج گارڈ بہروز، ہما عروج سب اپنی اپنی جگہوں پر موجود تھے۔ یکایک مجھ پر انکشاف ہوا کہ ماہین، ہما عروج کے ساتھ موجود نہیں ہے۔

وہ کہاں تھی؟ کہیں وہ اور عمران دونوں باہر تو نہیں نکلے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ماہین تو عمران سے کھل کر بات بھی نہیں کرتی تھی۔ اسے ہر وقت حشام کی ناراضگی کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ عمران خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ حشام کو پھر سے بگڑنے اور بھڑکنے کا موقع ملے۔

میں نے اپنی بھاری بھرکم جیکٹ پہنی۔ اس کا ہُڈ سر پر جمایا۔ دستانے چڑھائے اور باہر جانے کا سوچا۔ شراب نوشی کے اثرات غار کے تقریباً سب ہی مکینوں پر حاوی تھے۔ راہداریوں میں بھی مرد و زن آڑے ترچھے سو رہے تھے۔ شاید کچھ ابھی تک برفیلے کمروں کی نیم گرم تاریکی میں جاگ بھی رہے ہوں اور ایک دوسرے کو اپنی محبت کا یقین دلا رہے ہوں۔ اچانک مجھے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا برفیلی سرنگ نما راہداری میں کوئی تیزی سے میری طرف آ رہا تھا۔ وہ ایک دیوار گیر لیمپ کے قریب سے گزرا تو میں ششدر رہ گیا۔ وہ ماہین تھی اس کے جسم پر بھاری سرخ جیکٹ موجود تھی لیکن ٹوپی نہیں تھی سر پر..... اس کے لمبے بال لہرا رہے تھے۔ پاؤں میں برف پر چلنے والے بوٹ تھے جن کی دھمک عام بوٹوں سے مختلف تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھی میری طرف آئی۔ بے حد ہانپی آواز میں بولی۔ ''انکل تابی، وہ خطرے میں ہے۔ جلدی چلیں۔''

''کون؟ عمران؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں نے..... بڑی مشکل سے اسے بچایا ہے..... لیکن پھر کوئی اور آ جائے گا..... اسے مار ڈالے گا۔''

ماہین کی آواز سن کر بہروز اور حشام وغیرہ بھی جاگ گئے تھے۔ ماہین کے ایک ہاتھ اور چہرے پر تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔ سخت سردی کے سبب اس کی ناک بالکل سرخ ہو رہی تھی۔ ماہین سے سوال جواب کا وقت نہیں تھا۔ ہم اس کے عقب میں چلتے تیزی سے اس وسیع غار کے دہانے کی طرف لپکے۔ مدہوش مکینوں کے جسموں کو پھلانگتے ہم باہر آئے تو سردی کی برچھیوں نے جسم کے کھلے حصوں پر

بے رحم وار کیے۔ بے شک یہ وار بے رحم تھے مگر مجھ پر اتنا اثر نہیں کر رہے تھے جتنا دوسروں پر (بہت عرصہ پہلے میں نے سردی گرمی کو جھیلنا سیکھ لیا تھا) آسمان بالکل صاف تھا اور چاندنی میں اس برفستان کے نشیب و فراز دور دور تک صاف دکھائی دیتے تھے۔ دہانے کے پاس ہی ایک محافظہ سوئی پڑی تھی۔ میں نے اس کی رائفل اور ٹارچ اٹھالی۔ ایک ڈھلوان پر چڑھ کر ہم دوسری طرف اتر گئے۔

بھاگتے بھاگتے ماہین بولی۔ ''وہ شکنجے میں ہے۔ اس کا پاؤں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔ ورنہ شاید وہ اپنے ساتھ یہ سب نہ ہونے دیتا۔''

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس پر حملہ کیا گیا ہے...... وہ زخمی ہے۔''

''کس نے کیا ہے؟''

''ٹھیک سے کچھ پتا نہیں......'' وہ بھاگتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔ قریباً ایک فرلانگ آگے آکر ہم ایک کھائی میں اترے اور پھر سنبھل سنبھل کر ایک کھوہ میں داخل ہو گئے۔ ماہین نے ٹارچ میرے ہاتھ سے لے لی اور احتیاط سے اپنے قدموں کے نشان دیکھنے لگی۔ ''انکل تابی! بڑے دھیان سے۔ آپ اِن نشانوں کے اوپر ہی چلیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

ہم نے ماہین کی ہدایت پر عمل کیا۔ کچھ آگے گئے تو ٹارچ کی روشنی میں تحیّر خیز منظر نظر آیا۔ یہاں عمران چت پڑا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون برف پر دکھائی دے رہا تھا۔ عمران کے قریب ہی پانچ چھ فٹ کی دوری پر ہمیں ایک چوڑی چکلی جنگجو عورت نظر آئی۔ وہ بے ہوش تھی اور اوندھی پڑی تھی۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر گہری چوٹ اور خون کے نشانات تھے۔ کھوہ کے اندرونی حصے کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ یہاں کافی جدوجہد ہوئی ہے۔

میں عمران کی طرف لپکا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے جسم پر ڈالی۔ اس کا دایاں پاؤں لکڑی کے ایک وزنی شکنجے میں تھا۔ شکنجے کے ساتھ لوہے کی ایک زنگ آلود زنجیر بھی نظر آ رہی تھی۔ بہرحال پاؤں زیادہ زخمی نہیں تھا۔ اصل زخم اس کے سر پر تھا۔ یہاں غالباً اُلٹی کلہاڑی کا کندوار کیا گیا تھا۔ وہ چت پڑا تھا۔ اس کے دونوں بازو دونوں اطراف میں آہنی میخوں سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ ویسی ہی میخیں تھیں جو کوہ پیما برف میں گاڑتے ہیں۔ عمران کا لباس سامنے سے چاک کر دیا گیا تھا۔ بلا کی سردی میں اس کا سینہ ناف تک بالکل عریاں نظر آتا تھا۔

''عمران...... عمران......'' میں نے اُسے پکارا اور اس کے گال تھپتھپائے۔

وہ کراہا۔ ''پریشان نہ ہوں...... میں ہوش میں ہوں۔ مم...... ماہین کہاں ہے؟''

''یہ سامنے کھڑی ہے۔ یہی ہمیں یہاں لے کر آئی ہے۔''

عمران نے سر اٹھا کر ماہین کو دیکھنے کی کوشش کی مگر سر کی چوٹ کی وجہ سے کراہ کر رہ گیا۔ ''ماہین نے میری بڑی مدد کی ہے۔'' وہ بولا۔ ''ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔'' پھر حسبِ عادت اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری، کہنے لگا۔ ''یہ شکنجہ یقیناً کسی جانور کے لیے ہی لگایا گیا تھا۔ بڑی حق تلفی ہوگئی ہے اس بے چارے جانور کی۔''

''حق تلفی تو تمہاری ہوئی ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''مگر...... تم یہاں پائے کیسے جا رہے ہو، تم تو میرے ساتھ سوئے ہوئے تھے...... اور یہ سر کی چوٹ۔ اچھا بھلا زخم ہے......''

میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ اس کے سر پر مرکوز کیا۔ بے پناہ سردی کی وجہ سے خون زیادہ نہیں بہا تھا ورنہ زخم اچھا خاصا تھا۔ میری نگاہ پہلو میں کھڑے حشام پر پڑی۔ اس کی نگاہوں میں عمران کے لیے ہمدردی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ حالانکہ باقی سب مضطرب نظر آتے تھے۔ غالباً وہ اس ساری صورتِ حال پر جھنجلایا ہوا تھا، کیونکہ اس صورتِ حال کے مرکزی کردار عمران اور ماہین تھے۔

ہمارے پیچھے ہی پیچھے سردار محافظہ ڈولما بھی اپنی چند ساتھیوں کے ہمراہ پہنچ گئی تھی۔ اس نے منوہر سنگھ کو بتایا کہ لکڑی کی موٹی شاخوں کا بنا ہوا یہ شکنجہ یہاں بتی بھیڑیے یا آئی بیکس کو پکڑنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شکر کا مقام ہے کہ ٹانگ معمولی زخمی ہوئی ورنہ یہ ٹوٹ سکتی تھی۔ ڈولما نے اپنی دو ساتھیوں سے مل کر یہ خاص قسم کا چوبی شکنجہ عمران کے پاؤں سے علیحدہ کیا۔ اس کے ہاتھ کھولے گئے۔ اس دوران میں ماہین نے ہمیں بتایا کہ یہ سامنے پڑی عورت اس کے ہاتھوں بے ہوش ہوئی ہے۔ اس نے وزنی ڈنڈے کی دو شدید ضربیں اس کے سر پر لگائی تھیں۔ ماہین نے یہ بھی بتایا کہ ایک اور عورت تھی جو فرار ہو گئی ہے۔

ماہین نے اپنی سرخ جیکٹ کے اندر سے قریباً دو فٹ لمبی کٹار نکال کر ڈولما کو تھمائی اور اشاروں سے اسے بتایا کہ یہ اس عورت کی ہے جو سامنے بے ہوش پڑی ہے۔

پنڈلی سے عمران کی کھال چھل گئی تھی اور خون رِس رہا

تھا۔ ڈولما کے حکم پر دو پہلوان نما مرد محافظوں نے عمران کے لیے اپنے ہاتھوں کی کرسی بنائی تا کہ اسے اٹھا کر کھوہ سے باہر لے جایا جا سکے مگر عمران نے منع کر دیا۔

”ٹھہریں، میں ابھی یہاں کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ ہمت کر کے اٹھا اور لنگڑاتا ہوا کھوہ کے آخری حصے کی طرف بڑھا۔ ہم اس کے پیچھے تھے۔ ایک جگہ کلہاڑی نظر آئی لیکن یہ پوری کلہاڑی نہیں تھی بلکہ صرف اس کا پھل تھا۔ ہم ایک خم سے گزرے۔ ٹارچوں کی روشنی میں ایک طرف کچھ کچی برف نظر آئی۔ جیسے وہاں سے پتھریلی برف کھودی گئی ہو۔ عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ان عورتوں نے یہاں کچھ دبایا ہے۔“

میں نے منوہر سے کہا۔ ”ڈولما کو بتاؤ کہ عمران کے خیال میں یہاں کچھ چھپایا گیا ہے۔“

منوہر کی بات سننے کے بعد چاق چوبند ڈولما نے دائیں بائیں ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ اسے برف کھودنے والی ایک چھوٹی کدال نظر آگئی۔ ڈولما کی ہدایت پر دو محافظ عورتوں نے تیزی سے کچی برف ہٹانی شروع کی اور پھر سب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

جو سب سے پہلی شے نظر آئی وہ لوہے کا ایک صندوقچہ تھا۔ کدال کی ضرب سے اس کا قفل توڑا گیا۔ ڈھکنا کھلتے ہی سب سے اوپر وہ شاندار پسٹل دکھائی دیا جس کا دستہ سونے کا تھا۔ یہ ان دو پسٹلز میں سے ایک تھا جو آج شام کی تقریب میں جادو رامے نے مایا رانی اور اس کی والدہ کو پیش کیے تھے۔ لوہے کے اس صندوقچے میں جو دیگر اشیا تھیں۔ ان میں دو رسٹ واچ، چند زیور، کچھ انڈین نقدی، ولایتی شراب کی دو بہت قیمتی بوتلیں اور اس طرح کی دیگر اشیا شامل تھیں۔ پلاسٹک کے دو بڑے تھیلوں میں کچھ گندم بھی یہاں چھپائی گئی تھی (اس علاقے میں اناج کی بہت قدر و قیمت تھی)

”یہ سب کیا ہے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

عمران بولا۔ ”میں آپ کے پاس ہی لیٹا ہوا تھا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے اردگرد سب ہی مدہوش پڑے تھے۔ حتیٰ کہ آپ بھی بن پیے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ مجھے یہ دو محافظ عورتیں مشکوک حالت میں نظر آئیں۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ ان میں سے ایک نے کوئی چیز اپنے لبادے میں چھپائی ہے۔ میں ان دونوں کا پیچھا کرنے سے باز نہیں رہ سکا...... اور ان کے پیچھے ہی پیچھے یہاں تک پہنچ گیا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ یہاں کیا ناگہانی آفت مجھ پر ٹوٹ پڑے گی۔ میرا پاؤں اس چوبی پھندے میں اس بُری طرح پھنسا کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ پھندے کے بند ہونے سے جو کھٹکا پیدا ہوا اس نے ان دونوں عورتوں کو بھی ہوشیار کر دیا۔ پہلے تو مجھے یہی لگا کہ پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے......“

میں نے ٹارچ کی روشنی پھر عمران کے ٹخنے پر ڈالی۔ بہت بری طرح چھلا ہوا تھا مگر ہڈی یقیناً بچ گئی تھی۔ ڈولما نے اسے کندھے سے تھاما اور بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ وہ ذرا کراہ کر بیٹھ گیا۔ ڈولما نے اس کے ٹخنے پر ایک پاؤڈر سا چھڑکا اور پٹی بندھوائی۔ ساتھ ساتھ عمران بتاتا بھی رہا کہ یہاں کیا ہوا......

اس کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ نشے میں ٹُن ان دونوں عورتوں کی نیت عمران کے لیے خراب ہو چکی تھی۔ عین ممکن تھا کہ بعدازاں وہ اسے مار ہی ڈالتیں یا پھر کسی ایسی نامعلوم جگہ پھینکتیں جہاں اس کا کھوج لگانا ناممکن ہو جاتا۔ عمران ترنوالہ ہرگز نہیں تھا لیکن یہاں اتفاقاً سچویشن ہی ایسی بن گئی تھی کہ وہ بے بس ہو گیا تھا۔ دونوں عورتیں جان گئی تھیں کہ عمران ان کی چوری سے آگاہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے عمران کو خیر کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس نے قریب سے گزرنے والی ایک عورت کی ٹانگ پکڑنا چاہی تو دوسری نے چھوٹے دستے والی کلہاڑی الٹی جانب سے اس کے سر پر ماری۔ یہ کند ضرب اتنی شدید تھی کہ کلہاڑی کا پھل اتر کر دور جا گرا اور عمران کی آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا چھا گیا۔ بعد کے حالات ہمیں یہاں کی زمینی شہادتوں سے ہی معلوم ہو رہے تھے۔ عمران کے بازو بھی باندھے گئے تھے، اسے بالائی لباس سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ان حیوان صفت برفانی عورتوں نے عمران کے جسم پر شراب انڈیل کر اسے چاٹا تھا اور اسے بھی زبردستی پلانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ یہی وقت تھا جب ماہین بے خوفی کا مظاہرہ کرتی ہوئی عمران کے پیچھے ہی پیچھے یہاں پہنچی تھی۔ اس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس کی نگاہ پختہ لکڑی کے اس موٹے دستے پر پڑی جو کلہاڑی کے پھل سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس نے یہ دستہ اٹھایا اور عقب سے پوری قوت کے ساتھ ایک عورت کے سر پر دے مارا۔ وہ وہیں بے دم ہو کر گر پڑی۔ دوسری نشے میں چُور چنگھاڑ کر ماہین پر حملہ آور ہوئی اور یہیں پر ماہین کی وہ مہارت کام آئی جو وہ مارشل آرٹ میں رکھتی تھی اور کبھی کبھی اس کا مظاہرہ بھی کر گزرتی تھی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ان سنگین لمحوں میں اس مہارت سے زیادہ ماہین کے اس

جذبے نے کام کیا جو اس کے اندر موجزن ہوا تھا اور جس کا مقصد عمران کو بچانا تھا۔ وہ دیوانہ وار اس جنگجو عورت سے بھڑ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کاری ضربیں لگائیں۔ جنگجو وسخت جان عورت کو یقیناً ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہ بظاہر اسمارٹ اور نازک سی لڑکی اسے یوں ''ٹف ٹائم'' دے گی۔ اس کا تھوبڑا لہولہان ہو چکا تھا اور نشہ بھی ہرن ہو رہا تھا...... تاہم وہ اندھا دھند مُکّے چلا رہی تھی۔ اس کا ایک مُکا کھا کر ماہین بے ہوش عورت کے قریب گری تو اسے موقع مل گیا۔ ماہین نے بے ہوش عورت کے پہلو سے دو فٹ لمبی کٹار کھینچ لی۔

ماہین کے ہاتھ میں یہ تیز دھار ہتھیار اور ماہین کا اشتعال دیکھنے کے بعد وہ عورت یک دم بھاگ کھڑی ہوئی۔ ماہین نے پہلے خود عمران کا پاؤں پھندے سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ ناکام ہوئی تو دوڑتی ہوئی واپس آئی اور میرے پاس پہنچ گئی۔ یہ تھی اب تک کی تمام صورت حال۔

سردار محافظہ ڈولما اور دوسری مسلح عورتیں بھی قدرے حیرت سے ماہین کو دیکھ رہی تھیں جیسے یقین نہ کر پا رہی ہوں کہ ماہین نے ہی ان دونوں چور عورتوں کو دھول چٹائی ہے یا یوں کہا جائے کہ برف چٹائی ہے۔ ماہین کو بھی معمولی مرہم پٹی کی ضرورت تھی مگر وہ ابھی غار میں واپس جانا چاہتی تھی۔ ڈولما نے مفرور مجرمہ کی تلاش میں مسلح عورتوں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ برف کے گڑھے میں سے مسروقہ اشیا مع بیش قیمت طلائی پسٹل کے، نکالی گئیں اور انہیں ایک بڑی گٹھڑی میں جمع کیا گیا۔

☆☆☆

صبح ہونے تک یہ خبر پورے قبیلے میں پھیل چکی تھی کہ رات کو کیا ہوا ہے (بے ہوش ہونے والی عورت چل بسی تھی) پتا چلا کہ مایا رانی سخت طیش میں ہے اور کثرتِ مے نوشی کے سبب فرائض میں غفلت برتنے والوں کے خلاف تادیبی کارروائی کا ارادہ رکھتی ہے۔ چوری ہونے والا بیش قیمت پسٹل مایا کی والدہ والا تھا۔ معلوم ہوا کہ دوسری عورت پکڑی جا چکی ہے۔ اس نے نہ صرف چوری تسلیم کی ہے بلکہ یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ نشے نے ان دونوں کی عقل خبط کر رکھی تھی اور وہ عمران سے ''بدسلوکی'' کا ارادہ رکھتی تھیں۔ اس نے صرف بدسلوکی کے ارادے کا اعتراف کیا تھا لیکن مجھے اور ماہین کو یقین تھا کہ وہ عمران کو جانی نقصان بھی پہنچا سکتی تھیں۔ ان کی بے رحمی قابلِ ذکر تھی، پھندے میں پھنسے ہوئے اک زخمی کی مدد کے بجائے انہوں نے اس کے کپڑے چاک کیے، اسے زبردستی شراب پلانے کی کوشش کی اور اس سے بدسلوکی کا ارادہ کیا۔

میری اور عمران کی توقع کے عین مطابق، دوپہر سے ذرا پہلے ماہین کے لیے مایا رانی کا بلاوا آ گیا۔ یقیناً ماہین کے دلیرانہ رویّے نے مایا کو بھی متاثر کیا تھا اور وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ ماہین قریباً دو گھنٹے تک وہاں رہی۔ ایک مترجم ملازمہ کے ذریعے اس نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ماہین سے دوستانہ گفتگو کی۔ پسٹل کی بازیابی پر خصوصی شکریہ بھی ادا کیا۔

یہ سب کچھ تو بہت اچھا ہوا لیکن اگلے ہی روز اس کا ایک برا پہلو بھی سامنے آ گیا۔ میں اپنے برفیلے گھروندے میں بیٹھا عمران کے ٹخنے کی چوٹ دیکھ رہا تھا۔ ٹخنا کافی بہتر تھا۔ سر پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تمہارے اندر تجسس کا مادہ ہے اور دلیری بھی بے شک ہے...... لیکن اپنے باپ جیسی چوکسی شاید نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے تمہاری جگہ وہ ہوتا تو اس طرح پھندے میں نہ پھنستا۔''

''اسے ناگہانی آفت کہتے ہیں چاچو جان، کسی کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ کے ساتھ رہنے کا موقع ملتا رہا تو اپنی یہ کمی بھی پوری کر لوں گا۔''

''تو گویا کچھ اور کمیاں بھی ہیں تم میں؟''

''کوئی ایک ہی ہو تو بتاؤں جی۔ دیکھیں، دل میں عجیب عجیب خواہشیں سر اٹھاتی ہیں۔ کبھی یہ چاہتا ہے کہ چار پانچ گول مٹول بچوں کی بیوہ ماں مجھ پر عاشق ہو جائے اور میں بغیر محنت کیے بچوں کا پاپا بن جاؤں۔''

''خدا کا خوف کرو۔ مہنگائی کا دور ہے...... اور شام کا وقت ہے۔ شام کے وقت ایسی باتیں نہیں کرتے پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ پہلے بھی تم نے ایک ایسی ہی بات کی تھی نا، دیکھو پوری ہو گئی۔''

''کون سی بات؟''

''لاہور میں تم نے بکواس فرمائی تھی نا کہ تمہارا دل چاہتا ہے کہ کسی دولت مند جوان عورت کے ہاتھوں اغوا ہو جاؤ۔ ہو گئے نا اغوا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اغوا کے ساتھ ساتھ مقتول بھی ہو جاتے۔''

عمران نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''وہ عورتیں کہاں تھیں جی، بھوتنیاں تھیں بھوتنیاں اور ان کی جو دولت تھی وہ بھی ظاہر ہے چوری کی تھی۔ اغوا ہونے کا سارا مزہ کرکرا کر دیا بدبختوں نے......''

اتنے میں ماہین آتی دکھائی دی۔ عمران جلدی سے اٹھ گیا۔ "میرا خیال ہے جی، میں باہر کا ایک راؤنڈ لگا آؤں۔"

وہ اٹھا۔ ماہین سے سلام دعا کی اور لنگڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ ماہین اندر آ گئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہے۔ چہرہ مکدّر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ حشام کے ساتھ پھر کوئی بات ہوئی ہے۔

"کیا ہوا اب؟"

"کچھ بھی نہیں جی۔ بس حشام کچھ ناراض...... کچھ چپ سا لگ رہا ہے۔"

"وہی کل رات والی بات؟" میں نے پوچھا۔

"شاید......"

"ویسے تم نے بھی غلطی کی ماہین، تمہیں کسی بھی مہم جوئی سے پہلے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ تمہاری ٹانگ کے ساتھ اب بھی بارودی مواد موجود ہے۔ بھاگ دوڑ اور بار اماری میں وہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر تمہیں عمران کے حوالے سے کوئی شک ہوا تھا تو مجھے جگا دیتیں۔ میں دیکھ لیتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "بس اُس وقت، ذہن اس طرف گیا ہی نہیں...... اور ایک طرح سے...... یہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا انکل تابی۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس نے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اُڑسی۔ دیوار سے ٹیک لگائی اور بولی۔ "عمران کا ایک احسان تھا مجھ پر...... اور یقین کریں، میں اس کا بوجھ محسوس کرتی ہوں۔"

"کون سا احسان؟"

"ماشر بروم کے پہاڑ پر جب میرے کمرے میں آگ بھڑکی تھی اور دروازہ ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے میں پھنس گئی تھی...... عمران نے خود کو خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی تھی۔ ایک طرح سے کل رات حساب برابر ہو گیا۔ یقین کریں ایک بوجھ تھا میرے دل پر جو اتر گیا۔ میں نے یہی بات حشام کو بھی بتائی ہے، میرا خیال ہے کہ وہ سمجھ جائے گا۔"

...... ماہین کا خیال تھا کہ حشام سمجھ جائے گا...... بلکہ اچھا محسوس کرے گا کہ ماہین نے عمران کا کوئی احسان اپنے سر پر نہیں رکھا...... مگر ایسا ہوا نہیں۔ اگلے روز صبح سویرے اس کے بالکل الٹ ہوا۔

میں سویا ہوا تھا، عمران نے میرا کندھا ہلا کر مجھے جگایا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ "کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"حشام پھر ماہین سے جھگڑا کر رہا ہے۔"

اب میں نے بھی جھگڑے کی آوازیں سن لیں۔ جس کمرے میں ماہین اور ہما قیام پذیر تھیں، یہ آوازیں اسی کمرے سے آ رہی تھیں۔ حشام گرج رہا تھا۔ "تم نے خود کو سخت خطرے میں ڈالا۔ اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ کس لیے...... کس کے لیے؟ مجھ سے مشورہ تک کرنا ضروری نہ سمجھا تم نے...... بس منہ اٹھا کر چلی گئیں۔ اب میں کیا سمجھوں اس کو...... کیا سمجھوں؟" آخری الفاظ اس نے اتنی بلند آواز میں کہے کہ برفیلے در و دیوار..... دور تک گونج گئے۔

"حشام میں نے تمہیں بتایا ہے......"

"چپ ہو جاؤ۔" وہ اس کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ "جب تمہیں پتا ہے کہ وہ ہم دونوں کے تعلق کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے، تم کیوں دن رات اس کے لیے ہمدردیاں پال رہی ہو؟ کیوں مجھے کانٹوں پر گھسیٹتی ہو؟ کیا چاہتی ہو تم؟" وہ چلّایا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ اس نے حسبِ سابق ماہین کو تھپڑ جڑ دیا ہے۔

عمران نے جیسے تڑپ کر اُن کی طرف جانا چاہا۔ میں نے اسے پکڑ کر روک لیا۔ "نہیں عمران، مزید تماشا لگ جائے گا...... میں دیکھتا ہوں۔"

میں لپک کر وہاں پہنچا۔ حشام مسلسل چنگھاڑ رہا تھا۔ ہما عروج اس کے اور ماہین کے درمیان آ گئی تھی۔ پھر حشام نے طیش کے عالم میں ماہین کا کیمرا دیوار پر پٹخ کر توڑنا چاہا، میں نے اسے روک لیا۔

"چھوڑ دیں مجھے۔" وہ کراہ کر بولا۔ پھر اُس نے غصیلے انداز میں پتھریلی برف کی دیوار پر دو مکّے برسائے اور اپنا ہاتھ چھیل کر رکھ لیا۔ تب وہ پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ ماہین کا گال سرخ ہو رہا تھا۔

اسی روز شام کو ماہین کو تیز بخار ہو گیا۔ ہما ساری رات اس کی پیشانی پر پٹیاں کرتی رہی۔ صبح مجھ سے کہنے لگی۔ "ڈپٹی جی، مجھے ایک بات تو بتاؤ۔ یہ ماہین وچاری کس چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔ کسی وقت لگتا ہے کہ وہ حشام سے پیار کرتی ہے اور عمران سے ہمدردی رکھتی ہے۔ پر کسی ویلے ایسا بھی لگتا ہے کہ وہ عمران سے پیار کرتی ہے اور حشام سے ہمدردی رکھتی ہے اور پھر اس حشام کو دیکھو۔ ابھی اس کا شوہر بنا نہیں ہے اور پہلے ہی اس کے سر پر چڑھ کر ناچنے لگ پڑا ہے۔"

''بس ایسے ہی رویے ہوتے ہیں نا جو آہستہ آہستہ رشتوں میں بھی تبدیلی لے آتے ہیں۔''

''یہ گل بالکل ٹھیک ہے، کسی ویلے تو مجھے لگتا ہے کہ خود ماہین کو بھی اپنے آپ کی سمجھ نہیں آرہی۔ اوپر سے حشام کا بھیڑا سلوک اسے اور بددل کررہا ہے۔ وہ بڑی سچل کڑی ہے۔ یہاں ہر کوئی اس کی تعریف کررہا ہے...... سوائے حشام کے۔''

جادورائے اور میم مائرہ سفر کے لیے بہت سی ادویات بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے (ان کا کام ہی میڈیسن کا تھا) میم مائرہ کے مشورے پر دو روز ماہین کو دوا دی گئی مگر اس کا بخار ٹوٹنے میں نہیں آرہا تھا۔ تیسرے روز مایارانی نے ایک مقامی معالجہ کو ماہین کی طرف بھیجا۔ یہ پودوں کی جڑوں اور پتوں وغیرہ سے علاج کرتی تھی۔ اس کا نام گندھارا تھا۔ یہ چھ سات مہینے کی حاملہ نظر آتی تھی۔ بال بکھرے بکھرے تھے۔ عجیب چیز یہ نظر آئی کہ اس کے پاؤں میں بیڑی کی طرح کی ایک زنجیر تھی اور وہ بمشکل چل پاتی تھی۔

منوہر سنگھ نے بتایا۔ ''یہ وہ تیسری مجرمہ ہے جو سکامر کو بھگانے کے اپرادھ میں ہرپتی کے ساتھ شریک تھی۔ اسے زندہ جلانے کی سزا اس کارن نہیں دی گئی کہ یہ پیٹ سے ہے۔ جب یہ بچے کو جنم دے لے گی تو قبیلے کے قانون کے مطابق اسے بھی مار دیا جائے گا۔''

میں نے جواں سال عورت کی طرف دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔

منوہر بولا۔ ''بوڑھی ماتا اور رانی کے علاوہ یہ واحد ناری ہے جو کسی حد تک ہندی وغیرہ سمجھتی ہے۔''

ہمیں اندیشہ تھا کہ پتا نہیں یہ ماہین کو کیا الا بلا کھلائے گی۔ لیکن شام تک جب ماہین کو کچھ افاقہ محسوس ہوا تو ہمارے اندیشوں میں بھی کمی واقع ہوگئی۔ وہ دو دن تک ماہین کو کوئی سوپ قسم کی چیز پلاتی رہی۔ ساتھ ایلوپیتھک دوا بھی جاری رہی۔ ایک روز مایارانی خود بھی ماہین کو دیکھنے آئی۔ گمشدہ اشیا بازیاب کرانے میں عمران اور ماہین نے جو کردار ادا کیا تھا، اس پر مایارانی دونوں کی بہت مشکور نظر آتی تھی۔ خصوصاً ماہین کے لیے وہ انس محسوس کررہی تھی۔ اس کی دلیری نے بھی مایا کو متاثر کیا تھا۔

ماہین کی طبیعت بہتر ہوئی تو مایارانی اسے اپنے ساتھ اپنی رہائش گاہ پر ہی لے گئی۔ مایارانی اور اس کی والدہ کا خیال تھا کہ وہاں ماہین کو بہتر سہولتیں میسر ہوں گی اور پروٹوکول ملے گا۔ میں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ ماہین چند روز حشام اور عمران سے دور ہی رہے تو بہتر ہے۔

چالاک جادورائے نے چند ہی دنوں میں یہاں بڑی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بنالی تھی۔ اس نے نہ صرف مایارانی اور اس کی ماتا کو قیمتی پسٹل گفٹ کیے تھے بلکہ بعدازاں کئی اور تحائف بھی ان دونوں کو اور دیگر معزز خواتین کو پیش کیے تھے۔ نابینا ایلی جس کے ساتھ وہ زرخرید لونڈی کا سا سلوک کرتا رہا تھا اب اس کے محبت بھرے رویے کی حق دار ٹھہری تھی۔ وہ اسے بڑے مہذب انداز میں پکارتا تھا اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں اس سے باتیں کرتا تھا۔ وجہ صرف یہی تھی کہ وہ جانتا تھا یہاں کسی عورت سے بدسلوکی کرنے کا مطلب قبیلے کے غیظ و غضب کا شکار ہونا ہے۔

اگلے روز میم مائرہ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اسی پوائنٹ پر اس سے بات کی۔ میں نے کہا۔ ''مائرہ! تم نے دیکھا ہی ہے کہ مایارانی ماہین کو ایک اچھی دوست کی حیثیت دینے لگی ہے اور اب وہ بھی تمہاری طرح خاص رہائشی حصے میں ہے...... لیکن تمہارے رائے صاحب نے جو ریموٹ کنٹرول بم اس کی ٹانگ سے بندھوایا تھا، وہ اب بھی بندھا ہوا ہے۔ اب سوچ لو کہ یہ راز کھل گیا تو تمہاری اور رائے کی ساکھ مایا کی نگاہوں میں کیا رہ جائے گی۔''

میم مائرہ نے اپنے سرخ بالوں میں انگلیاں چلا کر تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم اپنی ساتھی کو سختی سے منع کردو کہ وہ اس بارے میں زبان نہ کھولے۔ میں موقع دیکھ کر ڈیوائس اس کی ٹانگ سے علیحدہ کروا دیتی ہوں۔''

''او کے، اب ایک اور جسارت کرنا چاہتا ہوں...... بلکہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھو میم مائرہ! ہم شریکِ سفر بھی ہیں، اور خطروں میں حصے دار بھی۔ لیکن ابھی تک ہمیں ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا کہ ہم کس مقصد سے یہاں موجود ہیں...... وہ سفید سانپ کیا چیز ہے جس کے لیے ہم برف کے اس دوزخ میں پائے جارہے ہیں؟''

وہ چند سیکنڈ توقف کر کے بولی۔ ''اس سوال کے جواب کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ سمجھو کہ ہم اپنے مقصد کے آس پاس پہنچ چکے ہیں۔''

''یعنی سفید سانپ کے......؟''

''سانپ...... یا جو کچھ بھی وہ ہے۔''

''یہ تو پھر سسپنس میں رکھنے والی بات ہوئی نا...... شروع میں ڈولما نے بھی ایسی ہی بات کی تھی کہ جس کو سانپ کہا جارہا ہے، وہ سانپ نہیں ہے۔''

وہ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد ذرا دھیمی آواز میں بولی۔ ”وہ سانپ نہیں...... سانپ جیسا ایک کیڑا ہے۔ وہ پیٹ کے بل نہیں چلتا، اس کے سولہ کے لگ بھگ چھوٹے پاؤں ہوتے ہیں۔ اسے مقامی زبان میں زوب کے نام سے پکارا جاتا ہے بلکہ یوں کہو کہ پکارا جاتا تھا......“

”پکارا جاتا تھا؟ کیا مطلب؟“

”دس پندرہ سال پہلے تک زوب اس علاقے میں موجود تھا مگر سخت موسم کی وجہ سے دھیرے دھیرے ختم ہو چکا ہے یا یوں سمجھو کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔“

”تو آپ لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہو؟“

”بس یہی سمجھ لو۔“ میم مائرہ نے گول مول بات کی۔ ”جونہی ہمیں چار پانچ جوڑے مل جائیں گے، ہم یہاں سے واپس روانہ ہو جائیں گے۔“

صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ مائرہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ سانپ نما اس کیڑے کو یہاں تلاش کیا جا رہا ہے مگر ہمیں کوئی ایسی سرگرمی نظر نہیں آئی تھی پھر ایسے خوفناک سرد موسم میں یہاں حشرات الارض کا پایا جانا یا ڈھونڈا جانا ناممکن ہی نظر آتا تھا۔ میری معلومات تو یہ تھیں کہ ایسے سرد ترین علاقوں میں اگر سانپ یا ایسے دیگر حشرات الارض ہوں بھی تو زمین کی گہرائی میں چلے جاتے ہیں اور خود پر ”سرمائی نیند“ طاری کر لیتے ہیں۔

مجھے شک گزر رہا تھا کہ زوب نامی یہ خاص کیڑا یہاں موجود ہے مگر مایا رانی اور اس کی ماتا کی اجازت کے بغیر یہ لوگ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان کی چاپلوسی اور خوشامد وغیرہ میں لگے ہوئے ہیں اور اگر یہ حربہ ناکام ہوا تو وہ بزور بازو اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ظاہر تھا کہ اگر وہ مسلح گارڈز کے علاوہ خصوصی طور پر مجھے اور عمران کو بھی یہاں لے کر آئے ہیں تو کسی نہ کسی طور تصادم کا امکان یہاں موجود ہے (غالباً احتیاط کے طور پر جادو رامے اور میم مائرہ نے فی الحال ہمیں اور گارڈز کو نہتا ہی رکھا ہوا تھا)

☆☆☆

عمران کے سر پر آنے والا زخم ایسا نہیں تھا کہ اسے بالکل نظرانداز کر دیا جاتا۔ اس کے چہرے کی ایک سائڈ بھی کچھ سوج گئی تھی۔ اسے کوئی تکلیف پہنچتی تھی تو نجانے کیوں میں خود کو عمران دانش کے سامنے شرمندہ محسوس کرنے لگتا تھا۔ بہرحال عمران کی طبع اس حوالے سے بڑی ڈھیٹ تھی۔ کہنے لگا۔ ”آپ کو دیکھ دیکھ کر مجھے بھی پریشانی اور تکلیف کو انجوائے کرنا آ گیا ہے۔ ہر حال میں مست رہنے کو دل کرتا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے گال پر ورم آیا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی وجہ سے ڈوڈو کی آنکھوں والے رامے سے میری دوستی ہو جائے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

”دیکھیں نا، ایسے ہی لگتا ہے نا کہ میں نے گال میں پان کی گلوری دبا رکھی ہے۔ وہ بھی پان کھاتا ہے۔ مجھے اپنا ہم ذوق سمجھے گا۔ ویسے سچی بات ہے پان جیسی خوب صورت اور خوشبودار چیز بھی اس کے منہ میں جا کر اپنی دلکشی کھو دیتی ہے......“

اسی اثنا میں کوئی اندر آ گیا۔ عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ یہ عمران کی دیسی معالج گندھارا تھی۔ اس کے پاؤں حسب معمول بیڑی میں تھے اور وہ چھوٹے قدم اٹھاتی آ رہی تھی۔ ماہین کی طرح عمران کا علاج بھی وہ خشک جڑی بوٹیوں سے کرنا چاہتی تھی...... اور ہمیں بھی یہ علاج ایلوپیتھک ہی کی طرح مؤثر لگا تھا۔

گندھارا اپنی نیچر کے حساب سے اچھی عورت لگتی تھی۔ یہاں کی زیادہ تر عورتوں کے برعکس اس کا صرف ایک ہی باکر تھا۔ عنقریب پیدا ہونے والا بچہ اسی باکر سے تھا اور وہ اس بات پر مطمئن تھی کہ اسے ہونے والے بچے کے باپ کا علم ہے۔ گندھارا کی آنکھوں میں ہر وقت ایک اداسی سی کروٹ لیتی رہتی تھی۔ ظاہر ہے وہ موت کی مسافر تھی۔ بچہ پیدا ہو جانے کے چھ سات روز بعد ہی اسے موت کی سزا ہو جانا تھی۔ یہاں کے دستور نرالے تھے اور پرانی برف کی طرح سرد اور ٹھوس بھی۔ یہ دستور انسانی فطرت سے بہت دور محسوس ہوتے تھے۔

کہیں پاس سے رونے کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ایک سے زیادہ مردوں کی آوازیں تھیں۔ جب گندھارا، عمران کے سر کا زخم نیم گرم محلول سے دھو رہی تھی، میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ کون رو رہا ہے؟“

وہ عمران کی طرف اشارہ کر کے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولی۔ ”پرسوں ان پر جن دو عورتوں نے حملہ کیا تھا ان میں سے ایک ماری گئی تھی اور دوسری بھاگ گئی ہے۔ یہ جو مرد رو رہے ہیں ماری جانے والی کے باکر (شوہر) ہیں۔“

میں نے اور عمران نے حیرت سے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ”اس کے دو باکر تھے اور دونوں سے ایک ہی جیسا پیار کرتی تھی۔ تبتی خرگوش کا گوشت یہاں

کسی کسی کو کھانا نصیب ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں کے لیے اس کا شکار کرتی تھی۔ مگر کہتے ہیں نا کہ جب انسان کی مت ماری جاتی ہے تو پھر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اپنی ایک ساتھی محافظ کے ساتھ مل کر چوری چکاری کرنے لگی۔ یہاں سے کئی قیمتی چیزیں چوری ہوئیں جن کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ دونوں چوری کا سامان اس کھوہ میں چھپاتی تھیں اور پھر آپ لوگوں نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا۔"

عمران سر پر پٹی بندھوا کر باہر گیا اور دو منٹ بعد واپس آگیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دو رنڈوے مردوں کو ہم آواز ہو کر روتے دیکھنا بڑا عجیب تجربہ ہے۔ آپ بھی جا کر دیکھیں۔"

میں نے کہا۔ "تم اپنی چوٹ پر توجہ دو اور ذرا آرام فرماؤ...... یہ نہ ہو کہ یہ رنڈوے مرد تمہیں دیکھ کر مشتعل ہو جائیں اور کچھ کر گزریں۔"

"لیکن ان کی سرتاج کو میں نے نہیں ماہین نے چوٹ لگائی تھی جناب۔ اور ماہین تو اب یہاں نہیں...... تقریباً وی آئی پی بن گئی ہے۔ منوہر سنگھ بتا رہا تھا کہ مایا رانی اس کا بہت خیال رکھ رہی ہے۔"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک جانب سے مایا رانی نمودار ہوگئی۔ اس کے ارد گرد محافظ عورتیں اور برچھی بردار مرد تھے۔ اس کے جسم پر زرد کھال کا لبادہ تھا جس پر کچھ چمکیلا کام بھی نظر آتا تھا۔ وہ تن کر چل رہی تھی۔ دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھ رکھے تھے۔ ہمارے پاس بیٹھی معالج گندھارا...... اپنی رانی کو دیکھ کر سہم سی گئی۔ رانی نے بھی اس پر بس ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے پر اکتفا کیا۔

مایا رانی کو دیکھ کر گندھارا کے علاوہ میں اور عمران بھی تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ مایا رانی عمران کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھی۔ اس نے عمران کی صحت کے حوالے سے معالجہ گندھارا سے بھی دو چار سوال کیے۔ اس کے بعد اس گھروندے کی طرف چلی گئی جہاں حشام مقیم تھا۔ حشام بھی باہر نکل کر مؤدب کھڑا ہوگیا۔ میں نے دور سے دیکھا وہ مترجم گندھارا کے ذریعے حشام سے باتیں کر رہی تھی۔ عمران نے اپنی لپ ریڈنگ کی صلاحیت استعمال کرتے ہوئے بتایا کہ وہ حشام اور ماہین کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بارے میں بات کر رہی ہے۔ یقیناً جھگڑے کی وجہ جاننا چاہ رہی ہے۔ ان کی جانب اس طرح گھورنا زیادہ مناسب نہیں تھا، میں اور عمران اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑ گئے۔

یکایک بھاگنے دوڑنے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ یوں لگا جیسے پچاس ساٹھ قدم دور غار کے کسی حصے میں قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ مایا رانی اور محافظوں سمیت سب گھوم کر شور کی طرف متوجہ ہوگئے پھر میرے کانوں سے ایک ایسی آواز ٹکرائی جس نے بدن میں پھریری دوڑا دی۔ یہ کسی درندے کی آواز تھی۔ بہت گمبھیر، تیکھی اور سماعت کو چیرتی ہوئی...... آواز قریب آرہی تھی۔ تب اندھا دھند بھاگتا ہوا ایک شخص اوندھے منہ مایا رانی اور محافظوں کے قریب گرا۔ اس کی پشت لہولہان تھی۔ یکایک نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ کسی جانور نے جست لگائی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ ایک برفانی شیر تھا، یعنی سنو لیپرڈ۔ اس کا قد چھ فٹ سے کم نہ ہوگا۔ جست لگاتے ہوئے وہ کچھ اور بھی لمبا نظر آیا۔ اس کے براؤن جسم پر چیتے جیسے داغ تھے اور نکیلے دانتوں والا منہ بھاڑ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ زخمی شخص پر جھپٹا اور پنجے سے اس کی گردن اُدھیڑ دی۔ یکایک میں نے ایک اور سنسنی خیز منظر دیکھا۔ مایا رانی نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے پہلو میں کھڑی ایک محافظ کے ہاتھ سے برچھی جھپٹی اور پلٹ کر لیپرڈ پر وار کیا۔ درندے کے جسم میں بجلیاں کوندرہی تھیں۔ وہ معمولی زخمی ہوا اور سیدھا مایا رانی پر آیا۔ مایا رانی نے کمال پھرتی سے خود کو بچایا۔ لیپرڈ معالجہ گندھارا کے قریب گرا۔ گندھارا چلائی اور بھاگنا چاہا۔ پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ وہ دو قدم چل کر گر گئی۔ وہ لیپرڈ کا آسان شکار تھی مگر لیپرڈ پھر رانی پر حملہ آور ہوا۔ رانی کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں بے خوفی اور طیش کے شعلے رقصاں تھے۔ وہ شیرنی کی زرد کھال پہنتی تھی اور اس وقت شیرنی ہی نظر آرہی تھی۔ ایک چنگھاڑ کے ساتھ لیپرڈ اس پر آیا۔ اس کا پنجہ رانی کے کندھے سے ٹکرایا اور وہ پشت کے بل گر گئی۔ میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ برچھی اور کلہاڑی بردار محافظ عورتیں اور مرد بھی ان لمحات میں سکتہ زدہ تھے۔ میں کچھ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا جب مایا رانی نے اپنے اوپر چڑھے لیپرڈ پر پلٹ کر طوفانی وار کیا۔ اس نے چلا کر تیز دھار برچھی لیپرڈ کی پسلیوں میں گھونپی اور پھر لیپرڈ کو اپنی ٹانگوں کے ذریعے اچھال دیا۔ قریباً پچاس پچپن کلو وزنی درندہ برف کی ٹھوس دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے پہلو سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا مگر وہ اب بھی کسی حد تک خطرناک تھا۔ ایک جانب سے ڈولما بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے اپنے پسٹل کی تین گولیاں زخمی لیپرڈ

کے جسم میں اتار دیں۔ وہ پھڑک کر بے حرکت ہو گیا۔ اس کی قریباً چار فٹ لمبی دم کسی ناگ کی طرح اپنے ہی خون میں لت پت تھی۔

ہم زخمی شخص کی طرف لپکے۔ اس کا نرخرہ اس طرح اُدھڑا تھا کہ ہڈیاں تک نظر آ رہی تھیں۔ گندھارا نے اس کا خون روکنا چاہا مگر صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کے لیے اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی پُتلیاں پتھرا گئیں۔

مایا رانی کے چہرے پر خون کے چھینٹے تھے، جنہیں اس کی محافظ عورتوں نے صاف کیا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ صرف اس لیے رانی نہیں ہے کہ یہ رتبہ اسے وراثت میں ملا ہے، وہ واقعی کسی ایسے مرتبے کی حق دار تھی۔

جانور کی لاش کو گھسیٹ کر غار کے کسی دوسرے حصے میں لے جایا گیا۔ ماحول میں ابھی تک سنسنی تھی۔ منوہر سنگھ نے بتایا کہ شدید موسم میں اسی طرح بھولے بھٹکے جانور کسی انسانی آبادی کی طرف نکل آتے ہیں...... ایسے خطرات یہاں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

☆☆☆

دو روز بعد برف باری شروع ہو گئی۔ یہ اتنی شدید تھی کہ یہاں کے مکین اپنے گھروندوں میں قید ہو کر رہ گئے۔ برف گرنے کی صدا کے سوا ہر طرف خاموشی تھی۔ یہاں تک کہ بھیڑیوں کی آوازیں بھی معدوم تھیں۔ بس دو تین دفعہ ایک مہیب آواز ضرور سنائی دی۔ عمران نے بیڑی میں جکڑی ہوئی گندھارا سے پوچھا تو پتا چلا کہ یہ برف ڈھلوانوں پر پھسلنے، یعنی ''ایوالانچس'' کی آواز ہے۔ شب و روز کی مسلسل برف باری رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ سردی انتہا کی تھی تاہم ان لوگوں نے اپنے اس وسیع و عریض غار کو قدرے گرم رکھنے کے بہت سے طریقے ڈھونڈ رکھے تھے۔

ایک روز منوہر سنگھ ہمیں اس خاص الخاص کیڑے زوب کی شکل دکھانے میں کامیاب رہا جس کے زہر کے حصول کے لیے راے اور مائرہ اپنے گینگ سمیت یہاں موجود تھے مگر یہ زوب زندہ نہیں، مردہ تھا۔ وہ نجانے کتنی مدت تک برف میں دبا رہنے کی وجہ سے لکڑی ہو چکا تھا۔ اس کی رنگت بالکل سفید نہیں بلکہ چھپکلی سے ملتی جلتی تھی۔ جو کیڑا منوہر نے ہمیں دکھایا، اس کی لمبائی ڈیڑھ فٹ کے قریب رہی ہو گی۔ یقیناً اگر اس کے ڈیڑھ درجن پاؤں نہ ہوتے تو وہ سانپ کے قریب ترین ہوتا۔

میں نے کہا۔ ''اسے دیکھ کر ہی پتا چل رہا ہے کہ اس کی کھال بہت موٹی ہے اور یہ ایک نہایت سخت جان مخلوق ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' منوہر بولا۔ ''جہاں تک میں نے اس کے بارے میں سن رکھا ہے، یہ سانپ کی طرح برف میں بالکل جم جانے کے باوجود اپنا جیون نہیں کھوتا اگر تین چار گھنٹے کے اندر اسے مناسب گرمی مل جائے تو یہ پھر حرکت میں آ جاتا ہے۔''

اسی اثنا میں ڈولما بھی اُدھر سے گزری۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ ہم نے منجمد کیڑے کو دم کی طرف سے پکڑ کر لٹکایا ہوا ہے تو اس کے چوڑے چہرے پر کچھ ناگواری ابھری۔ وہ کچھ بولی۔ منوہر نے اس کی بات کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈولما کہتی ہے کہ ہمارے اس قبیلے میں زوب کو عزت دی جاتی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی منوہر نے برسوں سے منجمد زوب کو بڑی احتیاط سے اونی نمدے پر رکھ دیا۔

''اس عزت کی وجہ کیا ہے؟'' میں نے منوہر کے ذریعے ڈولما سے پوچھا۔

ڈولما نے منوہر کے توسط سے جواب دیا۔ ''ہمارے ہاں مانا جاتا ہے کہ زوب کی وجہ سے مہلک برفانی طوفان نہیں آتے اور سردی حد سے نہیں گزرتی......''

ڈولما کے جانے کے بعد عمران نے کہا۔ ''یہ اچھی بات کہی اس ''فی میل ارسطو'' نے۔ اس کیڑے کی وجہ سے ہلاکت خیز سردی نہیں پڑتی لیکن یہ خود ہلاکت خیز سردی ہی کی وجہ سے بتدریج ختم ہو چکا ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا ہو۔'' منوہر نے خیال ظاہر کیا۔ ''ویسے بھی ایسے قبائل کے عقیدوں کو بدلنا بہت کٹھن کام ہوتا ہے۔''

جب ہم بات کر رہے تھے، ایک تنومند عورت اپنے تین باکروں کے ساتھ ہمارے سامنے سے گزری۔ وہ بہت اکڑ کر چل رہی تھی۔ اس اکڑ کی وجہ بہت بڑے بڑے سینگوں والا وہ پہاڑی بکرا تھا جو وہ کہیں سے شکار کر کے لائی تھی۔ جانور کا سر عورت کے ہاتھ میں تھا اور اس کا جسم اس کے تین باکروں نے اٹھا رکھا تھا۔ اچانک بے دھیانی میں ایک باکر کا پاؤں رپٹا اور ذبح شدہ جانور اس طرح گرا کہ عورت کے ہاتھ سے بکرے کا سر بھی گر کر فرش پر لڑھک گیا۔ غالباً اس کا کوئی سینگ عورت کے پاؤں پر لگا اور وہ آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے گلے کے گلوبند سے پکڑ کر باکر کو تھپڑ مارے اور پھر دونوں بازو پھیلا کر اسے ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ وہ بے چارہ کھڑا ہو گیا۔ شاید

عورت کو پہلے بھی کسی بات کا غصہ تھا۔ وہ بڑبڑاتی اور پاؤں پٹختی باقی دو باکروں کے ساتھ بکرے سمیت آگے بڑھ گئی۔

وہ نوجوان وہیں بے بسی کی تصویر بنا ایک ٹانگ پر کھڑا رہا اور وہ پورے تین پہر تک وہاں کھڑا رہا۔ ایک اور عورت اس کی نگران رہی۔ جب وہ اپنی کانپتی ٹانگ کو سہارا دینے کے لیے دوسری ٹانگ کا پاؤں نیچے لگاتا تھا، وہ اس کی ٹانگ پر چھڑی مارتی تھی۔ آتے جاتے لوگ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے تھے۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے اور بھی کئی تماشے ہمیں یہاں نظر آئے تھے۔

عمران اب بہتر تھا اور قدرے اچھے موڈ میں تھا۔ وہ گونگے جہاناں کے ساتھ اکثر اشاروں کنائیوں میں بات کرتا اور اسے سمجھاتا کہ ہونٹوں کی حرکت سے آواز کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے گندھارا کو بتا رکھا تھا کہ انڈین فلموں کا مشہور ہیرو واجابھ بچپن اس کا سوتیلا بھائی ہے اور اس کے باپ کی پہلی بیوی سے ہے۔

وہ اب اکثر مقامی عورتوں کے ساتھ بھی گپ شپ کرنے لگا تھا۔ اشاروں کنائیوں میں ان سے بات کرتا۔ اچھی شکل صورت کی وجہ سے لڑکیاں اس میں دلچسپی لیتی تھیں، اسے دیکھ کر مسکراتیں اور اس کی ٹھوڑی کے گڑھے پر تبصرے کرتی تھیں۔

کہنے لگا۔ ''کبھی تو دل چاہتا ہے کہ ان میں سے کوئی سچل پیس دیکھ کر اپنا آپ اس کے حوالے کر دوں۔ بھول جاؤں باقی سب کچھ۔''

میں نے کہا۔ ''بھول جاؤ مگر یہ مت بھولنا کہ گلے میں پٹا باندھنا پڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ کسی وقت ایک ٹانگ پر کھڑا بھی ہونا پڑے۔''

منوہر سنگھ بلند آواز میں ہنسنے لگا۔ ہم جانتے نہیں تھے کہ یہ جو تھوڑا بہت ہنسی مذاق ہے، ختم ہونے والا ہے، حالات بتدریج سنگین ہونے والے ہیں۔

☆☆☆

میں اپنے گھروندہ نما کمرے میں تھا۔ عمران بھی میرے قریب ہی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اندرونی حصے کی ایک راہداری نما جگہ پر جادورائے کو دیکھا تھا، وہ نابینا ایلی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے، محبت سے اس کی طرف دیکھتا ہوا گزرا تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ ایلی کے ساتھ اس کا یہ رویہ دکھاوے کا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مایا رانی اور بوشال ماتا کی نگاہوں میں اپنی عزت برقرار رکھنا چاہتا ہے...... نابینا ایلی کا خیال آتے ہی اس کے ارب پتی منگیتر یا بوائے فرینڈ ڈیرن فورڈ کا خیال بھی آ گیا۔ ہم نے اسے راولپنڈی کے ایک گورا قبرستان سے اغوا کیا تھا اور اس کی زندگی کو ایک ایسا موڑ دے دیا تھا کہ اب وہ یقیناً لاہور کی اس نامعلوم عمارت میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ انسان کے کرم کسی نہ کسی صورت میں تو اس کے سامنے آتے ہی ہیں۔

اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔ میں نے دیکھا معالجہ گندھارا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں مرہم پٹی والا چوبی باکس تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنا پیٹ تھام رکھا تھا۔ اس کی مرہم پٹی کے سبب عمران کے سر کا زخم واقعی حیران کن تیزی سے مندمل ہوا تھا۔ ویسے عمران میم مائرہ کی ہدایت کے مطابق اینٹی بائیوٹک بھی کھا رہا تھا۔

مرہم پٹی کروا کر عمران ذرا لنگڑاتا ہوا غار کے دہانے کی طرف نکل گیا تو گندھارا مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''یہاں سب میں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ مایا رانی کی سہیلی شادی کرنا چاہتی ہے۔''

''سہیلی؟ کون سہیلی؟''

''وہی آپ کے ساتھ آنے والی...... کیا نام ہے اُس کا...... ماہیر۔''

''ماہیر...... نہیں ماہین۔ تم اسے رانی کی سہیلی کیوں کہہ رہی ہو؟''

''سہیلی کہہ لو یا ہم مزاج ساتھی کہہ لو۔ رانی صاحبہ اس کے بہت قریب ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ہر طرح کی بات کر لیتی ہیں۔''

''یہ شادی والی بات کیا کہی ہے تم نے؟''

''مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں۔'' گندھارا بولی۔ ''لیکن یہاں کہا یہی جا رہا ہے کہ وہ ماہیر...... میرا مطلب ہے ماہین ان دونوں کو ہی پسند کرتی ہے۔ یعنی یہ آپ کا زخمی ساتھی عمران اور دوسرا وہ ڈیزائن دار بالوں والا حشام۔ وہ ان دونوں سے ہی شادی کرنا چاہتی ہے۔''

''تم ہوش میں تو ہو؟'' میں نے کہا۔ ''دونوں سے شادی کا کیا مطلب؟ تمہیں کسی نے غلط خبر دی ہے۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ بہت بڑا جرم ہے اور اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔''

''آپ کسی اور جگہ کی بات کر رہے ہیں، لیکن میں یہاں کی بات کر رہی ہوں جہاں آپ موجود ہیں۔ ہمارے ہاں یہ سب کچھ جائز اور رواج کے عین مطابق ہے۔''

''لیکن تمہارے رواج ہم پر لاگو نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ہماری اس ساتھی پر۔ رواج لاگو ہونا تو دور کی بات ہے...... وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''مگر میری اطلاعات تو کچھ اور ہیں۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''وہ دونوں سے محبت کرتی ہے...... اور ان میں سے کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتی۔ مایا رانی نے اسے ہماری برادری کی سب سے بڑی پیشوا دیوی تورما سے ملایا ہے۔ دیوی تورما کے ساتھ دو تین بار اس کی تفصیلی گفتگو ہوئی ہے۔ وہ کافی حد تک قائل ہو چکی ہے۔''

''میں نہیں مان سکتا۔ سورج مغرب سے نکل سکتا ہے مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔''

وہ عجیب اداسی سے مسکرائی۔ ''یہ طلسم نگری ہے صاحب جی، یہاں تو سورج نکلتا ہی نہیں۔ آپ سورج کی مثال کیسے دے سکتے ہو۔ جہاں تک بات ہے اس کے نہ ماننے کی، مجھے یقین ہے کہ وہ بہت حد تک مان چکی ہے جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں لڑکے بہت جلد اس کے باکر بن جائیں گے۔ دونوں میں سے کسی کو اس کی جدائی برداشت نہیں کرنا پڑے گی۔''

میرا جی چاہا کہ گندھارا کے منہ پر طمانچہ جڑ دوں مگر اس میں گندھارا کا بھی کیا قصور تھا۔ وہ غالباً وہی کچھ بتا رہی تھی جو یہاں کہا اور سنا جا رہا تھا۔

گونگا جہاناں ہمارے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ میم مائرہ کا بے دام کا غلام تھا اور ہر وقت اس کے حکم کا منتظر رہتا تھا۔ میرے خیال میں تو وہ مائرہ کے حکم پر پہاڑ سے بھی چھلانگ لگا سکتا تھا۔ میں نے اشاروں کنائیوں میں اس سے کہا کہ میں میم مائرہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ اس تک میرا پیغام پہنچائے۔ گونگا جہاناں ہماری ٹیم میں واحد شخص تھا جو اس خصوصی رہائش گاہ میں جا سکتا تھا جو ہال نما جگہ طامبورہ کے عقب میں واقع تھی اور جہاں بوشال ماتا، مایا رانی اور قبیلے کی دیگر اہم عورتیں مقیم تھیں۔

جہاناں چلا گیا۔ میم مائرہ فوراً تو نہیں آئی۔ تاہم قریباً ایک گھنٹے بعد اس نے اپنی شکل دکھا دی۔ وہ بتاتی کچھ نہیں تھی لیکن میرا اور عمران کا اندازہ یہی تھا کہ وہ اور رائے شب و روز اپنے مقصد کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں، وہی زہر جو زوب نامی کیڑے کے جسم میں ہے اور جس کا استعمال کسی ویکسین میں ہونا ہے...... کم از کم ہمارے علم میں تو یہی باتیں تھیں۔ اس حوالے سے جاپانی ریسرچر ڈاکٹر شا کا نام بھی بار بار ذہن میں گونج جاتا تھا جس نے چند برس پہلے حادثاتی طور پر کوئی وائرس بنا ڈالا تھا۔

''کیا بات ہے ڈپٹی صاحب!'' مائرہ نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''کہنے کو تو بہت کچھ ہے میم مائرہ...... مگر فی الحال یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں یہ سب کیا چل رہا ہے۔ ماہین کے حوالے سے یہ کس قسم کی لایعنی باتیں یہاں ہو رہی ہیں؟''

''باتیں تو لایعنی ہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''مگر یہاں کے ماحول کے مطابق غیر متعلقہ نہیں ہیں...... اور پھر میرا خیال ہے کہ اس لڑکی ماہین نے خود بھی کچھ اس قسم کا تاثر ابھارا ہے جس کی وجہ سے اس طرح کے بیانیے کو طاقت مل گئی ہے۔''

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا؟'' میں نے تڑخ کر کہا۔

''سب کچھ تمہارے سامنے ہی تو ہوا ہے تابش ڈیئر...... حشام اس کا منگیتر ہے اور وہ اس کا بہت خیال بھی رکھتی ہے۔ دوسری طرف عمران ہے...... جس سے شاید وہ چپکے چپکے پیار کرنے لگی ہے۔ تاڑنے والے بھی تو قیامت کی نظر رکھتے ہیں تابش۔ اور پھر جو کچھ اس دن کھوہ میں ہوا اور عمران کو بچانے کے لیے ماہین نے جس طرح خود کو خطرے میں ڈالا، اس سے بھی بہت سے اشارے مل رہے ہیں۔''

''یہ کیا فضول گفتگو ہے۔ ایک ساتھی کی حیثیت سے اس نے عمران کی مدد کی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ لوگ ایسے گھٹیا انداز میں سوچ سکتے ہیں۔''

''بات میرے سوچنے کی ہوتی تو شاید میں تمہاری ہاں میں ہاں ملانے لگتی، مگر بات یہاں کے ماحول اور سوچ کی ہے۔ یہاں صرف مایا رانی کا حکم چلتا ہے اور وہی ہوتا ہے جو مایا رانی اور یہاں کی مذہبی پیشوا دیوی تورما کہتی ہے۔''

''وٹ اے ربش، تو کیا ماہین ان کی باتیں مان کر حشام اور عمران کو اپنا شریکِ حیات بنانے پر رضامند ہو جائے گی؟''

''بظاہر تو یہ ناممکن نظر آتا ہے مگر یہاں اس ماحول میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ سنا ہے مایا رانی نے یہاں کی پیشوا دیوی تورما سے ماہین کو ملوایا ہے اور دیوی تورما نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر مرد دو محبتیں کر سکتا ہے تو عورت بھی کر سکتی ہے اور ایک سے زیادہ شادیاں بھی کر سکتی ہے۔ دنیا کے کئی خطوں میں اور تاریخ کے بہت سے

صفحات پر اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یونان اور افریقہ کے کئی حصوں میں یہ رواج موجود تھا۔ بلکہ...... آج بھی تبت، شمالی انڈیا، نائیجیریا، جنوبی امریکا اور چائنا کے کچھ حصوں میں......"

"پلیز اسٹاپ کرو اس موضوع کو۔" میں نے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی۔ "اور ایک بات میں آپ لوگوں کو صاف بتا دوں، وہ مر جائے گی پر ایسا نہیں کرے گی۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

مائرہ نے اپنے کندھے اچکائے اور استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ "برین واشنگ بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ یہاں بھی ایسا کچھ ہو جائے۔ ویسے بھی یہاں حتمی فیصلہ تو مایارانی کا ہی ہوتا ہے اور تم دیکھ ہی چکے ہو وہ یہاں کے دستوروں کے لیے کتنی سخت ہے۔"

اور پھر جیسے ایک دم اسے کچھ یاد آیا، بولی۔ "اور ہاں...... تمہارا وہ کام بھی میں نے کر دیا تھا...... ماہین کی ٹانگ پر اب کچھ نہیں ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اس طاقتور ریموٹ کنٹرول بم کی طرف تھا۔ جو کئی دنوں سے ماہین ساتھ ساتھ لیے پھرتی تھی۔ اس بم کے سبب ہم سب جیسے ایک تنے ہوئے رسے پر چلتے رہے تھے۔ بدخصلت جادورا کے لیے ایک بار پھر میرا دل نفرت اور غم و غصے سے بھر گیا۔ وہ زر کا پجاری تھا۔ اپنے مقصد کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا...... اور وہ جاتا تھا...... لوگ سمجھتے تھے کہ اس کے ہاتھوں میں جادو ہے۔ مٹی کو بھی سونا بنا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں جادو نہیں تھا، شیطانیت اور سفاکی کی لامحدود طاقت تھی۔

ماہین کی شادی والی بات ایک بھونڈے اور کریہہ مذاق کی طرح لگتی تھی۔ میں نے مائرہ کو بلا کر اس لیے بات کی تھی کہ مجھے کچھ تسلی ہو اور بات کلیئر ہو سکے مگر وہ سرخ بالوں والی حرافہ تو مجھے کچھ اور الجھا کر چلی گئی تھی۔ بہرطور مجھے یقین تھا کہ یہ سب کچھ چائے کی پیالی میں طوفان جیسا ہے...... اور جلد ہی یہ طوفان تھم جائے گا۔

مگر آنے والے دو چار دنوں میں میرا یہ خیال سراسر غلط ثابت ہوا۔ میں اور ٹیم کے دیگر ساتھی شدید حیرت اور بے یقینی کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔

ایک بار پھر احساس ہوا کہ مایارانی اس کی والدہ اور دیگر "معزز" عورتیں اپنے رسم و رواج کے حوالے سے کس قدر اٹل رویہ رکھتی ہیں۔ شدید برف باری قدرے تھم چکی تھی۔ غار کے طول و عرض میں کچھ چل رہا تھا، کچھ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ میں نے دو تین بار منوہر سنگھ کے ذریعے مایارانی سے درخواست کی تھی کہ میں ماہین سے ملنا چاہتا ہوں مگر اس درخواست کو اہمیت نہیں دی گئی۔ مایارانی کی طرف سے فقط اتنا کہا گیا تھا کہ ابھی چند دن تک ماہین سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ کل شام اتفاقاً فاصلے سے میری نظر ماہین پر پڑی تھی وہ گلابی ویلوٹ جیسے ایک کام دار چمکیلے لباس میں تھی اور چہل قدمی کے انداز میں مایارانی کے ساتھ چلتی ایک سرنگ جیسی راہداری سے دوسری میں داخل ہو گئی تھی۔ گیس لیمپ کی روشنی میں، میں نے دیکھا تھا کہ مایارانی کی طرح ماہین کے ہاتھ میں بھی کسی سرخی مائل مشروب کا گلاس تھا۔ تاہم منوہر کا کہنا تھا کہ وہ کوئی قہوہ قسم کی چیز ہے۔

اگلی صبح ایک اعلان نے ہمیں حیرت زدہ کر دیا...... اعلان ماہین کی شادی کا تھا اور یہ اسی طرح تھی جیسے کہا جا رہا تھا۔ ہم سکتے میں رہ گئے۔ عمران کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ دوسری طرف حشام بھی ہکا بکا تھا۔ جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہ ہماری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہاں سوچنے کی بات تھی کہ کیا یہ سب کچھ ماہین کی سمجھ میں آ رہا ہے۔ وہ اس طرح کی صورت حال کے لیے کس طرح راضی ہو سکتی تھی۔ کیا اس پر جبر کیا جا رہا تھا...... یا پھر یہ کوئی برین واشنگ قسم کا معاملہ تھا؟ پھر میرے ذہن میں یہاں کی مذہبی پیشوا دیوی تورما کا خیال آیا۔ اس کا پورا نام دیوی تورما چھائی لیا جاتا تھا۔ اس معاملے میں اس کا کیا کردار تھا؟

عمران نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چاچو جی! یہ کیا دیوانگی ہے، لگتا ہے کہ ان لوگوں کے ہوش ٹھکانے پر نہیں ہیں۔"

عمران کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر حشام بھی ہمارے پاس آ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ لوگ اپنے بے ہودہ رسم و رواج ہم پر کیسے ٹھونس سکتے ہیں؟ مجھے تو لگ رہا ہے کہ یہ ہمارا تماشا بنانا چاہتے ہیں۔ ہماری بے بسی کا مزہ لے رہے ہیں۔"

"آپ میم مائرہ سے بات کریں۔" عمران سخت الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم ماہین کے ساتھ اس طرح کا مذاق نہیں ہونے دیں گے۔"

یہ پہلا موقع تھا جب عمران اور حشام ہم آہنگ ہو کر ایک ہی بات کہہ رہے تھے ورنہ اس سے پہلے تو ان کا کسی بات پر متفق ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس ہم آہنگی کے باوجود میں حشام کی نگاہوں میں دبی دبی تپش دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ

خاموشی کی زبان میں عمران سے کہہ رہا ہو، یہ بھی جو کچھ ہوا ہے تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔ تم میرے لیے نحوست کا دوسرا نام ہو۔ نہ تم ان چور عورتوں کے پیچھے اس کھوہ میں جاتے، نہ ماہین پریشان ہو کر وہاں پہنچتی اور نہ یہ سب کچھ ہوتا، جو اَب ہو رہا ہے۔ یہ صرف تم ہو جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہوا ہے کہ شاید ماہین ایک تقسیم شدہ لڑکی ہے۔

عمران کی رائے ٹھیک تھی۔ مجھے میم مائرہ سے بات کرنا چاہیے تھی۔ بے شک وہ بھی کوئی مثالی عورت نہیں تھی لیکن عورت تو تھی۔ یہاں کے قبیح رسم و رواج کو اس کا دل بھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ بالفرض اگر خود اسے کسی ایسے عمل پر اور ایسی رسم کی پاسداری پر مجبور کیا جاتا تو وہ مان جاتی؟

گونگے جہاناں کے ذریعے میں نے میم سے ملنے کی درخواست کی۔ جہاناں ناکام لوٹ آیا۔ اس نے واپس آ کر اشاروں کنائیوں میں ہمیں جو کچھ بتایا، وہ حیران کن تھا۔ اس کے مطابق تو شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور مایا رانی کی خواہش پر ماہین کو شادی کی ابتدائی رسموں سے گزارا جا رہا تھا۔ جس میں ایک رسم یہ تھی کہ ماہین کے جسم کا وزن کر کے اس وزن کے مطابق اناج یعنی گندم ضرورت مندوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ گندم اور دیگر اناجوں کی یہاں گوشت اور پنیر وغیرہ سے کہیں زیادہ قدر و قیمت تھی۔ جہاناں کے اشاروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بالوں کے اونچے جُوڑے اور بہت لمبوترے منہ والی مذہبی پیشوا دیوی تورما چھائی بھی موقع پر موجود ہے اور اس شادی کے سلسلے میں پُرجوش نظر آتی ہے۔

مبتی خدوخال والی تورما چھائی کو میں نے فقط ایک مرتبہ دور سے دیکھا تھا۔ وہ اتنی بوڑھی تھی کہ کبڑی ہو چکی تھی۔ اس کے سر پر سفید بالوں کا بہت اونچا جُوڑا نظر آتا تھا۔ اتنا اونچا جوڑا آسانی سے بنایا نہیں جا سکتا۔ یقیناً کوئی سریش یا اکڑنے والی اور چیز استعمال کی جاتی تھی جس سے اس کے بال سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کے گلے میں پتھروں کی بہت سی مالائیں دکھائی دیتی تھیں۔

اس مذہبی پیشوا کو جب یہ پتا چلا کہ ہم سب اس شادی کے مخالف ہیں اور وہ دونوں بھی مخالف ہیں جن سے ماہین کی شادی کی بات کی جا رہی ہے تو وہ غضب ناک ہو گئی۔ اسی غضب ناک کیفیت میں وہ سوکھی سڑی بوڑھی محافظ عورتوں کے جلو میں ہمارے پاس پہنچ گئی۔ پہلے وہ عمران اور حسام کو مخاطب کر کے پتا نہیں کیا کیا بولتی رہی۔ پھر ہم پر برسنے لگی۔

ہم سے میری مراد ہیں، منوہر سنگھ، بہروز، ہما عروج اور جہاناں وغیرہ ہیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ شاید مسلح عورتوں کو ہم پر حملہ کرنے کا حکم دے دیتی۔

اس کے جانے کے بعد منوہر نے اس ''بوڑھی بجلی'' کی کڑک دھڑک کا ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''وہ کہتی ہے کہ اس کا کہا، یہاں پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ مایا رانی اور اس کی والدہ بھی اس کے کہے کے خلاف نہیں جا سکتیں۔ ماہین کی شادی ان ہی دو مردوں سے ہو گی جن کو وہ چاہتی ہے۔ اگر اپنی دنیا میں تم لوگ اپنی مرضی کر سکتے ہو، تو ہم بھی یہاں وہی کریں گے جو ہمارے نزدیک درست ہے۔ ہم اپنے دیوتاؤں کو ناراض نہیں کر سکتے۔ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ لڑکی ان دونوں لڑکوں کو چاہتی ہے، ان کو من سے پریم کرتی ہے تو پھر وہ اپنا بستر بھی ان دونوں کے ساتھ بانٹے گی۔''

یہ باتیں ہمارے تن بدن میں آگ لگا رہی تھیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ حالات ہمارے بس سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔

تعجب کی بات یہ تھی کہ میم مائرہ اور رامے کی طرف سے بھی کوئی ردِعمل سامنے نہیں آ رہا تھا۔ کیا وہ بھی بس تماشا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ''شادی'' یہاں ایک مذہبی فریضے یا رسم کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ دو روز بعد کی بات ہے، میں اور عمران بھاری کمبلوں میں لپٹے ہوئے اونگھ رہے تھے جب آہنی بیڑیوں کی چھن چھن سنائی دی۔ وہی گندھارا تھی۔ اس کا پیٹ اب پہلے سے زیادہ نمایاں ہو چکا تھا اور چہرے کی افسردگی بھی پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ ماں کے لیے بچے کا جنم خوشی کی نوید لاتا ہے مگر گندھارا کے لیے یہ جنم موت کا سندیسہ بھی تھا۔

میں نے گندھارا کو روک لیا اور پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

گندھارا کی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بہت سے مقامی الفاظ بھی شامل ہوتے تھے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ مایا رانی کی والدہ بوشال ماتا کی ایک دیرینہ خواہش تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ قبیلے سے باہر کی کوئی ایسی عورت یہاں پہنچے جس کی شادی دو یا اس سے زیادہ مردوں سے ہو سکے...... اور یوں ایک مثال قائم کی جا سکے۔

میں نے کہا۔ ''گندھارا، تم ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ کریں گے تب بھی نہیں ہو سکے گا۔ ماہین یہاں کی نہیں باہر کی لڑکی ہے۔ وہ ایسا خیال بھی اپنے دماغ میں نہیں لا سکتی۔''

گندھارا کے میلے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ میرے خیال میں تو ایسا ہو چکا ہے۔ وہ لڑکی تقریباً مان چکی ہے...... وہ دیوی تورماچھائی کے اثر میں ہے۔''

''وہ اثر میں ہے تو بھی یہ سب نہیں ہو سکے گا۔ وہ دونوں نوجوان اس پر رضامند نہیں ہیں۔ کیا کسی مرد کو زبردستی ازدواجی تعلق پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟''

''تم لوگوں کو کچھ پتا نہیں کہ یہاں کیا ہوسکتا ہے اور کیا ہوگا۔'' وہ عجیب انداز میں بولی۔ ''مایارانی نے سب انتظام کررکھا ہے۔''

بات کچھ سمجھ میں آرہی تھی، کچھ نہیں آرہی تھی۔

یہ دوسرے روز رات نو دس بجے کی بات ہے۔ عمران رات کا کھانا کھا کر سو چکا تھا لیکن میں جاگ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر گیس لیمپس کی روشنی میں کوئی مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ٹھگنا قد، گول مٹول سا جسم، وہ کچھ قریب آیا تو میں نے پہچان لیا۔ وہ جادو رائے تھا۔ یہ پہلا یا دوسرا موقع تھا کہ میں یوں اسے خصوصی رہائشی پورشن سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پینٹ کے اوپر اس نے ایک بہت دبیز موٹی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اکیلا ہی تھا اور ڈولتا ہوا سا آرہا تھا۔ راستے میں جو مقامی مرد و زن اسے دیکھتے تھے جھک کر سلام کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے؟ ان کے نزدیک وہ ہماری ٹیم کا سربراہ تھا اور یہی وہ ''جانباز'' تھا جس نے خود کو خطرے میں ڈال کر جنگجو ہرپتی کو کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا۔

رائے گھروندے میں میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے مگر اس سے پہلے میں بول پڑا۔ میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''رائے جی! میں نے میم مائرہ کو کئی پیغام بھجوائے ہیں لیکن وہ ملنے نہیں آئی...... دیکھیں، میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں، یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہماری برداشت سے باہر ہے۔ آپ کو یہاں وی آئی پی مہمان کی حیثیت حاصل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مایارانی سے بات کر کے اس بے ہودگی کو رکوائیں جو ماہین کی شادی کے نام پر کی جارہی ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم نے کوشش نہیں کی ہوگی۔'' وہ اپنی، ریڈیو آرٹسٹ جیسی گونج دار آواز میں بولا۔ اس کی باہر اُبلی ہوئی آنکھیں قریب سے اور بھی کریہہ لگ رہی تھیں۔ میں خاموش رہا تو اس نے بات جاری رکھی۔ ''یہ اپنے معاملوں میں بہت کٹر لوگ ہیں۔ خاص طور سے رسم و رواج کے سلسلے میں جب کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو ایک انچ پیچھے نہیں ہٹتے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ یہ اپنے اس شرمناک ارادے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے؟ ٹھیک ہے اگر یہ نہیں ہٹیں گے تو ہم اپنے بازوؤں کے زور پر انہیں روکیں گے۔'' میرا لہجہ آتشیں ہوگیا۔

رائے نے طویل سانس لیا۔ پان کی پیک گٹک کر اپنے رنگے ہونٹوں کو رومال سے پونچھا اور بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا میری طرف جھک گیا (میری معلومات کے مطابق وہ اپنے مخصوص پان کا وسیع اسٹاک ساتھ لے کر آیا تھا) ذرا دھیمی آواز میں بولا۔ ''اس کا یہی حل ہے کہ اس خرافات سے پہلے پہلے ہم لڑکی کو لے کر یہاں سے نکل جائیں۔'' لڑکی سے اس کی مراد ماہین ہی تھی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ ہمارا وہ ''کام'' مکمل ہو جائے دو چار دن میں...... جس کے لیے ہم یہاں آئے۔''

''اور وہ کیسے ہوگا؟ جو خاص زہر آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ تو اسی زوب نامی کیڑے میں ہے جو اَب یہاں ناپید ہوگیا ہے۔''

''تمہاری معلومات ادھوری ہیں۔'' وہ اپنے بڑے بڑے ڈیلے گھما کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''کیڑا ختم ہو گیا ہے لیکن ناپید نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اسی علاقے میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی تعداد میں موجود ہے۔ اگر کسی طرح ہمیں اس کے دو نر اور چار پانچ مادائیں مل جائیں تو بھی بہت ہے...... ویکسین کے لیے ہمارا کام چل سکتا ہے...... اور اگر ایسا نہ ہوسکا تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا...... ہمارا بھی اور عام انسانوں کا بھی......''

انسان اور انسانیت کی بات جادو رائے جیسے جانور کے منہ سے بہت بے محل لگتی تھی مگر وہ اپنے مطلب کے لیے کر رہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ جناب مجھ سے کوئی خاص بات کہنے کے لیے آئے ہیں۔'' میں نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے کرخت لہجے کو حتی الامکان نرم رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''ننانوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ کچھ زوب کیڑے اسی غار کی کسی شاخ میں یا ملحقہ کھوہ میں موجود ہیں...... اور اس کا علم کسی اور کو ہو یا نہ ہو مگر ان کی پیشوا دیوی تورما کو ضرور ہے۔''

''تو کیا آپ ان کی پیشوا پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں؟''

''ایسا سوچنا بھی غلط ہے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو یہاں قریباً دو مربع کلومیٹر میں پھیلے ہوئے اس غار میں قبیلے کے کم و

بیش ایک ہزار مرد و زن آباد ہیں اور ہماری تعداد کیا ہے۔ صرف 25 کے لگ بھگ۔ یہ غصے میں آ گئے تو خالی ہاتھوں سے ہی ہمارے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ بے شک ان کے پاس آتشیں ہتھیار بہت تھوڑے ہیں لیکن تیز دھار آلوں کی تو ان کو کوئی کمی نہیں۔ ہمیں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔'' رامے نے چند لمحے توقف کر کے اپنی پھولی توند پر ہاتھ پھیرا اور گفتگو جاری رکھی۔ ''اور میں صرف اس سانپ نما کیڑے زوب کی بات ہی نہیں کر رہا، اس لڑکی (ماہین) کی شادی پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی ہمیں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے، یہ بات تو دماغ میں بھی نہ لانا کہ اس سلسلے میں طاقت استعمال کی جائے......''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ ہم یہ سب کچھ ہونے دیں؟'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ ہم اس شادی والے ٹنٹے سے پہلے ہی اپنا کام ختم کر کے یہاں سے نکل جائیں۔ میں تمہیں دیوی تورما کی اس خاص کارندی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو اکثر اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ وہی لمبی تڑنگی عورت، بہت موٹی گردن والی، لگتا ہے کہ اس کا چہرہ اس کی گردن کے برابر ہے یا گردن سے کچھ چھوٹا ہے۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ رامے کس کی بات کر رہا ہے۔ اس مرد نما عورت کو میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ رامے بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اس عورت پر نظر رکھو، وہ یہاں سے باہر بھی آتی جاتی ہے۔ تم اُس کا پیچھا کر کے اسے کہیں پر دبوچ سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ تمہارے لیے کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہوگا۔''

''اسے یوں پکڑنے کا کیا فائدہ ہوگا؟''

''مجھے اور مائرہ کو پورا یقین ہے کہ یہ عورت بھی وہ سب کچھ جانتی ہے جس کا علم دیوی تورما کو ہے۔ نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ وہ زوب کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی ہے۔ وہ اگر اس غار میں موجود ہیں تو عین ممکن ہے کہ ان کی دیکھ بھال کی ذمے داری بھی اس نہال نامی عورت پر ہو...... میں یہ چاہتا ہوں کہ......''

بات کرتے کرتے جادو رامے یک دم رک گیا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور مجھے بھی چونکنا پڑا۔ کئی دفعہ بندہ کسی غیر موجود فرد کا ذکر کر رہا ہوتا ہے اور وہ بالکل غیر متوقع طور پر وہاں آن موجود ہوتا ہے۔ نہال نامی اس مرد نما عورت کے حوالے سے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا، وہ ایک بھاری کمبل میں لپٹی لپٹائی ایک بغلی راہداری میں جا رہی تھی۔ یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اس کا رخ غار کے دہانے کی طرف ہی ہے۔

رات کے اس پہر جبکہ ہلکی سی برف باری بھی شروع ہو چکی تھی، یہ عورت اگر باہر جا رہی تھی تو یقیناً وضاحت طلب بات تھی۔

جادو رامے نے اپنی گیند نما آنکھوں کو اشاراتی انداز میں حرکت دی۔ وہ مجھے اس نہال نامی عورت کے پیچھے جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ رامے سرگوشی میں بولا۔ ''خطرناک ہے...... ذرا احتیاط سے...... اور اگر مارنا پڑے تو بے شک مار ڈالنا...... بلکہ جانکاری کے بعد اس کو مارنا ہی بہتر ہوگا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ رامے نے ایک بریٹا پستول مجھے تھما دیا۔

سرگوشی کرنے کے لیے جب رامے میرے قریب آتا تھا تو اس کے جسم سے دو طرح کی باس اٹھ کر مجھ تک پہنچتی تھی۔ ایک تو کڑوے پان کی اور دوسری اس کے پنڈے کی جس میں ایک حیوانی قسم کا ٹچ موجود تھا۔ جنس کے حوالے سے جن چوپایوں کو بہت سرگرم سمجھا جاتا ہے ان میں ایک سؤر بھی ہے۔ یہ بُو باس اسی جانور سے ملتی جلتی تھی۔ اپنے یار عمران دانش کے ساتھ انڈیا کے سفر میں میں نے سؤر کوئی بار بہت قریب سے دیکھا تھا...... یہ زرد اور گلابی رنگ کے تھے۔ بلکہ گلابی رنگ کے تو کافی زیادہ تھے۔ عمران دانش نے بتایا تھا کہ یہ کالے رنگ کے بھی ہوتے ہیں۔ مجھے لگا کہ آج ایک طویل عرصے بعد میں کالا سؤر دیکھنے میں کامیاب رہا ہوں۔

میں نے جلدی سے ٹوپی اور دستانے پہنے اور اس نہال نامی مرد نما عورت کے تعاقب میں چل دیا۔ جلد ہی وہ میری توقع کے مطابق غار سے باہر تھی۔ میں بھی ایک معقول فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے رہا۔ کھلے آسمان کے نیچے سردی ہڈیوں میں گودا جما رہی تھی۔ بہت ہلکی سی برف بھی گر رہی تھی جیسے آٹے کی سفید دھول ہو۔ رات تاریک تھی مگر لمبی تڑنگی عورت کے ہاتھ میں چھوٹی ٹارچ تھی اور اس ٹارچ کی روشنی مجھے اس کا تعاقب جاری رکھنے میں مدد دے رہی تھی۔ کہیں دور سے بھیڑیوں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

ایک ڈھلوان چڑھنے کے بعد عورت دوسری طرف اتر گئی۔ یہاں پہنچ کر وہ رکی اور پھر بیٹھ گئی۔ اس نے کسی چیز سے برف کھودنا شروع کی، ایک برف پوش چٹان نے مجھے

تھوڑی سی آڑ فراہم کر دی تھی اور میں عورت کی مصروفیت دیکھنے میں کامیاب تھا۔ تب عورت نے اپنے کمبل کے اندر سے کچھ نکالا اور اسے اپنے کھدے ہوئے گڑھے میں رکھ دیا۔ چند ہی منٹ بعد وہ گڑھا برابر کرنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک مرتبہ جائزہ لینے والے انداز میں چاروں طرف دیکھا، پھر برف پر رکھی ٹارچ اٹھائی اور واپس چل دی۔ میں دم سادھے کھڑا رہا۔ وہ مجھ سے قریباً دس قدم کی دوری سے گزری اور سنبھل سنبھل کر ڈھلوان پر اترتی واپس چل دی۔ اس کے طور اطوار کے علاوہ اس کی چال ڈھال بھی مردوں جیسی تھی۔

میں نے قریباً پانچ منٹ انتظار کیا۔ اس کی ٹارچ کی جگنو جیسی روشنی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں محتاط انداز میں اس مقام کی طرف بڑھا جہاں نہال نے گڑھا کھودا تھا۔ یہاں پر تین چار جگہ لکڑی کے کوئی چھ فٹ اونچے پول کھڑے تھے۔ میں نے ایک پول پر ہاتھ پھیرا۔ اس پر کچھ الفاظ بھی کندہ کیے گئے تھے۔ یہ پول یا تھنے بہت پرانے نہیں لگتے تھے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر دو سیکنڈ کے لیے ٹارچ آن کی اور اس برف کو دیکھا جو کھودی گئی تھی۔ ابھی وہ دوبارہ سخت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے دستانے پہن رکھے تھے اور اسے کھود سکتا تھا۔ میں نے اسے کھودا اور دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہاں قریباً ڈیڑھ فٹ لمبا وہ سفید سانپ نما کیڑا موجود تھا جسے یہاں زوب کہا جاتا تھا۔

اس سے پہلے جو زوب میں نے دیکھا تھا، وہ برسوں سے اکڑا ہوا تھا مگر یہ تازہ تازہ مرا تھا۔ اس کے جسم میں ابھی تک لچک محسوس ہوتی تھی۔ تو گویا یہ بات طے ہو گئی کہ اس زوب نامی کیڑے کی نسل مکمل طور پر معدوم نہیں ہوئی تھی۔ یہ ابھی تک موجود تھا، کم از کم اس غار میں کہیں موجود تھا۔

اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں اوندھا گرا اور ٹارچ ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ گرتے ساتھ ہی میں نے تیزی سے کروٹ بدلی ورنہ سیدھی کلہاڑی کی ضرب یقیناً میرا کندھا توڑ ڈالتی۔ میرے سامنے وہی لمبی تڑنگی، موٹی گردن والی عورت کھڑی تھی جس کا نام راے نے نہال بتایا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے اڑنگا لگا کر اسے پہلو کے بل گرا دیا۔ میں جست لگا کر اس کے اوپر آنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی ایک اور محافظ عورت میرے راستے میں آ گئی۔ میرے سینے پر اس کے سر کی ٹکر زوردار تھی۔ میں پھر گرا مگر ٹکر مارنے والی کو بھی گردن سے دبوچ کر اپنے ساتھ ہی لے لیا۔ افقی رخ پر چلنے والے میرے طاقتور گھونسے نے اسے تقریباً بے ہوش کر ڈالا۔ میں اٹھ کر نہال کی طرف آنا چاہتا تھا مگر وہ اس سے پہلے ہی اٹھ چکی تھی اور سیدھی کلہاڑی سونت کر بلا کی طرح میری طرف آرہی تھی۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگا اور وہ اکیلی نہیں تھی، اس کے پیچھے اب مجھے دو مزید محافظ عورتیں نظر آرہی تھیں۔ میں نے بریٹا پستول نکال لیا اور چند قدم پیچھے کی طرف لیے اور پستول دونوں ہاتھوں میں تھام کر چلایا۔ ”رک جاؤ شوٹ کر دوں گا۔“

نہال نامی وہ عورت نہیں رکی۔ اس کا غضب ناک وار میں نے جھک کر بچایا اور پاؤں کی سیدھی ضرب (فرنٹ کک) کے ذریعے اس کی کہنی توڑ ڈالی۔ کلہاڑی اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گری۔ وہ چند ساعتوں کے لیے ساکت رہ گئی۔ شاید اسے مجھ سے ایسی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ اس کی اس لمحاتی غفلت کا فائدہ اٹھا کر میں نے اسے دبوچ لیا۔ چند ہی لمحوں بعد میں اس کے عقب میں تھا اور پستول کی سرد نال اس کی کنپٹی پر رکھ چکا تھا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نہ صرف مردنما نہال نے اپنی مزاحمت جاری رکھی بلکہ دیگر دونوں عورتیں بھی میری طرف لپکیں۔ ان میں سے کسی کے پاس آتشیں ہتھیار نہیں تھا۔ اس اسٹیج پر میں اس پوزیشن میں تھا کہ نہ صرف نہال کو بلکہ دونوں عورتوں کو بھی بہ آسانی شوٹ کر سکتا تھا۔ عورت ذات پر ہاتھ اٹھانا اور اس کی جان لینا میرے لیے ہمیشہ ہی مشکل رہا ہے۔ شاید ہی ایک دو مواقع ایسے آئے ہوں جب مجھے یہ کڑوا گھونٹ بھرنا پڑا ہو۔ اب بھی میں نہال کو شوٹ نہیں کر سکا۔ دونوں عورتیں مجھ پر پل پڑیں اور نہال بھی ان میں شامل ہو گئی۔ میں نے پستول دور نشیب کی تاریکی میں پھینک دیا۔ اسی اثنا میں پالتو بھیڑیوں کی آوازیں اور تین چار متحرک روشنیاں تیزی سے قریب آنے لگیں۔ نہال کو مزید کمک پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے میرے ہاتھ چمڑے کی مضبوط رسی کے ساتھ پشت پر باندھ دیے۔ اس شور و غل کے سبب اور بھی کئی افراد غار کے دہانے سے نکل کر موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں ہمارے ساتھ پاکستان سے آنے والے تین چار گارڈز بھی تھے۔ دوسروں کی طرح انہوں نے بھی زوب کی لاش دیکھ لی۔ شاید مقامی لوگ مجھے مزید ضربیں لگاتے تاہم اسی دوران میں سردار محافظ ڈولما بھی وہاں پہنچ گئی۔ میرے لیے اس کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔ ڈولما کی نگرانی میں مجھے واپس غار کی طرف لے جایا گیا۔

پالتو بھیڑیے، مضبوط آہنی زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے پھر بھی بے قراری سے میرے اردگرد چکرا رہے تھے۔ ڈولما

نے حکم دیا کہ مشتعل جانوروں کو مجھ سے دور رکھا جائے۔

☆☆☆

مجھے سیدھا مایا رانی کے پاس لے جایا گیا۔ وہ چبوترے پر اپنی منقش کرسی پر براجمان تھی۔ سرخ و سپید چہرے پر اشتعال نظر آرہا تھا۔ مایارانی کی والدہ بوشال ماتا بھی دوسری کرسی پر موجود تھی۔ قریب ہی جادورائے بھی بیٹھا تھا۔

مایارانی نے تنک کر مجھ سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ یہاں کی عزت افزائی تمہیں راس نہیں آئی۔ تم نے نہال کا پیچھا کیوں کیا؟''

مایارانی کا یہ سوال گندھارا نے ترجمہ کر کے مجھ تک پہنچایا۔ رائے کی موجودگی میں مجھ سے یہ سوال کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رائے نے یہ بلا مکمل طور پر میرے سر ڈال دی تھی۔ میں نے مترجم گندھارا کے ذریعے جواب دیا۔ ''میری کوئی غلط نیت نہیں تھی۔ میں ویسے ہی باہر نکلا تھا...... اس عورت کو دیکھا تو تجسس سے مجبور ہو کر پیچھے چل دیا۔''

''تمہاری نیت غلط نہیں تھی۔ اس کے باوجود تم اپنے ساتھ بھرا ہوا پستول لے کر گئے تھے؟'' مایارانی نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔

''لیکن یہ بھی تو دیکھیں رانی صاحبہ، پستول پاس ہونے کے باوجود...... اور اپنی جان کو شدید خطرہ ہونے کے باوجود میں نے فائر نہیں کیا۔ کسی کو زخمی تک نہیں کیا۔''

''اسی لیے تم زندہ بھی نظر آرہے ہو۔'' رانی سرد لہجے میں بولی پھر سوالیہ نظروں سے جادورائے کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں رائے سے پوچھ رہی ہو کہ اپنے اس کارندے کے اس خطرناک فعل کے بارے میں آپ کیا کہتے ہو؟

رائے اٹھ کر میرے پاس آیا۔ مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا اور سخت الفاظ استعمال کیے۔ خلاصہ یہی تھا کہ میں نے اپنی اوقات نہیں دیکھی اور حد سے تجاوز کیا ہے۔ میری قرار واقعی سزا تو یہی ہے کہ میری دو چار ہڈیاں توڑ کر مجھے بستر پر ڈال دیا جائے۔

ظاہر ہے رائے یہ سب کچھ مایارانی کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مگر وہ پوری طرح مطمئن ہو رہی تھی یا نہیں اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ رانی کے ذہن میں بھی یہ بات ہو کہ میں نے اپنے طور پر یہ سب کچھ نہیں کیا، کسی کے کہنے پر کیا ہے۔ یقیناً رانی اور دیگر

''معزز'' خواتین وحضرات کو اس بات کا بھی قلق رہا ہوگا کہ مقامی سانپ نما کیڑے زوب کے حوالے سے ان کا یہ موقف مشکوک ہو گیا ہے کہ وہ اب ناپید ہو چکا ہے۔ بہر طور میرے لیے مایارانی اور اس کی ساتھی خواتین کے رویّے میں اس لیے کچھ نرمی پائی جا رہی تھی کہ میں نے قدرت رکھنے کے باوجود حملہ آور عورتوں میں سے کسی پر فائر نہیں کیا۔ مایا رانی مترجم گندھارا کے ذریعے کچھ دیر تک جادورائے سے کچھ کھسر پھسر کرتی رہی پھر مجھے واپس بھیج دیا گیا۔

میرے ہاتھ کھول دیے گئے تھے البتہ اس سے پہلے میرے بھاری بھرکم لباس کی اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ مترجم گندھارا کے ذریعے مجھے بتایا گیا تھا کہ میں اب پیشگی اجازت کے بغیر اپنے کمرے (گھروندے) سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔

راستے میں مجھے کئی جگہ برف کی دیواروں پر آرائشی چیزیں آویزاں نظر آئیں۔ ان میں رنگ برنگے ریشمی کپڑوں کے فیتے، مصنوعی پھول اور جانوروں کے رنگین پر وغیرہ تھے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، یہ سب اس شادی کی تیاریاں تھیں جو یہاں اب کافی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ ماہین کی شادی لیکن ایک ایسے طریقے سے ہو رہی تھی جو ہمارے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھی۔

ایک جگہ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ یہ غار کے اندر ہی ایک چھوٹا سا غار نظر آتا تھا۔ اس کے اندر گدے اور ریشمی گدیلے بچھے ہوئے تھے۔ کیروسین کے لیمپ بھی روشن تھے۔ چند مرد مزدور اس چھوٹے غار کے ساتھ آٹھ فٹ اونچے دہانے کے آگے ایک مہین ریشمی پردہ لٹکا رہے تھے۔ ہلکے براؤن رنگ کے اس پردے کی وجہ سے اندر جلتے ہوئے تین لیمپس دھندلے سے نظر آتے تھے۔ یہ معلوم نہیں کس چیز کی تیاری تھی۔

مجھے واپس میرے گھروندے میں پہنچا دیا گیا۔ عمران یہاں بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اسے رائے کی آمد سے لے کر میرے باہر جانے تک کی ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ وہ فوراً مجھ سے تفصیل پوچھنا چاہتا تھا مگر اب احتیاط کی ضرورت تھی۔ اب ہمارے گھروندے کے عین سامنے دو محافظ عورتیں مقرر کر دی گئی تھیں۔ یقیناً یہ احتیاط میرے حوالے سے کی گئی تھی اور اس کی وجہ آج والا واقعہ ہی تھی۔

☆☆☆

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ لوگ ماہین کی عجیب و

غریب شادی پر تُل چکے ہیں اور اس میں اہم ترین کردار یہاں کی کُبڑی پیشوا دیوی تورما ہی ادا کررہی تھی۔ دوسری طرف یہ معاملہ عمران اور حسام دونوں کی سوچ سے باہر تھا۔ عمران بار بار مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ اگر یہ ''خرافات'' سیدھی طرح نہیں رکتی، تو پھر ہمیں ان لوگوں سے ٹکر لے لینی چاہیے لیکن یہ بات تو عمران بھی سمجھتا تھا کہ اگر ہزار بارہ سو افراد ایک طرف ہو گئے تو ہم چند کیا کرسکیں گے؟

میں عمران پر یہ انکشاف بھی کر چکا تھا کہ راے اور میم مائرہ کا شک درست ہے۔ زوب نامی کیڑا بالکل ناپید نہیں ہوا۔ اب بھی وہ کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت تعداد میں موجود ہے اور اس کا ثبوت وہ بالکل تازہ مرا ہوا زوب تھا جسے نہال نے دفن کیا تھا۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ جہاں زوب کو دفن کیا گیا وہاں لکڑی کے پول کیوں لگے ہوئے تھے۔ یہ درحقیقت اس جگہ کی نشانی تھی جہاں کسی مرے ہوئے زوب کو دفن کیا جاتا تھا۔ ان پولوں پر مقامی زبان کے کچھ الفاظ بھی کندہ تھے۔ یقیناً یہ کوئی مذہبی تحریر رہی ہوگی۔ جیسا کہ ڈولما کی زبانی ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ اس برادری میں زوب نامی اس نایاب کیڑے کو برکت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ یہ اعتقاد رکھا جاتا تھا کہ زوب کی موجودگی کی وجہ سے شدید برفانی طوفان نہیں آتے اور مہلک سردی سے وابستہ مشکلات کم ہو جاتی ہیں۔

عمران نے میرے چہرے سے تاڑ لیا کہ میں اسی واقعے کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس کے بعد مجھے اس گھروندے میں پابند ہونا پڑا ہے۔ وہ بولا۔ ''ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی جی۔ جب آپ نے زوب کی لاش دریافت کی تو وہ مرد نما نہال واپس کیسے لوٹ آئی؟''

''اس بارے میں، میں نے بھی سوچا ہے۔ ہوا دراصل یہ ہے کہ اس وقت ہلکی برف پڑ رہی تھی۔ ایسی برف پر قدموں کے مدھم نشان آ جاتے ہیں۔ نہال جب واپس جا رہی تھی، اسے ٹارچ کی روشنی میں تازہ برف پر کہیں میرے قدموں کے نشان بھی نظر آئے اور وہ چونک گئی۔''

ہماری اس گفتگو کے دوران میں ہی مقامی معالجہ گندھارا عمران کے سر کی چوٹ دیکھنے کے لیے آ گئی۔ اس کے پاؤں میں آہنی بیڑی بدستور موجود تھی۔ وہ زچگی کے قریب تر ہو رہی تھی اور چلنا پھرنا اس کے لیے مزید مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

عمران کا زخم تقریباً مندمل ہو چکا تھا...... پنڈلی بھی اب ٹھیک تھی۔ گندھارا نے اطمینان کا اظہار کیا۔ میں نے کہا گندھارا، تم واقعی ایک قابل معالج ہو۔ اگر بچے کی پیدائش کے بعد...... خدانخواستہ تمہیں واقعی موت کی سزا دے دی گئی تو یہ لوگ تمہارے اس خداداد فن سے محروم ہو جائیں گے۔''

وہ افسردگی سے بولی۔ ''اس کا انتظام بھی ان لوگوں نے کر لیا ہے۔ میری ایک شاگرد کو تیار کیا جا رہا ہے کہ وہ میرے بعد میرے کام کو سنبھال سکے۔ چند اور عورتیں بھی ہیں جو اس کام کو کچھ نہ کچھ جانتی ہیں۔''

عمران بولا۔ ''اگر راے اور میم مائرہ میں سے کوئی سفارش کرے...... یا ہم سب مل کر مایا رانی سے درخواست کریں، تو کیا بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔''

''مشکل...... بلکہ ناممکن ہے۔'' گندھارا نے گہری سانس لی۔ ''ان معاملات میں مایا رانی سے بھی زیادہ سخت دیوی تورما ہے۔ اس کے منہ سے جو بات نکل جائے، وہ پتھر پر لکیر ہوتی ہے اور اگر دیکھا جائے تو میں قصوروار بھی تو ہوں نا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں نے مایا رانی کو دکھ پہنچانے والوں کا ساتھ دیا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی سکامر سے بے حد پریم کرتی تھیں۔ سکامر کی بے وفائی کی وجہ سے مایا رانی کو اسے سزا دینا پڑی۔ اسے جان سے مارنا پڑا۔''

گفتگو گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''گندھارا! یہ ماہین کی شادی والا کیا مذاق ہے۔ کچھ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا اور پھر بات یہ بھی ہے کہ جب دونوں دولہا ہی راضی نہیں تو یہ شادی کیسے ہو سکتی ہے؟''

وہ بولی۔ ''یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ شادی ہوئی بھی تو بس دکھاوے کی ہوگی۔ کوئی اس کو دل سے نہیں مانے گا اور نہ ہی اس لڑکی ماہین کا کسی سے کوئی... ازدواجی تعلق بنے گا۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ کسی عورت سے تو زبردستی بھی ہو سکتی ہے لیکن......''

میں نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن وہ سمجھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے زرد مرجھائے ہوئے سے چہرے پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نظر آئی۔ یہ خوشی کی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس میں بے حد کرب چھپا ہوا تھا۔ ''یہ دیوی تورما ہٹ کی بہت پکی ہے۔'' گندھارا نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔ ''یہ اپنے عقیدے کے مطابق وہی کرے گی جو چاہتی ہے۔ ان تینوں کو ازدواجی بندھن میں باندھے گی اور اس بات کی بھی تسلی کرے گی کہ یہ ازدواجی تعلق قائم کریں۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے بھنا کر کہا۔ عمران کا چہرہ بھی سرخ ہوگیا۔

گندھارا نے پھر ایک عمیق سانس لی۔ ''بات تو شرم کی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ قدیم رسم کے مطابق دیوی تورما چھائی ان کے حجلۂ عروسی پر نظر رکھے گی۔ ایک خاص قسم کا پردہ وہاں لٹکایا جائے گا۔ وہ نہ تو اتنا باریک ہوگا کہ سب کچھ عیاں کردے اور نہ اتنا موٹا کہ سب کچھ چھپالے۔ اس رات تورما چھائی پردے کی دوسری جانب موجود رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔''

میں اور عمران سخت تحیّر کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ''اور ایسا یہاں کوئی پہلی بار نہیں ہورہا...... اس سے پہلے بھی میرے ہوش سنبھالنے کے بعد کم از کم دو دفعہ ایسا ہوا ہے جب باہر سے آنے والے کچھ لوگوں کو ایسی ہی شادی پر مجبور کیا گیا۔ دوسری مرتبہ کوئی پندرہ سال پہلے ایسا ہوا تھا، جب ایک جاپانی ڈاکٹر کے ساتھ آنے والے لوگوں میں سے ایک بندی اور دو بندوں کو ایسی شادی پر مجبور کیا گیا تھا۔ بعدازاں وہ تینوں کافی عرصہ یہاں پر رہے پھر ان میں سے ایک بندہ نمونیے کا شکار ہوکر مرگیا اور دوسرا بندہ اور اس کی بیوی واپس چلے گئے۔ اب تو لوگوں کو ان کے نام بھی یاد نہیں رہے۔''

''وہ جاپانی ڈاکٹر کون تھا جس کی ٹیم میں وہ لوگ یہاں آئے تھے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں ڈاکٹر جی کا نام یاد ہے۔ ان کو مسٹر شا کہا جاتا تھا۔ بہت ہی محنتی اور دماغ والے شخص تھے۔''

ڈاکٹر شا کے نام نے مجھے اور عمران کو چونکایا۔ یہ ڈاکٹر شا ہی تو تھا جس نے ریسرچ کے دوران میں حادثاتی طور پر ایک وائرس ایجاد کرلیا تھا اور پھر دن رات محنت کر کے اس وائرس کی ویکسین بھی بنائی تھی۔ اسی ویکسین کے فارمولے کے کاغذات ارب پتی ڈیرن اور اس کی بیوی میم مائرہ کے پاس موجود تھے مگر بعدازاں ایلی کی وجہ سے میاں بیوی میں شدید ناچاقی اور پھر طلاق ہوئی۔ میم مائرہ اپنے شوہر کے وہ کاغذات بھی لے اُڑی جس میں ویکسین کا سائنسی فارمولا تھا۔ وہ اپنی دانست میں مکمل کاغذات لائی تھی مگر وہ مکمل نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے جادورامے کے ساتھ مل کر یہ ویکسین بنانا چاہی تو انہیں شدید دشواریاں پیش آئیں۔ بالآخر میری اور عمران کی خطرناک کاوش کے سبب ایلی اور ڈیرن باقاعدہ طور پر اغوا ہوکر رامے اور مائرہ کے قبضے میں آئے اور یوں ڈاکٹر شا کے کاغذات کا ادھورا پن مکمل ہوا۔

گندھارا کی زبانی ڈاکٹر شا کا نام سننے کے بعد یہ سارے خیالات چند ثانیے کے اندر میرے ذہن سے گزر گئے...... یقیناً عمران کے ذہن سے بھی گزرے ہوں گے۔

بہرحال ابھی ہم نے اس ڈاکٹر شا والے واقعے کو مزید کُریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہماری تمام تر توجہ اس واقعے پر مرکوز تھی جو ابھی پیش نہیں آیا تھا لیکن پیش آنے والا تھا۔ ابھی ذرا دیر پہلے گندھارا نے حجلۂ عروسی کی بات کی تھی، میرے ذہن میں فوراً ایک دن پہلے کا وہ منظر چمک گیا جو میں نے یہاں اس گھروندے میں پابند ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا غار، اس میں گیس لیمپس کی ملفوف روشنی اور چپٹی ناکوں والے مزدور جو ایک مہین پردہ دہانے پر آویزاں کررہے تھے۔ سردی کے باوجود مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

شادی کی تیاری جاری تھی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عمران کا پارا چڑھتا چلا جارہا تھا۔ دوسری طرف حشام کا چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا۔ یقیناً وہ ماہین کو عمران کے ساتھ تقسیم کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ حشام کیا، کوئی بھی ہوتا اسے یہ صورت حال قبول نہ ہوتی۔ دور غار کے کسی اندرونی حصے میں نفیری اور اک تارا بجنے کی آواز آرہی تھی۔ گندھارا اور منوہر سنگھ کی زبانی پتا چلا تھا کہ یہ شادی کی رسموں میں سے کوئی رسم ہے جو ماہین کے ساتھ ادا کی جارہی ہے۔ گندھارا نے ہی بتایا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں کچھ عورتیں یہاں آئیں گی اور وہ ماہین کے ''محبوبوں'' کی حیثیت سے عمران اور حشام کو قیمتی گلوبند پہنائیں گی۔ اس رسم کے دو دن بعد شادی کی رسم ادا ہوجائے گی۔

عمران نے میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اس بے ہودگی کو روکنے کے لیے ہمیں کوئی عملی قدم اٹھانا ہوگا۔''

''مثلاً کیا کروگے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں یہ گلوبند ہرگز نہیں پہنوں گا۔ اس سے مایا رانی اور اس خبیث دیوی تورما کو یقین ہوجائے گا کہ یہ خرافات انجام کو نہیں پہنچ سکتی۔''

''تمہارے یا حشام کے گلوبند نہ پہننے سے یہ شادی رک جائے گی؟''

''پھر بھی نہ رکے گی تو میں پہرا توڑ کر مایا رانی کے سامنے پہنچ جاؤں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ ہمیں یہ سب قبول

نہیں۔"

"یہاں مرد کی نہیں، عورت کی مرضی چلتی ہے۔"

"تو پھر عورت کی اصل مرضی معلوم کریں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ماہین اس طرح کی شرمناک صورتِ حال کو قبول کر سکتی ہے؟"

"منوہر سنگ بتاتا ہے کہ وہ برین واشنگ قسم کے عمل سے گزری ہے۔ وہ راضی ہے۔"

"سو فیصد غلط...... ایک سو دس فیصد غلط۔" عمران نے بھنا کر کہا۔ اس کا چہرہ سرخ تر ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو کرب کروٹ لے رہا تھا، وہ اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ وہ ماہین کے لیے محبت اور چاہت کے اعلیٰ ترین جذبات رکھتا ہے، اس کا عشق اس کے دل کی عبادت گاہ میں ایک چراغ کی طرح روشن ہے۔ شاید یہ ویسی ہی...... یا اس سے ملتی جلتی محبت تھی جو کبھی اس کے والد نے شبانہ سے کی تھی اور پھر درد کے سمندر میں ڈوب کر اسے کھویا تھا...... ہاں کہانیاں خود کو دہراتی ہیں۔

ابھی ہم بات کر رہے تھے کہ نفیری، ڈھولک اور اک تارے کا شور نزدیک تر آ گیا۔ ہم نے دیکھا بہت سے مرد زرق برق لباس پہنے، ہاتھوں میں طشتریاں اٹھائے ہماری جانب آ رہے تھے۔ ان میں کچھ بچے بھی شامل تھے۔ طشتریوں میں مٹی کے دیے تھے اور بھنے ہوئے اناج (گندم) کی خوشبو تھی۔ چند عورتوں نے بھی ایسی ہی طشتریاں اٹھا رکھی تھیں۔ ان کے عقب میں کبڑی تورما چھائی، چمک دار لاٹھی ٹیکتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے اردگرد ڈولما اور دیگر محافظ عورتیں تھیں۔

کچھ دیر بعد وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا، حسام اور عمران کو لکڑی کی بنی ہوئی دو خوب صورت کرسیوں پر بٹھایا گیا...... تورما چھائی کے اشارے پر جب ان دونوں کو گلوبند پہنانے کی کوشش کی گئی تو دونوں نے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ عمران نے تو ہاتھ چلا کر گلوبند دور پھینک دیا۔ تورما چھائی کے جھریوں بھرے چہرے پر طیش کے سبب زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے زور سے چلا کر مقامی زبان میں کچھ کہا۔ دو محافظائیں کٹاریں نکال کر عمران کے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں...... جیسے تورما چھائی کے ایک اشارے پر اس کی گردن کاٹ سکتی ہوں۔ منوہر سنگھ کی "ترجمانی" کے ساتھ تورما اور عمران کے درمیان جو مکالمہ ہوا، وہ اس طرح تھا۔

"تم جانتے ہو تم نے جو حرکت کی ہے، وہ ہمارے خداؤں کے نزدیک کتنی غلط ہے اور اس کی کتنی بڑی سزا تمہیں مل سکتی ہے۔"

عمران نے کہا۔ "جو سزا تم لوگ دے رہے ہو، اس سے بڑی اور کیا ہو گی۔ تم اپنے رسم و رواج ہم پر ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہو اور یہ ہمیں ہرگز قبول نہیں۔"

تورما چھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "دو مردوں کا ایک ہی عورت سے عشق کرنا جائز ہے۔ دن رات اس سے ملن کے سپنے دیکھنا جائز ہے...... مگر ملن جائز نہیں ہے۔"

"جسموں کا ملاپ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ کسی سے دور رہ کر بھی اس سے محبت کی جا سکتی ہے۔"

"دور رہ کر صرف جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔ ساری عمر اپنی ہی آگ میں جلا جا سکتا ہے یا پھر چوری چھپے والے کام کیے جا سکتے ہیں۔ ہمارا قانون مردوں کو بھی یہ موقع دیتا ہے کہ اگر دو مرد ایک ہی عورت پر مرمٹے ہیں تو اس کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ بالکل جس طرح تمہاری دنیا میں ایک مرد اپنی پسندیدہ دو یا اس سے زیادہ عورتوں کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔"

"تم اور تمہاری مایا رانی فطرت کے خلاف جانا چاہ رہی ہو اور اس میں ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔"

"تم اپنی بکواس بند رکھو۔" دیوی تورما گرجی۔ "مایا رانی، اس لڑکی کو اپنی سہیلی کا درجہ دے چکی ہے اور تم دونوں کے لیے حکم صادر کر چکی ہے۔ اب وہی ہو گا جو ہم چاہتے ہیں۔"

تب دیوی تورما نے اپنی جھکی ہوئی کمر کو سیدھا کر کے حسام کی جانب دیکھا۔ "کیا تم بھی یہی انکار والی حماقت کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

حسام کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا، تاہم اس کا جواب بھی انکار میں آیا۔

دیوی تورما یک دم بھڑک اٹھی۔ اس کے جسم پر طیش کے سبب لرزہ سا طاری ہو گیا۔ گرج کر بولی۔ "مقدس گلوبند پہناؤ ان دونوں احمقوں کو......"

ایکا ایکی کئی مسلح عورتوں اور مردوں نے عمران اور حسام کو گھیر لیا۔ جب ڈولما نے عمران کو زبردستی گلوبند پہنانے کی کوشش کی تو اس نے دھکا دے کر ڈولما کو دور ہٹا دیا۔ عمران کے جذباتی پن کا نتیجہ خطرناک تصادم کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ ابھی اس کے سر کا زخم بھی بمشکل مندمل ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر عمران کو روکا۔ اسی اثنا میں وہ مرد نما عورت نہال کے منہ پر زوردار گھونسا جڑ چکا تھا۔ یکا یک

کئی مسلح عورتوں مردوں نے عمران کو دبوچ لیا۔ اس کے گلے میں زبردستی گلوبند پہنا دیا گیا۔ دوسری طرف حشام نے بھی معمولی مزاحمت کی مگر اسے گلوبند پہننا پڑا۔

اب بہت سے لوگ ہمارے اردگرد جمع ہو چکے تھے...... ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ چہروں پر اشتعال بھی نظر آتا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے منوہر سنگھ سے پوچھا۔

''حشام اور عمران صاحب کے انکار نے لوگوں کو غصہ دلایا ہے۔ خاص طور سے عمران صاحب کا، گلوبند فرش پر پھینک دینا سب کو بہت برا لگا ہے۔ وہ اسے ایک بڑا اپرادھ سمجھ رہے ہیں۔''

عمران اب بھی تھوڑی بہت مزاحمت کر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف کٹاریں اور برچھیاں چمک رہی تھیں۔ طاقت آزمائی خودکشی کے مترادف تھی۔ اسی دوران میں مایا رانی کی والدہ بوشال ماتا بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے حکم پر عمران کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔ تیز دھار آلات کے نرغے میں عمران اور حشام کو غار کے اندرونی حصے کی جانب دھکیلا جانے لگا۔

☆☆☆

یہ کیا ہو رہا تھا؟ گمان نہیں کیا تھا کہ مقامی طرز کی شادی والی یہ صورتِ حال اتنی سنگین شکل اختیار کر جائے گی۔ راما نے اس سے بچنے کا حل یہ بتایا تھا کہ ہم جلد از جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر یہاں سے نکل جائیں...... مگر یہ سوچ خام خیالی ہی ثابت ہوئی تھی۔ ہمارے ''مطلوبہ زوب'' تک پہنچنے کا فی الحال دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا...... اور شادی کے نام پر یہ خرافات، مجسم حقیقت بن کر ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ عمران اور حشام کو کہاں لے جایا گیا ہے اور وہ کس حال میں ہیں۔ رات کو اپنے برفیلے گھروندے میں اکیلا لیٹا میں دیر تک سوچتا رہا۔ یہ بات حقیقت تھی کہ عمران بڑی خاموشی سے ماہین کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ دوسری جانب اس حقیقت سے بھی انکار نہیں تھا کہ حشام کسی صورت ماہین کو کھونا نہیں چاہتا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ماہین کی ملکیت کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دو تین سال سے منگیتر تھے۔ یقیناً حشام اور عمران دونوں نے نہ سوچا ہوگا کہ کسی وقت ایسی صورتِ حال بھی پیش آسکتی ہے۔

رات دوسرے پہر میری آنکھ لگ گئی۔ صبح کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ یہ پنجابی لہجے والی ہما عروج تھی۔ ''ڈپٹی جی! آپ یہاں سوئے پڑے ہو وہاں بہت بڑا تماشا لگا ہوا ہے۔''

ہما کی آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے آنکھیں مل کر سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھا۔

وہ بولی۔ ''ان دونوں منڈوں نے کام بہت بگاڑ لیا ہے۔ لگتا ہے کہ دونوں نے ہی اس ویاہ سے انکار کیا ہے...... اور اس انکار کی وجہ سے مایا رانی اور دوسری زنانیاں آگ بگولا ہو گئی ہیں۔ دونوں منڈوں کو باندھ دیا ہے انہوں نے۔''

''کہاں باندھ دیا ہے؟''

ہما عروج کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا گیا۔ ''اسی تھاں پر...... جہاں پر مایا کے بھاگ جانے والے خصم اور اس کی مدد کرنے والی زنانی کو آگ لگائی گئی تھی۔''

میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یوں لگا جیسے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

ہما ہراساں لہجے میں بولی۔ ''سچی گل ہے ڈپٹی جی، میرا تو کلیجا نکل رہا ہے۔ مایا رانی کا غصہ وی رانیوں والا ہی ہے، کوئی بڑی ڈھیں پٹاس نہ ہو جائے۔''

میں جیکٹ پہن کر اٹھا اور ہما کے ساتھ بھاگم بھاگ دہانے تک پہنچا۔ غار اور اس کی ساری شاخیں تقریباً خالی نظر آ رہی تھیں۔ مسلح محافظ عورتیں بھی شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں بھی دہانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ میرے لیے تو مایا رانی کا حکم تھا کہ میں اپنی آرام گاہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔

باہر کا منظر دیکھ کر میں کانپ گیا، یہ تقریباً وہی تھا جو سکا مرا اور عورت کو زندہ جلائے جانے کے موقع پر نظر آیا تھا۔ عمران اور حشام دونوں پتھر کے ستونوں سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر چوٹیں تھیں۔ اردگرد سیکڑوں کا مجمع تھا۔ مایا رانی، کبڑی پیشوا دیوی تورما اور چند معزز عورتیں کرسی نما نشستوں پر براجمان تھیں۔

یکایک چند مسلح عورتیں مجھ پر جھپٹیں اور مجھے جکڑ لیا۔ ان میں ڈولما اور مرد نما نہال بھی شامل تھیں۔ میں مزاحمت کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور اگر رکھتا بھی تو یہ کافی مشکل تھا۔ بڑی پھرتی سے میرے ہاتھ پشت پر جکڑ دیے گئے۔ بلا کی سردی تھی اور برچھیوں کے یخ بستہ پھل میری گردن کو چھو رہے تھے، مجھے ایک جانب لکڑی کے طویل بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ یہاں منوہر سنگھ کے علاوہ گونگا جہاناں، فورمین بہروز اور ہمارے ساتھ آنے والے چند نہتے گارڈز بھی موجود تھے۔ بہرحال راما

اور مائرہ خاص مہمانوں میں نظر نہیں آتے تھے۔

لوہے کی بیڑی میں جکڑی ہوئی حاملہ مترجم گندھارا کے ذریعے مایا رانی، عمران اور حسام سے جو گفتگو کر رہی تھی، وہ اس طرح تھی۔

مایا رانی نے کہا۔ ”نہیں، کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ یا تو تم دونوں کو شادی کرنا پڑے گی، یا پھر موت کو گلے لگانا ہوگا...... اور یہ شادی بھی بخوشی کرنا ہوگی۔“

یہ دیکھ کر میری رگوں میں لہو جمنے لگا کہ ان وحشیوں نے عمران اور حسام دونوں کے اردگرد خشک لکڑیاں چن دی تھیں...... جیسے دونوں پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتے ہوں کہ اگر بات نہیں مانی گئی تو سزا وہی ہوگی جو بتا دی گئی ہے۔

عمران اور حسام دونوں انکاری رہے، عمران کا انکار زیادہ حتمی محسوس ہوتا تھا، مایا رانی نے ذرا نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے جیسے ایک اور کوشش کی۔ ”کیوں اس نوجوانی میں اپنی جان گنوانا چاہتے ہو۔ تم دونوں کو ہی...... بلکہ تینوں کو ہی وہ سب کچھ مل رہا ہے جو تم چاہتے تھے۔ تم دونوں اپنی محبوب ماہین کے ساتھ من چاہی زندگی گزارو گے۔ یہاں ہمارے ہاں اپنا ایک خاندانی نظام ہے۔ کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوتا، عورت اور اس کے باکروں کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ باکروں کے ازدواجی حقوق اور ان کی تقسیم کے لیے بھی ایک تفصیلی طریقہ طے ہوتا ہے۔“

حسام کے چہرے پر طیش کے آثار نظر آئے۔ عمران بھی پھنکارا۔ ”ہم لعنت بھیجتے ہیں، تمہارے اس نظام اور طریقے پر، سو بار لعنت بھیجتے ہیں۔“ میں عمران کو پہلی بار اس قدر سنجیدہ اور کرب میں دیکھ رہا تھا۔

مایا رانی نے کہا۔ ”تم اس نظام پر لعنت نہیں بھیج رہے، یہاں کے دستور کے مطابق ایک خوب صورت اور دلکش زندگی پر لعنت بھیج رہے ہو، ان لاتعداد خوب صورت راتوں پر لعنت بھیج رہے ہو جو تمہارے حصے میں آنے والی ہیں۔ وہ ریشمی اندھیرے جو نوجوانوں کے لیے زندگی کا اصل جوہر ہوتے ہیں، تم بر آمدہ خوشی پر نفرین بھیج کر تکلیف دہ موت کو گلے لگانا چاہتے ہو۔“

کبڑی دیوی تورما نے کرخت آواز میں کہا۔ ”اور مایا رانی کے نزدیک یہ ایک عورت سے بے وفائی بھی ہے اور تم جانتے ہو مایا رانی مرد کی بے وفائی کو معاف نہیں کرتیں۔“

اگلے دو چار منٹ میں یہ تکرار جاری رہی۔ حسام زیادہ خوف زدہ تھا، تاہم حسام اور عمران کو اب بھی یہی لگ رہا تھا کہ شاید یہ سب کچھ انہیں ڈرانے کے لیے کیا جا رہا ہے اور مایا رانی آخری حد تک نہیں جائے گی۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔

مگر پھر...... اچانک ہی صورت حال اتنی سنگین ہوگئی کہ مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ تکرار اور اشتعال کی کیفیت اچانک ہی عروج پر پہنچ گئی۔ مایا رانی کا سرخ چہرہ آگ کی طرح دہک گیا۔ اس نے کوئی مخصوص اشارہ کیا اور مسلح عورتوں نے خشک لکڑیوں پر چربی کا تیل چھڑک دیا۔ حسام کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ عمران ایک مضبوط نوجوان تھا اور وہ ابھی تک غیر معمولی مضبوطی کا مظاہرہ کر رہا تھا...... لیکن ابھی تک شاید اسے یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی یہ سب کچھ ہونے جا رہا ہے۔

یہ کڑی آزمائش کے لمحے تھے۔ میں عمران کو اپنے سامنے ان لوگوں کی وحشت کی بھینٹ چڑھتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے پتا تھا، اب میں مزید نہیں رک سکوں گا، اپنے بندھے ہاتھوں کے باوجود مایا رانی اور دیوی تورما پر جا پڑوں گا اور وہ کچھ کر گزروں گا جو اُن کے گمان میں بھی نہ ہوگا۔ اس کے بعد جو بھی ہو جاتا، وہ قبول تھا۔

...... ہاں یہ سخت ترین آزمائش کے لمحے تھے۔ ایسی آزمائش جس میں فولاد بھی پگھلتا ہے اور پتھر پانی ہوتے ہیں۔ آزمائش کے ایسے لمحے ارادوں اور پندھاروں کو توڑ کر چکنا چور کرتے ہیں اور آہنی عزائم والے لوگ بھی تنکوں سے ہلکے ہو کر ہواؤں میں بکھرنے لگتے ہیں۔ مایا رانی کی للکار ایک حتمی آواز بن کر گونجی۔ ”آخری لمحوں میں یہ آخری موقع ہے۔ ہماری بات مانی ہے، یا دیوتاؤں کی اس اگنی میں جلنا ہے......“

مشعل بردار عورتیں خشک لکڑیوں کے بالکل قریب کھڑی تھیں۔ حسام کی آواز جیسے کسی بہت گہرے کنویں کے اندر سے برآمد ہوئی اور بہت سے کانوں تک پہنچی۔ ”میں...... مرنا...... نہیں چاہتا۔“

”تو پھر کیا چاہتے ہو؟“ مایا رانی نے پکار کر پوچھا۔ ”کیا تمہیں منظور ہے؟“

حسام کے چہرے سے جیسے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ چکا تھا۔ تحیر زدہ کئی نگاہوں نے دیکھا کہ حسام نے اثبات میں سر ہلایا۔

”زبان سے بولو۔ جواب دو۔“ مایا رانی گرجی۔

”مم...... مجھے...... منظور ہے۔“ اس نے کہا اور اس کے یہ الفاظ گندھارا نے ترجمہ کر کے مایا رانی اور دیگر عورتوں تک پہنچائے۔ فضا کا سکوت جیسے ایک مہیب چھناکے سے ٹوٹ گیا تھا۔ کوئی بہت تنا ہوا رسا جیسے زبردست تڑاخے سے ٹوٹا تھا اور اس کے ساتھ بندھی ہوئی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ گئی

تھی۔ اس توڑ پھوڑ کا اصل ہدف بے شک حشام ہی تھا۔

مایا رانی نے ابرو سے کوئی اشارہ کیا۔ تیل میں بھیگی ہوئی خشک لکڑیوں کے قریب کھڑی مشعل بردار عورت پیچھے ہٹ گئی اور صرف وہی نہیں ہٹی جو حشام کے قریب تھی، وہ بھی ہٹ گئی جو عمران کے قریب تھی۔ مایا رانی نے مسکراتی نظر سے حاضرین کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اس کے اٹھتے ہی باقی خواتین بھی اٹھ گئیں۔

☆☆☆

مایا رانی نے بڑے عجیب انداز سے فیصلہ کیا تھا اور یہ ایسا فیصلہ تھا جسے کوئی جھٹلا ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ فیصلہ عمران کے حق میں تھا، جو آخر تک ثابت قدم رہا تھا۔ آخری آٹھ دس منٹ میں اعصاب کی جو سخت ترین جنگ ہوئی تھی، وہ یادگار تھی۔ مایا رانی کے علاوہ شاید دو چار معزز عورتوں کو ہی یہ علم تھا کہ عمران یا حشام میں سے کسی کو جلایا نہیں جانا...... صرف اس بات کی جانچ کی جانی ہے کہ کون واقعی ماہین کی محبت کا حق دار ہے۔

اس واقعے کے بعد حشام تو ہکا بکا تھا ہی عمران بھی حیران تھا۔ وہ جیسے موت کو چھو کر واپس آیا تھا۔ اب سہ پہر ہونے والی تھی۔ میں اور عمران پہلی بار اس وسیع غار کے اس خصوصی حصے میں موجود تھے جہاں مایا رانی اور دیگر معزز مرد و زن رہتے تھے۔ یہاں فرش کے علاوہ منجمد دیواروں پر بھی غالیچے وغیرہ موجود تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ اس خطرناک لیپرڈ کی کھال بھی نظر آرہی تھی جو چند روز پہلے مایا رانی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ غار کے اس حصے میں سردی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مایا رانی کافوری لیمپ کی روشنی میں بڑی تمکنت سے ہمارے سامنے قالین پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھی تھی۔ منوہر سنگھ مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

مایا رانی نے عمران سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم مبارک باد کے مستحق ہو تم نے خود کو ماہین کا درست حق دار ثابت کیا ہے...... مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ حشام سے زیادہ ''تم'' اس کی زندگی کے لیے موزوں اور مناسب ہو۔''

مایا کی بات سننے کے بعد عمران نے منوہر کے ذریعے جواب دیا۔ ''مایا رانی! آپ ایک طرح سے یہاں کی فرمانروا ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا ہم اس پر اعتراض نہیں کر سکتے مگر میں اور میرے ساتھی ماہین کے حوالے سے سخت الجھن میں ہیں۔ میں...... اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

وہ مسکرائی۔ ''غالباً تم ان باتوں کی وجہ سے الجھن میں ہو جو اس آزمائش سے پہلے پھیلائی گئی تھیں اور جن میں ماہین کی رضامندی بھی بتائی گئی تھی۔ وہ سب غلط ہے۔ دیوی تورما چھائی بھی جو کچھ کہہ رہی تھی یا کر رہی تھی اس کے ایما پر کر رہی تھی۔ ماہین اس سارے معاملے سے تقریباً بے خبر تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں یہ فیصلہ کس طرح سے کرنے جا رہی ہوں، ورنہ شاید وہ مجھے روکنے کی کوشش کرتی۔''

''کیا وہ اب بھی لاعلم ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں۔'' مایا رانی پھر مسکرائی۔ ''وہ سب کچھ جان چکی ہے...... اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ خود بھی ایک بڑی الجھن سے نکلی ہے۔ آج کے واقعے سے پہلے ہی وہ حشام کے حوالے سے تذبذب کا شکار ہو چکی تھی۔ آج کے واقعے کے بعد مجھے سو فیصد یقین ہے کہ حشام اس کی زندگی سے نکل گیا ہے...... ہمیشہ کے لیے۔''

''لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں رانی جی... کہ میں اس کی زندگی میں داخل ہو گیا ہوں۔'' عمران نے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ تم بہت عرصے سے اس کی زندگی میں ہو...... اور شاید...... وہ بھی تمہاری زندگی میں ہے۔ اب قدرت نے تم دونوں کو ایک بہترین موقع فراہم کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس سے ملو۔ تم دونوں ایک دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول دو۔ دیوتا بھی یہی کہتے ہیں کہ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ شادی کے سارے انتظامات موجود ہیں۔ تم دونوں ایک روز بعد اٹوٹ بندھن میں بندھ سکتے ہو۔''

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''مایا رانی! ہم آپ کے جذبات کی بے حد قدر کرتے ہیں لیکن ہمارے لیے یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں۔ سب سے پہلے تو ماہین اور عمران کا ملنا ضروری ہے۔ اگر یہ کوئی فیصلہ کرتے بھی ہیں تو اس سے پہلے ان کے بڑوں کی مرضی ضروری ہو گی اور......''

مایا رانی نے ذرا تلخ ہو کر ہاتھ اٹھایا۔ ''ماہین کے بڑوں کی مرضی تو میں کچھ نہ کچھ جانتی ہوں۔ تمہاری دنیا میں بڑوں کے فیصلے ٹھونسے جاتے ہیں اور اکثر ''محبت'' کو ذبح کیا جاتا ہے۔'' مایا کی آنکھوں میں پھر وحشت جھلکنے لگی۔

جوان مایا رانی ذرا غصے میں ہوتی تھی تو اس کا چہرہ آگ کی طرح دہکنے لگتا تھا اور وہ صرف نام ہی کی رانی نہیں تھی۔ چند روز پہلے ہم نے بھٹکے ہوئے برفانی لیپرڈ کے ساتھ اس کی دلیرانہ لڑائی دیکھی تھی۔

میں نے دھیمے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ کی بات بجا ہے رانی! پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ اگر شادی ہونی ہے تو پھر ہمارے طریقوں سے ہو۔''

''یہاں بھی تمہارے طریقوں سے ہی ہو گی۔'' رانی نے کہا۔ ''ہم نے کبھی بھی باہر کے لوگوں کو یہاں کے رسم و

رواج پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کرتی۔ اب تک جو کچھ ہوا یہ ایک ناٹک تھا اور تم دونوں بھی یہ بات بخوبی سمجھ رہے ہو۔"

"آپ سے درخواست ہے مایا رانی کہ مجھے ایک بار ماہین سے ملنے کا موقع دیں۔" عمران نے کہا۔

عمران کے گداز لہجے نے مایا کے چہرے پر درشتگی کچھ کم کر دی۔ (ویسے بھی اس کا رویہ عمران کی نسبت مجھ سے کچھ سخت تھا۔ یقیناً اس کی وجہ وہی نہال والا واقعہ تھا۔ میں نے نہال کا پیچھا کیا تھا اور اسے زوب کو دفن کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مقامی لوگوں نے رامے اور مائرہ کو یہی بتایا تھا کہ زوب اب ناپید ہو چکا ہے مگر نہال والے واقعے سے ثابت ہوا تھا کہ ایسا نہیں ہے)

عمران نے مایا رانی سے درخواست کی تھی کہ وہ ماہین سے ملنا چاہتا ہے۔ مایا رانی آمادہ نظر آنے لگی مگر اسی دوران میں قریب ہی کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ پھر دو محافظ عورتیں زور سے چلائیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور آواز ابھری۔ مجھے شک گزرا کہ یہ مترجم گندھارا کی آواز ہے۔ دو سیکنڈ بعد گندھارا لڑکھڑاتی ہوئی اندر آ گئی۔ پاؤں میں آہنی بیڑی کے سبب وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور مایا رانی کے قدموں کے پاس گر گئی۔ اس کے چہرے پر تازہ چوٹیں تھیں اور جیسے دم گھٹنے کے سبب ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ وہ فریادی انداز میں مایا رانی سے مخاطب ہوئی اور رو رو کر کچھ بتانے لگی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوا کہ کسی نے اسے بند کر دیا تھا اور وہ خود کو چھڑا کر یہاں پہنچی ہے۔ وہ مقامی زبان میں بات کرتے ہوئے بار، بار ہماری طرف بھی اشارہ کر رہی تھی، جیسے کوئی بڑا انکشاف کر رہی ہو۔ مایا رانی اور منوہر وغیرہ کی آنکھوں میں بھی حیرت کا ریلا سا بہنے لگا۔ مجھے لگا کہ وہ گندھارا، جادو رامے اور مائرہ کا نام بھی لے رہی ہے۔

مایا رانی نے تسلی دینے والے انداز میں گندھارا سے کچھ کہا پھر میری طرف دیکھا۔ گندھارا اپنا پیٹ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ محافظ عورتوں نے اسے دونوں طرف سے تھاما اور دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ مایا رانی بھی پیچھے گئی۔ ہم وہیں قالین پر بیٹھے تھے۔

"کیا ہوا ہے؟" عمران نے منوہر سے پوچھا۔

منوہر کے چہرے پر حیرت کی یلغار تھی، بولا۔ "گندھارا نے اتفاقاً جادو رامے اور مائرہ کی گفتگو سن لی ہے۔ اس گفتگو سے اس پر انکشاف ہوا ہے کہ وہ دونوں ہر صورت میں زوب تک پہنچنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ گندھارا نے یہ بھی بتایا ہے کہ چند روز پہلے آپ نے نہال کا جو پیچھا کیا تھا، وہ بھی رامے کی ہدایت اور حکم پر کیا تھا...... وہ زوب کی ٹوہ لگانے میں مصروف ہے۔"

"بس، یا کچھ اور بھی؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کچھ اور بھی جی۔" منوہر سنگھ نے کہا۔ "گندھارا نے بتایا ہے کہ رامے اور مائرہ ہر صورت زندہ زوب تک پہنچنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں، چاہے اس کے لیے انہیں کچھ بھی کرنا پڑے۔ گندھارا کو یہ بھی شک ہے کہ ان دونوں نے بھاری رشوت اور تحفے تحائف دے کر یہاں کے کسی اہم فرد کو اپنے ساتھ بھی ملایا ہوا ہے۔ اندر خانے کچھ پک رہا ہے۔"

یہ باتیں واقعی انکشاف انگیز تھیں۔

میں نے منوہر سے کہا۔ "گندھارا بات کرتے ہوئے بار بار میری طرف بھی اشارہ کر رہی تھی؟"

"جی جناب! اس نے رامے کا ایک اور پول بھی کھولا ہے۔ وہ یہ کہ مایا رانی کی رقیب ہریتی سے لڑ کر اسے رامے نے نہیں آپ نے مارا تھا۔ رامے نے غلط طور پر اس کا کریڈٹ لیا اور تمغا وصول کیا۔ اس طرح کی کچھ اور باتیں بھی وہ بتا رہی ہے۔"

"گندھارا کو پکڑا کس نے تھا؟"

"دراصل رامے اور مائرہ کو پتا چل گیا کہ گندھارا نے چھپ کر ساری باتیں سن لی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک گارڈ کی مدد سے اسے دبوچ لیا اور گھسیٹ کر ایک تاریک کمرے میں لے گئے جہاں کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہاتھ پیر باندھ دیے۔ شاید وہ اس کی ہتھیا ہی کر دیتے مگر لگتا ہے کہ وہ اس سے یہاں اندر کی کچھ جانکاریاں بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ واہگرو نے کرپا کی کہ گندھارا بندھے ہوئے منہ کے ساتھ غوں غاں کی جو آوازیں نکال رہی تھی وہ کسی طرح اس کی ایک شاگرد لڑکی تک پہنچ گئیں۔ اس نے گندھارا کی بندشیں کھولیں اور وہ بھاگتی ہوئی یہاں مایا رانی کے پاس آ گئی۔"

ایکا ایکی مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں صورتِ حال سنگین تر ہونے والی ہے۔ رامے اور مائرہ کا بھید کھل گیا تھا۔ ان کے پاس آتشیں ہتھیار موجود تھے اور بقول گندھارا انہوں نے یہاں کے کسی اہم فرد کو اپنے ساتھ بھی ملا لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا ٹکراؤ ہونے والا ہے۔

برف کدے میں خطرناک لوگوں کے درمیان پھنسے تابش، عمران اور ماہین کی مشکلات کا احوال اگلے ماہ پڑھیے



کالی کوکھ

امجد اقبال

کبھی کبھی راہ چلتے ایسا واقعہ نظر سے گزرتا ہے کہ انسان خود کو ہلکان کر لیتا ہے... کوشش اور خواہش کے باوجود وہ اس کے حصار سے نکل نہیں پاتا... ایک ایسے ہی نوجوان کی بپتا جس کے دن و رات پریشانی، بے یقینی اور لا حاصل جدوجہد میں گزر رہے تھے...

جھپکی تھی آنکھ کہ منظر بدل گیا...... ایک اَن دیکھے دشمن کی چال کا احوال......

مجھے رات بہت اچھی لگتی ہے۔ میں دوستوں سے اکثر کہا کرتا ہوں کہ رات کا متبادل نہیں ہے۔ خاموشی، اندھیرا، خنکی، چاند، تارے، سوئے ہوئے اونگھتے ہوئے پیڑ، سنسان سڑکیں، ویران گلیاں، خمار میں مستغرق در و بام اور ایسے میں دور کہیں ریلوے اسٹیشن پر بجنے والی مخصوص سیٹی اور ریل کی چھک چھک۔ اور تو اور ایسے فسوں ماحول میں اگر کہیں قریب یا دور سے کسی گاڑی وغیرہ کے انجن کی گھرر گھرر بھی سنائی دے جائے تو بڑا انوکھا سا لطف آتا ہے۔ حالانکہ

دن کے ہنگاموں میں انہی انجنوں کی آوازیں قیامت سے کم نہیں لگتیں۔ میرا خیال ہے کہ رات دراصل حسن اور روحانیت کی کھوج کا سمے ہوتا ہے۔ آپ کے ذہن میں ایسے ایسے شاندار خیالات کا نزول ہوتا ہے کہ دن میں آپ ان کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ جو لوگ دن کے تھکا دینے والے ہنگاموں کے تو عینی شاہد ہوتے ہیں لیکن رات کے سحر سے واقف نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ سرِشام ہی نیند کی کشادہ بانہوں میں سمٹ جاتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر احمق کوئی ہو نہیں سکتا۔ ان پر رات کے بھید نہیں کھل سکتے۔ گویا وہ زندگی کے ایک بہت بڑے پہلو کو دریافت کیے بغیر ہی مر جاتے ہیں۔

آپ کو میرے یہ خیالات بہت اچھے لگے ہوں شاید۔ ممکن ہے آپ نے میری شخصیت کا جو پہلا عمومی تاثر قائم کیا ہو، وہ ایک بہت حساس یا آرٹسٹ قسم کے انسان کا ہو۔ لیکن میں بھی رات بھر نہیں جاگ سکتا۔ نجانے کیوں نیند مجھے رات کے بارہ بجتے ہی دبوچ لیتی ہے۔ یہ میرے بچپن کی عادت ہے۔ میں بہت تگ و دو کر کے بھی رات ایک بجے سے زیادہ نہیں جاگ سکتا۔ یعنی میں رات بارہ ایک بجے تک ہی رات کا فسوں کھوج سکتا ہوں۔ اس کے بعد بہت سے رازوں کو کھنگالے بنا ہی دل میں دریافت کی طلب لیے سو جاتا ہوں۔

میں نے جب پہلی جماہی لی تو حمید نے جھٹ سے رسٹ واچ دیکھی اور بولا۔ ”لو بھئی! تیرا وقت تو ہو گیا۔“

میں نے تاش کے پتّوں کو چھانٹتے ہوئے کہا۔ ”فکر مت کر...... یہ بازی کھیل کے ہی اٹھوں گا۔“

شکیل نے کہا۔ ”لے...... اِکّا لے......“

قیصر نے اپنے پتّوں کو دیکھ کے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو، میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں...... یہ لے...... جوکر لے......“ پھر وہ مجھے کہنی مار کے بولا۔ ”صابر...... بیٹا آنکھیں اور دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھ...... ورنہ پٹخوں گا تجھے...... ایسا پٹخوں گا کہ الو کی بھی کیا پٹختا ہو گا۔“

تاش کی بازی جاری رہی۔ اِکّا، بادشاہ، کوئن، جوکر...... پتے اٹھتے اور گرتے رہے۔ بازی ختم ہوئی تو میں ایک گہری سانس کھینچ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”بکواس...... آخری بازی ہر روز میں ہی ہارتا ہوں، جیسے یہی لکھ دیا گیا ہے نتیجہ۔“

قیصر نے ہنس کے کہا۔ ”لکھ نہیں دیا گیا میرے دوست...... قصور تیرا اپنا ہے۔ آخری بازی تک تیری آنکھیں بظاہر بسیار کوشش سے کھلی رہتی ہیں۔ پر تیرا دماغ سو جاتا ہے۔ دیکھ لے، ابھی فقط ساڑھے بارہ ہوئے ہیں۔“

”بھائی تم کھیلو......“ میں نے ایک اور جماہی لے کے کہا۔ ”میں تو چلا۔ گھر پہنچتے پہنچتے ایک بج ہی جائے گا۔ پکی بات ہے۔“

”تو بائیک کیوں نہیں لے لیتا؟“ قیصر نے مشورہ پیش کیا۔

میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔ ”لے لوں گا۔ جب حالات سنوریں گے۔“

حمید نے کہا۔ ”اچھا ہے، تیرے پاس بائیک نہیں ہے۔ اب تو گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ جاتا ہے۔ جتنی تجھے نیند آتی ہے، تو تو مار بیٹھے گا رات کو بائیک کسی دیوار میں۔“

اس بات پر وہ تینوں ہنسنے لگے۔

میں جوتے پہن کے اور کانوں پر مفلر لپیٹ کے دیوار پر نصب آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔ بلب کی کم تیز روشنی میں تاریک تاریک سا عکس تھا۔

”اچھا بھائی۔ کل ملیں گے۔“ میں نے الوداعی ہاتھ ہلایا اور باہر نکل آیا۔

”عجیب آدمی ہے یار......“ میری سماعتوں نے کمرے میں شکیل کا تبصرہ سنا۔ ”سارا دن بینک کے ٹھنڈے کمرے میں فارغ ہی بیٹھتا ہے بلکہ وہاں بھی نیند پوری کر لیتا ہو گا۔ پھر بارہ بجتے ہی گھر کی طرف بھاگتا ہے۔ جیسے دن بھر کا تھکا ہارا ہو اور اڑتالیس گھنٹے سے نہ سویا ہو کم از کم۔“

حویلی کے وسیع احاطے میں بلب کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں کے اُس پار رات کی تاریکی مسلط تھی۔ بے داغ خاموشی تھی۔ گیٹ کے پاس شہتوت کا سربلند اور گھنا پیڑ اپنی جھکی ہوئی شاخوں کے ساتھ گویا گہری نیند کے عالم میں اونگھ رہا تھا۔ میں گیٹ سے باہر نکلا۔ ہلکی چاندنی میں کولتار کی سیاہ سڑک تاحدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھی۔

میرا گھر تین کلومیٹر دور تھا۔ یعنی کہ پیدل کی پچیس تیس منٹ کی مسافت۔ میں نے سبک قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔

باوجود یہ کہ نیند غالب آرہی تھی۔ رات کے فسوں نے میرے تخیل پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔ سڑک پر چلتے وقت قدموں کی چاپ بھی مجھے موسیقی کے سُروں کے مانند معلوم ہو رہی تھی۔

میری رفتار خاصی تیز تھی اور میرے تصور کے پردے پر خیالات اُمڈے چلے آرہے تھے...... دور تک بچھی کولتار کی یہ کالی سڑک یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی غیر

دریافت شدہ جزیرے کی سمت جاتی ہو۔ سڑک کے اطراف میں مکانات یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے رات کے سحر سے وجد میں آ کے آہستہ آہستہ جھوم رہے ہوں...... اور درخت یوں سرنگوں کھڑے تھے، جیسے کسی گہرے دکھ نے ان کی توانائیاں نچوڑ کر انہیں نڈھال کر دیا ہو۔

میرا گھر ایک نو آباد شدہ کالونی میں تھا۔ گو کہ یہ کالونی اب شہر کا حصہ ہی تصور ہوتی تھی، تاہم یہاں شہر کی سی گہما گہمی اور نہیں تھی۔ بہت سارے پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ اکثریتی مکانات رہائشی تھے۔ میں دو کلومیٹر تک سڑک پر چلنے کے بعد کالونی کی طرف جانے والی ٹوٹی پھوٹی نیم پختہ، نیم کچی سرک پر مڑ گیا۔ اب مجھے مزید ایک یا سوا کلومیٹر کی مسافت طے کرنا تھی۔

سڑک پر مڑتے ہی ہمیشہ کی طرح ایک ناخوشگوار احساس نے میرے رگ و پے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہاں آ کر رات کے فسوں کا مجھی ستیاناس ہو جاتا تھا۔ گہری تاریکی ہر شے کو چھپا لیتی تھی اور تو اور یہاں پر چاند کی چاندنی بھی زیادہ کارگر معلوم نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس کا رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں پر بسنے والوں میں اکثریت محنت کشوں کی تھی۔ شہر کی راتیں جاگتی ہیں اور جاگنے پر اکساتی رہتی ہیں جبکہ یہاں معاملہ برعکس تھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے لوگ ہر شام ہی یوں سوتے تھے کہ یہ پوری کالونی خوابیدہ سی معلوم ہوتی تھی۔

میں اپنے مکان سے محض آٹھ دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ نیند آنکھوں کو بوجھل کیے دے رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ دودھ کا گلاس پینے کے بعد یوں بستر پر گروں گا کہ صبح نو دس بجے سے پہلے نہیں اٹھوں گا۔ اس خیال نے بھی مسرت آمیز طمانیت بخشی کہ کل اتوار ہے۔ بینک کی چھٹی ہو گی۔ جب جی چاہے گا اٹھوں گا۔ ملازم پیشہ افراد ہفتے میں صرف ایک دن بادشاہ ہوتے ہیں۔ باقی چھ دن محکومی کرتے ہیں۔

مجھے ٹھٹک کے رک جانا پڑا۔ رات کی تاریکی میں مجھ سے چند سو گز کے فاصلے پر ایک پیڑ کے نیچے ایک سایہ موجود تھا اور یہ بات کالونی کے 'کلچر' سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ کیونکہ رات کی تاریکی کے باوجود میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ سایہ کسی عورت کا تھا۔ رات کے ایک بجے ایک عورت وہاں کیا کر رہی تھی؟ میری حسیات بیدار ہو گئیں۔ نیند کا احساس غائب ہو گیا اور تجسس جاگ اٹھا۔

اس عورت نے مجھے نہیں دیکھا تھا شاید۔ میرے وجدان نے گواہی دی۔ میں نے کچھ سوچ کے آگے بڑھنا ترک کر دیا اور ایک قریبی درخت کے موٹے سے تنے کی آڑ لے لی۔ اب اُس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ میری باقی حسیات ہی نہیں بلکہ آنکھیں بھی اب پوری طرح بیدار تھیں۔ میں مختلف زاویوں سے سوچ رہا تھا کہ اس وقت ایک اکیلی عورت وہاں کیونکر موجود ہو سکتی تھی؟

کیا وہ کسی جادو ٹونے میں مصروف تھی؟ عورتیں کالے علم میں عموماً دلچسپی رکھتی ہیں لہٰذا اس امکان کو خارج از قیاس نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے، وہ کسی پیر یا عامل کی ہدایت پر اپنے کسی دشمن کی زندگی تلپٹ کرنے کی غرض سے وہاں پر کوئی عمل کر رہی ہو۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے یا شوہر سے لڑ جھگڑ کے گھر سے نکل پڑی ہو اور اب کوئی اور ٹھکانا نہ پا کر بے بسی سے وہاں پر کھڑی شب گزاری کر رہی ہو اور اپنے جذباتی فیصلے پر پچھتا رہی ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے زبردستی گھر سے نکال دیا ہو۔ لیکن ابھی ٹامک ٹوئیے ہی مارے جا سکتے تھیں۔ کوئی حتمی بات نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ عورت شاید اضطراری طور پر پیڑ کے قریب ٹہل رہی تھی۔ کبھی چند ثانیوں کے لیے رک جاتی۔ پھر اٹھ کے ٹہلنے لگتی۔ میں اس کی کیفیت سمجھ بھی رہا تھا اور سمجھنے سے قاصر بھی تھا۔ یوں کہنا بے جا نہیں ہو گا کہ میں خود بھی ڈانواں ڈول تھا۔

میرے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ میں پوری رات وہاں رک کر اس عورت کا پہرا نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کے ایک فیصلہ کیا...... کہ مجھے اس کے نزدیک جانا چاہیے اور اس سے پوچھنا چاہیے کہ وہ وہاں کیا کر رہی ہے؟

یوں تو دو مسلح گارڈز رات کے لیے کالونی میں تعینات کیے گئے تھے جو رات بھر کالونی میں گشت کرتے تھے۔ تا کہ چوری چکاری کا احتمال نہ رہے۔ لیکن آج شاید وہ بھی سو گئے تھے یا پھر ابھی اُن کا اِدھر سے گزر نہیں ہوا تھا۔

میں ابھی اس عورت کے نزدیک جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ میری آنکھ نے دیکھا، وہ وہاں سے جانے لگی تھی۔ میں چونک گیا اور میں پیڑ کے تنے کی اوٹ سے نکل کے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میری رفتار خاصی تیز تھی اور میری چھٹی حس نے مجھے باور کروایا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ دو سائے سڑک پر رواں دواں تھے۔ وہ آگے تھی، میں پیچھے۔ وہ ایک گلی میں مڑ گئی تو میں نے باقاعدہ بھاگنا شروع کر دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ

کسی گھر میں داخل ہو کر میری نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے لیکن جب میں اس گلی میں مڑا تو اس کا ہیولا کچھ دور جاتا نظر آیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔

اس نے رک کے ایک گھر کا دروازہ بلا کھٹکے کھولا اور اندر غائب ہو گئی۔ میں اس دروازے پر نظریں جمائے تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں پہنچا اور ایک گہری سانس لے کے رہ گیا۔ دروازہ اندر سے مقفل ہو چکا تھا۔

میں کچھ دیر تک خالی الذہنی کے عالم میں کھڑا آہنی دروازے کو گھورتا رہا۔ میری سانس ہلکی سی پھولی ہوئی تھی۔ کچھ دوڑنے اور کچھ تجسس اور سنسنی کے باعث۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں؟ کیا دروازہ کھٹکھٹانا مناسب ہوگا؟ میرا دل نہ مانا۔ میں کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہنے کے بعد تھکے تھکے قدموں سے واپسی کے راستے پر چل پڑا۔

لیکن نیند اُڑ چکی تھی۔ میں نے سوچا، گھر جانے سے پہلے اس درخت کے پاس جانا چاہیے۔ آخر پتا تو چلے کہ وہ عورت وہاں کر کیا رہی تھی؟

میں درخت کے پاس پہنچا تو وہاں بھی گہری تاریکی کا بسیرا تھا۔ میں نے احتیاطاً سیل فون کی ٹارچ جلائی اور درخت کے اطراف میں پھینکی۔ درخت کے تنے کے قریب کوئی چیز روشنی میں چمکی تو میں بے اختیار اس سمت لپکا۔ وہ شاید کوئی بیگ وغیرہ تھا۔ میں نے اسے ہلا جلا کے دیکھا تو وہ ایک موٹا سا کمبل تھا۔ میں نے کمبل کو ہلایا جلایا تو یکلخت ہی مجھے کرنٹ سا لگا اور میں لرز کر چند قدم پیچھے جا کھڑا ہوا۔ خنکی کے باوجود لہو رگوں میں سلگ اٹھا۔

کمبل میں ایک نومولود سا انسانی وجود تھا۔ جیسے ہی میرا ہاتھ اس کے وجود سے مس ہوا، میں کانپ اٹھا۔ تو وہ بدنصیب گناہ کی پیداوار تھا، جسے اس کی ماں اپنی زندگی اور عزت بچانے کے لیے رات کے اس پہر اس ویران مقام پر پھینک گئی تھی؟

میں چند منٹوں تک گم صم کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کوئی ماں اس قدر سفاک بھی ہو سکتی ہے کہ اپنے وجود سے نکلی ایک زندگی کو یوں بے دردی سے کہیں ویرانے میں پھینک دے؟ کالونی میں کتوں کی بہتات تھی۔ اگر وہ کتے اس طرف آنکلتے تو یقیناً اس نومولود کو ہضم بھی کر چکے ہوتے۔

دکھ، حیرت، صدمے اور پریشانی سے میرا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ٹارچ درخت کے تنے کے ساتھ پڑے کمبل کا احاطہ کر رہی تھی۔ بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ہمت مجتمع کی اور آگے بڑھ کر کمبل تھوڑا سا کھسکایا۔ بچہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ جس طرح سکون سے لیٹا ہوا تھا، مجھے خیال آیا کہ شاید وہ زندہ نہیں تھا۔ ممکن ہے، اس کی ڈائن ماں نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ میں کمبل کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔ بچے کو ہلا جلا کے دیکھا۔ وہ نوزائیدہ معصوم زندہ تھا۔ اس کے نتھنوں سے سانسیں پھوٹ رہی تھیں۔ البتہ وہ طمانیت بھری نیند سویا ہوا تھا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر کم از کم تین یا چار دن کی تھی۔ میں نے دیکھا، وہ ایک گورا چٹا، خوب صورت بچہ تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ تاریکی کا راج تھا۔ اونچے نیچے بغیر کسی مربوط اور جامع منصوبہ بندی سے بنے مکانات سکوت میں ڈوبے تھے۔ کالونی قبرستان کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔

''کیا کروں؟'' میں نے بے چینی سے سوچا۔

گارڈز کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں بچے کو وہاں کتوں کے رحم و کرم پر کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ورنہ میرا مقام بھی ایک کتے سے زیادہ نہ رہ جاتا۔

بالآخر میں نے چند لمحوں کے غور و فکر کے بعد جھک کر کمبل سمیت بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر معصوم بچے کے چہرے کے ننھے ننھے خدوخال کو دیکھتے ہوئے خود سے دریافت کیا کہ کیا کروں؟ کیا اس کی ماں کے گھر کے دروازے پر دستک دوں اور اسے کہوں کہ اپنا بچہ لے لو۔ مگر وہ سفاک عورت تو خود اپنے بچے کو وہاں چھوڑ گئی تھی۔ وہ کیوں اسے قبول کرے گی۔ بلکہ یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کے سامنے صاف مکر جائے اس بچے کے ساتھ اپنے تعلق سے۔ اور میں نے تو اس عورت کا چہرہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ صرف اس کا ہیولا ہی دیکھا تھا۔

تو میں کیا کروں اس بچے کا...... اس بچے کا وجود میری روح کو چیر رہا تھا۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا اور میرے قدم اپنے گھر کی جانب اٹھنے لگے۔

☆☆☆

دو چار دن میرے لیے خاصی پریشانی کے تھے۔ بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی۔ دو دن بینک سے بھی غیر حاضر رہا۔

یوں تو میں تنہائی پسند انسان ہوں۔ عمر میری تیس سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اپنے مکان میں گزشتہ چھ سات سال سے اکیلا رہ رہا ہوں۔ ماں، باپ کے انتقال کے بعد شادی بیاہ وغیرہ کا سوچا بھی نہیں میں نے۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والے مذہب کا پیروکار ہوں۔ نہ تو

کسی کے معاملات میں ٹانگ اڑاتا ہوں، نہ کسی سے زیادہ میل جول رکھتا ہوں۔ محلے میں بھی بہت کم لوگوں کے ساتھ میری یاداللہ ہے اور جن لوگوں کے ساتھ ہے، وہ بھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ میری فطرت ہی ایسی ہے۔ لیکن اس رات کو پیش آنے والے واقعے نے خود میں مگن رہنے والے میرے جیسے انسان پر بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔

بینک، کالونی کے شرقی نکڑ سے گزرنے والی مین روڈ پر تھا۔ مجھے بینک تک پہنچنے میں چالیس منٹ لگتے تھے۔ میں روزانہ یہ مسافت پیدل ہی طے کرتا تھا۔ اپنے اندر کھوج پیدا ہو جانے کے باعث اب میں اس گلی کا اکثر چکر لگایا کرتا تھا، جس میں اس رات کو وہ عورت داخل ہوئی تھی۔ بینک کے لیے نکلتے وقت میری نگاہیں آپ ہی آپ اس گلی کی سمت اٹھ جاتی تھیں اور بینک سے نکلنے کے بعد میں سیدھا اپنے دوستوں کے پاس چلا جاتا اور رات گئے تک وہاں بازی جمتی تھی اور پھر میں جب رات بارہ ایک بجے کے قریب اپنے گھر کی طرف نکلتا تو ایک بے نام سے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس گلی میں چلا جاتا اور اس مکان کے سالخوردہ آہنی دروازے کو دیکھ کے اپنے گھر کی طرف بڑھ جاتا۔

کچھ تگ و دو اور پوچھ تاچھ کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مکان رشید احمد کا ہے، تو میں حیرت سے دوچار ہوا۔ رشید احمد ہمارے بینک کے بالکل سامنے بریانی شاپ چلاتا تھا اور میں نے کئی بار اس کی شاپ سے بریانی کھائی تھی۔ وہ پختہ عمر کا قدرے بھاری بھرکم شخص تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ میلے شلوار قمیص میں دیکھا تھا اور اس کے منہ میں ہمیشہ پان ہوتا تھا۔ سر پر سفید ٹوپی رکھتا تھا۔

جب مجھے یہ پتا چلا کہ وہ مکان رشید احمد کا ہے تو میرے ذہن میں اس کا سراپا گھوم گیا تھا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ وہ عورت جو اس رات پیڑ کے نیچے ایک نومولود بچے کو بے رحمی سے چھوڑ گئی تھی، اس کی کیا لگتی ہو گی؟ بیٹی......؟ بہن......؟ یا کوئی اور رشتے دار؟ میں دو ایک بار اس کی شاپ پر گیا بھی...... لیکن اس ضمن میں کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ فقط بریانی کھا کر وہاں سے اٹھ آیا۔

اس واقعے نے مجھے ذہنی طور پر اس قدر متاثر کیا تھا کہ میرے معمولات غیر محسوس انداز میں بدلتے چلے گئے۔ مثلاً میں نے ایک ہی ہفتے میں بینک سے کئی چھٹیاں کر لی تھیں۔ حالانکہ میں اس قدر ریگولر ہوا کرتا تھا کہ گزشتہ ایک سال میں، میں نے صرف ایک چھٹی کی تھی۔ میری چھٹیوں پر منیجر صاحب کو تشویش ہوئی اور انہوں نے مجھے بلا کر خصوصی باز پرس کی تھی۔ میں نے کچھ خانگی الجھنوں کا عذر بنا کر جان چھڑوالی تھی۔

علاوہ ازیں یہ کہ میں نے دوستوں کی طرف کم کم جانا شروع کر دیا تھا۔ انہیں میری غیر حاضری پر تشویش ہوئی تھی۔ میں نے انہیں بھی جھوٹ موٹ بہانہ بنا کر مطمئن کر دیا تھا۔

ایک روز میں نے گرین ٹی اسٹال پر لطیف کو گھیر لیا۔ اس کی منحوس صورت دیکھتے ہی میرے ذہن میں بجلی کی سی سرعت سے ایک آئیڈیا آ گیا تھا۔ وہ حسب عادت چیونگم چباتا ہوا آ رہا تھا کہ میں اس کے سامنے آ گیا۔ وہ مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ”صابر بابو...... بڑی موج میں آ رہے ہو۔ ذرا دیکھ کے چلا کرو۔“

وہ کترا کر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ ”کدھر جا رہے ہو؟“

بولا۔ ”میں کدھر جا سکتا ہوں صابر بابو...... سارا شہر ہی اپنی جاگیر ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

”کدھر؟“

”وہاں...... تمہیں چائے پلاتا ہوں۔“

منہ بنا کر کہنے لگا۔ ”رہنے دو جی۔ میں چائے پی کر ہی نکل رہا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ چلو۔“

”ضروری بات......؟“ اُس نے بے تاثر سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”صابر بابو! تم ٹھہرے شریف النفس دفتری بابو...... مجھ ناچیز سے کون سی ضروری بات کرنا چاہتے ہو۔ ایک سال پہلے کہا تھا کہ بینک میں نوکری دلوا دو...... نوکری چاہے سیکیورٹی گارڈ کی ہو...... وہ تک تو نہیں دلوا سکے۔“

میں نے اُس کے شکوے کو نظر انداز کر کے کہا۔ ”بیوقوف...... تمہارے فائدے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں؟“

وہ شانے اُچکا کے میرے ساتھ چلا آیا۔ ہم ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے دو کپ چائے آرڈر کرنے کے بعد بیزار صورت لطیف کو دیکھا۔ ”ایک چھوٹا سا کام ہے۔ کر دو گے تو تمہیں ٹھیک ٹھاک رقم دوں گا۔“

”بولو جی...... سن رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''رحمان گلی...... مکان نمبر نو...... رشید بریانی فروش کا گھر ہے۔ جانتے ہو نا اُسے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا۔ ''معلوم یہ کرنا ہے کہ اُس کے گھر میں کُل کتنے افراد رہتے ہیں۔''

''خیریت؟'' وہ چونکا۔

''صرف اپنے کام سے مطلب رکھو تو بہتر ہے۔'' میں نے اسے گھورا۔ ''اور صرف افراد کی تعداد نہیں معلوم کرنی ہے بلکہ ہر فرد کا نام بھی معلوم ہونا چاہیے۔ ہر عورت اور ہر مرد کا نام جاننا ہے مجھے۔''

وہ کچھ متجسس سا نظر آیا۔ شاید اس کے اندر یہ کھد بدی پیدا ہو رہی تھی کہ مجھ جیسے دفتری بابو، کو رشید بریانی فروش کے گھر کے افراد سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

''کتنے پیسے دو گے اس کام کے؟'' بالآخر اس نے اپنے مطلب کی بات کی۔

''پانچ ہزار۔'' میں نے کہا۔

وہ منہ بنا کر بولا۔ ''صرف پانچ ہزار؟...... صرف پانچ ہزار میں کیا ہوتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہیں صرف ان کے نام معلوم کرنے ہیں...... انہیں اغوا نہیں کرنا۔ سمجھے!''

''دس ہزار لوں گا صابر بابو۔''

''سات ہزار دوں گا۔ اب دکان داروں والی بات نہ کرو۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''تمہارے پاس دو دن ہیں۔ دو دن میں یہ کام مکمل کرو۔''

''کچھ ایڈوانس دو۔'' وہ کاروباری انداز میں بولا۔

میں نے تین ہزار روپے اُس کے حوالے کر کے کہا۔ ''باقی کام کے بعد۔''

دو روز بعد وہ میرے گھر میں میرے سامنے کرسی پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لے کر بتا رہا تھا۔ ''صابر بابو...... رشید بریانی والے کے گھر میں کُل نو افراد ہیں۔ ایک اس کی بیوی ہے۔ اس کا نام سلمٰی ہے۔ ایک اس کی بھتیجی ہے۔ اس کا نام صاعقہ ہے۔ چار لڑکیاں ہیں اس کی...... آسیہ، کرن، روبینہ اور مریم۔ اور تین اس کے لڑکے ہیں۔ جن کے نام ہیں ٹونی، بنی اور عامر۔ دسواں رشید خود ہے۔''

''پکی بات ہے نا...... ان کے سوا تو کوئی نہیں ہے؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

کہنے لگا۔ ''لطیف ایک اعتماد کا نام ہے جی...... لوگ مجھ پر بھروسا کرتے ہیں۔ کام کے سلسلے میں کبھی ڈنڈی نہیں ماری۔ اگر میری معلومات غلط ثابت ہوں تو پھر جو جی چاہے سزا دینا مجھے۔''

''اوکے۔'' میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم واقعی کام کے بندے ہو۔'' پھر میں نے چار نوٹ ہزار ہزار کے اس کی مٹھی میں دے دیے۔ اس نے نئے نوٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر انہیں چوم کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اجازت؟''

''ہاں، اجازت۔'' میں نے کہا تو وہ خوشی خوشی وہاں سے چلا گیا۔

میں اکیلا بیٹھ کے سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ رشید احمد کی عمر پچاس سال کے اریب قریب ہوگی۔ دیکھا جائے تو اس کے بچے جوان ہوں گے۔ لوئر مڈل کلاس میں مالی مشکلات کے باوجود کم عمری میں شادیاں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تو لڑکیاں بلوغت کی قانونی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اپنے گھر کی ہو جاتی ہیں۔ رشید احمد کی پہلی اولاد کی عمر پچیس سال یا اس سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ تو کیا اس نے اپنی جوان بیٹیوں کی شادیاں نہیں کی تھیں؟ یہ اور اس جیسے کئی سوال ابھی بھی منہ پھاڑے کھڑے تھے اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے لطیف سے ادھورا کام لیا تھا۔ محض اس کے بچوں کی تعداد اور ان کے نام جان کر کسی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا تھا۔

لطیف کالونی کے آوارہ اور لوفر لڑکوں میں شمار ہوتا تھا۔ مجھے اُس کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں۔ بس یہ معلوم تھا کہ وہ پیسے لے کر لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا تھا۔ ان کاموں کی نوعیت اخلاقی بھی تھی اور غیر اخلاقی بھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اسے جا پکڑا تو وہ میرا مدعا سن کے بولا۔ ''صابر بابو! اب میں یہ پوچھوں گا کہ تمہیں رشید کے گھر سے کیا دلچسپی ہے...... تو تم بُرا مناؤ گے؟''

''بالکل۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں یہ پوچھنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں پیسے سے غرض ہونی چاہیے۔''

''اوکے۔'' اس نے سنجیدگی سے ذرا خاص کاروباری انداز میں کہا۔ ''مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ رشید بریانی والا بہت بدتمیز اور سخت طبیعت کا آدمی ہے۔ اس کام میں خطرہ بہت ہے۔ میں مشکوک بھی ہو سکتا ہوں۔ دس ہزار سے ایک روپیہ کم نہیں لوں گا۔''

''یار، کچھ خدا کا خوف کرو۔'' میں نے کہا۔ ''صرف

معمولی سی معلومات حاصل کرنی ہیں۔ کوئی دہشت گردوں کی پناہ گاہوں کا سراغ نہیں لگانا، اتنے سے کام کے دس ہزار؟"

"اتنا سا کام؟" وہ شاطر مسکرایا۔ "صابر بابو...... یہ کام کہنے کو اتنا سا لگ رہا ہے۔ آپ خود یہ کام کرتے تو آپ کو پتا چلتا کہ اس میں کس قدر خطرہ ہے...... کیسے کیسے لوگوں سے ملنا پڑے گا اور کہاں کہاں خوار ہونا پڑے گا۔ اگر یہ اتنا سا کام ہے تو آپ خود کرلو۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "آٹھ ہزار۔"

"دس۔" وہ اڑ گیا تھا۔

میں نے ہار مان لی۔ "ٹھیک ہے۔ یہ لو چار ہزار ایڈوانس...... چھ کام کے بعد ملیں گے اور سنو...... معلومات غلط نہ ہوں ورنہ پچھتاؤ گے۔ اور ہاں، تمہارے پاس کل کا دن ہے۔ پرسوں مجھے رپورٹ چاہیے، ہر حال میں۔"

پرسوں وہ دوسری بار میرے سامنے میرے گھر میں بیٹھا رپورٹ پیش کررہا تھا۔ "رشید بریانی والے کی بڑی دونوں بیٹیاں دوسرے شہر میں ایک ہی گھر میں دو بھائیوں سے بیاہی ہوئی ہیں۔ وہ عید، بقرعید پر ہی میکے میں شکل دکھاتی ہیں۔ چھوٹی بیٹیوں میں سے ایک اِدھر ہی محلے میں بیاہی ہوئی ہے۔ اس کے میاں کی آٹو ورکشاپ ہے۔ سب سے چھوٹی مریم ابھی کنواری بیٹھی ہے۔ پتا چلا ہے کہ بہت تیز وطرار لڑکی ہے۔ محلے کے لڑکوں کو انگلیوں پر نچاتی ہے۔ لڑکوں میں بڑا اپنی بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے شہر میں ہوتا ہے۔ وہ وہاں پر اپنے بہنوئی کے ساتھ مل کر کاروبار کرتا ہے۔ منجھلا عامر ہے، جو چند ماہ پہلے بیاہا گیا ہے اور اپنے باپ کے ساتھ بریانی شاپ پر ہوتا ہے۔ ویسے وہ شادی کے بعد کرائے کے گھر میں علیحدہ رہ رہا ہے۔ سب سے چھوٹا ٹونی ہے جو گھر میں مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ ابھی وہ تیرہ چودہ سال یا اس سے کم عمر کا ہے۔ یہ تو ہو گئے رشید بریانی والے کے بچے...... بیوی اس کی گھریلو عورت ہے۔ رشید چونکہ بڑا سخت مزاج ہے۔ وہ اس سے دب کر رہتی ہے اور اس کا محلے کی عورتوں سے میل جول نہ ہونے کے برابر ہے۔ رشید کا چھوٹا بھائی تین سال پہلے ایک کنٹینر کے نیچے آکر کچلا گیا تھا۔ اس کی لڑکی صاعقہ کم وبیش ڈیڑھ دو سال سے رشید کے گھر میں رہ رہی ہے۔ کیونکہ اس کی ماں نے اس کے باپ کی موت کے ایک ڈیڑھ سال میں ہی دوسری شادی رچالی تھی۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ "گویا اس وقت رشید احمد کے گھر میں کُل پانچ افراد مقیم ہیں...... اُس کی چھوٹی لڑکی اور لڑکا، اس کی بھتیجی، اس کی بیوی اور وہ خود۔"

"ہاں جی، یہ پکی معلومات ہیں۔ اگر یہ معلومات غلط ثابت ہوئیں تو میں پوری رقم آپ کو واپس کردوں گا۔"

میں نے اسے توصیفی نظروں سے دیکھا۔ "تم بہت کام کے آدمی ہو۔"

اُس کے چہرے پر یہ سن کے ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔

میں نے اسے چھ ہزار دے کر رخصت کردیا۔

☆☆☆

میری تنخواہ زیادہ نہیں تھی۔ لیکن چونکہ میں فیملی کے جھنجٹ سے آزاد تھا، لہٰذا میری زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔

میں نے محض تجسس میں پڑ کر چند ہی دنوں میں سترہ ہزار کی 'خطیر' رقم اڑا دی تھی۔ لطیف کا یہ مہینا خوشی خوشی گزرنے والا تھا اور میرا کھینچ کھانچ کر۔

کیا تھا اگر میں تجسس میں نہ پڑتا۔ وہ کون عورت تھی جو اُس رات اپنا لختِ جگر پیڑ کے نیچے رکھ کر چلتی بنی تھی؟ کیا اُس کے بارے میں جاننا ضروری تھا؟ فرض کیا، میں اُس عورت کی بابت جان بھی لیتا ہوں...... لیکن میں کروں گا کیا؟ کیا وہ عورت مان لے گی کہ وہی اُس رات چند لمحوں کی لذت یا کمزوری کے نتیجے میں جنم لینے والا گناہ کی پوٹ وہاں پھینک گئی تھی؟

لیکن جس طرح محبت خود بخود پیدا ہوجاتی ہے، تجسس بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ محبت انسان کو چین نہیں لینے دیتی۔ تجسس بھی انسان کو بے چین رکھتا ہے۔ یہ معما بری طرح میرے اعصاب پر سوار ہوگیا تھا اور یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اُس رات کے بعد میں کسی اور چیز کے متعلق سوچ ہی نہیں پایا تھا۔ جیسے میری سوچوں کے تمام زاویے ایک ہی نقطے پر آکر مرکوز ہوگئے تھے۔

میں نے ہر پہلو پر سوچ لیا تھا۔ کسی پہلو سے صرفِ نظر نہیں کیا تھا۔ میرا شبہ صاعقہ کو لے کر پختہ ہورہا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میری معلومات کے مطابق رشید کی بیوی خاصی بھاری بھرکم تھی۔ اس کی چھوٹی، کنواری بیٹی (جو لطیف کے بقول، بہت تیز اور شاطر لڑکی تھی اور محلے کے لڑکوں میں اس کے چرچے رہتے تھے) ابھی قانوناً بالغ بھی نہیں ہوئی تھی جبکہ میں نے جس عورت یا لڑکی کا ہیولا اُس رات دیکھا تھا، وہ ایک بھرپور جوان لڑکی یا عورت کا تھا اور رشید کے گھر میں اس ہیولے کے معیار پر پورا اترنے

والی ہستی ایک ہی تھی اور وہ تھی اس کی بھتیجی، صاعقہ۔ لہٰذا میرے شبہات بے بنیاد ہرگز نہیں تھے۔

صاعقہ یتیم لڑکی تھی۔ عمر اس کی بیس برس کے لگ بھگ تھی۔ منتظر تھی کہ کب اس کا تایا اس کے ہاتھ پیلے کرتا ہے۔ لیکن پھر وہ بچہ کہاں سے آگیا؟ کیا اس کے کسی کے ساتھ تعلقات رہے تھے؟ لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ بات گھر میں چھپی کیسے رہ سکتی تھی؟ ماں بننے والی عورت اپنا آپ کبھی چھپا نہیں سکتی۔ تو کیا رشید کے حکم پر ہی اس نے اپنا ناجائز بچہ ویرانے میں چھوڑا تھا؟ لیکن اس بات کو بھی جی نہیں مانتا تھا۔ رشید بہت سخت مزاج اور اکھڑ شخص تھا۔ وہ درگزر کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

تو پھر وہ عورت کون تھی؟

یہ سوچ سوچ کر میرا سر دکھنے لگا تھا اور اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ ممکن ہے، وہ عورت ان کی کوئی عزیزہ یا جاننے والی ہو اور گناہ کے بوجھ سے نجات پاکر معاشرے میں جینے کی ضمانت حاصل کرنے کے لیے چند دن کے لیے ان کے یہاں ٹھہر گئی ہو؟ امکانات تو بہت تھے۔ لیکن میری سوچ کی سوئی صاعقہ پر آکر ٹھہر جاتی تھی۔

تجسس کے کیڑے نے کسی پل چین نہ آنے دیا تو میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی تنخواہ کی قربانی دینا گوارا کرلی۔ میں نے لطیف کو ایک مرتبہ پھر بلایا اور کہا۔ ”تمہیں چند دن تک رشید کے گھر پر نظر رکھنی ہے۔ جیسے ہی اس گھر کی عورتوں میں سے کوئی باہر نکلے، تمہیں اس کا پیچھا کرنا ہے، اگر وہ مارکیٹ کی طرف جائے یا گھر سے دور کہیں جائے تو تم فوراً مجھے اطلاع دو گے۔ تمہیں اس کام کے دس ہزار ملیں گے۔“

وہ خباثت سے مسکرایا۔ ”بہت خوب جناب۔ مجھے لوفر بنانے کی قیمت صرف دس ہزار؟“

”زیادہ لالچی مت بنو۔“ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ”تم پہلے ہی مجھ سے سترہ ہزار بٹور چکے ہو۔ ستائیس ہزار آج کل ایک عام سرکاری ملازم بمشکل کما پاتا ہے۔“

”لیکن شاید آپ کو اندازہ نہیں صابر بابو کہ یہ کام کس قدر پُرخطر ہے۔ اگر میں وہاں محلے والوں کی نظروں میں آگیا تو میری درگت بھی بن سکتی ہے۔ صرف دس ہزار کی خاطر کون خود کو اتنے بڑے خطرے سے دوچار کرنا چاہے گا؟“

”یعنی کہ تم انکار کررہے ہو؟“ میں نے خفگی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو، میں یہی کام کسی بے روزگاری کے ستائے ہوئے شخص سے اس سے کم پیسوں میں کروالوں گا۔“

میری دھمکی کارآمد ثابت ہوئی۔ ”ارے آپ تو ناراض ہوگئے صابر بابو...... میں آپ کو ناراض کیسے کرسکتا ہوں۔ یہ کام ذرا رسکی ہے مگر جو آپ کہو گے، لے لوں گا۔“

میں نے چند نوٹ اس کی طرف پھینکے۔ ”لو...... باقی کام کے بعد۔“

دو دن گزر گئے۔ میں دفتر بھی جاتا رہا اور بہت دنوں کے بعد دوستوں کی بیٹھک پر جاکر بازی بھی لگاتا رہا۔ وقت گزاری مقصود تھی۔ میں موبائل ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا کہ مبادا کس وقت لطیف کا فون آجائے۔

تیسرے روز میں بینک سے نکل کر دوستوں کی بیٹھک کی طرف چلا۔ راستے میں ایک ہوٹل پر بیٹھ کے کھانا کھایا۔ جب دوستوں کی بیٹھک کے عین قریب پہنچا تو لطیف کی کال آگئی۔ میری رگوں میں لہو کی گردش یک لخت تیز ہوگئی، میں نے کال ریسیو کی تو لطیف نے پوچھا۔ ”صابر بابو! کہاں ہو؟“

میں نے بے چینی سے کہا۔ ”تم کہاں ہو؟“

بولا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے دو عورتیں رشید کے گھر سے نکلی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک لڑکا بھی ہے۔ میں نے ان کا پیچھا کیا، کالونی کے چوک تک وہ پیدل گئیں۔ وہاں سے انہوں نے رکشا لے لیا۔ میں نے بھی ایک رکشا لے لیا ہے اور ان کے پیچھے ہوں۔“

”اوہ، گڈ۔“ میں نے مضطرب ہوکر کہا۔ ”تم ان کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔“

”بے فکر رہو۔ میں نے رکشے والے کو منہ مانگے پیسے دیے ہیں۔ ان کا رکشا میری نظروں کے بالکل سامنے ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ عورتیں مارکیٹ کی طرف جارہی ہیں۔“

”او کے۔ میں ابھی مارکیٹ پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم ان پر نظر رکھو......“

میں نے مارکیٹ پہنچ کر لطیف سے رابطہ کیا۔ ”ہیلو...... کہاں ہو؟“

اس نے بتایا۔ ”میں مین مارکیٹ میں ہوں صابر بابو...... وہ رکشے سے اتر کر سنگاپور جیولرز والی شاپ میں داخل ہوگئی ہیں۔ بچہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ شاید زیورات وغیرہ بنوانا چاہ رہی ہوں گی۔“

”ہاں، میں بھی قریب ہی موجود ہوں۔ ابھی پہنچتا

ہوں۔'' میں نے کہا اور موبائل جیب میں ڈال کر مطلوبہ شاپ کی طرف بڑھنے لگا۔ سنگاپور جیولرز کا سائن بورڈ چند سو گز کی دوری پر میری نظروں کے عین سامنے تھا۔ میں نے یہ فاصلہ چار سے پانچ منٹوں میں طے کیا اور جب میں شاپ کے عین سامنے پہنچا تو لطیف لپک کر میری طرف آیا۔ ''وہ اندر گئی ہیں صابر بابو۔''

''آہستہ بولو۔'' میں نے اسے گھورا۔ ''ابھی تم جا سکتے ہو۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔''

اس نے اپنی بیہودہ فطرت کے عین مطابق اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی۔ ''بقایا رقم؟''

میں نے سرد آہ بھر کر اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''اتنی بے اعتباری مت دکھایا کرو۔ کل شام کو میرے گھر پر آ کر لے جانا۔''

''ٹھیک ہے جی۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں نے تو اپنا کام کر دیا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر وہاں سے غائب ہو گیا۔

☆☆☆

میں نے اپنے گھر پر بھی دستک نہیں دی تھی۔ کیونکہ اپنے گھر کا واحد مکین میں خود ہی تھا۔ کوئی دروازہ کھولنے والا نہیں تھا۔

لیکن اُس روز میں گھر لوٹا تو میں نے دروازے پر دستک دی تھی۔ مجھے بینک کی طرف سے پانچ روزہ تربیتی ورکشاپ میں حصہ لینے کے لیے دارالحکومت بھیجا گیا تھا اور میں پانچ روز بعد شام کے وقت اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا اور میری بیوی کے مسکراتے ہوئے چہرے نے پل بھر میں ہی میری پانچ دن کی تھکن غائب کر دی۔ وہ میرے گلے سے آ لگی۔ اسے پیار کرنے کے بعد میں اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ میں نے بیڈ پر بے خبری کی نیند سوتے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگایا، اس کا ماتھا چوما۔ پھر اپنے پہلو میں کھڑی صاعقہ کو دیکھا اور ہم دونوں کے چہروں پر طمانیت بھری مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

آپ اپنے ذہن میں اٹھنے والے متعدد سوالات کو لے کر خاصے متعجب ہوں گے۔ آپ کی حیرت دور کرنا ضروری ہے۔ دراصل لطیف کے جانے کے بعد میں جیولری شاپ کے باہر رشید کی بیوی، اس کے بیٹے اور صاعقہ کے باہر نکلنے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد باہر نکلے اور پھر مارکیٹ کی مختلف شاپس میں گھومتے پھرتے چھوٹی موٹی چیزیں خریدنے لگے۔ ایک شاپ میں صاعقہ اپنی تائی اور کزن سے کچھ دور آ گئی تو میں لپک کے اس کے پاس چلا گیا۔ ''صاعقہ! میرا نام صابر ہے۔ میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ گھریلو لڑکی تھی۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح پُراعتماد نہیں تھی۔ گھبرا کر کہنے لگی۔ ''آپ کون ہیں...... خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔''

''گھبراؤ مت۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہے۔ میں......''

وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ''آپ جو کوئی بھی ہیں، میں آپ کو نہیں جانتی۔ نہ ہی میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ آنٹی نے دیکھ لیا تو بہت بُرا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا خیرخواہ ہی سمجھو۔''

اُس کی گھبراہٹ بدستور رہی۔ وہ میری بات کا جواب دیے بغیر وہاں سے جانے لگی تو میں لپک کر اس کے راستے میں آ گیا۔ وہ خوف زدہ ہرنی کے مانند ہراس بھری نظروں سے لاچاری کے عالم میں مجھے تکنے لگی۔ میں نے جلدی سے فرش پر پڑا ہوا ایک کارڈ اٹھایا اور جیب سے بال پوائنٹ نکال کر اس کی پشت پر اپنا رابطہ نمبر لکھ کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ ''لو...... یہ میرا نمبر رکھ لو...... جیسے ہی موقع ملے، مجھ سے رابطہ کرنا۔''

وہ کارڈ پکڑنے سے متردد تھی۔ میں نے موقع کی مناسبت سے دھمکی دی۔ ''کارڈ نہیں لو گی تو جانے نہیں دوں گا۔''

بادلِ ناخواستہ اس نے کارڈ پکڑ لیا۔ میں نے جانے سے قبل ملتجی ہو کر کہا۔ ''پلیز صاعقہ! ایک بار...... صرف ایک بار مجھ سے رابطہ کر لینا...... میں تم سے ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی لوفر یا عاشق مت سمجھو۔ بات کچھ اور ہے۔ میں انتظار کروں گا۔''

میں مارکیٹ سے نکلا تو خاصا پُرجوش تھا اور یقین تھا کہ وہ مجھ سے رابطہ ضرور کرے گی۔

صاعقہ اپنے ڈیل ڈول سے بیس کے بجائے پچیس چھبیس سال کی بھرپور جوان لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا جسم بھرا بھرا تھا اور قد و قامت بھی متاثر کن تھی۔ البتہ اس کے چہرے کے نقوش زیادہ پُرکشش نہیں تھے۔ لیکن اس کی سادگی اور سہمی سہمی نگاہوں کو دیکھ کر میں اسے قبول صورت لڑکیوں کی فہرست میں شامل کرنے پر مجبور تھا۔

گوکہ میں اب بھی پُریقین نہیں تھا کہ اُس رات پیڑ کے نیچے ملنے والی عورت وہی تھی۔ لیکن میں نے بہت غور وفکر کے بعد پوری منصوبہ بندی کر لی تھی کہ مجھے اس کو کیسے ڈیل کرنا تھا۔

میرا پہلا دن انتظار کی سُولی پر لٹکے لٹکے گزر گیا۔ میں رات دیر تک جاگتا اور اس حوالے سے سوچتا رہا۔ دوسرے روز شام کے وقت، جب میں صحن میں بیٹھا فلم دیکھ رہا تھا، ایک اجنبی نمبر سے کال موصول ہوئی تو میں چونک گیا اور میرے دل نے گواہی دی کہ کال کرنے والی صاعقہ ہی تھی۔

”ہیلو۔“ موبائل کے اسپیکر سے اس کی کمزور سی، سہمی ہوئی آواز سن کر مجھے یہ پہچاننے میں ایک لمحہ لگا کہ وہ صاعقہ ہی تھی۔

”ہیلو صاعقہ! میں نے بہت دوستانہ اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ”کیسی ہو؟ شکر ہے کہ تم نے کال کر کے میرا انتظار ختم کر دیا۔“

اس نے کہا۔ ”آپ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ جو کہنا ہے، جلدی سے کہہ لیں۔ میں چھپ کر بات کر رہی ہوں۔ زیادہ دیر تک فون نہیں سن سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”صاعقہ! میں تم سے رُوبرو ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے صرف پانچ منٹ لوں گا اور مجھ پر بھروسا رکھو۔ تم جہاں کہو گی میں وہاں آجاؤں گا۔“

بولی۔ ”آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟ اُس روز بھی آپ میرا نام لے رہے تھے۔ آج بھی لے رہے ہیں۔“

”میں تمہارے تمام سوالوں کے جواب دے دوں گا۔ صرف ایک بار مجھ سے ملو۔ ہم کہیں بھی مل سکتے ہیں۔ کہیں کیفے میں، کسی پارک میں...... جہاں تم کہو۔“

اس نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا۔ ”اتوار کے روز میں آنٹی کے ساتھ مارکیٹ جاؤں گی۔ سنگاپور جیولرز کے پاس کچھ ڈیزائن دیکھنے جانا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اوکے میں سمجھ گیا لیکن کس وقت جاؤ گے تم لوگ؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میں جانے سے پہلے میسج کر دوں گی۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

”اوکے۔“ میں نے مطمئن ہو کے کہا۔ اس کے بعد رابطہ کٹ گیا۔

اس روز جمعہ تھا۔ بیچ میں ہفتے کا دن حائل تھا۔ اتوار کو چھٹی تھی۔ میں اتوار کے دن کسل مندی سے لیٹا ہوا تھا کہ موبائل پر میسج کی ٹون نے متوجہ کیا۔

”ہم نو بجے کے قریب نکلیں گے لیکن دیر بھی ہو سکتی ہے۔“

یہ میسج پڑھ کر میری ساری سستی اُڑن چھو ہو گئی۔ اس وقت سات بجے تھے۔ ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔

میں پورے نو بجے سنگاپور جیولرز شاپ کے آس پاس موجود تھا۔ مجھے لگ بھگ پون گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ پون گھنٹے بعد میں نے صاعقہ اور اس کی تائی کو رکشے سے اتر کر شاپ میں داخل ہوتے دیکھا۔ آج ان کے ساتھ لڑکا نہیں تھا۔

یہ دیکھ کر مجھے خاصا حوصلہ ملا تھا کہ صاعقہ شاپ کے اندر جا کر بھی متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور اس کی حرکات وسکنات اور انداز واطوار سے اس کی اندرونی بے چینی اور کشمکش ظاہر ہو رہی تھی۔ میں نے کچھ دیر تک شاپ میں دیوار پر آویزاں جیولری کے ڈیزائن ملاحظہ کیے، یوں جیسے میں قیمتی زیورات بنوانے کے لیے من پسند ڈیزائن ڈھونڈ رہا تھا، ایک دو بار صاعقہ سے نظریں چار ہوئیں۔ وہ اپنی آنٹی کے پہلو میں کھڑی تھی اور اس کی آنٹی جیولر سے بات چیت کر رہی تھیں۔

ٹہلتے ٹہلتے میں شاپ سے باہر آگیا کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ شاپ میں دال نہیں گلے گی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی شاپ سے باہر آ گئی تھیں اور فوراً ہی رکشے میں بیٹھ گئیں۔ صاعقہ نے نظر بچا کر کوئی اشارہ کیا، میں نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور قریب سے گزرنے والے رکشے کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ ”اس رکشے کے پیچھے چلنا ہے۔“ میں نے رکشے میں بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو سمجھایا۔

رکشا ڈرائیور ذرا ٹیڑھا آدمی ثابت ہوا۔ ”معاملہ کیا ہے صاحب بہادر؟“

”معاملے کو چھوڑو صاحب بہادر!“ میں نے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ”جلدی کرو۔ وہ رکشا کہیں کھو نہ جائے۔“

بولا۔ ”بِنا پوچھے ہی بیٹھ گئے ہو آپ رکشے میں...... میں فری نہیں ہوں...... ضروری کام سے جا رہا تھا۔ آپ کوئی اور رکشا دیکھ لو صاحب بہادر۔“

اب میں نے فلموں اور ڈراموں سے فیض حاصل کرنے کا بروقت فیصلہ کیا اور خالص دھمکی آمیز انداز میں اس کی گدی پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ”قانون سے تعاون کرو صاحب بہادر...... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

اس نے خوف زدہ بیل کی طرح گردن موڑ کے مجھے دیکھا۔ ”کک...... کیا مطلب...... آپ......“

''میرا تعلق اسپیشل انویسٹی گیشن برانچ سے ہے۔ اس رکشے میں موجود سواریاں فراڈ اور ڈکیتی جیسے جرائم میں ملوث ہیں۔ مجھے ان کی ریکی پر تعینات کیا گیا ہے۔''

''اوہ...... اچھا۔'' اس نے فکر مندی سے ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر شرافت سے رکشا آگے بڑھا دیا۔

صاعقہ والا رکشا مین مارکیٹ میں جا کر رک گیا تو میں بھی رکشے سے اتر آیا۔ میں نے کرایہ رکشا ڈرائیور کی سمت بڑھایا تو وہ دانت نکال کے بولا۔ ''رہنے دیں جی۔''

میں نے خاص افسرانہ بے نیازی اور متانت سے کہا۔ ''رکھ لو صاحب بہادر۔ میں ان افسروں میں سے نہیں جو محکمے کی عزت کی پروا نہیں کرتے۔''

صاعقہ اور اس کی آنٹی ایک گارمنٹس شاپ میں داخل ہوگئیں۔ میں ان کے پیچھے چلا گیا۔ گارمنٹس شاپ خاصی وسیع تھی۔ اِدھر اُدھر کپڑے دیکھنے کے بعد آنٹی کاؤنٹر کی طرف چلی گئیں تو صاعقہ دانستہ اُدھر ہی کھڑی رہی۔ میں لپک کر اس کے پاس چلا گیا۔

''بولیں۔'' صاعقہ نے مجھے دیکھ کے کہا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''وقت اس قدر مختصر ہے کہ مجھے سجھائی نہیں دیتا کہ بات کا آغاز کیسے کروں؟'' میں نے کہا۔ ''کچھ ہفتے پہلے ولی اسٹریٹ پر شیشم کے درخت کے نیچے ایک نومولود بچہ پڑا ہوا مجھے ملا تھا۔ عمر اس کی تین چار دن سے زیادہ نہیں تھی۔ تم اس کو وہاں رکھ کے آئی تھیں۔''

اس کے چہرے پر یکلخت مردنی سی طاری ہوگئی۔ ''کیا بکو اس ہے یہ......؟''

''تم مکر نہیں سکتیں صاعقہ۔'' میں نے سچ تک پہنچنے کے لیے بڑے وثوق سے جھوٹ بولا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ تم ہی تھیں۔ اگرچہ رات کا وقت تھا۔ مگر میں نے چھپ کے دیکھا تھا...... چاندنی میں صاف نظر آرہا تھا کہ وہ تم تھیں۔''

''ضرور تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' اس نے زور سے سر کو نفی میں ہلایا۔ ''میں جارہی ہوں۔''

''رکو صاعقہ۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم جانتی ہو اس بچے کے ساتھ کیا ہوا؟''

''میں کیا جانوں کہ تم کس بچے کی بات کر رہے ہو...... اور یہ عجیب و غریب باتیں مجھ سے کیوں کر رہے ہو؟'' وہ آپ سے تم پر آگئی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ لیکن میں ابھی آخری داؤ کھیلنے والا تھا۔

''صاعقہ! اُس رات میں اُس بچے کو دیکھ کے چپ چاپ گھر چلا گیا تھا۔ لیکن گھر جا کر چین کی نیند نہ سو پایا...... ضمیر کچوکے لگاتا رہا کہ بھلا یہ کہاں کی انسانیت ہے، کالونی میں رات بھر آوارہ کتے گھومتے ہیں۔ اس معصوم بچے کی ظالم ماں نے اگر اس بات کی ذرا پروا نہیں کی...... تو میں نے بھی تو بے حسی کی انتہا کر دی ہے۔ صبح منہ اندھیرے میں بچے کو دیکھنے کے لیے وہاں گیا تو دیکھا کہ وہاں چند ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کتوں نے اس ننھی جان کو بھنبھوڑ ڈالا تھا۔''

''کیا......؟'' میری داستان طرازی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں آپ، یہ نہیں ہوسکتا۔'' یک لخت اس کی آنکھوں نے خودکار انداز میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈا...... تو مجھے یقین ہوگیا کہ میں اس ننھے منے بچے کی بے رحم اور گنہگار یا مظلوم ماں کے سامنے کھڑا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں...... تم کیسی ماں ہو صاعقہ...... تمہارے دل میں ذرا بھی رحم نہیں آیا کہ تم اپنے وجود کے ایک ٹکڑے کو کتوں کے سامنے ڈال رہی ہو؟''

وہ دوپٹے سے منہ چھپا کے سسکنے لگی۔ شاپ میں موجود لڑکوں نے حیرت کی نگاہ سے ہم دونوں کو دیکھا۔ اب وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا دشوار اور غیر مناسب تھا۔ لہٰذا میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اُس کی ماں تم ہی ہو...... جھوٹ بولنے پر معذرت خواہ ہوں۔ لیکن تسلی رکھو...... تمہارا بچہ زندہ ہے...... سلامت ہے۔''

وہ بے قرار ہوئی۔ ''کہاں ہے...... میرا بچہ کہاں ہے؟'' اس کی بھنچی بھنچی مضطرب آواز جو مجبوریوں کے جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی، مجھے بہت قابلِ رحم لگی۔

میں نے کہا۔ ''میں ابھی کاؤنٹر پر جا کر اپنا موبائل نمبر لکھوں گا۔ تم ابھی اِدھر ہی ٹہلتی رہو۔ ابھی میں نمبر پکڑا دوں گا۔''

''نمبر ہے میرے پاس۔'' اس نے کہا تو مجھے یاد آیا کہ میں اپنا نمبر اسے دے چکا تھا۔

میں نے پھر کہا۔ ''میں اپنا ایڈریس تمہیں بتا دیتا ہوں۔ تم فرصت یا موقع ملتے ہی میرے گھر آجانا۔ بچہ میرے پاس ہی ہے۔ لیکن میں زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتا ہوں۔ آنے سے پہلے رابطہ ضرور کر لینا۔''

اس واقعے کے بعد ایک بہت بڑا بوجھ میرے اعصاب سے اتر گیا تھا۔ میں خاصا ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔

کالونی سے پچیس کلومیٹر کی مسافت پر ایک گاؤں

میں میری دور کی رشتے دار (جو ماں کی طرف سے میری کچھ لگتی تھیں) ثروت خالہ رہتی تھیں۔ جب میں نے درخت کے نیچے سے بچہ اٹھالیا تھا تو میں بے حد پریشان تھا کہ اسے سنبھالے گا کون؟ میرے گھر میں کوئی عورت تو تھی نہیں۔ بہت غور و فکر کے بعد میرا دھیان ثروت خالہ کی طرف چلا گیا۔ مرحومہ والدہ کی نسبت سے ثروت خالہ میری بہت قدر کرتی تھیں۔ میں نے جب انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کیا تو انہوں نے خندہ پیشانی سے میری بات سنی اور چٹکیوں میں مسئلہ حل کر دیا۔ انہوں نے وہ بچہ لے کر اپنی بڑی بہو فضیلہ کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ فضیلہ کے اپنے چار بچے تھے، نئے مہمان کو بھی اس نے خوشی خوشی قبول کر لیا تھا۔ اس پریشانی سے نجات پانے کے بعد میں نے اپنی ساری توانائیاں صاعقہ سے رابطے میں صرف کر دی تھیں۔ ایسے میں لطیف نے بھی مجھ سے خاصی تگڑی رقم بٹور لی تھی۔ لیکن اس کا نتیجہ بڑا زبردست نکلا تھا۔

چوتھے روز میں آفس میں بیٹھا تھا کہ صاعقہ کی کال آگئی۔ وہ گھر سے کسی سہیلی کے گھر جانے کے بہانے نکلی تھی اور اب اپنے بچے سے ملنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے گھر کا ایڈریس دیا اور پندرہ منٹ بعد پہنچنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد میں نے باس سے چھٹی لی اور اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

”دیکھیں...... آپ دیکھنے میں تو خاصے شریف آدمی لگتے ہیں...... آپ کے پاس بچہ نہیں ہے تو آپ نے مجھے دھوکے سے کیوں بلوایا ہے؟“ وہ غصے میں آ کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آپ نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو میں شور مچا دوں گی۔“

”تمہارا بچہ میری خالہ کے پاس ہے۔ ڈرو مت۔ میں کوئی گھٹیا انسان نہیں ہوں۔ اصل میں میرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ میں اکیلا رہتا ہوں۔ میں بچے کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔ اس لیے گاؤں میں خالہ کے پاس بھیج دیا۔ وہ وہاں بالکل محفوظ ہے۔ میں ہر روز فون پر اُس کے بارے میں خیر، خبر لیتا رہتا ہوں۔ تم تسلی رکھو۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔ لیکن اتنی دیر تک کیا تم اپنے گھر سے باہر رہ سکو گی؟“

وہ کرسی پر سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ ہولے ہولے ہچکیاں لیتی رہی۔

میں نے اُس کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے وہ عورتیں زہر لگتی ہیں جو چند لمحوں کی لذت کی خاطر گناہ کی دلدل میں گر جاتی ہیں...... اپنی بے قابو خواہشات کو سنبھال نہیں پاتیں...... اور پھر اس گناہ کے ثمر کو بے رحمی سے رات کی تاریکی میں گلیوں اور ویرانوں میں پھینک جاتی ہیں۔ اتنی سفاک تو جانوروں کی مائیں بھی نہیں ہوتیں...... کیا تمہارے سینے میں خدا نے دل کی جگہ پتھر رکھ دیا ہے؟“

وہ سسکی۔ ”ہر انسان کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”یعنی لذت کی خواہش اور گناہ کا ارتکاب انسان کی مجبوری ہے؟“

”ایسا نہیں ہے۔“

”تو پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟“

اُس نے جو مجبوری بتائی۔ اسے سن کر میں گنگ رہ گیا تھا۔ میں بے اختیار سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں دیر تک اپنی اپنی جگہ دکھ اور صدمے سے نڈھال سر نہوڑائے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے ہمت کی اور اس کے قریب کرسی گھسیٹ لی۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے میں نے خلوص اور ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ”تم بے فکر رہو...... میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

اس پر وہ اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”میں بے سہارا بھی ہوں...... اور زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا کروں...... تایا جان بہت سخت آدمی ہیں۔ میں تو گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔ وہ اپنی بیوی کو آئے روز پیٹتے ہیں۔ اپنے بچوں کو بھی انہوں نے میرے سامنے کئی مرتبہ مارا پیٹا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”اب تمہیں بالکل نہیں ڈرنا چاہیے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

اس کے بعد جو کچھ ہوا، بہت تیزی سے ہوا۔ میں خوش ہوں کہ اکیلے پن سے مجھے نجات مل گئی ہے۔ اب صاعقہ میری بیوی ہے۔ جنید اگرچہ میرا خون نہیں ہے...... مگر یہ بات صرف صاعقہ اور میرے دل میں رہے گی۔ وہ میری سگی اولاد کے طور پر پروان چڑھے گا۔ رشید بریانی والا اپنی یتیم بھتیجی کے ساتھ ریپ کے جرم میں تاحیات جیل کی کال کوٹھری میں پڑا اپنے انسانیت کو شرما دینے والے گناہ کی سزا کاٹ رہا ہے۔

اب میں دوستوں کی طرف شاذ ہی جاتا ہوں۔ بینک سے چھٹی کے بعد سیدھا گھر آتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ ذاتی موٹر سائیکل خرید لوں۔ اس طرح سفر میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا اور میں جلدی گھر پہنچ جایا کروں گا۔

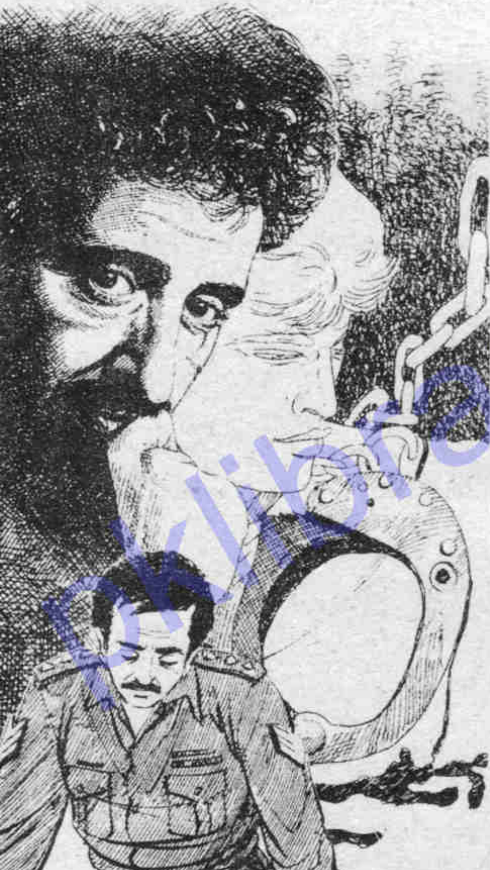
❖ ❖ ❖

ایک جرم کرنے کے بعد اگلے جرم کی طرف بڑھتے قدموں میں خود اعتمادی بڑھتی چلی جاتی ہے... وہ تینوں بھی جیل میں ساتھ تھے... ایک ہی وقت میں فرار کا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچا... آگے کی منزل تھی... جھوٹ... حوصلہ اور ایک دوسرے پر اعتبار کا موسم... یکایک متزلزل ہوگیا...

اپنے عہدے...... ذمّے داری اور احساس سے غداری نہ کرنے والوں کی ذہانت کا کھیل

مفرور

جمال دستی



وہ تینوں مچھ جیل سے فرار ہو کر یہاں تک پہنچے تھے...... ان تینوں کا تعلق جیکب آباد سے تھا۔ تعلق کیا تھا بس، مجرمانہ وارداتوں کے سلسلے میں زیادہ عرصہ وہاں رہے تھے۔

بہرکیف...... یہ شہر جیکب آباد، سندھ اور بلوچستان کی سرحد پر واقع ہے۔ سکندر عرف سکو کا خالصتاً تعلق کوئٹہ سے تھا جبکہ دھڑیں بخش کندھ کوٹ اور منٹھار موالی شکار پور کا باشندہ تھا۔ تینوں عادی مجرم تھے۔

سب سے پہلے دھڑیں بخش اور سکندر کی ملاقات جیکب آباد کی جیل میں ہوئی تھی۔ دونوں میں دوستی بھی ہو گئی۔ رہا ہونے کے بعد دونوں چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے لگے پھر بستی کی طرف نکل گئے، وہاں دونوں ایک بڑی اور خطرناک واردات میں دھر لیے گئے۔

پھر وہاں سے ان دونوں، یعنی سکندر اور دھڑیں بخش کو مچھ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ وہیں تیسرے ڈکیت منٹھار

موالی سے ان کی ملاقات ہوئی جو ان کے جیل منتقل ہونے کے دو دن بعد وہاں ''سرکاری مہمان'' ہوا۔

منتھار نے خود کو ایک بڑا ڈکیت بتایا تھا اور اس کا اعتراف بھی بعد میں سکندر اور دھڑیں بخش کو کرنا ہی پڑا کیونکہ فرار کا ماسٹر مائنڈ منتھار ہی تھا۔

چند دنوں بعد ہی منتھار نے یہاں سے فرار کا منصوبہ بنایا تھا جو بہرحال کامیاب رہا تھا۔

تینوں مجرم اپنے اپنے فن کے ماہر تھے۔ منتھار موالی اور دھڑیں بخش تو کافی عمر کے تھے جبکہ سکندر نوجوان تھا۔

بہرکیف اس وقت وہ تینوں ایک بلند پہاڑی پر جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مچھ جیل اس مقام سے کوئی ایک کلومیٹر دور تھا۔ اس کی بلند سنگین اور پُرہیبت دیواریں اس بلندی سے صاف نظر آرہی تھیں۔

پہاڑی کے اس دامن میں جہاں وہ چھپے ہوئے تھے، وہاں بھیڑ بکریاں دور دور تک چر رہی تھیں۔ وہ تینوں مسلسل بھاگتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اور اب انہیں ذرا ستانے کا موقع ملا تھا۔ دھڑیں بخش پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا، اس کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں، وہ یوں بھی دمے کا مریض تھا۔ منتھار نے اس سے کہا۔

''میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔''

''بے شک۔'' سکندر نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ ''اس بیماری کے باوجود تمہارے پھرتیلے جسم میں ایک چاق و چوبند ذہن ہے۔''

لیکن اس دوران دھڑیں بخش نے جواب میں کھانسی کے دوران دمے کے مرض کو بے شمار گالیاں دے ڈالیں پھر اس نے کہا۔ ''جیل کا سائرن کسی وقت بھی ہنگامہ کھڑا کر سکتا ہے۔''

''ہاں۔'' سکندر نے ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے جیل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں بیس پچیس منٹ میں پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے کم از کم چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا ہے تب کہیں جا کر ہم مین شاہراہ تک پہنچ سکیں گے اور بچاؤ کی بھی صورت نکال سکیں گے۔''

منتھار خاموش رہا اور دھڑیں بخش گالیاں بکتا رہا، سکندر نے پھر کہا۔ ''اس وقت جیلر سبھاگو خان کی حالت تباہ ہوگی اور وہ دیوانہ ہو رہا ہوگا۔''

''دھڑیں بخش نے بھی تو اس کو الجھا دیا تھا۔'' منتھار ہنسا۔

سکندر نے پھر جیل کے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ باقی قیدیوں کو ایک جگہ جمع کر رہے ہیں۔''

''اب ہمیں اس سمت نکل جانا چاہیے جو اُن کے خیال میں بھی نہ آسکے۔'' دھڑیں بخش نے کہا اور پہاڑی کے ڈھلان پر پیٹ کے بل پھسلنے لگا۔

''ہمارے راستے اب الگ الگ ہیں۔'' منتھار نے دھڑیں بخش سے کہا۔ ''اگر وہ تمہیں پکڑلیں تو یہی کہنا کہ ہم سیدھے چلتے گئے تھے۔ شاید ہمیں کوئی لفٹ مل گئی ہوگی۔''

پھر وہ بھی اونچی اونچی گھاس میں ایک سمت رینگ گیا۔

چند گھنٹے مچھ شہر کی سنگلاخ پہاڑی وادیوں میں بھٹکنے کے بعد وہ تینوں کوئٹہ شہر پہنچ گئے۔ کوئٹہ شہر کا رخ کرنے کا فیصلہ صائب تھا، جس پر کم از کم سکندر ضرور اندر سے خوش ہوا تھا، کیونکہ وہاں اس کی محبوبہ دلنواز شیریں کا گھر تھا، بہرکیف اب وہ تقریباً آزاد تھے۔ پولیس انہیں تلاش نہیں کر پائی تھی اور یہاں انہوں نے اپنے بہروپ بدل ڈالے تھے۔

☆☆☆

منظور بلوچ کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ چائے کا مگ اس کے ہاتھ میں کپکپا کر رہ گیا۔ شکر تھا کہ گرم چائے اس کے ہاتھ پر نہیں گری، البتہ اس کے چند قطرے فرش پر ضرور چھلک گئے تھے۔ مچھ پولیس تھانے کے انسپکٹر جلال شاہ کا کمرا گزشتہ چند دنوں سے ویران پڑا تھا اور اے ایس آئی منظور بلوچ ہی ایک طرح سے اس تھانے کا انچارج بنا ہوا تھا۔

اس عرصے میں وہ بھی کبھار ایک آدھ گھنٹے کے لیے سو بھی جاتا تھا اور بیدار ہونے پر چائے پی کر ذہن کو بیدار کرتا تھا۔

''سوری سر! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ کب آنا ہوا؟''

''میں اپنی میز سے چند اہم کاغذات نکال رہا ہوں۔'' انسپکٹر جلال شاہ نے کہا۔ ''تم تو عیش کر رہے ہو میرے جانے کے بعد!''

منظور بلوچ کی پیشانی پر شرمندگی کے قطرے پھوٹ پڑے۔ اسی لہجے میں بولا۔ ''معاف کیجیے سر! لیکن میں نے آپ کے کمرے میں جھانکا نہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''برسوں پہلے میں بھی ایسی حرکتیں کرتا تھا۔ جاؤ اطمینان سے چائے پیو، میں تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا۔''

لیکن منظور وہیں کھڑا رہا۔ انسپکٹر جلال جانتا تھا کہ

منظور اس کا بہت احترام کرتا ہے اور اس وقت وہ اس سے کچھ کہنے کے لیے بے قرار ہے۔

''کیا بات ہے منظور! کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''جی سر!'' منظور نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں، آپ یہاں واپس آجائیں۔'' پھر اس نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا۔ ''آپ کو پتا ہے کہ میں آپ کا وفادار ہوں، یہاں کے حالات کچھ درست نہیں ہیں۔''

''پہلے دروازہ بند کردو۔'' جلال شاہ نے کہا اور جب منظور نے دروازہ بند کر دیا تو اس نے کہا۔ ''ہاں، اب بتاؤ حالات تمہارے لیے ذاتی طور پر درست ہیں پیشہ وارانہ طور پر ٹھیک نہیں ہیں۔''

''بات یہ ہے سر!'' منظور نے کہا۔ ''میں ہر وقت یہاں موجود رہتا ہوں۔ ہر قسم کی باتیں سنتا ہوں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ آخر آپ اچانک یہاں سے کیوں چھٹیوں پر چلے گئے۔''

انسپکٹر کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھتے ہی منظور نے جلدی سے کہا۔ ''یقین جانیے سر! یہاں آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوتی رہی ہے۔ اب یہی سکندر عرف سکو کا معاملہ لے لیجیے۔ وہ جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ خطرناک مجرم ہے وہ۔ آج اسے فرار ہوئے پورا ہفتہ ہو رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس نے ایک مسافر وین کو لوٹنے کے دوران ایک ہندو تاجر کو چاقو گھونپ دیا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' انسپکٹر جلال شاہ نے پوچھا۔

''ہم اس کے جیکب آباد والے مکان کی نگرانی کر رہے ہیں۔''

''ضروری تو نہیں کہ وہ جیکب آباد چلا گیا ہو، کوئٹہ بھی دور نہیں یہاں مجھ سے......''

''یقیناً، کوئٹہ میں بھی ایک مکان پر ہمیں شبہ ہوا ہے، وہاں بھی نگرانی کے لیے بندے بھیج رکھے ہیں۔ وہ اس کی شادی شدہ محبوبہ شیریں کا مکان ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق وہ اکثر چوری چھپے وہاں اس سے ملنے جاتا رہتا ہے۔'' منظور نے جیسے بے بسی سے کہا۔ ''لیکن وہاں دن میں اعجاز اور قریشی کی ڈیوٹی ہے۔ رات کو زمان اور نذیر کی، مگر وہ اپنے فرائض میں غفلت سے کام لے رہے ہیں۔''

انسپکٹر جلال شاہ نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے۔ کسی گہری بات کو جانچنے کا یہ اس کا پرانا انداز تھا۔ اسی لمحے منظور نے دوبارہ کہا۔

''ویسے یہ بات سر، میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں۔ میں نے کسی سے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ ہر شخص سے کبھی نہ کبھی غفلت ہو جاتی ہے، لیکن سکندر کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ معاشرے کے لیے خطرہ ہے۔ اگر اسے جلد گرفت میں نہ لیا گیا تو یہ بہت جلد ایک بڑا اور خطرناک گینگ بنا لے گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں اسے سر......!''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' انسپکٹر جلال شاہ نے کہا۔ ''لیکن میرے یہاں سے چھٹیوں پر چلے جانے کے بعد تو انسپکٹر ایاز کو عارضی طور تعینات کیا گیا تھا۔''

''جی سر!'' منظور بولا۔ ''وہ دو ایک روز کی چھٹیوں پر ہیں۔ ان کی بیٹی کی شادی تھی، کل شاید آجائیں ڈیوٹی پر......''

''ویسے کیا تمہیں انسپکٹر ایاز سے کوئی شکایت......''

''نہیں سر!'' منظور جلدی سے بولا۔ ''یہ تو شکایت کی بات بھی نہیں، میں تو ایک واقعہ آپ کو بتا رہا ہوں، بہرحال میں نے زمان اور نذیر کو بہت بُرا بھلا کہا ہے۔''

انسپکٹر جلال ہنسا۔ ''ٹھیک ہے پریشان مت ہو، میں بہت جلد واپس آؤں گا، کسی بھی دن، اس وقت تک تم زمان اور نذیر سے پورا پورا تعاون کرو، اچھا اب میں چلتا ہوں، مجھے ذرا جلدی ہے۔''

''اور ہاں سر۔'' منظور بولا۔ ''اس کے ساتھی دھڑیں بخش کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ وہ بھی اسی کے ساتھ فرار ہوا تھا، مگر فرار کے ایک روز بعد ہی اسے پکڑ لیا گیا۔''

''یہ بہت اچھا ہوا۔'' انسپکٹر جلال نے کہا۔ ''مگر سکندر؟ وہ تو ابھی آزاد ہے۔''

''جی سر!'' منظور ہونق سا بن گیا۔ جلال نے رخصت ہوتے وقت اس کی طرف دیکھا۔

''میرا نمبر تو ہے نا تمہارے پاس؟''

''جی جی سر، ضرور، میں آپ نے آپ کا نمبر ڈیلیٹ تو تھوڑی کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم کل کسی وقت مجھے فون کر لینا۔''

''بہت بہتر سر!'' منظور بولا۔ ''ویسے سر کیا آپ واقعی دوبارہ یہاں......''

''کل بتاؤں گا۔'' کہتا ہوا انسپکٹر جلال شاہ وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

سکندر کرسی پر بیٹھا ویسی ٹھہرا پی رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں اس کے چرس بھرا اسگریٹ تھا۔ اس نے دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھی ہوئی تھیں۔ اس کمرے کی کھڑکی

سے میونسپل پارک صاف نظر آرہا تھا۔ منتھار موالی ٹی وی پر خبریں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''کئی دنوں سے ہمارے بارے میں کسی چینل پر کوئی خبر نہیں آئی۔ میرا خیال ہے وہ بھی مایوس ہو چکے ہیں۔ اب ہمارے کام کرنے کا وقت آگیا ہے۔''

سکندر نے بوتل فرش پر رکھی۔ ''خالی بیٹھے بیٹھے تو میں بھی تنگ آ گیا ہوں یار!''

''بس تو پھر بے کار بیٹھنا بند ہوا آج سے۔'' منتھار موالی نے مسکت لہجے میں کہا۔ ''یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ کوارٹر میں نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ کوئٹہ کے مضافات، یعنی بلیلی میں......''

سکندر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ نشے میں بھی تھا اور غصے میں بھی، کہنے لگا۔ ''مجھے تسلیم ہے کہ تم جرائم کی دنیا کے کھلاڑی کسی سے کم نہیں ہو۔'' کہتے ہوئے وہ کھڑکی کی طرف چلا گیا اور باہر جھانکنے لگا۔ بلیلی، کوئٹہ سے چمن جانے والی مین شاہراہ پر واقع تھا۔

منتھار نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ سکندر اس وقت کھڑکی سے پلٹا اور پھر جھک کر ٹھرے کی بوتل اٹھا کے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ منتھار اسے یوں تکنے لگا جیسے وہ اس کی اندرونی کیفیت کا ادراک رکھتا ہو، بولا۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو یار! میں جانتا ہوں کہ تم گھر جانا چاہتے ہو، لیکن ابھی وہاں جانے میں خطرہ ہے۔ پولیس گھات میں ہوگی۔''

سکندر نے ایک گھونٹ بھر کے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات تھے۔ ''میں کہتا ہوں اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''تم احمق ہو۔'' اس بار منتھار نے بھی غصے سے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آج جب میں بینک گیا تھا تو تم اپنے گھر کا چکر لگا آئے تھے۔''

سکندر تلخی سے ہنسا۔ ''ہاں تم بینک گئے تھے، اس بھیس میں۔ کاش! تم آئینے میں غور سے اپنا چہرہ تو دیکھ لیتے۔ وہ وگ لگا کر تم کتنے مسخرے لگ رہے تھے۔''

منتھار جواب میں بولا۔ ''موضوع مت بدلو سکندر! تم آخر اپنے گھر کیوں گئے تھے؟ بہت بڑی حماقت تھی یہ، سمجھے۔''

سکندر کرسی سے اٹھ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ''میں تمہیں خبردار کرتا ہوں، آئندہ مجھے احمق نہ کہنا، سمجھے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں اسی علاقے میں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا۔ وہاں کی ایک ایک گلی، ایک ایک چپا میرا جانا پہچانا ہے۔ میں وہاں گیا تھا، اگر وہاں پولیس تھی بھی تو وہ مجھے نہیں دیکھ سکی، یا میرا اس سے سامنا نہیں ہوا۔ سمجھے۔''

منتھار ٹہلتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا، باہر کا جائزہ لیا۔ ''بظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' اس نے سکندر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر تمہیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ تم نے واقعی خطرہ مول لیا تھا۔''

''مگر اب تو تمہیں بھی یقین آچکا ہے کہ میرا تعاقب نہیں کیا گیا۔'' سکندر نے ٹھرے کا لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا اس مسئلے پر بات نہ کرو، اگلے ہفتے ہم سکھر میں ہوں گے۔ کیوں؟''

''ہاں۔'' منتھار بولا۔ ''لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ تم نے اچھا نہیں کیا تھا۔ آخر تمہیں میری بات کا یقین کیوں نہیں آتا۔''

سکندر نے غور سے منتھار کو دیکھا۔ ''میں تم پر یقین نہیں کرتا، یہ بات درست ہے۔ آخر میں تم پر کیوں یقین کروں۔ ابھی تک میری سمجھ میں یہی نہیں آیا کہ آخر تم نے فرار میں میری مدد کیوں کی تھی؟''

''کسی دوستانہ جذبے کے تحت میں نے تمہاری مدد نہیں کی تھی سکندر! میں تمہیں صاف صاف بتا دوں۔'' منتھار نے سخت لہجے میں کہا۔ ''قسمت ہی تھی کہ ہمیں فرار کا یہ موقع مل گیا۔ محافظ اور نگران وہاں سے دور تھے، اس پہاڑی اور خشک نالے میں کوئی نہ تھا، اگر اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو شاید میں برسوں اسی جیل میں سڑتا رہتا۔''

''یہ ٹھیک ہے، مگر پھر تم مجھے اور دھڑیں بخش کو بھی کیوں ساتھ لے آئے اور ہاں یہ مت بھولو کہ ہمارے فرار کا منصوبہ ساز دھڑیں بخش ہی تھا۔''

''یہ مجبوری تھی، دھڑیں بخش میرا دشمن تھا، اسے ساتھ نہ لیتا تو وہ مجھے پکڑوا دیتا اور تمہیں اس...... لیے ساتھ لیا کہ تم ہوشیار ہو، تیز طرار ہو، ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں، میں نے یہ بھی سوچا تھا۔'' منتھار نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے آگے بولا۔

''اور...... میرا یہ سوچنا درست ثابت ہوا۔ اس نخلستانی کھیت سے گزرتے ہوئے جب میرے ٹخنے میں موچ آ گئی تو تم نے ہی مجھے سہارا دیا، تم نہ ہوتے تو میں شاید ہمت ہی ہار بیٹھتا، یہی وجہ ہے کہ اب تم میرے مہمان ہو۔''

سکندر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے تم

ٹھیک ہی کہہ رہے ہو، دھڑیں بخش سے تمہاری دشمنی......'' اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو منٹھار تلخ مسکراہٹ تلے بولا۔

''حصے داری پر، اس نے مجھے گرفتار کرانے کی دھمکی دی تھی۔''

''تب سے تم نے بغض بیٹھالیا اپنے دل میں؟''

''مخالفت کی سیاست میں یہی ہوتا ہے۔''

''خیر، مجھے اب بھی تم پر شبہ ہے۔'' کہتے ہوئے سکندر کی آنکھوں میں سختی آگئی۔ ''میں نے لاکھوں روپوں کا ڈاکا ڈالا ہے پھر دوسرے بڑے جرائم بھی کیے ہیں۔ میں جانتا ہوں منٹھار! تم بھی نرے گاؤدی نہیں ہو۔ تمہیں ان تمام واقعات کا اخبارات کے ذریعے علم ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ پولیس کو ابھی تک لوٹ کا مال نہیں ملا ہے۔''

''مجھے یہ سب کچھ پہلے سے معلوم تھا۔'' منٹھار نے کہا۔ ''کوئٹہ شہر چھوڑنے سے پہلے تو یہ دولت یقیناً سمیٹو گے، مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں......''

سکندر نے منٹھار کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے دوست! میں خالی ہاتھوں بھی تم سے اچھی طرح نمٹ سکتا ہوں، سمجھے، لیکن آج دن میں گھر جا کر میں احتیاطاً اپنی حفاظت کے لیے یہ لے آیا ہوں۔'' سکندر نے اپنی جیب سے دایاں ہاتھ نکالا تو اس میں سیاہ پستول چمک رہا تھا۔

منٹھار کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے کمرے کے ایک کونے سے قالین پلٹا اور جیبی چاقو کی مدد سے فرش سے ایک ٹائل اکھاڑا جس کے نیچے چھوٹے سے خلا میں چمڑے کا ایک تھیلا رکھا تھا۔

منٹھار نے یہ تھیلا نکال کر سکندر کی طرف اچھال دیا۔

''اسے دیکھو، شاید تمہارا دل بہل جائے۔''

سکندر نے بے تابی سے تھیلا کھولا پھر اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیلتی چلی گئیں۔

''ہیرے......!'' بے اختیار اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوا۔

''ہاں...... تراشیدہ ہیرے۔'' منٹھار نے کہا۔ ''تم نے ڈکیتی میں جتنی رقم اڑائی ہے ان ہیروں کی مالیت ان سے کہیں زیادہ ہے۔'' پھر اس نے اپنے لہجے کو مزید تند کرتے ہوئے آگے کہا۔

''اور...... سکندر! میں تم سے اب پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں، اس کے بعد تمہیں کوئی وارننگ نہیں دوں گا، بات یہ ہے کہ اگر میرا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ تمہاری عمر کا ہوتا، بہر حال غور سے سنو، اگر اب تم نے میرا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی یا مجھ پر طنز کیا تو میں تمہیں ہلاک کر دوں گا، تم نوجوان ہو، برخوردار ہو۔ میں تمہیں اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگا ہوں، لیکن اپنے بیٹے کی بدتمیزی بھی میں پسند نہیں کرتا تھا۔''

سکندر تو ایک لمحے کو گنگ ہو کر رہ گیا، لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر کا مجرم جاگ اٹھا۔

''بڑے میاں! تم بھی عجیب دیوانے ہو۔ آخر تمہیں کیوں یقین ہے کہ میں تمہارا اگلا کاٹ کر، تمہاری لاش یہیں چھوڑ کر اور یہ ہیرے لے کر بھاگ نہیں جاؤں گا۔''

منٹھار کا قہقہہ خوف ناک بھی تھا اور بلند بھی۔ ''برخوردار ہی ہونا، تمہارا خیال ہے کہ میں کچی گولیاں کھیلا ہوں۔ مجھے یقین ہے، اس لیے کہ اس وقت تم میرے رحم و کرم پر ہو، میرے بغیر تم اس شہر سے تو کیا اس ملک سے بھی نہیں نکل سکتے، کیونکہ میں نے ہی گوادر کے اس ماہی گیر ٹھیکے دار سے بات کر رکھی ہے جو اپنی لانچ پر ہمیں بھارت یا دبئی لے جا سکتا ہے اور یہ سب میرے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اب برخوردار! مانا کہ تم بہت تیز و طرار لیکن شطرنج کی کسی بساط پر

لڑکا، لڑکی

لڑکا: ''میں آخری بار پوچھ رہا ہوں، کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

لڑکی: ''نہیں۔''

لڑکا: ''سوچ لو۔''

لڑکی: ''کہا نا نہیں۔''

لڑکا: ''ویٹر! باجی کا بل الگ بنانا۔''

☆☆☆

لڑکا: ''کہاں جا رہی ہو؟''

لڑکی: ''خودکشی کرنے۔''

لڑکا: ''تو اتنا میک اَپ کیوں کیا ہے؟''

لڑکی: ''کل صبح اخبار میں فوٹو بھی تو آنی ہے۔''

☆☆☆

لڑکے والے: ''ہمیں ایسی لڑکی چاہیے جو زیادہ کھاتی پیتی نہ ہو۔ ہمیشہ چپ رہے اور سب کی سنے۔''

لڑکی والے: ''ایسی لڑکی تو پھر آپ کو 'آئی سی یو' میں ہی ملے گی۔''

رابعہ اسلم حیات کا بڈھے والا ضلع سرگودھا سے تعاون

تم مجھے شکست نہیں دے سکتے۔"

سکندر اس مرتبہ جواب میں نہیں ہنسا لیکن جب وہ اس سے بولا تو اس کا لہجہ بہت زہریلا تھا۔

"میں شطرنج کی بازی نہیں جماتا، میں دوٹوک کام کرنے کا عادی ہوں۔ قتل میرا مشغلہ ہے، یقین کرو میں تمہاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔"

☆☆☆

رات جیسے بھاری سل کی طرح بیت رہی تھی۔ وہ دونوں بہت دیر ہوئی سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے لیکن منٹھار کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ اسے سکندر پر اعتماد نہیں تھا، اس کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ وہ کسی وقت بھی کوئی انتہائی اقدام اٹھا سکتا ہے۔ پھر منٹھار نے سکندر کے قدموں کی آواز سنی۔ اس نے جان بوجھ کر سکندر کو ایسی چارپائی دی تھی جو اٹھتے بیٹھتے چرچرایا کرتی تھی۔ سکندر مکان سے باہر جا چکا تھا۔

منٹھار نے جوتے پہنے، شال اٹھائی پھر وہ سکندر کے تعاقب کے لیے تیار ہو گیا۔

سکندر بےفکری سے راستہ طے کر رہا تھا، یہ تمام علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے اپنی منزل پر پہنچ سکتا تھا۔ اسے اپنی کامیابی کا قطعی یقین تھا۔ اطمینان سے سیٹی بجاتے ہوئے وہ اسٹاپ کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا جہاں تقریباً رات گئے، کوئٹہ سے چمن کے لیے مسافر وین اور کوچز گزرتی رہتی تھیں۔

"نہیں...... آج رات نہیں......" اس نے چلتے چلتے سوچا اور رفتار دھیمی کر دی۔ اس کے جسم کے اعضا میں میٹھا میٹھا کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ "شیریں...... شیریں......" اس کے ہونٹوں سے ایک نام ابھرا۔ اس نام کے ساتھ کتنی ہی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ کتنی ہی حسین شامیں اور بھیگی راتیں اس کی آغوش میں گزری تھیں۔ شیریں، جس سے اس کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ اس کا باپ اور بھائی، شیریں کی شادی اس سے کرنے کے سخت مخالف تھے۔ حالانکہ یہ سب لوگ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شیریں اس کی چچیری تھی۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی۔

شادی کے بعد...... شیریں کو اپنے شوہر سے کوئی خوشی نہیں ملی تھی۔ وہ غربت اور تنگ دستی میں زندگی گزار رہے تھے، سکندر نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اب وہ اس کی مالی مدد کر دیا کرتا تھا۔ اس سے ملتا بھی تھا۔ یہی نہیں بیشتر چوری کا مال وہ اسی کے مکان کے پچھواڑے میں رکھوا لیا کرتا تھا جس کا علم ظاہر ہے شیریں کے شوہر کو تو نہ ہوتا مگر شیریں اس کی رازداں ضرور تھی۔

بینک ڈکیتی کی ایک تازہ کارواردات میں اس نے سیف سے بڑی تعداد میں نقد رقم اور کچھ کاغذات اٹھا لیے تھے۔ کاغذات اس کے کام کے نہ تھے تاہم اس نے وہ ردی سمجھ کے پھینکے نہیں تھے۔ کیا خبر اس سے بھی کسی ذریعے سے بعد میں دولت ہتھیانے کے مواقع مل سکیں۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ وہ بیگ اٹھائے اور خاموشی سے شیریں سے ملے بغیر چلا جائے۔ کیونکہ پولیس اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔

لیکن پھر شیریں سے ملے بغیر بھی اس طرح چلے جانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ شیریں کے وصل سے لطف اندوز ہونے کا خیال ہی اتنا سُرور آگیں تھا کہ وہ پھسل گیا۔

ابھی وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ اس کے قدم اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔ اس کے سامنے ایک انسانی ہیولا کھڑا تھا۔ تب ہی اس نے سب انسپکٹر منظور بلوچ کو دیکھا۔ اس کا دماغ گھوم گیا۔ وہ شاید اس کی مخبری کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچا تھا۔ ممکن تھا اور بھی پولیس والے اِدھر اُدھر موجود ہوتے۔

سکندر نے بجلی کی تیزی سے لات ماری جس سے منظور لڑکھڑا گیا۔ اسی لمحے سکندر نے پستول نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا، مگر اس سے پہلے کہ وہ پستول نکالتا، ایک سایہ اس کے قریب سے نکل کر منظور بلوچ پر جا پڑا۔

یہ منٹھار تھا...... جس نے بھرپور قوت سے ایک مُکّا منظور کے جبڑوں پر جڑ دیا، منظور کٹے ہوئے شہتیر کے مانند گرا۔ اس کا سر پتھر سے ٹکرایا اور وہ بےہوش ہو گیا۔ منٹھار نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

پھر منٹھار نے سکندر کو جھنجوڑ دیا۔ "احمق، بےوقوف، پاگل۔ ایک تو تم ان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے پھر اسے گولی بھی مار رہے ہو۔ کیا خبر دیگر سپاہی قریب ہی متلاشی ہوں اور وہ گولی کی آواز سے ادھر آن نکلتے۔ اس سے تو بہتر ہے ڈھول بجا کر تم ساری پولیس کو ادھر متوجہ کر لو۔"

سکندر نے ایک جھٹکا دے کر خود کو بوڑھے منٹھار کی گرفت سے آزاد کرایا اور توصیفی لہجے میں بولا۔

"تمہارا مکا تو بہت زبردست تھا، ایک ہی وار میں اس سالے جگادر انسپکٹر کو ڈھیر کر ڈالا۔"

منٹھار نے اپنے ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے کہا۔ "چلنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

سکندر نے فوراً ہی اپنا فیصلہ دے دیا۔ "ہاں، لیکن پہلے میں اپنا مال لے لوں۔"

''مال؟'' منتھار نے بھویں سکیڑیں۔ پھر اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ابھرے جیسے وہ اس کے منہ سے یہی سننے کا منتظر ہو، اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک اور چہرے کے تاثرات کو سکندر تاریکی کے سبب نہ دیکھ سکا تھا۔ جواب میں بولا۔

''ہاں، مال! جس طرح تمہارے پاس ہیرے ہیں، اسی طرح میرے پاس بھی بہت سا لوٹا ہوا مال ہے، ایک بینک ڈکیتی کی تھی اور لگے ہاتھوں ایک سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیف بھی کھود ڈالا تھا۔''

''کہاں ہے مال؟''

''شیریں کے گھر۔''

''چلو پھر جلدی۔ صبح کی سپیدی پھیلنے سے پہلے پہلے ہمیں گوادر کی طرف کوچ کرنا ہے ہر حالت میں...... حالات خراب ہو گئے ہیں اب۔'' منتھار نے کہا پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بولا۔ ''لیکن شیریں......''

''اس کی فکر مت کرو۔'' سکندر نے اس کی بات کا اشارہ سمجھتے ہوئے ازراہِ تشفی کہا۔ ''شیریں کو اس کا پتا نہیں چلے گا اور نہ ہی میں اس سے ملوں گا فی الحال...... میں خاموشی سے اس کے گھر کا پچھواڑا پھاندوں گا اور بیگ اٹھالاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' منتھار کو تسلی ہو گئی۔

دونوں وین میں سوار ہو کر شہر پہنچ گئے۔ یہاں بھی انہیں اگرچہ پولیس کی مخبری اور خفیہ پہرے کا خدشہ تھا لیکن سکندر تو کئی بار انہیں جل دینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اس بار بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ منتھار کو مکان سے ذرا دور کھڑا کیا اور خود محبوبہ کے گھر کی دیوار ٹاپ کر بیگ بغل میں دبائے لے آیا۔

سکندر نے اب پھر اپنا ارادہ تبدیل کر لیا، اس نے سوچا، ٹھیک ہے، منتھار نے دو تین بار اسے پولیس سے بچایا تھا اور یہ بھی درست تھا کہ وہ منتھار کے بغیر اس ملک سے نہیں نکل سکتا تھا، لیکن اگر منتھار سے اس کی ملاقات نہ ہوتی تب بھی تو اسے کچھ نہ کچھ انتظام کرنا ہی تھا۔

بیگ میں لاکھوں کی رقم موجود تھی جو اس نے بینک ڈکیتی میں لوٹے تھے اور وہ کاغذات بھی جو اسے سرکاری اور بہت اہمیت کے حامل لگے تھے، وہ ان کی واپسی کے لیے بھی بڑی رقم بلیک میلنگ کے ذریعے اعلیٰ حکام سے حاصل کر سکتا تھا۔ ورنہ نقد رقم تو تھی ہی۔

ابھی وہ یہی سب کچھ سوچ رہا تھا اور بے خبر بھی کہ منتھار دبے قدموں اس کے قریب آ چکا ہے اور موقع ملتے ہی اس پر بھرپور اور جچا تلا حملہ بھی کر ڈالا۔ سکندر کو اپنے شانے کا جوڑ ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ وار اتنا شدید تھا کہ سکندر کا دایاں بازو مفلوج ہو کر بے جان ہو گیا اور منتھار موالی نے اس کے بے جان ہاتھ سے پستول جھٹکے سے چھین لیا۔

سکندر کے منہ سے گالیوں کا طوفان اُبل پڑا اور آنکھوں میں تکلیف سے آنسو نکل گئے۔

منتھار کے ہیروں کو دیکھ کر سکندر یہ بھول ہی گیا تھا کہ مجرم خواہ کتنا ہی دولت مند کیوں نہ ہو، اس کی دولت کی ہوس بڑھتی ہی رہتی ہے۔

☆☆☆

سب انسپکٹر منظور بلوچ...... اسپتال کے کمرے میں ایک بستر پر محوِ آرام تھا۔ انسپکٹر جلال نے، جو اس کی عیادت کو آیا تھا، منظور کو بتایا۔

''بینک ڈکیتی کے موقع پر سکندر نے سیف سے رقم اڑائی سو اڑائی مگر اس کے ساتھ ہی ایسی دستاویز بھی لے گیا جن کی اہمیت کا اسے علم نہیں تھا، یا پھر کچھ اندازہ تھا۔ حکام کا کہنا تھا کہ وہ دستاویزات قومی اہمیت کی حامل ہیں۔ لہٰذا ہر قیمت پر انہیں واپس حاصل کرنا چاہیے۔ مصیبت یہ تھی کہ اس سلسلے میں سکندر سے کوئی سودا بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اگر اسے ان کاغذات کی اہمیت کی ہوا بھی لگ جاتی تو پھر اس کے مطالبات کی کوئی حد نہ ہوتی۔ پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ان کاغذات کے سلسلے میں دوسرے ملکوں سے رابطہ قائم کرتا، یا بلیک میلنگ پر آمادہ ہو جاتا۔''

اس کے بعد انسپکٹر جلال نے اسے اس کیس کی تمام تفصیلات بتادیں۔

''مگر سر......!'' منظور نے پوچھا۔ ''یہ منتھار موالی کون تھا؟''

''مجھے افسوس ہے منظور! میں نے تمہارے چہرے پر کچھ زیادہ ہی سختی سے گھونسا مار دیا تھا۔'' انسپکٹر جلال شاہ نے جواب دیا۔ ''اب تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ منتھار کون تھا۔'' پھر جلال مسکراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

سب انسپکٹر منظور کو آج پہلی بار علم ہوا تھا کہ اس کا باس اتنے عرصے دفتر سے کیوں غائب رہا تھا۔ پھر یہ سوچ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ انسپکٹر جلال نے نہ صرف مجرم کا روپ دھار کر جیل کی ہوا کھائی بلکہ اس نے سکندر کو اپنے اعتماد میں لینے کے لیے اتنا بڑا ڈراما اتنی کامیابی سے کھیلا تھا۔

❖❖❖

قتل دل وجاں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

پرندوں کی بھی اپنی عادات و خصلتیں ہوتی ہیں... جو چڑیا لگاتار اپنا گھونسلہ بدلتی رہتی ہے... اور کبھی یہ طے نہیں کرپاتی کہ کون سے گھونسلے کا مستقل انتخاب کرے... وہ آخرکار گھونسلے کے بغیر رہ جاتی ہے... اسی قسم کے حالات و واقعات سے دوچار لڑکی کا فسانۂ زندگی... زندگی کے ہنگاموں میں مشکل ترین کام اپنے جذبات و احساسات کو کنٹرول میں رکھنا ہے... حدود و قیود سے تجاوز کرنے والے ہمیشہ گردشِ راہ کے مسافر رہتے ہیں... دولت و محبت کی خاطر قتلِ دل و جاں کرکے منافقت کا راستہ اختیار کرنے والوں کی ابتدا اور انتہا...

بے وفائی کے راستوں پر گامزن دلبر دشمن کی دل آزاریاں......

''جاؤ...... چلی جاؤ یہاں سے......'' وہ چلاّ کر بولا۔ ''مت آیا کرو میرے پاس...... تم بے وفا، دھوکے باز ہو...... میں جانتا ہوں، تم میرا مذاق اُڑانے اور مجھے اندر ہی اندر تڑپتا دیکھنے آتی ہو، میرا تماشا دیکھنے آتی ہو۔ مگر یاد رکھو سین! تم نے مجھے دھوکا دیا، خوش تم بھی نہیں رہو گی۔'' وہ نفرت کے زہر میں بجھے لہجے میں بولے جارہا تھا۔ ''تم کیا اب مجھے وہی گھسی پٹی مجبوریوں کے واسطے دینے کے لیے آئی ہو؟ ہونہہ...... محبت صرف محبت ہوتی ہے سین صاحبہ! اس میں مجبوری، لیکن ویکن، اگر مگر کا کیا دخل...... جاؤ یہاں سے......''

وہ آخر میں اس قدر زور سے چلاّیا کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جب دوبارہ کھولیں تو اس کے سامنے فلیٹ کا بند دروازہ تھا۔ وہ چلی گئی تھی، لیکن نہیں...... وہ آئی ہی کب تھی!...... فلیٹ کا دروازہ تو اسی طرح کئی گھنٹوں سے بند تھا، یہاں تو کوئی نہیں آیا تھا۔ نہ سین نہ کوئی اور...... ہاں، یاسر نے شاید ہمیشہ کی طرح اس کی، سین کی یادوں کو پکارا تھا۔ وہ اکثر اس کے پاس آتیں، اسے رُلا ڈالتیں، کبھی کبھی تو ادھ موا کردیتیں۔ تب وہ چلاّ کر اس کی یادوں کو اسی طرح جلی کٹی سنا کر بھگانے کی کوشش کرتا۔

''اُف، یہ مجھے کیا ہوجاتا ہے، وہ مجھے اتنی شدت سے کیوں یاد آتی ہے کہ میں پاگل ہی ہوجاتا ہوں۔ آخر میں اس فریبی عورت کو بُھلا کیوں نہیں دیتا۔ وہ محبت کے، میرے...... قابل تھی ہی کب...... مجھے ہوش آجانا چاہیے۔'' اس نے خود کو سمجھایا۔

وہ اٹھا، کچن میں گیا اور چائے بنائی۔ دوبارہ کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ چائے کی دو چسکیاں لیں، پھر سگریٹ سلگا لیا۔ اس کا خیال تھا کہ سین کی یادیں پھر در آئیں گی، مگر اب ایسا نہیں ہوا۔ شاید اس نے انہیں بری طرح دھتکار دیا تھا۔

مگر نہیں...... وہ اس بار پھولوں کی طرح مسکراتے ہوئے اس کے بالکل قریب آگئی۔ اس قدر کہ سین کا شاخِ

گُل جیسا لچکتا پُرنکہت بدن اس کی دسترس میں آ گیا۔ میں اس کی دسترس میں ہوں، مگر وہ مجھے میری رضا سے مانگتا ہے، لی تفسیر بن کے۔ وہ بے خود ہو گیا۔ وہ پانچ برس پرانی ہی تو یاد تھی۔ وہ خوب صورت ماضی جس کی ایک حسین شام سبین کی سنگت میں رنگِ الفت عطا کر گئی تھی۔ پھر وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ محبت کب فاصلوں کا انتظار کرتی ہے، وہ تو بس ہو جاتی ہے۔ انہیں بھی محبت ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے راستے اور پھر دل کے واسطے ایک تعلقِ خاطر بن گیا، لیکن پھر جیسے تقدیر نے ان کی محبت پر شب خون مارا۔

''نہیں...... نہیں ...... یہ غلط ہے۔ تقدیر نے نہیں، خود سبین نے محبت کی یہ ڈور توڑ ڈالی تھی۔ تقدیر کا بھلا کیا دوش...... ہٹ جاؤ...... دور ہو جاؤ۔ چلی جاؤ۔'' وہ پھر اپنی سابقہ کیفیات میں آنے لگا تھا۔

''اف...... میں کس قدر نفسیاتی بنتا جا رہا ہوں...... مجھے یہ شہر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ میں یہاں کیوں آ گیا۔ جانتا بھی تھا کہ یہاں وہ بے وفا رہتی ہے۔ یہ تو اس بے وفا کا شہر ہے۔ آہ، اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو! تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

اس نے اپنے سر کو جھٹکا۔ وہ آج ہی حیدرآباد پہنچا تھا۔ یہاں اس کی ملکیت تھی، یہ چھوٹا سا دو کمروں اور ایک لاؤنج کا فلیٹ اس کی ملکیت تھا۔ وہ اسے فروخت کرنے کے لیے کراچی سے آیا تھا۔ اسے رقم کی اچانک ضرورت پڑ گئی تھی، اپنے کاروبار میں لگانی تھی۔ لیکن یہاں آتے ہی سبین کی یادوں نے یلغار کر ڈالی تھی۔ سبین بھی اسی شہر میں تھی، اپنے شوہر کے ساتھ...... جس کا نام بہرام خان تھا۔ وہ ایک سُپر اسٹور کا منیجر تھا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ پھر خود سے باتیں کرنے لگا۔ ''بھلا ایک کے لیے انسان اپنی زندگی ہار جاتا ہے۔ میری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو میں جوان اور صحت مند ہوں۔ دولت کما سکتا ہوں اور کما رہا ہوں۔ مزید دولت کمانا جانتا ہوں۔'' وہ اب خود کو دوسرے انداز میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''میں تو اس شہرِ بے وفا میں...... یہاں اپنا فلیٹ فروخت کرنے آیا ہوں، کوئی سبین کی شکل دیکھنے تھوڑی ہی آیا ہوں۔ ہرگز نہیں۔''

اسے پھر سکون آنے لگا۔ وہ چائے اور سگریٹ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس نے سامنے لگی ایل ڈی بھی آن کر دی۔ اس کی نظریں اسکرین پر جم گئیں۔ کمرشل چل رہے تھے۔ اچانک اس کی نظر نیچے چلنے والی خبروں کی پٹی پر پڑی اور اس کی آنکھیں ایک چونکا دینے والی خبر پر جم سی گئیں۔

''لیاقت سُپر اسٹور کا منیجر بہرام خان کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔'' آگے تفصیلات چلنے لگیں۔ ''بتیس سالہ بہرام خان لیاقت سُپر اسٹور کا منیجر تھا۔ کل رات گئے گھر واپس لوٹنے کے دوران کار الٹ گئی۔ حادثہ تیز رفتاری اور کار بے قابو ہونے کی صورت میں پیش آیا۔''

وہ بُت بن گیا۔ تقدیر نے جیسے ایک اور بے رحم پلٹا کھایا تھا۔ اس کے اندر کی کیفیت ایک دم اور ہو گئی۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ یہ سبین کا شوہر ہی ہو، بہرام خان نام کے



نجانے کتنے ہی لوگ اس شہر میں......، مگر نہیں...... ہر بہرام خان تو لیاقت سُپر اسٹور کا منیجر نہیں ہوتا ہوگا۔ مجھے خبر کی تصدیق کرنا چاہیے۔ سیمن سے رابطہ کرتا ہوں۔

اس نے فوراً اپنا سیل فون نکالا، سیمن کا نمبر آج بھی اس کے سیل فون میں محفوظ تھا۔ مگر ''مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔''

اس کی بھویں سکڑ گئیں۔ کیا سیمن نے نمبر بدل لیا تھا یا مجھے بلاک کر دیا تھا، تاکہ میں اسے تنگ نہ کروں۔ اچھا ہی ہوا اس کا نمبر نہیں لگا۔ مجھے کیا۔ ہونہہ...... اس کے دل میں نفرت سی بیدار ہونے لگی۔ بیوہ ہوگئی ہے تو ہوتی رہے۔ مجھے بھلا خبر کنفرم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس نے فون پر بات کرنے کی حسرت پوری کرنے کے لیے کراچی میں اپنے دوست سے بات کر ڈالی۔ یہ عمومی نوعیت کی خیر خیریت کی باتیں تھیں۔

☆☆☆

وہ اپنا فلیٹ فروخت کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ اسٹیٹ ایجنٹ سے بھی رابطہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ ملکی سیاسی اور اقتصادی حالات کے سبب رئیل اسٹیٹ مارکیٹ کو نقصان پہنچا ہے، اسی لیے پیسہ ''رولنگ'' نہیں کر رہا۔ کوئی مارکیٹ نہیں، نہ کوئی بائر، ممکن ہے عام انتخابات کے بعد کچھ حالات بہتر ہوں، ابھی بہتر ہے فلیٹ فی الحال کرائے پر دے ڈالیں۔ مگر اس نے کرائے پر نہیں دیا اور تالا لگا کے کراچی آگیا۔

کچھ دن اور بیت چلے۔ وہ مصروف ہوگیا۔ خبر کی پٹی بار بار اس کے ذہن میں چلتی رہی۔ اس نے نیٹ پر پرانے اخبارات کھنگالے۔ ''آرچیو'' میں اسے بہرام خان سے متعلق خبر ایک پرانے پرچے میں مع تصویر کے مل گئی اور وہ دنگ رہ گیا۔ وہ واقعی وہی بہرام خان تھا، سیمن کا شوہر......

پھر ایک کام کے سلسلے میں کافی عرصہ بعد اسے حیدرآباد آنا پڑا تو وہ خود کو سیمن کے گھر جانے سے نہ روک سکا۔ گویا کشاں کشاں ہی اس کے قدم سیمن کے گھر کی جانب اٹھتے چلے گئے تھے۔

اس نے دروازے پر پہنچ کر کال بیل بجائی۔ دور کہیں گھنٹی بجی۔ دروازے کے پیچھے قدموں کی آہٹ اُبھری پھر دروازہ بھی کھل گیا۔

یاسر حیران سا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ بدل گئی تھی۔ اس کے ہلکے براؤن بال اس کے خوبصورت چہرے کے گرد ہالے کی طرح تھے اور اس کا حُسن اسی طرح دھیمی دھیمی آنچ دیتا تھا۔ ایک لمحے کو یاسر ان پانچ سالوں کو بھول گیا جو ان کے درمیان خلیج بن کر آ کھڑے ہوئے تھے۔ اسے سیمن، وہی انیس بیس سالہ شرماتی، لجاتی اور مسکراتی دوشیزہ محسوس ہوئی جو اس سے پیار کرتی تھی۔

''یاسر......!'' وہ دروازے پر اسے دیکھتے ہی حیرت اور خوشی کے ملے جلے لہجے میں چلّائی۔ ''یاسر......! مجھے یقین نہیں آ رہا......!'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں کمپیوٹر ٹیبل اور دوسرے کونے میں دیدہ زیب ایل ای ڈی لگا تھا اور فرش پر بیش قیمت قالین تھا۔ وہ یونہی کھڑا کمرے کو دیکھتا رہا۔ سیمن اس کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔

''بیٹھو......'' وہ بولی۔ یاسر بیٹھ گیا۔ سیمن بھی سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیسے ہو......؟''

یاسر نے غور سے اُسے دیکھا۔ ''آج کل کراچی میں رہتا ہوں۔ ساحل کے پاس میرا اپارٹمنٹ ہے۔ وہیں میرا ریسٹورنٹ ہے۔ سی بائٹ کے نام سے۔ خوب چلتا ہے۔ معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔''

''گڈ......'' سیمن نے کہا۔ ''تم خوش ہو؟'' وہ ہولے سے ہنس کر بولی۔

''خوش......!'' یاسر نے کہا۔ ''ہاں، میں نے ہر چیز پالی ہے نا۔'' سیمن خاموش بیٹھی رہی۔ ''ویسے تم جانتی ہو سیمن! میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''

''نہیں......!'' وہ بولی۔

''گزری ہوئی یادوں کو تباہ کرنے......'' یہ کہتا ہوا وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ''یا ایک نئی یاد لے جانے کے لیے...... شاید میں اسی لیے آیا ہوں۔ یا شاید پھر...... تم سے کچھ پوچھنے کے لیے......'' اس کا انداز آخر میں ذو معنی ہو گیا۔

''میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سگریٹ سلگایا۔ ''جب سچ بولنے کا موڈ ہو تو بتا دینا۔''

''بہت تلخ ہو گئے ہو تم۔''

''شاید۔''

''اسی لیے آئے ہو تم۔'' سیمن اچانک کھڑی ہوگئی۔ ''کوئی بہانہ، کوئی جھوٹی کہانی سننے کے لیے...... مجھے معاف کرنے کے لیے۔ میرا ہاتھ تھام کر یہ کہنے کے لیے کہ، مسز سیمن بہرام خان! میں نے تمہیں معاف کیا۔ تم نے مجھ سے

بے وفائی کی مگر میں نے تمہیں معاف کیا۔ میں کتنا عظیم ہوں، اسی لیے آئے ہو تم......؟"

"نہیں......" یاسر بولا۔ "مجھے خود نہیں معلوم میں کیوں آیا ہوں یہاں۔ بس، کوئی بات تھی۔ چھوٹی سی معمولی سی، جو دل میں چبھتی تھی۔ ایک دن میں نے ٹی وی خبر کی پٹی پڑھی تھی کہ تمہارے شوہر کا کار کے حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔"

سین نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ بولی۔ "ہاں! وہ مر گیا ہے......"

"کیوں......؟" یاسر نے نہ چاہتے ہوئے پوچھ لیا۔ "حادثے والی رات کیا وہ نشے میں تھا؟ حادثے والی رات وہ کہاں تھا؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" سین نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں پتا ہے یاسر! مجھے زندگی میں بہت کم دولت ملی ہے۔ میرا باپ ایک اسٹور کلرک تھا جہاں وہ رات گئے لوٹتا تھا اور فائلوں پر جھکے جھکے اس کی کمر خمیدہ اور نظر کمزور ہو گئی تھی۔ میں نے کبھی دولت نہیں دیکھی، اور...... اور تم بھی تو یو کے سدھار گئے تھے اچانک...... میں بالکل تنہا اور غیر محفوظ اور غریب......"

"میرا بہنوئی جو میرا محسن بھی تھا، اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔" یاسر ایک دم بولا۔ "تمہیں بتایا تو تھا میں نے۔ بہن نے رو رو کر مجھے بلوایا، وہاں اظہر کا ریسٹورنٹ متاثر ہو رہا تھا، گھر بھی۔ اچھا ہی ہوا، اس بے چارے نے پھر بھی مجھ پر ایک اور احسان کیا، واپسی میں مجھے بھی کچھ پیسے دیے کہ میں پاکستان جا کر اچھا سا ریسٹورنٹ کھول لوں، وہ قرض حسنہ ہی تھا اس کا دیا ہو۔ جو بعد میں، میں نے لوٹا دیا۔" وہ رکا پھر بولا۔ "ہاں، تم آگے کیا بتا رہی تھیں؟"

"اسی وقت مجھے بہرام خان مل گیا۔" وہ سر جھکا کر بولی۔ "دولت مند، برسر روزگار اور تنہا...... میں...... میں آہستہ آہستہ تمہیں بھولنے لگی۔ تم نے ریت پر بنے ہوئے نشان دیکھے ہیں نا۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ وہ مٹ جاتے ہیں۔ میں بھی تمہیں بھولتی گئی۔ اس کو ورثے میں ایک کروڑ ملے تھے اور وہ تنہا تھا۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ یوں مشترکہ حالات ہمیں ایک دوسرے کے پاس لاتے گئے۔ اس کے پاس دولت تھی، اچھا روزگار تھا اور میرے پاس صرف خواب تھے...... تشنہ خواب، جن کی تکمیل کے لیے دولت کی ضرورت تھی۔" کہتے ہوئے اس نے ذرا ٹھہر کر ایک لمبی ہنکاری لی۔ "بہر حال...... مختصراً یہ کہ میں نے شادی کر لی

اور جانا کہ اب خوابوں کی اور خواہشوں کی تکمیل کا وقت آ گیا ہے۔" وہ درمیان میں سر جھٹک کر ہنسی۔ "یہی میری غلط فہمی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ مجھے احساس ہو چلا تھا کہ آج کے دور میں بھلا...... ایک کروڑ کیا ہوتے ہیں، انسان کے تو ایک کروڑ خواب ہوتے ہیں۔ ایک کروڑ آرزوئیں ہوتی ہیں۔ میں نے تو لاکھ بھی نہیں دیکھا تھا، سچ پوچھو تو ہزار بھی قسمت سے ہی دیکھا ہو، اسی لیے مجھے شاید اس کے ایک کروڑ زیادہ لگے تھے، خیر، صرف سات ماہ کے بعد بہرام کے اکاؤنٹ میں دو ایک لاکھ ہی رہ گئے تھے اور میرے پاس ناتمام خواہشوں کا ایک ڈھیر تھا۔ میری خواہشوں کے سامنے اس کی منیجری کی نوکری بھی معمولی محسوس ہونے لگی۔ میرا اس کے ساتھ جھگڑا روز کا معمول ہونے لگا۔ میں اسے مزید اچھی نوکری کا کہتی رہتی۔ پھر ایک دن تنگ آ کر میں نے اسے چھوڑ کر جانے کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ وہ خوف زدہ ہو گیا میری اس دھمکی پر...... اس نے مسکرانا تک چھوڑ دیا۔ سگریٹ سے وہ پینے پلانے بھی لگا۔ میں نے اس سے معافی مانگی کہ میں نے وہ سب غصے میں کہا تھا، خدارا اب خود کو سنبھالو۔ پھر چند دنوں بعد ایک رات وہ دیر سے گھر لوٹا۔ وہ نشے میں تھا۔ اس نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا اور ایک چمڑے کا بیگ دکھایا، بلکہ اسے میرے سامنے رکھ دیا۔ لائٹ آن کی اور وہ بیگ کھولا۔ اس میں پانچ ہزار کے بڑے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔"

"کتنی دولت تھی......؟" یاسر نے پوچھا۔ سین نے اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ "پورے سات...... سات کروڑ......"

"سات کروڑ......" یاسر حیرت سے چیخا۔ "ناممکن......"

"سات کروڑ!" سین نے دوبارہ مضبوط لہجے میں کہا۔ "پورے سات کروڑ۔ اس نے وہ گڈیاں بستر پر بکھیر دیں اور بولا۔ "سین! تمہیں دولت کی ضرورت تھی نا۔ یہ دولت کافی ہو گی۔ سات کروڑ ہیں۔ سین! اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کہاں سے آئے تو وہ بولا کہ سب قسمت کا کمال ہے۔ اس نے جوئے میں جیتے تھے۔ ایک جگہ ہوٹل کے تہ خانے میں جوا ہو رہا تھا بقول بہرام کے ہی وہ بڑے پیمانے کا جوا تھا۔ لہٰذا وہ کھیل میں شامل ہونے کے لیے اپنی آخری تھوڑی بہت جمع پونجی بھی لگا بیٹھا۔"

اس کی بات سن کر یاسر ایک ٹھکا مار کے ہنسا۔ پھر اسی

انداز میں بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ جھوٹ مرحوم بہرام نے بولا تھا یا اب تم بول رہی ہو۔ سات کروڑ جوئے میں اتنی آسانی سے نہیں جیتے جاتے۔ اول تو اتنی بڑی رقم کے کھیل میں کسی اجنبی کو شامل نہیں کیا جاتا۔ اگر کر بھی لیا جائے تو دیگر لوگوں کو ہزاروں روپے دکھانے بھی پڑتے ہیں۔ کوئی عام شخص جیب میں اتنے روپے لے کر کروڑوں کے جوئے میں شریک نہیں ہوسکتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' سیمن نے سر ہلایا۔ ''پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا مگر بہرام جس ہوٹل میں اکثر جایا کرتا تھا وہاں ہر رات جُوا ہوتا تھا۔ خفیہ طور پر اور جو لوگ جُوا کھیل رہے تھے ان میں سے ایک کو بہرام جانتا تھا۔ بہرام نے خود مجھ سے کہا تھا کہ اس نے بینک سے اپنی تمام جمع پونجی نکال لی تھی اور وہ اپنی زندگی کا آخری جُوا کھیل رہا تھا۔ ہارنے کے لیے یا جیتنے کے لیے...... اور وہ جیت گیا...... میرا دعویٰ ہے کہ یہ رقم اس نے چرائی نہیں تھی، سات کروڑ روپے کا غبن یا ڈاکا یا چوری اخباروں کی سرخی ضرور بنتی۔''

''ہوسکتا ہے۔'' یاسر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''یہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔''

''بہرام نے مجھے بتایا تھا کہ پانچ آدمی کھیل رہے تھے۔ جب وہ جوئے میں شامل ہوا تو جُوا جاری تھا۔ ان پانچ میں سے ایک کا نام حامد تھا۔ مجھے بہرام کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ پھر ہم نے وہ سات کروڑ اپنے گھر کے تہ خانے میں چھپا دیے۔ وہ اب نوکری چھوڑ کر کوئی کاروبار کرنا چاہتا تھا، لیکن پھر وہ ایک رات اچانک غائب ہوگیا۔ ایک دو روز بعد لوٹا پھر حادثے والے دن بھی صبح میں نے اس کے پاس بھرا ہوا پستول دیکھا۔ میں یہی سمجھی شاید اتنی بڑی رقم جیتنے کے بعد اسے اپنی جان کا خوف ہو۔''

''ان پانچ آدمیوں میں سے ایک کا نام حامد تھا۔'' یاسر سوچتا ہوا بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ پھر سات کروڑ جیتنے کے بعد آخر بہرام کو غائب ہونے کی کیا ضرورت تھی؟''

سیمن چپ سی رہی۔ پھر وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''بہرام کے جانے کی وجہ مجھے معلوم ہے۔'' وہ بولی۔ ''مگر شاید وہ وجہ میں تمہیں نہ بتا سکوں۔''

یاسر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ''حادثے کے وقت وہ کہاں جارہا تھا، کیا گھر لوٹ رہا تھا یا پھر...... اور اس کے پاس صبح بھرا ہوا پستول کیوں تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''بکواس کرتی ہو تم......'' وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔ ''حادثے کے وقت وہ کہاں جارہا تھا، یہ تمہیں نہیں معلوم۔ اس کے غائب ہونے کی وجہ تمہیں معلوم ہے۔ مگر تم مجھے بتا نہیں سکتیں۔ سیمن! میں الو کا پٹھا نہیں ہوں کہ تمہاری ہر بات کا آنکھ بند کر کے اعتبار کرتا جاؤں۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ ''اور...... اب تو میں نے آنکھ بند کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ جانے کب، کہاں، کیا ہوجائے۔''

''یاسر!'' سیمن نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''تم بات کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ وہ رقم اب میرے پاس نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''جس رات بہرام گھر سے گیا تھا، اس رات میں نے تہ خانے میں جا کر دیکھا تو وہاں سے چمڑے کا وہ بیگ غائب تھا۔ جس کے اندر سات کروڑ کی رقم تھی۔ میرا...... میرا خیال ہے کہ بہرام ساری دولت اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا اُس رات...... یا پھر حادثے والی رات کو......''

یاسر جوں کا توں بیٹھا رہ گیا۔ وہ بولتی رہی۔ ''دولت نہ تہ خانے میں ملی۔ نہ بہرام کی لاش کے ساتھ۔ کار کے ڈھانچے میں نہ کوئی بیگ تھا نہ سات کروڑ کی رقم۔''

''تو تمہیں افسوس اس بات کا ہے۔'' یاسر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کہ تمہیں دولت نہ مل سکی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ تمہارے چہرے پر غم کی یہ جو مدھم سی پرچھائیں ہے، بیوہ ہوجانے کی نشانی ہے۔ اب پتا چلا کہ یہ تو سات کروڑ کے زیاں کی بدولت ہے۔''

''پلیز، یاسر!'' سیمن نے لجاجت سے کہا۔ ''یہ ظلم ہے۔ اس طرح مت کہو۔''

''یہ ظلم ہے۔'' یاسر نے کہا۔ ''نو بے بی! میں ظلم نہیں کرتا، یہ تمہارا شعبہ ہے۔ اس میں تو تم ایکسپرٹ سمجھی جاتی ہو۔''

''تم...... تم آخر چاہتے کیا ہو؟'' اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ''ٹھیک ہے۔ میں نے تم سے محبت کی مگر جب تم یوکے چلے گئے تو میں نے کسی اور کے ساتھ شادی کر لی، لیکن...... لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ بہرام درحقیقت ایک جواری تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ مر جائے گا اور میں تنہا رہ جاؤں گی۔''

یاسر کو اس لمحے وہ ایک ننھی سی بچی محسوس ہوئی جو طوفانی ہواؤں میں کسی کمزور ٹیلے پر کھڑی ہو۔

''میں بہت بُری ہوں کیونکہ میرے پاس تشنہ خواب

ہیں اور نا تمام خواہشیں ہیں۔"

"تم واقعی بُری ہو۔" یاسر نے دل میں کہا۔ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

"اب تم کیا چاہتی ہو؟" بالآخر یاسر نے پوچھا۔

"میں...... میں چاہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو۔ میری مدد کرو...... سات کروڑ حاصل کرنے کے لیے۔"

"سوری سین!" وہ بولا۔ "میں اب یاسر خان نہیں رہا، میں سب کچھ کرسکتا ہوں، تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں، تمہاری مدد کرسکتا ہوں اور سات کروڑ کا سراغ بھی لگا سکتا ہوں، مگر میں یہ سب کیوں کروں......؟ مجھے کیا فائدہ ہو گا؟" وہ عیاری سے مسکرایا۔

"مجھے زیادہ حساب کتاب تو نہیں آتا، بس، تم دو کروڑ رکھ لینا۔" سین نے کہا۔

"تین کروڑ کی بات کرو، چار تو پھر بھی تمہیں ملیں گے۔" یاسر بولا۔ سین کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر مسکرائی۔

"ٹھیک ہے، تین تمہارے مگر...... مگر میری ایک شرط ہے۔"

"کیا......؟" یاسر نے حیرت سے پوچھا لیکن سین کی معنی خیز مسکراہٹ اور آنکھوں کے دھیمے سے اشارے کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس کا سوال بے معنی تھا۔ اس کا چہرہ قریب آتا گیا۔

"میری شرط یہ ہے......" اس نے سرگوشی کی۔ "کہ اب تم اپنے فلیٹ میں نہیں، میرے پاس، یہاں رہو گے۔"

اس کی شرط سن کر یاسر کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ دفعتاً ہی اسے احساس ہوا کہ گزرے چند برسوں نے اس کے حُسن پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کے متناسب جسم کا گداز اسے اپنے پاس محسوس ہوا۔ اس کی مرمریں بانہیں اسے اپنی گردن کے گرد محسوس ہوئیں، یاقوتی لب اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں پر محسوس ہوئے۔ یہ عورت کون ہے؟ اس نے سوچا، محبوبہ...... یا بیوی؟ یہ کیوں کہتی ہے کہ تم میرے پاس ٹھہرو گے۔ سنبھل کر چلنا یاسر خان! اسی راہ پر تم کچھ سال قبل چلے تھے تو ہر پھول کے پیچھے سیکڑوں کانٹے پنہاں تھے اور کوئی پھول ایسا نہ تھا جس میں خوشبو ہو۔ پھر اب اسی راستے پر کوئی پھول اور کوئی خوشبو کس طرح ہو سکتی ہے۔ یاسر کا دل بے طرح دھڑکنے لگا اور بولنے لگا۔ مجھے راہوں کے کانٹوں سے کوئی غرض نہیں۔ بس اک توقع ہے تو خوشبو کی جو اس عورت کی محبت سے آتی ہے۔ مجھے سین سے محبت ہے۔ کیا کروں میں، وہ بے وفا ہے، سنگ دل ہے، مگر مجھے اس سے محبت ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے...... مجھے محبت ہے۔ اس سے......

☆☆☆

واپسی پر وہ سین کے متعلق سوچتا رہا۔ چند برس پہلے کی سین جو مسز بہرام نہ تھی، صرف سین تھی اور اس کی آنکھیں تھیں جو اثبات کے اشارے کرتی تھیں اور اس کے ہونٹ تھے جو صرف کسی اقرار کے لیے وا ہوتے تھے اور اس کا دل تھا جو صرف یاسر کے لیے دھڑکتا تھا۔ پھر وہ محبت بھی تھی جو کسی پوشیدہ راز کی طرح ان آنکھوں سے برستی تھی اور...... ان کے انداز سے ظاہر ہوتی تھی، مگر اب کیا ہے......؟ اس نے خود سے کہا۔ اب یہ سب کہاں ہے یاسر خان! محبتیں تو دوبارہ شروع نہیں ہوتیں۔ محبت یا تو قائم رہتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے۔ ختم ہونے کے بعد محبت دوبارہ شروع نہیں ہو سکتی۔ زندگی کی طرح اور سانسوں کی طرح اور دھڑکن کی طرح...... بہ قول فیض شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔

ے موتی ہو کہ شیشہ جام کہ دُر...... جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے، جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا۔ تم ناحق ٹکڑے چن چن کر، دامن میں چھپائے بیٹھے ہو۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔ کیا آس لگائے بیٹھے ہو یاسر خان! یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں، یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط چبھتے ہیں۔

بہرکیف...... جذبات سے قطع نظر اگلے دن تک بہت سی اہم باتیں طے کی جاچکی تھیں۔ یاسر نے فوراً کراچی کا رخ کیا۔ اپنے چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے لیے ایک منیجر کو مقرر کردیا۔ اسے کچھ ہدایات دیں، جس میں پانچ، چھ روز بعد یاسر کا ایک دن کے لیے حیدرآباد سے یہاں چکر لگانا بھی شامل تھا۔ وغیرہ۔ باقی معاملات کے لیے فون کا رابطہ سہل تھا۔

اس کے ایک دو روز بعد یاسر دوبارہ حیدرآباد آ گیا۔ اپنے فلیٹ کا رخ کیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ کو پارٹی وزٹ کے لیے سردست روک دیا گیا۔ شام یا دن میں اس کا سین سے روز کا ملنا معمول قرار پایا۔ دونوں سر جوڑ کر آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے۔ سات کروڑ کے حصول کے لیے دونوں نے پوری طرح تیاری پکڑ لی تھی۔

اس کے بعد وہ ہوٹل گرین پہنچا۔ استقبالیہ پر خرانٹ قسم کی خاتون موجود تھی۔ اس نے یاسر کے عاجزانہ لہجے پر رحم کھاتے ہوئے ڈیسک پر رکھے لیپ ٹاپ پر جلدی جلدی اپنی انگلیاں چلائیں، پھر اسے وہی بتایا جس کی یاسر کو توقع

تھی۔

"جی ہاں! مسٹر حامد ہمدانی ایک ماہ قبل یہاں مقیم تھے، وہ آخری بار پندرہ روز پہلے منگل والے دن آئے تھے۔ وجہ کاروباری دورہ تھا۔ ان کا مکمل پتا ہے......"

"بہت شکریہ۔" یاسر نے ایک محبت نواز مسکراہٹ پھینکی۔ موٹے شیشوں والی عینک کے عقب میں مسکراہٹ کا اندیشہ نمودار ہوا اور وہ پلٹ گیا۔

جام شورو، یونیورسٹی سوسائٹی، فیز تھری کے ایک بنگلے پر پہنچ کر وہ رکا۔ چوکیدار نے بتایا کہ "صاحب" کاروباری دورے پر کراچی گئے ہوئے ہیں۔ متوقع ملاقات کے لیے چوکیدار نے اسے آفس کا پتا دے دیا، جو لطیف آباد دو نمبر کی کمرشل اسٹریٹ کی ایک بلڈنگ میں واقع تھا۔

یاسر بلا دیر وہاں جا پہنچا۔ معلوم ہوا کہ شام تک حامد کی واپسی متوقع ہے۔ وہ انتظار کر کے پھر شام کو آفس جا پہنچا۔ اسٹاف کم تھا۔ وہ ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار کرتا تھا، اندرونِ سندھ اور پنجاب سے چاول اور گندم کی خرید و فروخت کرتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یاسر کو اس پر ایک مجسمے کا گمان ہوا تھا۔ اندازِ گفتگو سپاٹ، برجستہ، قدرے طنزیہ اور سرد بھی۔ پوچھنے پر وہ جھلا کر بولا۔

"مسٹر......؟ کیا نام بتایا تھا؟"

"یاسر خان۔"

"ہاں، یاسر خان! میں اس بہرام خان نام کے آدمی کو نہیں جانتا اور جانتا بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا، روزانہ ہی میں بیسیوں لوگوں سے ملتا رہتا ہوں۔ ہوگا کوئی، مجھ سے بھی ملا ہو شاید۔ تم کیا اس کے بھائی ہو؟ ناموں کے سابقات سے تو یہی لگتا ہے؟"

"میں اس کا بچپن کا دوست ہوں۔ وہ اب کار کے ایک حادثے میں مر چکا ہے۔ لیاقت سپر اسٹور کا منیجر تھا۔" یاسر نے بتایا۔

"تم کون ہو، اس کے باپ؟" حامد جھلا کر بولا۔

"اداکاری اچھی کر لیتے ہو تم۔" یاسر نے بھی طنزیہ رویہ اختیار کیا۔ "مگر میرے پاس خاصے ثبوت ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہرام خان کو اچھی طرح جانتے ہو۔ ہوٹل گرین کے خفیہ روم میں تم پانچوں اور بہرام جوئے کی میز پر......" یاسر کی بات ادھوری رہ گئی۔ حامد نے اسی وقت میز پر لگی بیل بجا دی۔ دروازہ کھلا اور اس کی خوب صورت سیکریٹری اندر داخل ہوئی۔

"نازیہ......!" حامد نے کہا۔ "لیاقت سپر اسٹور کے منیجر بہرام خان سے میری بات کراؤ اسی وقت فون پر۔"

سیکریٹری خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔ یاسر بولا۔

"میں نے تمھیں بتایا کہ وہ کار کے حادثے......"

"خاموش۔ تصدیق کرنا لازمی ہے میرے لیے۔" اس نے بات کاٹ دی۔

پانچ منٹ بعد ہی دروازہ کھلا اور نازیہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک نگاہ کرسی پر براجمان یاسر کی طرف دیکھا اور حامد سے بولی۔ "سر! تقریباً ایک ماہ قبل بہرام خان مارے جا چکے ہیں۔"

"او کے جاؤ۔" اس نے کہا۔ نازیہ لوٹ گئی۔ وہ یاسر سے مخاطب ہوا۔ "بہرام کسی حادثے میں مر چکا ہے۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔ "اور تم یہاں بیٹھے میرے اور اس کے درمیان کسی دوستی یا شناسائی کے رابطے کو ثابت کرنے پر تلے بیٹھے ہو۔ مائی ڈیئر یاسر! تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہے؟"

"نہیں۔" یاسر نے سکون سے کہا۔ "میرا دماغ خراب ہے! کیونکہ میں اُس ایک رات سے واقف ہوں جو تمھارے اور اس شخص کے درمیان مشترک تھی، اسی رات اس کی کار کو حادثہ پیش آیا۔ میرا دماغ تو واقعی خراب ہے، حامد! کیونکہ چند باتیں مجھے معلوم ہوگئی ہیں۔ ایسی باتیں جن میں کسی گزری ہوئی رات کا قصہ بھی آتا ہے۔ یعنی سات کروڑ کا ذکر......" کہتے ہوئے اس نے بھانپتی ہوئی نظروں سے حامد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور معمے میری سمجھ میں نہیں آتے۔ گزری ہوئی رات اور سات کروڑ، قتل اور خون...... اس قسم کی باتیں کسی جاسوسی ناول کے اشتہار میں اچھی لگتی ہیں۔"

"جس رات بہرام خان قتل ہوا۔" یاسر نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اس رات تم ہوٹل گرین میں موجود تھے۔ تم اور تمھارے تین دوست۔ تم نے وہاں جُوا کھیلا، جُوا خفیہ طور پر کھیلا جاتا رہا۔ انسان اپنی زندگی میں کتنے ہی جُوئے کھیلتا ہے اور ہارتا ہے۔ بہرام خان نے اپنی ساری جمع پونجی اس جوئے پر لگا دی اور خوش قسمتی سے وہ سات کروڑ کی خطیر رقم جیت گیا۔"

"اگر تم کوئی خفیہ پولیس والے ہو تو تمھاری عقل پر میرا کچھ پڑھ ڈالنے کو دل کرتا ہے۔" حامد، بات کاٹ کے بولا۔ "اتنی رقم بھلا کوئی جیب میں لیے گھومے گا؟"

"اس وقت بھی تمھارے دفتر کے سیف میں کروڑ سے اوپر ہی رقم موجود ہوگی۔" یاسر نے کہا۔ "ٹیکس، ایف



جان! ذرا دیکھو تو ہمارے پڑوسی جوڑے میں کتنی محبت ہے

بی آر اور ریٹرن ٹیکس سے بچانے کے یہ پرانے طور طریقے تم جیسے کاروباری لوگوں کو خوب آتے ہیں۔ چند ایک کروڑ تو کچھ بھی نہیں، تمہاری خواب گاہ میں بھی اس وقت اس سے زیادہ رقم، روپوں اور ڈالرز کی صورت میں... موجود ہوگی اس لیے اس بحث میں مت پڑو۔"

"اچھا تو شہر میں اس دوران جتنے لوگ حادثے میں مارے گئے، ان کے پیسے گم ہوئے ان سب کا ذمے دار میں ہوں؟" حامد نے پینترا بدلا۔

"قصہ مختصر کرو۔" یاسر نے ہاتھ اٹھایا۔ "پہلے تم تسلی رکھو کہ میں پولیس کا آدمی یا کوئی رپورٹر نہیں ہوں، اسی لیے کسی معاملے داری پر بات کرنے کے لیے تم آزاد ہو۔ یہ بتاؤ، تمہارے وہ تین دوست کون تھے، جو اُس رات بڑے پیمانے کے اس جوئے میں شامل تھے؟" یاسر نے پوچھا۔ "اور کیا سات کروڑ جیتنے کے بعد تم نے بغیر کسی احتجاج کے اتنی آسانی سے بہرام خان کو سات کروڑ کی رقم کے ساتھ گھر جانے دیا تھا؟"

"اس سے پہلے کہ میرا کوئی ملازم تمہیں اٹھا کر باہر پھینکے۔" حامد نے ایک دم غرا کر کہا۔ "دفع ہو جاؤ۔ جاسوس کی اولاد۔"

"پہلے مجھے صرف شبہ تھا حامد صاحب!" یاسر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر اب کچھ کچھ یقین ہوتا جارہا ہے کہ بہرام کو پیش آنے والا حادثہ اتفاقی نہیں تھا۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔ ان سات کروڑ کے لیے جو قسمت نے اچانک اس کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔ مجھے شبہ ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے اور اس کے قاتل تم ہو۔" یاسر نے پورے اعتماد سے انگلی کے ساتھ حامد کی طرف اشارہ کیا۔ "تم...... حامد ہمدانی...... کیونکہ وہاں بہرام صرف تمہیں جانتا تھا، صرف تمہیں......"

پھر دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اس نے وہ گالی سنی جو کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے حامد نے چلا کر اسے دی تھی۔ دروازہ بند کرنے کے دوران ہی وہ چونک پڑا۔ اندر سے برآمد ہونے والی گالی سن کر نہیں، بلکہ، سامنے ایک دم پلٹ کر اپنی میز کی طرف بڑھتی ہوئی اس کی سیکریٹری نازیہ کو دیکھ کر...... وہ مسکرایا۔ یقیناً وہ دروازے کے پیچھے کھڑی اندر ہونے والی گفتگو کان لگا کر سن رہی تھی۔

اس کی ڈیسک کے قریب گزرتے ہوئے یاسر نے اسے بھانپتی ہوئی نظروں سے گھورا تو نازیہ نے فوراً ایک چٹ لکھ کر اس کی طرف خاموشی سے بڑھا دی اور سرگوشی میں بولی۔

"اس نمبر پر مجھ سے گھنٹے بھر بعد رابطہ کریں۔" یاسر نے چٹ لی اور باہر آ گیا۔

کار میں سوار ہوتے وقت اس نے چٹ پر درج سیل نمبر اپنے فون پر سیو کیا، چٹ پھاڑ کر باہر اچھال دی اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

تنہا کمرے میں حامد اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا تھا۔ اچانک اس کے فون کی بیل گنگنائی۔

"ہیلو۔" اس نے فون کان سے لگا کر کہا۔

"کیا حال ہیں؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں قیصر بول رہا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے ہمارے بُرے دن آ گئے ہیں۔" حامد نے جیسے چھوٹتے ہی اس سے کہا۔ "آج ایک جگادری سا آدمی میرے پاس آیا تھا۔ یاسر خان نام تھا اُس کا......"

"کیا کہتا تھا؟" قیصر کی آواز آئی۔

"وہ سالا، بہرام خان کی بیوی کا دوست ہے۔ ممکن ہے عاشق نامراد بھی رہا ہو۔"

"کام کی بات کرو۔" قیصر نے ٹوکا۔

''سنتے رہو پھر۔'' حامد بولا۔ ''اس نے مجھ پر بہرام خان کو قتل کرنے کا الزام لگایا۔ اسے سات کروڑ کی رقم کا بھی علم ہے، قیصر! مجھے اس آدمی کے تیور ٹھیک نہیں لگتے۔''

''تم نے کیا کہا اُس سے......؟''

''میں کیا کہہ سکتا تھا۔'' حامد بولا۔ ''کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں نے اسے نکال دیا۔''

''اچھا کیا۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''میں کچھ دیر میں پہنچ رہا ہوں۔ فون پر لمبی بات نہیں ہو سکتی۔''

''او کے، مگر مراد شاہ اور نومی کو بھی لے کر پہنچو۔'' حامد نے کہا۔ ''مجھے سکون کی سخت ضرورت ہے۔ اس شخص نے اچانک گڑبڑ پیدا کر دی ہے۔''

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

☆☆☆

گھنٹے بھر بعد یاسر نے نازیہ کے دیے ہوئے نمبر پر بات کی، اس نے اسے دریا کے کنارے واقع ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرنے کی ہدایت کی۔ وہ وہاں پہنچا تو اس کے دس پندرہ منٹ بعد نازیہ آ گئی۔

''ہیلو، زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔'' وہ مسکرائی اور کرسی کھسکا کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''نہیں۔'' وہ بھی مسکرایا۔ نازیہ ایک پُرکشش اور اسمارٹ لڑکی تھی۔ ''کیا منگواؤں آپ کے لیے؟ چائے یا کافی۔''

''چائے۔''

یاسر نے چائے کے ساتھ کچھ بائٹس بھی منگوا لیے۔

''تم حامد سے ملنے کیوں آئے تھے؟'' نازیہ نے پوچھا۔ یاسر کا خیال تھا کہ وہ اسے کچھ بتانا چاہتی ہے۔ اس نے تو الٹا سوال کر ڈالا۔ کیا خبر یہ بھی حامد کی کوئی چال ہو۔ تاہم محتاط ہو کر بولا۔

''تم تو دروازے کے پیچھے کھڑی سن رہی تھیں سب، پھر کیوں سوال کیا؟''

''ہاں، سب سن چکی تھی۔ کیا تمہیں اُس کے باقی تین دوستوں کے نام معلوم ہیں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' یاسر نے کہا۔

''قیصر، مراد شاہ اور نعمان عرف نومی...... یہ تینوں ہی اس کے دوست ہیں۔'' نازیہ نے بتایا۔ یاسر حیران رہ گیا۔ جو بات معلوم کرنے میں اس کے کئی ہفتے صرف ہو سکتے تھے وہ یوں اچانک اس لڑکی نے بتا دی تھی۔

''تمہیں...... تمہیں یقین ہے......!'' وہ حیرت سے بولا۔ ''میرا مطلب ہے، یعنی...... تمہیں کیسے معلوم ہے؟''

''مت بھولو کہ میں اس کی سیکریٹری ہوں۔'' نازیہ نے اطمینان سے کہا۔ ''میں ہی تو لوگوں سے اس کی ملاقات کا وقت طے کرتی ہوں اور اس کی مصروفیات کا ریکارڈ رکھتی ہوں۔ پانچ تاریخ کی رات کو اپنے انہی تینوں دوستوں کے ساتھ گرین ہوٹل میں وہ مقیم تھے۔ مجھے یہ ہدایت تھی کہ ہر ملاقاتی کو پرکھ کر یعنی، جس سے کوئی متوقع کاروباری ڈیل ہو سکتی ہے، سیل پر رابطہ کر لے، ورنہ بزنس منیجر علی بخش اسے ڈیل کرے۔'' وہ چپ ہوئی۔ یاسر ششدر بیٹھا رہا۔ قیصر، مراد شاہ اور نومی...... اس نے دل ہی دل میں یہ نام دہرائے۔

''ایک بات پوچھوں؟'' نازیہ نے کچھ دیر بعد اس سے کہا۔

''ہاں۔''

''بہرام، تمہارا کون تھا؟'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''میرا مطلب ہے...... رشتے دار...... یا پھر...... دوست۔''

یاسر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر گھٹے گھٹے انداز میں بولا۔ ''ایک لڑکی تھی...... جس سے میں محبت کرتا تھا، شاید اب کرتا ہوں۔ بہرام خان اس لڑکی کا شوہر تھا۔''

نازیہ نے اچانک ہنسنا شروع کر دیا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے پلٹ پلٹ کر ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ یاسر سنجیدہ شکل بنائے بیٹھا تھا اور نازیہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنسے جا رہی تھی۔ یاسر کو یوں لگا جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

''بند کرو، کیا مذاق ہے۔'' وہ بالآخر جھلا کر بولا۔

''ایسا عاشق صادق میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔'' ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''اب دیکھ لو۔'' یاسر نے جھنا کر کہا۔ ''میں کیا کرتا، وہ بیوہ ہو گئی تھی اور مصیبت میں تھی اور سات کروڑ سے محروم ہو گئی تھی۔ اس کی مدد کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا میں۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا۔ ''دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے میں شاید یہ بات احمقانہ لگتی ہے۔ مگر آدمی کا دل دھڑکنے لگے اور کوئی جذبہ سیاہ چادر کی طرح آدمی پر چھاتا جائے اور مجبور کرتا جائے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ احمقانہ ہونے کے باوجود...... یوں سقراط بھی جانتا تھا کہ وہ زہر کا پیالہ پینے والا ہے اور گلیلیو بھی جانتا تھا کہ شاہی دربار میں زمین کو گول قرار دینے کا دعویٰ کر کے موت کو دعوت دے رہا

ہے۔"

اس فلسفے پر نازیہ کی ناک سرخ ہونے لگی۔ اس پر شاید پھر ہنسی کا دورہ پڑنے لگا تھا۔ یاسر گھبرا گیا۔ پہلے دائیں بائیں دیکھا، لوگوں کے بشروں سے اسے یہی لگا جیسے وہ ایک بار پھر ہنسی کے طوفان سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں۔

"خدا کے لیے اپنی طوفانی ہنسی پر قابو پاؤ۔ مذاق بن جائیں گے ہم دونوں یہاں پر۔"

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے......!" بالآخر نازیہ نے اپنی اُمڈتی ہوئی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور آگے بولی۔ "میری مانو تو اب بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر چلے جاؤ، کیوں پرائے جھگڑے میں ٹانگ اڑاتے ہو۔"

"کاش......!" یاسر نے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ "کاش! تم جتنی خوب صورت ہو اتنی ہی عقل مند بھی ہوتیں، کیونکہ بات اب پرائی نہیں رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" نازیہ نے حیرت سے کہا۔

"سین سے...... میرا مطلب ہے۔ بہرام کی بیوہ سے...... میرا معاہدہ ہو چکا ہے۔"

"شادی کا......!" نازیہ نے کہا۔

"نہیں، سات کروڑ تلاش کرنے کی صورت میں تین کروڑ میرے......"

"شکر خدا کا......!" نازیہ نے ایک لمبا سانس لیا۔ "میں تو سمجھی تھی کہ تم میں عقل و خرد کے تمام آثار مفقود ہو چکے ہیں۔"

"یس......" یاسر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "ابھی ابھی مجھے محسوس ہوا ہے کہ عقل و خرد کے تمام آثار مفقود ہو چکے ہیں۔ ابتدا میں یہی ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا؟"

"کیا......؟"

نازیہ نے گڑبڑا کر کہا۔ "کس چیز کی ابتدا......؟"

اسے احساس ہوا کہ اس کا سوال فضول تھا اور بے معنی بھی، قصور سارا اس نوجوان کی آنکھوں کا تھا، جو اعتماد سے مسکراتی تھیں۔ سرگوشیاں کرتی تھیں اور بولتی تھیں۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ کافی دیر سے وہاں بیٹھی ہے اور باہر رات کا اندھیرا چھاتا جا رہا ہے اور اچانک پھیلنے والی تاریکی کی طرح ایک بے نام سا جذبہ ہے، ایک نامعلوم سی خلش اس کے دل پر چھائی جا رہی ہے۔

"تھینک یو، نازیہ!" یاسر نے اس کے گلابی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم سے ملنے کے بعد مجھے بے پناہ حوصلہ ملا ہے۔"

"اپنا خیال رکھنا یاسر......!" اس نے خود کو کہتے سنا۔ وہ خود نہیں بول رہی تھی۔ اس کے اندر موجود کوئی بے پناہ، شدید جذبہ بول رہا تھا۔ "حامد ہمدانی اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا۔"

"فکر نہ کرو۔" یاسر نے مسکرا کر کہا۔ "اٹھو، تمہارے گھر والے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

باہر اندھیارا تھا اور خاموشی تھی۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ دیے آگے بڑھتے گئے اور بالآخر تاریکی میں مدغم ہو گئے۔

☆☆☆

اس کے سامنے تین کرسیوں پر قیصر، مراد شاہ اور نومی بیٹھے ہوئے تھے۔ تینوں بزنس سوٹ میں تھے اور قیمتی سگار پی رہے تھے۔ حامد اُن سے مخاطب تھا۔

"میں کیا کر سکتا تھا......" وہ دانت پیس پیس کر کہہ رہا تھا اُن سے...... "وہ سیدھا اندر گھس آیا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس چکر میں آیا ہے تو میں اس مردود کو اندر گھسنے ہی نہ دیتا۔"

"عمر کیا تھی اُس کی؟" قیصر نے پوچھا۔

"ہو گی اٹھائیس انتیس سال کی۔" حامد بولا۔ "مگر عمر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ بہرام خان کے بارے میں شبہ کر رہا ہے۔"

"تمہیں اس کو گولی مار دینی چاہیے تھی۔" مراد شاہ نے کہا۔ "نہ رہتا بانس نہ بجتی بانسری۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہے۔" حامد نے پلٹ کر کہا۔ "ہر مسئلے کا حل گولی نہیں ہوتی۔ ہر گولی کے بعد دس مسئلے اور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں اسے گولی مار کر لاش غائب کرا دیتا تو اس کے دوست اور رشتے دار سب اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ معاملہ پولیس تک چلا جاتا۔"

مراد شاہ شرمندہ نظر آنے لگا۔ اسی لہجے میں بولا۔ "آئی ایم سوری! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ......"

"تمہارا مطلب جو بھی ہو، ہمارے خیال میں تم خاموش ہی رہو تو اچھا ہے۔"

"آل رائٹ۔" مراد شاہ سر کھجا کر چپ ہو رہا۔

"میں نے تم لوگوں سے پہلے ہی کہا تھا۔" نومی نے احتیاط سے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سات کروڑ اتنی بڑی رقم نہیں ہوتی۔ ہم آپس میں ایک ایک یا

ڈیڑھ ڈیڑھ کروڑ بھی جمع کرتے تو رقم پوری ہو جاتی۔ اب سات کروڑ کے عوض چار آدمی چوبیس گھنٹے اپنے دلوں میں گرفتاری کا خوف چھپائے پھرتے رہیں۔ یہ عذاب بہت بڑا ہے، گناہ سے بھی بڑا......"

"گزری باتوں کو چھوڑو۔" حامد نے کہا۔ "جو ہو چکا، سو ہو چکا۔ یہ سوچو کہ اب کیا ہوگا۔ ہمیں اب کیا کرنا ہے؟"

"فرض کرو۔ وہ پولیس کے پاس چلا جائے۔" اس کی بات پر پورے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ صرف دیوار گیر کلاک کی ٹک ٹک باقی تھی۔ وہ خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی صورتیں تکتے رہے۔

☆☆☆

یاسر نے کال بیل کے بجائے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ یہ اس کی آمد کا مخصوص کوڈ تھا۔ دروازہ کھلا۔ سبین اس کی منتظر تھی۔ یاسر سیدھا اندر چلا آیا۔ سبین دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے آگئی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" یاسر صوفے پر گر گیا۔ "چائے پلاؤ۔ سخت تھکا ہوا ہوں۔"

وہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ اس کی چال کا رقص دیکھتا رہا۔ وہ کافی لے کر واپس آئی تو یاسر آنکھیں موندے صوفے پر نیم دراز تھا۔ چائے کے برتنوں کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آج میں حامد ہمدانی سے ملا تھا۔" اس نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ سبین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسی لہجے میں بولی۔

"تت...... تم مل لیے اُس سے......؟"

"ہاں!" یاسر بولا۔ "کافی تلاش کے بعد۔"

"کیا کہتا تھا وہ......؟"

"مجھے کچھ کچھ یقین ہو چلا ہے۔" یاسر نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ "کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے، ہمارا شبہ غلط نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے...... اسی نے...... یعنی......"

"ہاں! میرا خیال ہے کہ اسی نے بہرام کو قتل کروایا ہے یا ایسے حالات پیدا کیے جن کی بدولت بہرام خان مر گیا اور...... تم بھی سات کروڑ سے محروم ہو گئیں۔" یاسر کا لہجہ اچانک زہریلا ہو گیا۔

"تم کہنے کا حق رکھتے ہو۔" وہ نیچی آواز میں بولی۔

"خواہ تم کچھ بھی کہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا۔"

"اعتماد......!" یاسر ہنسا۔ "کیسا اعتماد؟ ہمارے درمیان اعتماد کا تو کوئی رشتہ ہی نہیں رہا۔ میرا کام صرف اتنا ہے کہ کسی طرح تمہارے سات کروڑ تمہیں واپس دلا دوں۔ کیونکہ اس میں تین کروڑ میرے ہوں گے، فقط اتنی سی بات ہے، یہی ہمارا تمہارا رشتہ ہے۔ تین کروڑ کا رشتہ...... روپوں کا دولت کا رشتہ...... اس رشتے کے بیچ اعتماد کہاں سے آ گیا بھلا؟"

چائے ختم ہو چکی تھی اور گفتگو تلخ تر ہوتی جا رہی تھی۔

"تم تھکے ہوئے ہو......" بالآخر سبین نے مسکرا کر کہا۔ "اور تمہیں آرام کی ضرورت ہے، آرام و سکون کی اور اطمینان کی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے کی طرف لے چلی۔ "اور پھر ہمارے درمیان ایک اور رشتہ بھی تو ہے، سابقہ محبت کا رشتہ......"

"میں...... میں اپنے فلیٹ پر جا کر ہی آرام کروں گا۔" وہ تھکی تھکی آواز میں بولا۔

"چلے جانا، لیکن کچھ دیر آرام کرنے کے بعد۔"

کمرے میں بیڈ پر پڑتے ہی وہ نیم غنودہ عالم میں سوچتا رہا۔ سابقہ محبت! کمرے کی نیم تاریکی میں سبین کے قرب کی خوشبو میں بھیگتے بھیگتے اس نے سوچا۔ کیا محبت کا گزر جانا بھی کوئی رشتہ بن جاتا ہے...... نو...... نیور...... ایسا نہیں ہوتا، محبت سورج کی کرن کی طرح ڈوبنے کے بعد پھر نمودار نہیں ہو سکتی۔ وہ مزید سوچتا مگر سبین کے قرب نے زیادہ موقع نہیں دیا...... اور کوئی وحشی جذبہ ان دونوں پر سمندر کی سرکش لہر کی طرح چھاتا چلا گیا۔

☆☆☆

یاسر کی آنکھ کھلی تو کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ اسی وقت قریب بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے سیل فون کی مخصوص میسج ٹون ابھری۔ سبین دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سیل اٹھا لیا۔ سیل اسی کا تھا۔ اس میں ایک میسج تھا۔ اس کے لیے...... حامد کی طرف سے...... اسے سنسنی خیز سی حیرت ہوئی، حامد اس کے موبائل نمبر سے بھی واقف ہو چکا تھا اور یقیناً اس سے بھی کہ وہ اس وقت کہاں تھا اور کس سے "معاملہ داری" استوار کیے ہوئے تھا۔

بہرکیف اس نے دھڑکتے دل سے چند سطری وہ میسج پڑھا۔

"یاسر خان! چند اہم معاملات پر مذاکرات کے لیے

میں اپنے آفس میں تمہارا انتظار کروں گا۔ امید ہے کہ تم آج ڈنر میرے ساتھ ہی کرو گے۔ حامد۔"

اس دوران سین بھی جاگ گئی۔ اس نے حامد ہمدانی کا وہ میسج اسے بھی پڑھوا دیا۔ وہ یک دم اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"یہ...... یہ...... یہ سب کیا ہے...... یاسر؟"

وہ ہنسا۔ "یہ آغاز ہے مائی ڈیئر۔ جنگ شروع ہونے والی ہے۔"

"اپنا خیال رکھنا یاسر!" سین نے کہا۔ "حامد مجھے اچھا آدمی نہیں لگتا۔" یاسر کا دل اچانک دھڑکنے لگا اور ہر دھڑکن کہنے لگی۔ کس نے کہے تھے یہ الفاظ...... اس نے سوچا۔ یہ باتیں آج سے پہلے کس نے کہی تھیں اس سے......

"حامد، اچھا آدمی نہیں ہے، یاسر! اپنا خیال رکھنا، ہاں، اسے یاد آ گیا۔ نازیہ...... وہ خوب صورت سیکریٹری......

☆☆☆

"تم......!" نازیہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم یہاں پھر آ گئے......"

"ہاں......!" یاسر نے کہا۔ "تمہارے باس نے مجھے ڈنر پر بلایا ہے۔"

یہ سن کر نازیہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میز کے گرد گھوم کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ آج اس کے لباس کا رنگ گلابی تھا اور یاسر نے محسوس کیا کہ آج اس کے لباس اور اس کے عارض و بدن کے رنگوں میں تمیز کرنا ناممکن تھا۔ جہاں لباس کے رنگ ختم ہوتے تھے وہاں سے بدن کے رنگ شروع ہو جاتے تھے اور حلقہ در حلقہ اور قوس در قوس پھیلتے جاتے تھے، چھاتے جاتے تھے۔

"کیا بات ہے؟" نازیہ نے اس کی نظروں کی "آوارگی" کو محسوس کرتے ہوئے اپنا ہاتھ لہرایا۔

"کچھ نہیں......" یاسر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "ذرا تمہیں دیکھ رہا تھا، اوہ...... یاد آیا، مسٹر حامد کو اطلاع کرو کہ یاسر خان اس سے ملنا چاہتا ہے۔"

"تمہارا دماغ واقعی......" مگر نازیہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ یاسر نے اسے حامد کے میسج کے بارے میں بتایا، نازیہ کو کچھ تامل ہوا تو اس نے اپنا سیل نکال کر اسے میسج دکھا دیا۔

"یہ تو اس کے سیل کا نمبر نہیں ہے۔" وہ اُلجھ کر بولی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل سب کے پاس دو دو بلکہ چار چار سموں والے موبائل سیٹ ہیں۔ تم اطلاع کرو۔"

نازیہ نے ایک گھبرائی ہوئی سانس لی اور بولی۔

"احمق آدمی! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو، اس وقت اندر وہ سب بیٹھے ہوئے ہیں۔ حامد اور اس کے تینوں دوست...... قیصر، مراد شاہ اور نومی...... وہ...... وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔"

"میں اُن سے بات کرنے آیا ہوں، ان کے کردار کے بارے میں تحقیق کرنے نہیں۔"

پھر یہی وہ وقت تھا جب پیچھے سے ایک ہلکی آواز آئی۔ یاسر کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ یقیناً، حامد کے آفس کا دروازہ ابھی ابھی کھلا تھا اور دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔ اداکاری کا وقت آ گیا تھا۔

"میڈم!" یاسر نے نازیہ سے کہا۔ "میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ مجھے مسٹر حامد سے ابھی ملنا ہے......" اس نے میز پر مُکا مار کر کہا۔ "ابھی اور اسی وقت......"

"اس وقت آپ نہیں جا سکتے۔" نازیہ کے لہجے میں بھی فرض شناس سیکریٹری کا سپاٹ پن اور مشینی انداز عود کر آیا۔ اداکاری مکمل تھی......

"کیوں نہیں جا سکتا؟" یاسر نے وہ سیل فون جو اس نے ہنوز ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، اس کے سامنے کر دیا۔ "یہ میسج دکھایا تو ہے میں نے آپ کو حامد صاحب کا......؟ کیا یہ ثبوت کافی نہیں؟"

"باس، اس وقت میٹنگ میں ہیں۔" نازیہ بولی۔ "آپ ایک گھنٹے تک تشریف لائیے، شاید اس وقت تک......"

"نازیہ......!" پیچھے سے حامد کی آواز ابھری۔ بھاری، گمبھیر اور پُروقار آواز...... وہ دونوں چونک پڑے۔

"مسٹر یاسر کو اندر بھیج دو۔"

"رائٹ سر۔"

"اور ہاں...... تم جا سکتی ہو۔"

"اتنی جلدی سر؟"

"ہاں، مجھے کوئی کام نہیں ہے۔" حامد نے کہا اور یاسر کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں حامد کے پیچھے پیچھے داخل ہونے سے قبل یاسر نے ایک لمحے کو پلٹ کر نازیہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا پرس اٹھاتے اٹھاتے رک کر اس کی طرف ... دیکھ رہی تھی۔ یاسر کو یوں لگا جیسے وہ اسے روک رہی ہو۔ التجا کر رہی ہو، آنکھیں جو اس سے کہیں دور چلے جانے کو کہہ رہی ہوں۔ آنکھیں جو اسے موت سے دور دھکیل رہی ہوں۔ آنکھیں، جو اسے اس سارے ہنگامے، ساری گڑبڑ سے بچا کر لے جانا چاہتی ہوں۔

پلٹ کر کمرے میں داخل ہو کر اس نے پورے اعتماد سے دروازہ بند کر دیا۔

اندر وہ تینوں بیٹھے تھے۔ سوٹڈ بوٹڈ، دو سیاہ بریف کیس سامنے رکھے تھے۔ قیمتی سگار پی رہے تھے اور ایک مستقل مسکراہٹ اپنے چہروں پر سجائے ہوئے۔

حامد نے سب سے اس کا تعارف کروایا۔

''مجھے تمہارا میسج ملا تھا۔'' یاسر نے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات کرنا چاہتے تھے تم مجھ سے......؟''

''ہاں۔'' حامد نے کہا۔ ''بات تو کرنی تھی مگر اس طرح نہیں۔ آرام سے بیٹھو، بات بھی ہو جائے گی۔''

''میرے پاس وقت کم ہے۔'' یاسر نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''جو بات کرنی ہے، جلدی کرلو۔''

حامد نے سامنے بیٹھے ہوئے، تینوں دوستوں پر نظر ڈالی۔ تینوں یاسر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حامد نے سر کھجایا، انگلیاں چٹخائیں، مسکرایا اور پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

''بات سیدھی سی ہے، تم نے کل جانے سے قبل مجھ پر کسی بہرام خان نامی آدمی کے قتل کا الزام لگایا تھا۔ غالباً اپنے یقین کا اظہار بھی کیا تھا۔ آج میں اس کی وضاحت چاہتا ہوں۔ ان سب معززین کے سامنے......''

''معززین......!'' یاسر ہنسا۔ ''یہ لوگ...... جو قتل کی رات سے قبل جوئے میں شریک تھے۔ جو قتل کے اس منصوبے میں تمہارے معاون تھے۔''

''تم ہم پر بھی الزام لگا رہے ہو۔'' قیصر نے ایش ٹرے میں اپنا سگار مسلتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' یاسر کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''اور میں یقیناً غلطی پر نہیں ہوں۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' قیصر اٹھ کھڑا ہوا۔ حامد نے اسے گھسیٹ کر واپس بٹھایا۔

''مجھے یہاں بلانے کا مقصد کیا ہے؟'' یاسر نے کہا۔

''بات چیت کرنا۔'' حامد نرمی سے بولا۔ ''بات کو اُلجھانے کے بجائے سلجھانے کی کوشش کرنا، بس اور کچھ بھی نہیں، تم خوامخواہ جذباتی انداز میں سوچ رہے ہو۔'' وہ کہتے ہوئے مسکرایا۔ ''اور...... شاید مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہے۔''

وہ سب مسکرانے لگے۔ یاسر کا پارا اچانک چڑھ گیا۔

''کیا مطلب ہے، اس بات کا......؟''

''اخباری رپورٹ کے مطابق بہرام خان کی بیوی، بلکہ بیوہ کی عمر خاصی کم ہے۔'' یاسر بولا۔

''ہاں، چوبیس سال کچھ زیادہ نہیں ہوتے۔'' قیصر نے کہا۔

''اور پھر تمہاری عمر بھی تو زیادہ نہیں ہے۔''

''تمہاری......'' یاسر نے اٹھنے کی کوشش چاہی مگر نہ اس کی بات پوری ہو سکی اور نہ اٹھ کھڑے ہونے کی خواہش، دو مضبوط ہاتھوں نے اس کے کندھے پر زور دے کر اسے واپس بٹھا دیا۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' حامد نے بھیڑیے کی طرح غرا کر کہا۔

''تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔'' یاسر نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں پولیس کو رپورٹ کردوں گا۔''

قیصر اور حامد نے پولیس کو بیک وقت دو مختلف گالیاں دیں۔

''بہرام کیوں مرا؟'' یاسر نے پھر اٹھنے کی کوشش چاہی جو پیچھے کھڑے ہوئے مراد شاہ نے پھر ناکام بنا دی۔ ''تم لوگوں کی اس حرکت کا مطلب یقیناً یہی ہے کہ اس کے قتل کے بارے میں میرا شبہ درست ہے۔''

''فرض کرو شبہ درست تھا۔'' حامد ہنسا۔ ''پھر؟''

''اس کے جیتے ہوئے سات کروڑ کہاں ہیں؟'' یاسر بولا۔

''تم واقعی بہت جذباتی ہو۔'' قیصر نے کہا۔ ''ذرا صورتِ حال پر غور کرو مائی ڈیئر فرینڈ! تم اس وقت مکمل طور پر ہمارے قبضے میں ہو۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب کو تھپتھپایا۔

اچانک یاسر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے دائیں ہاتھ کا پہلا گھونسا تو پیچھے کھڑے ہوئے مراد شاہ کے جبڑے پر پڑا، پھر کرسی اپنی جگہ سے جانبِ پرواز ہوئی اور یاسر کے مضبوط ہاتھوں نے اسے قیصر پر دے مارا جو کرسی سمیت نومی پر ڈھیر ہو گیا۔ پانچ سیکنڈ میں تین آدمی زمین بوس ہو چکے تھے۔ عین اسی وقت حامد نے میز کی کسی دراز سے ایک سیاہ نال والا پسٹل نکال لیا۔ پستول کا رخ یاسر کی طرف تھا، پھر پل کے پل یاسر کو احساس ہوا کہ زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے، اسے اتنی بیدردی سے ضائع کر دینا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

''ویری گڈ!'' حامد نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے تمہاری عقل مندی کا یہ مظاہرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔''

قیصر، نومی اور مراد شاہ، بالترتیب اپنے بازو، سر اور

چہرہ، سہلاتے ہوئے اٹھے اور کینہ توز نظروں سے یاسر کو گھورتے ہوئے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

''ہاتھ اوپر اٹھا دو۔'' نومی نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔

یاسر نے ہاتھ اوپر اٹھائے تو ان تینوں نے انتہائی نامناسب انداز میں اس کی تلاشی لی۔ جیب میں کچھ نہ تھا۔ انہیں سخت مایوسی ہوئی۔

یاسر مطمئن انداز میں دیوار کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ لہٰذا نہ وہ اس اشارے کو دیکھ سکا جو حامد نے اپنی عظیم الشان میز کے پیچھے بیٹھے کیا تھا اور نہ اس پسٹل کے دستے کو جو اچانک اس کے سر پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑا۔ بس، ایک ہلکی سی آواز آئی اور سامنے والی دیوار کا رنگ اچانک سیاہ ہو گیا۔ لڑکھڑا کر نیچے گرنے سے قبل اس نے چہار سُو پھیلتی ہوئی تاریکی میں ہاتھ بڑھا کر کچھ پکڑنا چاہا، کوئی سہارا ہاتھ نہ آیا۔ بے ہوشی کسی سیاہ چادر کی طرح اس پر چھاتی چلی گئی۔

☆☆☆

سیل فون کی میوزیکل بیل بجی تو اس وقت سین تنہا تھی، صرف خیالات تھے جو لمحوں کی طرح اس کے ساتھ رہے تھے۔ بیتے ہوئے دنوں کے خیالات۔ بہرام خان۔ اس کا شوہر جو اچانک مر گیا تھا اور یاسر جو کسی فرشتہ رحمت کی طرح اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ گزرے ہوئے دنوں کی باتیں، محبت اور شادی، ناکامی اور کامیابی، موبائل فون کی گنگناتی بیل نے اسے چونکا دیا۔

''ہیلو۔'' اس نے اسکرین پر کسی کا نام، نمبر دیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔

''مسز بہرام خان!'' دوسری طرف سے کسی مرد نے کہا۔ ''اگر تمہیں سات کروڑ واپس مل جائیں تو......'' اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سین فون تھامے جوں کی توں کھڑی رہ گئی۔ یہ کیا؟ اس نے سوچا۔ کون تھا، جو ایک بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کیا اس شہر میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو بہرام کی حادثاتی موت کے علاوہ، سات کروڑ کے بارے میں بھی جانتے ہوں، وہ حیرت سے کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اس نے اسی نمبر پر ''ری ڈائل'' کیا، ''مطلوبہ نمبر سے سہولت میسر نہیں ہے'' کے بیزار کن اور روایتی ریکارڈ شدہ وائس میسج نے اسے جھلا کر رکھ دیا۔ شاید اجنبی کو پورا ادراک تھا کہ سین اسے کال بیک کر سکتی تھی۔ تجسس برقرار رکھنے کے لیے اس نے دوسرا داؤ چلا تھا۔

☆☆☆

یاسر کو ہوش آیا تو اس کے گرد شور مچاتا ہوا دریا تھا۔ وہ ایک لانچ کے فرش پر پڑا تھا۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا اور تاریک رات تھی...... چار سیاہ ہیولے اس کے سر پر کھڑے تھے۔

''پھینک دو۔'' کسی نے کہا۔ غنودگی ابھی تک اس پر طاری تھی مگر وہ آواز کو پہچان گیا۔ یہ حامد کی آواز تھی۔ اس کے لہجے میں عناد اور زہر تھا۔ ''اس بہتے دریا میں یہ جلد ہی لاش میں بدل کر دور جا چکا ہوگا۔''

پھر دو ہیولے اس پر جھکے اور وہ اچانک ہوا میں معلق ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش چاہی مگر کوئی صدا اس کے ہونٹوں سے برآمد نہ ہو سکی۔

''سوچ کیا رہے ہو۔'' حامد کی آواز کہیں دور سے آئی۔ ''پھینک دو۔''

''کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے؟'' نومی کی آواز میں خوف تھا۔ ''اس کی لاش دریافت ہو جانے پر ہم پھنس سکتے ہیں۔''

''لاش نہیں بتائے گی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔'' حامد نے کہا۔ ''اس کے سارے شناختی کاغذات نکال لیے گئے ہیں۔'' وہ کریہہ ہنسی ہنسا۔ ''یوں بھی دریا کی موجیں خاصی بے رحم ہوتی ہیں اور کنارے پر دریائی کراڑے پر خاردار جھاڑیاں بھی اُگی ہوتی ہیں، کہیں نکیلے پتھر بھی ابھرے ہوتے ہیں جو اچھی بھلی خوب صورت شکلوں کو بگاڑ دیتے ہیں۔ ناقابلِ شناخت بنا دیتے ہیں۔''

یاسر اب تک انہی دو افراد کے ہاتھوں میں ہوا میں معلق تھا۔ اس کے ہاتھ قیصر نے اور ٹانگیں مراد شاہ نے پکڑ رکھی تھیں۔ اس نے ایک دفعہ پھر کوشش چاہی، ذہن پر چھائی دھند کو صاف کرنے کی اور ہوش میں آنے کی، مگر دھند بہت تھی اور آنکھیں کھلتی ہی نہ تھیں۔ اس نے بے بسی سے موت کو خ. کی طرف بڑھتے دیکھا۔ بچاؤ، اس نے چیخنا چاہا، کوئی امید، کوئی سہارا، کوئی کرن کہیں سے آئے، مگر آسمان تاریک تھا اور زمین دور تھی......

چار مضبوط ہاتھوں نے اسے اچانک اچھال دیا۔ اس نے اپنے جسم کو بلند ہوتے ہوئے اور پھر نیچے آتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے ہاتھ چلانے کی کوشش چاہی مگر مسئلہ وہی تھا۔ اس کا جسم اس کے ذہن کے تابع نہ تھا، ان دیکھی زنجیریں جیسے اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی تھیں اور وہ اپنی مرضی کے مطابق حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

موجیں اب اس کے اردگرد تھیں۔ خنک اور تاریک پانی۔ بے رحم اور ظالم موجیں۔ شور مچاتی ہوئی اور سر پٹختی ہوئی لہریں، وہ تیزی سے نیچے جانے لگا۔ گڈبائے۔ اس نے

قہقہہ لگا کر کہا۔ سب وہیں رہ گیا۔ محبتیں اور چاہتیں، لعنت ہے، اس زندگی پر۔ سب کچھ وہیں رہ گیا۔ صرف موت رہ گئی۔ مائی فٹ۔

☆☆☆

اس بار اس کی آنکھ کھلی تو پس منظر میں دریا کا شور ضرور موجود تھا مگر حیرت انگیز طور پر پانی اس کے گرد نہ تھا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے اس نے چشم تصور سے خود کو غیر آباد کنارے پر کہیں پڑا ہوا دیکھا، پھر اچانک کسی نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"تم!" اس نے آنکھیں کھول کر حیرانی سے کہا۔

ان کے اردگرد جنگلی جھاڑیاں تھیں، خود وہ کراڑے کی ریت پر تھا بلکہ تھے...... وہ بھی تھی...... کیا محبت کے دوران مرنے کے بعد ساتھ رہنے کا وعدہ اس طرح بھی وفا ہوتا ہے۔ داہنی جانب بہتا ہوا پُرشور دریا نظر آیا اور پہر رات بیتی جاتی تھی۔

"اپنا وزن کم کرو۔" نازیہ نے کہا۔ "ورنہ بڑھاپے میں ہائی بلڈ پریشر اور دل کے مریض بن جاؤ گے۔"

"دل کا مریض تو جوانی میں ہی بن گیا ہوں۔" یاسر نے دل پر ہاتھ رکھ کر کسی عاشق کی طرح کہا۔ "اور مریض غم عشق و بسمل رخِ یار کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ وہ موت کے چنگل سے نکل کر یوں اچانک زانوئے لیلیٰ کیسے ہوا؟"

"میں نے تم سے اسی وقت کہا تھا۔" نازیہ بولی۔ "تمہارا حامد ہمدانی کے پاس جانا دنیا کی عظیم ترین حماقتوں میں سے ہے۔ وہ بہت کمینہ آدمی ہے۔ کینہ پرور اور بے رحم۔ مجھے تو اسی وقت شبہ ہوگیا تھا جب اس نے مجھ سے گھر جانے کو کہا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ تم سے آج پوری بات کرنا چاہتا ہے۔ تخت یا تختہ۔ تم اس کے کسی جرم کے ثبوت لیے پھر رہے تھے۔ اس کے لیے راستہ کون سا بچا تھا۔ سوائے تمہاری زبان بند کرنے کے تمہارے ساتھ ہی اس کی زندگی کو لاحق سارے خطرے، سارے خوف، ختم ہو جاتے۔ ایک قتل کے عوض یہ سودا اس کے لیے مہنگا بہرحال نہیں تھا۔"

"مگر اس فلم میں ہیرو کو بچانے کے لیے ہیروئن کہاں سے نمودار ہوگئی؟"

"سمجھ میں آنے والی بات ہے۔" وہ عمومی لہجے میں بولی۔ "ان کے نرغے میں تمہیں کمرے میں جاتے دیکھا اور مجھے دفتر سے جلد چھٹی کی نوید ملنے کے بعد میں خوش ہونے کے بجائے متفکر ہوگئی اور پھر وہی کرنا پڑا، جو ایسے موقع پر مجھے کرنا چاہیے تھا، میں گھر جانے کے بجائے ان کی ریکی کرتی رہی، دفتری بلڈنگ کی، انہیں میں نے نکلتے دیکھا اور تمہیں کار میں ٹھونستے، کسی بوری کی صورت۔ دوسری کار بھی تھی۔ یہ لوگ روانہ ہوئے تو میں بھی ایک رکشے میں ان کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی۔ ویران دریائی کنارے کے پاس ان کی کاریں رکی تھیں۔ میں بھی اتر گئی۔ رکشے والا حیران ہوا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے گھور کر اسے کہا کہ میں ایک رپورٹر ہوں اور میری ایک کال پر کئی پولیس موبائل یہاں آجائیں گی۔ وہ بے چارہ دُم دبا کر رکشے سمیت بھاگ اٹھا۔ بہرکیف......" بتاتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو پیچھے ہٹایا جو اس کے گلابی چہرے پر سیاہ بادلوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔

"تمہیں قتل کرنے کے لیے انہیں شاید دریا سے بہتر کوئی مقام نہیں نظر آیا۔ جب انہوں نے رات کی تاریکی میں لانچ اسٹارٹ کی، اس وقت میں ان کی لانچ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔ پھر جب انہوں نے بوری کھول کر تمہیں اٹھا کر لانچ کے فرش پر پھینکا تو تب تک میں کسی طرح لانچ کے دنبالے والی جگہ میں ایک رسی کے ذریعے اتر چکی تھی۔

القصہ...... تمہیں پانی میں پھینکنے کے بعد وہ پلٹنے لگے تو میں تب تک ہوا بھری ٹیوب تلاش کر کے قبضے میں کر چکی تھی اور بے آواز پانی میں اتر گئی۔ لانچ دور چلی گئی اور مجھے تمہاری بوری کو نہ صرف سنبھالنے کا بلکہ اسے بڑی مشکلوں سے کھینچ کر کنارے اور پھر کراڑے تک لانے کا بڑا کشٹ کرنا پڑا، ورنہ تم احمقوں کی طرح ڈوب کر اطمینان سے تہ میں جا بیٹھتے اور مسز بین بہرام عرف محبوبہ سابق برائے یاسر خان جیتے جی مرجاتی کیونکہ دوسری بار ہونے والی یا نہ ہونے والی بیوگی کے علاوہ سات کروڑ کا صدمہ بھی بلاشبہ سہنا پڑتا۔"

اس نے بات ختم کی اور پل کے پل یاسر نے اپنے دل میں اس نازک نظر آنے والی مضبوط لڑکی کے لیے محبت کا کوئی شدید جذبہ محسوس کیا۔

"نازیہ! تمہارا یہ احسان......" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔" وہ اسے خاموش پا کر بولی۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا لیے اونچی نیچی چٹانوں پر لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔

☆☆☆

نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، وہ رات اس کے لیے عذاب ناک بن گئی تھی۔ سونے کی کوشش فضول ٹھہری۔ عذاب دگنا ہو چکا تھا۔ ایک عذاب تو بہرام خان کی موت سے شروع ہوا تھا اور حامد کی یقین دہانیوں اور قیصر، مراد شاہ کی تسلیوں کے باوجود جاری تھا۔ اب ایک اور عذاب نے گزری ہوئی رات سے جنم لیا تھا۔

نعمان...... عرف نومی کو وہ نوجوان یاد آیا۔ کیا نام تھا؟ یاسر، یاسر خان...... اب کہاں ہو گی اُس کی لاش، دریائی گھاس کے کسی جھنڈ میں پھنسی ہوئی یا کسی کائی زدہ تہ میں اگے نباتاتی پودوں میں اٹکی ہوئی؟ اس نے ایک جھرجھری لی...... یہ میں کس جگہ آن کھڑا ہوا ہوں۔ جہاں گناہ در گناہ کے مسلسل لمحے، سانسوں کی طرح خود کو دہراتے جاتے ہیں اور یوں زندگی گزر جاتی ہے۔ اس نے قدِ آدم آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بستر کی شکنوں سے گزری ہوئی رات کی بے چینی واضح تھی۔ ایش ٹرے میں موجود سگریٹ کے ٹوٹوں سے اس کے ضمیر کی خلش عیاں تھی۔

اس نے کچھ سوچا اور پھر اپنے سیل فون پر ایک نمبر پنچ کرنے لگا۔

دوسری جانب سے نیم غنودہ نسوانی آواز اُبھری، یوں جیسے دوسری جانب بھی کوئی آدھی نیند سے جاگا ہو۔

''سبین......'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میں...... میں......'' اس کے ہاتھ ہی نہیں آواز بھی کانپ رہی تھی۔

''تم......!'' دوسری طرف سے سبین نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔ ''تم نے کیوں فون کیا ہے مجھے؟''

''میں...... میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں، سبین۔'' نومی نے عاجزی سے کہا۔ اس کے ہاتھ ہنوز کانپ رہے تھے۔ ''صرف چند منٹ، پلیز۔''

''میں تمہیں جان سے مار دوں گی، اگر تم میرے سامنے آئے۔'' سبین نے ایک گالی دے کر اس سے کہا۔

''صرف پانچ منٹ سبین!'' وہ بولا۔ ''خدا کے لیے سبین۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''کیا بات کرنی ہے تمہیں، کیا کوئی بات ایسی بھی رہ گئی ہے جو تمہیں دہرانی ہو۔''

نومی کو اس کے لہجے کی ہلکی سی نرمی سے اپنی بات کے اثر کا اندازہ ہوا۔ بولا۔ ''میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا۔'' اس نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''اس وقت سات بج رہے ہیں۔ میں ساڑھے سات بجے تک آرہا ہوں۔''

''پانچ منٹ سے زیادہ ٹھہرے تو میں چیخ چیخ کر پوری بلڈنگ کو جمع کرلوں گی۔'' سبین نے تہدید کی۔ ''سمجھ رہے ہو نا، اور کوئی رومانی سچویشن پیدا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''تھینک یو، سبین!'' اس نے ایک طویل ہنکاری لے کر کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

رات ساری یوں ہی بیت چلی۔ یاسر گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے سیل پر بھی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر جواب ندارد، کبھی ''رابطہ ممکن نہیں'' تو کبھی مطلوبہ سہولت میسر نہیں۔'' جھلا کر اس نے اس کے اسٹوڈیو فلیٹ کا رخ کیا، مگر وہاں بھی تالا منہ چڑھا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہیں ایمرجنسی میں دو ایک روز کے لیے کراچی نہ چلا گیا ہو، کیونکہ جب سے وہ ''مشن'' کے سلسلے میں حیدر آباد آیا تھا دوبارہ کراچی کا چکر نہیں لگا پایا تھا۔ اس نے بہرحال واٹس ایپ پر وائس میسج دے دیا، مگر اس کا جواب کیا آنا تھا، وہ میسج ''سین'' ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے فکر لگ گئی۔

اسی پریشانی کے سبب وہ رات بھر نہیں سو پائی تھی کہ اچانک اس کے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا، سمجھی، یاسر نے کال کی ہے، مگر یہ نعمان (نومی) کی کال تھی۔ اس کا منہ بن گیا۔ اس سے بات کرنے کے بعد سبین کو جانے انجانے خوف نے آلیا۔

اگر یاسر نے نومی کو میرے ساتھ دیکھ لیا تو؟ حالات ہی ایسے تھے کہ یاسر کسی بھی وقت اس کے پاس آسکتا تھا۔

نعمان کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات اتفاقاً مگر بگڑی تھی۔ بہرام خان سے ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کے سبب جب وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تو اسے دور کرنے کے لیے، نعمان سے پہلی ملاقات کا اخلاقانہ اور محبت بھرا رویہ اسے بھا گیا۔

سپر اسٹور میں اس کے ہاتھ سے کچھ لفافے گر پڑے، جو ایک اجنبی نے اسے اٹھا کر دیے نہ صرف یہ بلکہ باہر کار تک اس کی ڈکی میں بھی سارا ''گروسری'' کا سامان بار کرا دیا۔ وہ ''اجنبی'' یہی نعمان عرف نومی تھا، جو خود بھی، تنہائی کا مارا ہوا، اپنی ذات میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی اپنی بیوی سے نہیں بن سکی تھی، وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ کاروباری مصروفیت یا پھر کچھ اور وجہ رہی ہو، اس نے دوسرے ''ساتھی'' کے لیے کوئی توجہ ہی نہ دی۔

دوسرا ساتھی، اسے سین کی صورت ملا تو تالی دو ہاتھ سے بجی۔ پھر دو دیوانے مل بیٹھے۔ دونوں کے ''لائف پارٹنرز'' ہونے نہ ہونے کے برابر تھے۔ (ان کی نظروں میں) راہ و رسم دوستی، سنگ داری اور پھر تعلقِ خاطر کی ان سرحدوں تک جا پہنچی جہاں ''علاقہ ممنوعہ'' تو لکھا ہوتا ہے، مگر فرزانوں کو ان کی کب پروا ہوتی ہے، پر واجب ہوتی ہے جب کسی سرحدی محافظ کی اچانک، سرحد پار کرنے والوں پر نظر پڑ جاتی ہے۔ ایک روز بہرام خان کی بھی اپنی ''سرحد'' پر نظر پڑ گئی۔

یوں پھر وہی رات کئی راتوں کے بیچ سے نمودار ہوئی جو اَب تک سین نہیں بھولی تھی۔ اس رات سین، نومی کے ساتھ تھی۔ اپنے جلوؤں کی تمام چمک دمک اور حسن جمال سوز کی تمام رعنائیوں کے ساتھ۔ اسے یہ معلوم تھا کہ خفیہ تجوری میں سات کروڑ پڑے تھے جو چند دن قبل بہرام جیت کر لایا تھا۔ لہٰذا تحفظ کا ایک احساس اس کے ساتھ ساتھ تھا، لیکن اس رات بہرام خان جلدی گھر آ گیا تھا۔ شاید اس خاموش اور خوب صورت رات میں اسے کوئی خوب صورت خیال سوجھ گیا تھا۔

اِدھر انہیں کچھ نہیں پتا چلا تھا، کیونکہ رات حسین تھی اور وہ دونوں کمرے میں ہر رات کی طرح تنہا تھے۔ کوئی رکاوٹ اور کوئی بات نہ تھی جو انہیں روک سکتی۔ بہرام خان خاموشی سے گھر میں داخل ہوا اور بیڈ روم سے آنے والی آوازیں سن کر ٹھٹک گیا، بلکہ سن ہو گیا۔ دروازے کی چابی کے سوراخ سے سب کچھ نظر آتا تھا۔ وہ بھی کمرے میں تھا، سین بھی کمرے میں تھی اور جو کچھ کمرے میں ہو رہا تھا، وہ بھی......

اس دن سین کو کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ نومی صبح ہونے سے قبل، روز کی طرح چلا گیا تھا اور وہ گناہ کی راتوں میں ایک اور رات کا اندراج کرنے کے بعد آرام سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ پورا دن گزر گیا اور بہرام نہ آیا۔ یہ خیال تو اسے شام کو آیا کہ ڈرائنگ روم کی ایش ٹرے میں تین سگریٹوں کے ٹکڑے بجھے پڑے ہیں اور یہ سگریٹ بہرام پیتا تھا۔ ایک کرسی پر نیلے رنگ کی وہ جیکٹ بھی پڑی تھی جو بہرام گزشتہ روز پہن کر گیا تھا۔ وہ خوف سے لرزتی رہی اور بہرام کا انتظار کرتی رہی، مگر بہرام نہیں آیا۔

رات ہونے سے قبل بہرام آ گیا مگر یہ کیا...... لاش کی صورت...... جاننے والوں نے بتایا کہ وہ نشے میں تھا اور کار کی رفتار بہت تیز تھی۔ سین نے صبح کے ان خنک خوش گوار لمحوں میں خود سے کہا۔ کیوں تھا وہ نشے میں؟ کیا میری بے وفائی کو بھلانے کے لیے؟ بے وفائی کو شراب کب ختم کر سکتی ہے۔ زہر کو زہر کب مٹا سکتا ہے؟ قاتل کون ہے؟ وہ جس نے اسے شراب دی یا میں، جس نے اسے بے وفائی دی۔ وہ آنکھیں موندے لیٹی رہی اور سوچتی رہی۔

☆☆☆

یاسر...... کا تھکن سے بُرا حال تھا۔ سیڑھی سے اوپر چڑھتے وقت اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سیکنڈ فلور پر پہنچ کر وہ جونہی سین کے فلیٹ کی طرف مڑا، اس کی نظر کسی شخص پر پڑی جو سین کے فلیٹ میں داخل ہو رہا تھا...... پھر لمحے بھر میں وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔

یاسر کی ساری تھکن یک دم غائب ہو گئی۔ اب وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ آنے والے خطرات اور پڑنے والی مشکلات سے مقابلے کے لیے تیار......

دروازہ بند ضرور تھا مگر لاک نہیں تھا۔ یاسر نے پہلے کان لگا کر سنا اور پھر چابی کے سوراخ سے اندر دیکھا۔ باتوں کی آواز بہت دور سے آ رہی تھی۔ گویا وہ ڈرائنگ روم میں ہیں۔ اس نے خود سے کہا اور بغیر آواز کیے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم میں ہی تھے۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ مختصر سی گیلری کی طرف ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اندر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ یاسر خاموشی سے کھسکتا ہوا اس کھڑکی کے عین نیچے جا بیٹھا۔ اس کے ہونٹوں پر خود بخود ایک عجیب سی اسرار بھری مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

☆☆☆

کمرے میں وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک میز تھی جس کی چمک دار سطح پر ان کے چہرے ایک دوسرے کو نظر آ رہے تھے۔

''تمہیں اصولاً یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' سین نے کہا۔

''کیوں؟'' نومی نے استفسار کیا۔ ''تمہارا شوہر جب تک زندہ تھا، اس وقت تو تم نے کبھی میری آمد پر اعتراض نہیں کیا۔''

''اس وقت کی بات اور تھی۔'' سین نے کہا۔ ''اب حالات بدل چکے ہیں۔ ازدواجی رشتوں کے ٹوٹ جانے کے بعد اب کئی رشتے اور قائم ہو گئے ہیں اور یہ رشتے اعتماد

کے رشتے ہیں۔ تمہیں یہاں دیکھ کر ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔"

"ہاں۔" نومی کے لہجے میں طنز تھا۔ "اب تک تو کافی نئے رشتے قائم ہو چکے ہوں گے؟"

"تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟" سبین اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ "طوائف...... یا کوئی داشتہ؟"

"پلیز، سبین! میں اس وقت لڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"تم نے فون پر صرف پانچ منٹ کا وعدہ کیا تھا۔ جلدی بات کرو اور جاؤ۔" سبین کا لہجہ تلخ تھا۔

نومی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے ایک گہرا کش لیا اور بولا۔ "میں ایک پیشکش لے کر آیا تھا۔"

"کیسی پیشکش؟" سبین کے لہجے میں اب بھی بے نیازی اور تلخی تھی۔

"میں......" نومی نے رک رک کر کہا۔ "میں تم سے...... تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ پیشکش نہیں ہے مائی ڈیئر!" سبین زہریلے طنز سے ہنس کر بولی۔ "یہ محض ایک خواہش ہے، کیونکہ میں تم سے شادی کرنے کی قطعی کوئی خواہش نہیں رکھتی۔" نومی کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے اور جلد ہی معدوم بھی ہو گئے۔

"ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو سبین!" وہ بولا۔ "حالات پر بھی غور کرو۔"

"حالات!" سبین تقریباً چلا اٹھی۔ "یہ حالات کس نے پیدا کیے ہیں۔ گڑبڑ اگر پھیلائی ہے تو کس نے؟ یہ سب تم نے کیا ہے۔" اس نے نومی کی طرف پلٹ کر کہا۔ "بہرام نے اُس رات ہم دونوں کو ساتھ دیکھ لیا تھا۔ وہ جلدی گھر آگیا تھا۔ اپنی بیوی سے ملنے...... آہ، مگر اس کی بیوی کسی اور کے ساتھ، تمہارے ساتھ مصروف تھی۔ وہ سات کروڑ بھی لے گیا اور نشے کی حالت میں کار کا ایکسیڈنٹ کر کے خود بھی مر گیا۔ وہ بے چارہ کر بھی کیا سکتا تھا۔" سبین کے لہجے میں دھیرے سے اداسی اتر آئی اور پشیمانی بھی۔ وہ بولتی رہی۔

"بیوی بے وفا ہو جائے اور اعتبار کے سارے ناتے ٹوٹ جائیں اور سارا اعتماد ختم ہو جائے تو کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔"

"سبین۔" نومی نے اسے اپنی طرف گھسیٹ کر کہا۔ "مجھ سے شادی کر لو، تمہیں اس وقت حفاظت کی ضرورت ہے۔ تحفظ کی اور مکمل یقین کی۔"



یہ جیل بھرا ہوا ہے...... قید تنہائی کے دس دس مجرم ایک ساتھ رہتے ہیں

سبین تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی اور دور جا کھڑی ہوئی۔

"ہاتھ مت لگاؤ مجھے......" اس نے چلا کر کہا۔ "تم سے لہو کی بو آتی ہے۔ تم ہی بہرام کے قاتل ہو۔ تم اگر آشنائی کا یہ سلسلہ ختم کر دیتے تو کچھ نہ ہوتا۔ میں محفوظ رہتی اور میری زندگی یوں تنہا نہ گزرتی۔ اُس رات تم میرے پاس نہ ہوتے تو بہرام کو موت کا انتخاب نہ کرنا پڑتا۔"

"جو ہو چکا، سو ہو چکا۔" نومی نے نرمی سے کہا۔ "تم نے اب تک میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"میں کسی سے شادی نہیں کر سکتی۔" سبین بولی۔ نومی نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں اعتراف کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ اس لڑکی کو جس سے اسے محبت ہے، وہ سب کچھ بتا دے جو اس کی راتوں کا عذاب بن کر اس پر مسلط تھا۔ اسے بہرام کی لاش یاد آئی۔ وہ قتل جو اُن سب نے مل کر کیا تھا۔ پھر ایک اور لاش تھی، یاسر خان کی لاش دریا بُرد۔ وہ نوجوان، امنگوں بھرا نوجوان ان کی بربریت کا نشانہ بن گیا۔ وہ عذاب پھر اس کے دل میں دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگا۔ دو لاشیں کہیں خلا میں تیرتی ہوئی آئیں اور اس کے سامنے معلق ہو گئیں۔ ہواؤں کا شور

بڑھنے لگا اور طوفانی جھکڑ چلنے لگے۔ ہزاروں لوگ کہیں دور قہقہے لگانے لگے۔ نعمان، نومی...... فرشتۂ اجل نے گھنٹیوں کے شور میں چیخ کر اس سے کہا۔ ”میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ تم نے میرا کام آسان کر دیا۔“ گھنٹیوں کا شور اور بڑھ گیا۔ ”تھینک یو نعمان نومی۔ تم نے واقعی میرا کام آسان کر دیا۔“ گھنٹیاں تیز ہوتی گئیں اور ہواؤں کے جھکڑ در و دیوار پر سر پٹخنے لگے۔

نومی کے جانے کے بعد بھی وہ اداسیوں میں گھری یوں ہی بیٹھی رہی۔

☆☆☆

”میرے خدا!“ نازیہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ”تو اس نے تمہیں یہ بات نہیں بتائی؟“

”نہیں۔“ یاسر نے ازراہِ تاسف سر ہلایا۔ ”اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

وہ دونوں ایک نیم تاریک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ ریسٹورنٹ میں ہلکی سی خنکی تھی جو باہر کی گرمی سے کہیں زیادہ خوش گوار تھی۔

”تم آج آفس نہیں گئیں۔“ یاسر نے گرم چائے کا گھونٹ لے کر پوچھا۔

”نہیں۔“ نازیہ نے کہا۔ ”آج آفس بند ہے۔ بتایا گیا ہے کہ چند ناگزیر وجوہات پر آج آفس بند رہے گا، لیکن اصل وجہ کچھ اور ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ”بلکہ اصل وجہ تمہارا انتقال پُرملال ہے۔“

”حق مغفرت کرے۔ عجب آزاد مرد تھا۔“ یاسر بولا۔ ”تم مجھ سے ملتے وقت احتیاط سے کام لیا کرو۔ حامد یا اس کے کسی ساتھی کو پتا چل گیا تو تمہیں نوکری سے نکال دیا جائے گا اور...... ہوسکتا ہے کہ اس نمک حرامی کے صلے میں حامد تمہیں کوئی سزا بھی دے۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ نازیہ کے لہجے میں اعتماد تھا اور لبوں پر مسکراہٹ۔ ”میں اس بات کا خاص خیال رکھتی ہوں۔“

ریسٹورنٹ میں آدھا گھنٹا گزارنے کے بعد وہ باہر نکلے تو تیز چمک دار دھوپ نے ان کا استقبال کیا۔ فٹ پاتھ پر تیزی سے جاتا ہوا ایک آدمی یاسر سے ٹکرایا اور رک کر معذرت کرنے لگا۔

”کوئی بات نہیں۔“ یاسر نے مسکرا کر کہا۔ قریب سے گزرنے والوں نے ایک لمحے کے لیے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر اپنی راہ ہولیے۔ عین اسی وقت ٹکرانے والے اس آدمی نے سرگوشی کی۔

”میری جیب میں ایک سیاہ پستول ہے جس کا رخ تمہاری طرف ہی ہے۔ کوئی احمقانہ حرکت کرنے کی کوشش خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔“

اگلے پانچ منٹ بعد وہ دونوں ایک سیاہ کار میں بیٹھے تھے جو کسی انجان منزل کی طرف جارہی تھی۔ کار کے شیشے ٹنٹڈ تھے اور ڈرائیور ان کے لیے اجنبی تھا۔ منزل نامعلوم تھی اور سفر طویل تھا۔

☆☆☆

مسلسل، عذاب مسلسل اب تک جاری تھا۔ انہوں نے اسے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ انہوں نے یاسر کو ایک ریسٹورنٹ میں گھستے ہوئے دیکھ لیا ہے اور اب وہ اسے اغوا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اسے فوراً بلایا تھا مگر اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا تھا مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔

”مسٹر نومی!“ اس نے خود سے کہا۔ ”آپ کو تو اس ڈرامے میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ کمزور لوگوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس میں مضبوط لوگوں کی ضرورت ہے جو قتل کر سکیں اور بہتے ہوئے خونِ ناحق کو دیکھ سکیں اور گناہ کے بعد ہنس سکیں اور ظلم کے بعد اطمینان سے مسکرا سکیں۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ زندگی کی بساط پر موت کی بازی ہے۔ آپ اس میں کہاں پھنس گئے، مسٹر نعمان!“ اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے گلاس میں وہسکی ڈالی، ادھ کٹا لیموں ڈالا۔ برف کی ڈلی ڈالی۔ پھر گھونٹ بھرا۔ سینے میں تلچھٹ سی اترتی محسوس ہوئی۔

یاسر اسے یاد آیا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ زندہ بچ گیا تھا۔ یہ معجزہ نہیں تھا تو کیا تھا۔ اس نے گلاس خالی کر کے زور سے میز پر رکھا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہوتے جارہے تھے۔ اسے پھر وہ رات یاد آئی۔ اس رات انہوں نے بہرام کو قتل کیا تھا۔

سینٹرل ہائی وے پر انہوں نے اسے روک لیا تھا۔ حامد، قیصر اور مراد شاہ اس کے ساتھ تھے۔ کافی دیر تک اس کے پیچھے سائے کی طرح لگے رہنے کے بعد حامد نے کار کو اس کے سامنے لے جا کر اس طرح روکا تھا کہ اگر بہرام خان اپنی کار کو کچے میں اتار کر نہ روکتا تو کاروں کے علاوہ خود ان کا بھی بیڑا غرق ہوسکتا تھا۔ وہ رات اسے شدت سے یاد آنے لگی۔

”کیا بات ہے؟“ بہرام خان نے اتر کر ان سے پوچھا تھا۔

''تم سے ایک بات کرنی ہے۔'' مراد شاہ نے کہا تھا۔

''کیا بات ...... کرنی ہے۔'' بہرام کے لہجے میں نشہ تھا۔ وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

''تم جوئے میں ہم سے سات کروڑ جیت کر گئے تھے۔''

''ہاں۔''

''ہمیں شک ہے کہ تم نے بے ایمانی کی تھی۔''

''بکواس کرتے ہو تم۔''

''ہمیں سات کروڑ واپس چاہئیں۔ تم نے گڑبڑ کی تھی۔''

بہرام نے نشے میں لڑکھڑا کر کار کا سہارا لیا تھا۔ ''نہ میں نے گڑبڑ کی تھی ...... اور ...... نہ میں تمہیں وہ رقم واپس کروں گا۔''

''ہم تمہاری کار کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔'' ان کی نظر اس بریف کیس پر تھی جو کار کے پچھلے حصے میں پڑا ہوا تھا۔

''دفع ہو جاؤ۔'' وہ گھوم کر واپس کار کے دروازے کی طرف بڑھا تھا مگر حامد اس کی راہ میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور سپاٹ چہرے پر ایک سرد، سفاک جذبہ۔

''نومی! گاڑی میں سے بریف کیس نکالو۔''

بہرام کی لات اچانک چلی تھی اور پستول سڑک کے اس پار نشیب میں جا گرا تھا۔ اگلے گھونسے کی ضرب حامد کے چہرے پر پڑی اور وہ بغیر کسی آواز کے سڑک پر ڈھیر ہو گیا مگر شراب کے نشے نے اس کی طاقت کو برقرار نہیں رہنے دیا۔ قیصر اور نعمان نے اسے بے بس کر دیا تھا اور مراد شاہ کے مکے اس کے چہرے پر ہتھوڑوں کی طرح برستے رہے تھے۔ چند منٹ بعد جب حامد ہوش میں آیا تھا تو بہرام بے ہوش ہو چکا تھا۔ بریف کیس میں مطلوبہ رقم تھی۔ سات کروڑ۔

بہرام کو بے ہوشی کے عالم میں انہوں نے کار میں بٹھا کر اسٹیئرنگ پر اس کے دونوں ہاتھ جما دیے تھے اور اسٹارٹ کر کے اسے طویل نشیبی سڑک پر دھکیل دیا تھا۔ کار دھیرے دھیرے آگے بڑھتی گئی تھی۔ فاصلے کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔ جہاں تک سڑک سیدھی تھی، وہاں تک کار چلتی گئی اور سڑک مڑتے ہی ایک دھماکے کے ساتھ نیچے گہرائیوں میں جا گری تھی۔

نومی نے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ایک جھرجھری لی۔ جلتی ہوئی کار کے شعلوں میں بند بہرام اسے یاد آیا۔ اس کی بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور جھلسے ہوئے چہرے کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا۔ اس نے اگلا گلاس ختم کیا۔ اس کے اندر کی، ضمیر کی خلش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے خالی گلاس اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ شیشوں کی کرچیاں دور تک پھیل گئیں۔

☆☆☆

انہیں اتارنے سے قبل احتیاطی تدابیر کے طور پر ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئی تھیں اور دونوں ہاتھوں کو پشت پر یوں جکڑ بند کر دیا گیا تھا کہ بظاہر انہیں آزاد کرانا ناممکن نظر آتا تھا۔ صورت حال میں روایتی فلم کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ لہٰذا روایت کے مطابق انہیں بیدردی سے ایک چھوٹے سے کمرے میں دھکیلا بھی گیا اور اندر دھکیل کر دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔

اب وہ کمرے میں تنہا تھے۔ انہیں قید کرنے سے قبل ان کی آنکھوں سے پٹیاں اتار دی گئی تھیں اور اب وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔'' یاسر نے کہا۔ ''بار بار سمجھایا تھا۔''

''کیا؟'' نازیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہی کہ، خیال رکھنا چاہیے تھا تمہیں بھی۔'' یاسر بولا۔ ''وہ لوگ پہلے ہی میری تاک میں تھے۔ تمہیں کم از کم اپنا خیال رکھنا چاہیے تھا۔''

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' نازیہ نے کہا۔ ''حامد کو پہلے ہی شبہ ہو چلا تھا مجھ پر کہ اس کی سیکریٹری ہونے کے باوجود تمہاری کوئی بات اس سے چھپائے ہوئے ہوں۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ تمہارے ساتھ مجھے دیکھ کر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی ہوگی بلکہ اپنے شبے کی صداقت پر وہ خوشی محسوس کر رہا ہوگا۔''

''ساری گڑبڑ تقدیر کی ہے۔'' یاسر نے سر ہلا کر کہا۔

''کیسی گڑبڑ؟'' نازیہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''تقدیر شاید ہم دونوں کو ملانے پر تلی ہوئی ہے۔'' کہتے ہوئے یاسر نے یونہی سر کھجایا۔ ''اور اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ وہ ہم دونوں کو کسی خاموش کمرے میں ملانے پر تلی بیٹھی ہے۔''

نازیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں خاموشی تھی اور تنہائی تھی۔ دروازے کے نیچے موجود ایک باریک سی درز سے چل کر اندر، آ جانے والی ہلکی ہلکی دھوپ کی ایک کرن دھیرے دھیرے فرش پر رخ بدلتی گئی۔ اس کی چمک

مانند پڑتی گئی اور روشنی مدھم ہوتی گئی، کرن غائب ہو گئی تو انہوں نے جانا کہ شام ہو گئی ہے۔ پھر اندھیرا پھیلنے لگا...... ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے مگر سکون کی بات یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور بول سکتے تھے۔

رات بہت بیت چلی تھی، وقت کا انہیں کچھ اندازہ نہ تھا۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ جب دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی ہلکی سی سرسراہٹ ابھری۔ پھر کلک کی آواز آئی۔ وہ دم سادھے بیٹھے رہے۔ رات کی اس تاریکی میں دروازہ دھیرے سے کھلا اور ایک سیاہ ہیولا اندر داخل ہوا۔ اندر داخل ہو کر وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے ماچس کی ایک تیلی جلائی۔ ایک ننھا سا شعلہ پیدا ہوا اور ہلکی ہلکی روشنی پورے کمرے میں پھیل گئی۔ یاسر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

وہ نعمان عرف نومی تھا......

☆☆☆

سبین کی آنکھ کھلی تو شام ہو چلی تھی۔ اس نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور کچن میں جا کر ہیٹر پر چائے کے لیے پانی رکھا۔ عین اسی وقت فون کی سُریلی بیل گنگنائی۔

''ہیلو۔'' اس نے دوسری بیل پر فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

''میں حامد بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''حامد ہمدانی۔''

سبین خاموش کھڑی رہی۔ اسے اچانک یاسر کا خیال آیا۔ دو راتوں سے وہ اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ نہ اپنے فلیٹ پر۔

''میں تمہیں فون کبھی نہیں کرتا۔'' حامد نے کہا۔ ''بلکہ اپنے کسی آدمی کے ہاتھوں تمہارے پاس پیغام بھجوا دیتا مگر میں یہ بات خود تم سے کرنا چاہتا تھا۔''

''یاسر تو ٹھیک ہے نا؟'' سبین نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ حیرت اسے اس وقت ہوئی جب اسے پتا چلا کہ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا ہے۔

''تمہیں کیسے پتا؟'' حامد نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''اور میں نے تمہیں اس کی خیریت کے سلسلے میں فون نہیں کیا۔ مجھے تم سے کوئی اور بات کرنی ہے۔''

''کیا بات ہے؟''

''تم یہ سب کچھ کیوں کروا رہی ہو؟'' حامد کی آواز آئی۔ ''آخر چاہتی کیا ہو تم......؟''

''اپنے شوہر کے قتل کا انتقام۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' حامد کہنے لگا۔ ''بات کسی جذبے کی نہیں ہے، تم اس رقم کے چکر میں ہو جو تمہارے شوہر نے کہیں کھو دی ہے۔''

''یا تم نے چرا لی ہے، چھین لی ہے۔'' سبین کو وہ نامعلوم فون کال یاد آ گئی جو گزشتہ روز کہیں سے آئی تھی۔ وہ یقیناً حامد کی کال تھی۔

''تم نے مجھے پہلے بھی فون کیا تھا نا؟''

''میرے سوال کا جواب دو۔'' حامد نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں تمہاری رقم واپس مل جائے تو کیا تم یہ سارا چکر ختم کر دو گی؟''

''مجھے اپنے شوہر کے قتل کا انتقام......''

''بکواس بند کرو۔ اپنے مرحوم شوہر سے دلی محبت کا ڈھونگ مت رچاؤ۔ جو عورت اپنے شوہر کی زندگی میں ہی اُس سے بے وفا رہی ہو، وہ اس کی موت کے بعد کس منہ سے کسی فرضی محبت اور لگاؤ کی داستان بیان کر سکتی ہے۔ میں سب جانتا ہوں مسز سبین بہرام! تمہاری بے وفائیاں بھی اور تمہارے عشق بھی۔ میں ان راتوں سے بھی واقف ہوں جو تم نے بہرام کی زندگی ہی میں کسی اور کے ساتھ گزاری ہیں۔ میں ان لوگوں کی صحیح تعداد بھی جانتا ہوں جو تمہاری خاطر پاگل ہو چکے ہیں۔'' وہ ہنسا۔

''بلکہ...... اب تک پاگل ہیں۔ یاسر خان کی طرح، جو آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں، کیونکہ تمہارے حُسن کا سہارا ان کے پاس ہوتا ہے اور جو دماغ ہونے کے باوجود سوچ نہیں پاتے کیونکہ تمہارے حُسن کے جلوے سے برتر کوئی خیال ان کے پاس نہیں آ پاتا۔''

''میں تمہارے سوال کا جواب یاسر سے مشورے کے بعد دوں گی۔'' سبین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''نہیں۔'' حامد بولا۔ ''جواب صرف تمہیں دینا ہے۔ یاسر کی فکر مت کرو۔ وہ بہت بنتا تھا۔ بہادر اور نڈر اور بے خوف۔ اسے اس بات کی سزا ضرور ملے گی۔ سردست تم اپنی بات کرو۔ تمہارا کیا جواب ہے؟ اگر تمہیں سات کروڑ واپس مل جائیں تو کیا تم گزرے ہوئے تمام واقعات کو کسی خوابِ گم گشتہ کی طرح بھول جاؤ گی۔ اپنے شوہر کے قتل کو بھی اور...... یاسر کو بھی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ ایک دم خوف زدہ سے لہجے میں بولی۔ ''کہیں تم یاسر کو...... اسے ختم کرنے کا......''

''تم اس بات کو بھول جاؤ گی کہ تم کسی یاسر کو جانتی بھی تھیں۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رک کر بولا۔ ''ویسے تم چاہو تو

میری پیشکش کو ٹھکرا بھی سکتی ہو۔ تم انکار بھی کر سکتی ہو۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے دو دن دیتا ہوں، پرسوں میں تمہیں پھر فون کروں گا۔ پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے سوچ لینا کہ نقصان کس کا زیادہ ہوگا۔ یہ تم جانتی ہی ہوگی۔" سلسلہ منقطع ہو گیا اور سیمین فون ہاتھ میں تھامے کھڑی رہ گئی۔ یہ "اَن نون" نمبر تھا اور وہ بھی، جو اس سے پہلے اسی آواز میں کیا گیا تھا۔

☆☆☆

نشے سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ قریب آیا تو یاسر کو اس کے منہ سے شراب کی تیز بو آتی محسوس ہوئی۔

"یاسر خان!" اس نے دیوار کا سہارا لے کر ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہا۔ "تم تو ٹارزن نکلے۔ ہماری موت کی ساری کوششیں ناکام گئیں اور تم زندگی کی ہر کوشش میں کامیاب ہو گئے۔" پھر اس کی نظر نازیہ پر پڑی۔

"اور تم...... پولٹل گرل!...... تم اس کے ساتھ کیسے؟" اس نے ہچکی لی۔ "کہیں تم دونوں...... ایک دوسرے سے محبت تو نہیں کرنے لگے......؟"

یاسر خاموش کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس قیدِ تنہائی میں نومی کا یوں اچانک نمودار ہونا اور وہ بھی پی کر...... مگر باوجود اس کے لہجے میں دشمنی کا زہر نہ تھا۔ یہ بات آسانی سے کھوپڑی میں نہیں آتی تھی۔

"گڈ......! ویری گڈ۔" اس نے کمرے کے وسط میں پہنچ کر اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم دونوں کو دیکھ کر۔ تمہاری آنکھوں کی چمک دیکھ کر اور چہرے کی روشنی دیکھ کر۔ بہت اچھی بات ہے۔ محبت کرنا۔" اس نے پھر ہچکی لی۔ "لیکن مشکل بھی بہت ہوتی ہے۔ لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ نظریں بدل لیتے ہیں اور وعدے بھول جاتے ہیں، بڑی گڑبڑ ہے۔ اس محبت کے چکر میں۔"

اداسی اچانک اس کی آنکھوں میں تیرنے لگی۔ "محبت میں بہت سی باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ سن رہے ہو نا تم دونوں...... جیسے فون کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لائن کے دونوں سروں پر کوئی نہ کوئی موجود ہو۔ محبت میں بھی دونوں سروں پر دو جذبے ضروری ہوتے ہیں۔ شدید، وحشی، پاگل جذبے، ورنہ سب فضول ہو جاتا ہے۔"

ایسے میں نومی کے اپنے کانوں میں ایک آواز گونجنے لگی۔ (میں تم سے شادی کی قطعی کوئی خواہش نہیں رکھتی۔ میں تم سے شادی...... میں تم سے شادی کی...... میں تم سے......

ترک نوجوان کی محبت کا انجام

عضدالدولہ کے امرا میں ایک ترک نوجوان تھا۔ وہ اپنے پڑوسی کی بیوی پر عاشق ہو گیا۔ جب اس کا پڑوسی کاروبار پر چلا جاتا تو وہ طرح طرح سے اس کی بیوی کو لبھانے اور رجھانے کی کوشش کرتا۔ بیوی نے اپنے شوہر سے شکایت کی۔ شوہر نے گھر میں گڑھا کھودا۔ بیوی سے کہا کہ میں سامنے سے جا کر پیچھے والے دروازے سے اندر آجاؤں گا۔ جب ترک دروازے پر آئے تو اسے اشارے سے اندر بلا لینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جونہی ترک اندر داخل ہوا، اس کے پڑوسی نے اسے گڑھے میں ڈال کر پورے گڑھے کو مٹی سے پاٹ دیا۔ عضدالدولہ کے ہاں جب کئی روز تک ترک نہ پہنچا تو اسے پریشانی لاحق ہوئی۔ اس نے اس کے پڑوس کے مؤذن کو اپنے دربار میں بلایا اور صبح سے لے کر رات گئے تک اپنے ہاں روکے رکھا۔ پھر اسے رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "تم سے جو شخص یہ پوچھنے آئے کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا تھا۔ اس کا نام مجھے بتا دینا۔"

مؤذن آدھی رات کو جب مسجد میں پہنچا تو اس نے ایک شخص کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے محبت جتاتے ہوئے دریافت کیا کہ آج خلافِ معمول خلیفہ کے ہاں تمہاری طلبی کیوں ہوئی تھی؟" مؤذن نے اِدھر اُدھر کے بہانوں سے اسے ٹال دیا۔ اگلے روز خلیفہ نے اطلاع ملنے پر اس شخص کو بلایا اور تخلیے میں پوچھا۔ "ہمارے ترک امیر کے متعلق جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟" وہ شخص سر سے پاؤں تک لرز گیا اور ہاتھ جوڑ کر از اول تا آخر پوری کہانی خلیفہ کو سنا دی اور کہا کہ میں قابلِ گردن زنی ہوں۔ خلیفہ نے کہا۔ "جاؤ نہ تم نے کچھ کہا اور نہ ہم نے کچھ سنا۔"

مرسلہ: راحیل اشرف، کوہاٹ

یہ صدا بن کر پھیلنے لگی اور ٹکرا کر واپس آنے لگی...... میں تم سے شادی کی...... میں تم سے......)

''اس لیے میری جان!'' اس نے یاسر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''فون کے دونوں سروں پر ہر وقت موجود رہنا۔'' پھر اس نے نازیہ کی طرف مڑ کر کہا۔

''اور سنتے رہنا اور بولتے رہنا اور اس جذبے کو زندہ رکھنا جو راتوں کو سپنا بن کر آتا ہے اور دن میں خوشبو کی طرح ساتھ رہتا ہے۔''

اس نے گھوم کر کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یاسر نے حیرانی سے پہلے نومی اور پھر نازیہ کو دیکھا۔

''تم کیوں آئے ہو؟'' نازیہ نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''جاؤ۔'' نومی نے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور خود گرتے گرتے بچا۔

''کیا مطلب؟''

''کیا، کیا مطلب؟ میں تمہیں رہا کروانے آیا ہوں۔'' نومی نے بچوں کی طرح سرگوشی میں کہا۔ ''جادوگر نے شہزادے کو اور شہزادی کو قید کر لیا ہے، پتا ہے تمہیں؟'' اس کی آواز اور مدھم ہو گئی۔ ''وہ ان کو جانور بنا دے گا۔ انہیں کھا جائے گا۔ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ یہاں سے۔ کھڑے ہوئے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ۔'' اس نے یاسر کو دروازے کی طرف دھکیلا۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔'' یاسر نے بے یقینی اور بے چینی سے کہا۔ ''تم...... تم تو اُن کے ساتھ تھے...... حامد، قیصر اور مراد شاہ کے ساتھ......''

''بے وقوف! میں اب بھی اُن کے ساتھ ہوں۔ وقت ضائع کیوں کرتے ہو؟'' وہ بولا۔ ''مگر میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں۔ بہرام کے بعد میں کسی اور قتل کے الزام کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، ایک ہی بوجھ کافی ہے۔ جاؤ...... خدا کے لیے، باہر میری کار کھڑی ہے۔ چابیاں اسی میں لگی ہوئی ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک پستول نکالا اور یاسر کو تھما دیا۔ ''میرے لیے ایک ہی ضرب کافی ہوگی۔ صبح وہ مجھے بے ہوش پڑا پائیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ تم فرار ہو گئے ہو۔ میری حماقت پر شاید وہ مجھے لعن طعن بھی کریں...... مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

پستول کے آہنی دستے کی ایک ہی ضرب نومی کے لیے کافی تھی۔ وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ یاسر نے پستول چیک کیا۔ وہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے نازیہ کی طرف دیکھا۔ خوشی اس کے عارض پر بارش کے بعد دھوپ کی طرح پڑ رہی تھی۔ وہ نازیہ کا ہاتھ پکڑ کر محتاط انداز میں باہر نکلا۔ ایک کمرے سے گزر کر وہ دبے پاؤں ایک طویل راہداری پھر گیلری میں نکل آئے۔

باہر کار کے اندر چابیاں موجود تھیں۔ کار کا انجن خاموشی سے اسٹارٹ ہوا اور یاسر بغیر لائٹ آن کیے کار کو گھما کر سڑک پر لے آیا۔ ڈیش بورڈ پر رفتار بتانے والی سوئی دھیرے دھیرے آگے بڑھتی گئی۔ ہیڈ لائٹس آن کر دی گئی تھیں۔

☆☆☆

''وہ بچ کر کیسے نکل گیا؟'' حامد نے زخمی شیر کی طرح ٹہلتے ہوئے پوچھا۔ قیصر اور مراد شاہ بھی کرسیوں پر سکون سے نہیں بیٹھے تھے۔

''میں...... کمرے میں گیا تو وہ شاید تیار بیٹھا تھا۔'' نومی نے اپنے سر کا عقبی حصہ سہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا، اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ لڑکی...... تمہاری سیکریٹری بھی اس کے ساتھ تھی۔''

''ہونہہ...... نازیہ......!'' حامد دانت پیس کر بولا۔ ''مجھے اس کُتیا پر پہلے ہی شک تھا۔ میں اسے اچھی طرح سمجھ لوں گا۔''

''تم وہاں کرنے کیا گئے تھے؟'' قیصر نے تشکیک بھرے لہجے میں نومی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''اس نے کراہنا شروع کر دیا تھا۔'' نومی نے جواز گھڑا۔ ''آواز سن کر لگتا تھا کہ وہ مرنے والا ہے۔ میں نے...... میں نے سوچا کہ ایک نظر ڈال لوں مگر اندر داخل ہوتے ہی......'' اس نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

''اس شخص کا علاج میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' حامد نے کمرے کی دونوں دیواروں کے درمیانی فاصلے کو...... اٹھارویں بار طے کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اسے مارنے کی کوشش کی تو وہ نہ جانے کیسے بچ گیا۔ دریا کی موجوں سے بچ کر نکل آیا۔ پھر نازیہ نجانے کیسے اس کے ساتھ مل گئی اور اب وہ ایک بند کمرے سے نکل بھاگا ہے۔'' اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''ہمارے ایک آدمی کو زخمی کر کے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' قیصر بدستور نومی کو مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا۔ ''تمہیں ضرورت کیا تھی اس کمرے میں جانے کی؟ اور جانا ہی تھا تو کوئی پستول لے کر

جاتے۔''

''مطلب کیا ہے اس بات کا؟'' نومی نے اچانک گرم ہو کر کہا۔ ''تم الزام لگانا چاہتے ہو مجھ پر۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے انہیں فرار ہونے میں مدد دی ہے؟''

''کم آن۔'' حامد نے نرمی سے کہا۔ ''ہم یہ تو نہیں کہہ رہے۔''

''فرق صرف لفظوں کا ہے۔'' نومی بولا۔ ''ورنہ لہجے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔''

''نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔'' مراد شاہ بولا۔ ''کوئی ایسی بات نہیں۔''

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ ایک دوسرے کی صورتیں تکتے رہے۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یاسر کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کے بجائے نازیہ کے فلیٹ پر جانا چاہیے۔'' حامد بولا۔ ''وہ وہیں پہنچے گا۔''

''مگر ہمیں کرنا کیا ہوگا؟''

''اس بار ہم اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔'' حامد نے کہا۔ ''کیونکہ اگر ہم نے اسے گولی نہ ماری تو وہ ہمیں گولی مار دے گا۔''

☆☆☆

ہوٹل میں کمرا بک کرواتے وقت یاسر نے اپنا نام ایاز یعنی مسٹر اینڈ مسز ایاز لکھوایا تھا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے معمر شخص نے ان کے چہرے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ان کی شادی ہوئے تین دن بھی نہیں ہوئے ہوں گے جس پر یاسر نے سر جھکا کر اور نازیہ نے شرم سے سر جھکانے کے بعد ہنسنے کی کامیاب اور جاندار اداکاری کرنے کے بعد مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ کمرے کی چابیاں پکڑاتے وقت استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے شخص نے دو دفعہ سر ہلایا اور شکل سے عقل مند نظر آنے والے اچھے بھلے نوجوان کی اس عظیم الشان حماقت پر افسوس کرتا ہوا دوبارہ کسی اخبار کو پڑھنے میں محو ہو گیا۔

''میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔'' یاسر نے کمرے میں پہنچ کر کہا۔

''کیا؟''

''کاؤنٹر پر نام لکھواتے وقت ہم نے سچ بولا تھا یا جھوٹ؟'' ساتھ ہی وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''میرا مطلب ہے ۔۔۔ مسٹر اینڈ مسز ایاز۔''

نازیہ نے تکیہ اٹھا کر اس پر دے مارا اور باتھ روم میں گھس گئی۔ پندرہ منٹ بعد وہ باہر نکلی تو یاسر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''خدایا۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''مجھے اپنی مخلوق کے ان خطرناک حملوں سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔'' نازیہ کے گیلے بالوں سے قطرے ٹپک رہے تھے اور اس کا نکھرا ہوا چہرہ کسی پھول کی طرح شگفتہ تھا۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' نازیہ نے اس کے عین سامنے بیٹھ کر کہا۔

''اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔'' یاسر نے سنجیدگی سے کہنا شروع کر دیا۔ ''مثلاً، کہنے کو میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اب ہمیں اصولاً چند رومانی باتیں کرنی ۔۔۔'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

یاسر، پلیز۔'' نازیہ نے کہا۔ ''میں مذاق نہیں کر رہی ہوں اور نہ ہی یہ مذاق کا وقت ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میرے فلیٹ میں رہنا خطرناک ہے کیونکہ وہ جگہ ان کی نظر میں ہو گی۔ اسی لیے ہم اس ہوٹل تک آ پہنچے ہیں مگر اب کیا ہوگا۔ ہم اس ہوٹل میں کب تک رہیں گے اور اس سے بھی اہم تر سوال یہ ہے کہ ہمیں اب کیا کرنا ہے؟''

یاسر نے جواب میں دستی گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ ''اس وقت شام کے پانچ بجے ہیں۔ آج رات ہم اپنے مشن پر نکلیں گے۔ اب ہمیں وہ کام کرنا ہے جو جیمز بانڈ اور شرلاک ہومز حتیٰ کہ ابنِ صفی کا عمران اور فریدی کرتے تھے۔''

''کام کی بات کرلو تو مہربانی ہوگی۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور یاسر بتانے لگا۔

''آج کی رات فیصلے کی رات ہے، ڈیئر! اس لیے آرام سے سو جاؤ۔ کاغذی طور پر شادی شدہ ہونے کے بجائے اگر ہم واقعی شادی شدہ ہوتے تو شاید میں تمہیں اس طرح سونے کا مشورہ نہیں دیتا مگر ۔۔۔ خیر، خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' وہ نازیہ کی طرف دیکھے بغیر بستر پر گر کر تکیے میں منہ چھپا کر سو گیا، جو کمر پر دونوں ہاتھ رکھے، ہونٹ بھینچے اسے غصے سے گھورے جا رہی تھی اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش میں خاصی کامیاب بھی رہی تھی۔

☆☆☆

تیسری رات شروع ہونے والی تھی اور یاسر کا اب تک کوئی اتا پتا نہ تھا۔ سین اپنے فلیٹ پر تنہا تھی۔ وہی خیالات اس کے ساتھ تھے۔ بے رحم اور ظالم خیالات جو کسی

جلاد کی طرح اپنے فیصلے صادر کرتے تھے۔ سزائیں سناتے تھے۔ جرم بتاتے تھے۔ یاسر نہ جانے اس وقت کہاں ہوگا۔ اس نے سوچا۔ حامد ہمدانی کے بنائے ہوئے کسی تہ خانے میں...... بے بس اور لاوارث...... مگر میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟ اس نے خود سے کہا۔ پہلے بھی تو میں کچھ نہیں کر سکی تھی جب بہرام کو مارا گیا تھا۔ ساری بازی ان کے پاس ہے۔ تمام ٹرپ کے پتے، تمام مہرے بھی اور بساط کے سارے خانے بھی...... سب کچھ حامد کے پاس ہے۔ میں یہاں بیٹھ کر بے بسی سے تماشا ہی دیکھ رہی ہوں۔ سوائے اس کے اور کروں بھی تو کیا؟ سات کروڑ کا سنسنی خیز تماشا...... جس میں لوگ مر رہے ہیں اور مار رہے ہیں۔ یاسر! یہ میں نے تمہیں کس مشکل میں پھنسا دیا۔ وہ کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ نیچے ٹریفک کا شور تھا اور اوپر آسمان پر گہری تاریکی تھی۔

☆☆☆

اس احمقانہ پہرے کا آغاز شام سات بجے سے ہوا تھا۔ وہ چاروں ایک کار میں اس وقت سے ٹین کے فلیٹ کے سامنے والی مصروف سڑک کے اس پار کھڑے تھے۔ ساڑھے نو بجے پہلے قیصر اور نومی کھانا کھانے گئے اور ان کے آنے کے بعد حامد اور مراد شاہ چل پڑے۔

رات کے گیارہ بجے مراد شاہ نے دبی زبان سے پہلی دفعہ اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ لوگ یہاں نہیں آئیں گے۔ وہ دونوں بہت تیز ہیں اور اتنی سی بات ان کی کھوپڑی میں بھی آگئی ہوگی کہ یہاں پر ہم لوگ موجود ہوں گے۔''

''مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں ضرور آئیں گے۔'' حامد نے کہا۔ ''وہ یقیناً مناسب وقت کے انتظار میں ہوں گے۔ رات ہوتے ہی وہ سیدھے یہاں پہنچیں گے۔''

یوں وہ خاموشی سے بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ کار کی ایش ٹرے میں بجھی ہوئی سگریٹوں کا ایک انبار جمع ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

گھر میں سناٹا تھا۔ یاسر نے دروازہ کھولنے کی کوشش چاہی مگر ناکام رہا۔ دروازہ باہر سے لاک تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ گھر کے مکین کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ پیچھے کھڑی ہوئی نازیہ نے سرگوشی کی۔ ''کیا بات ہے؟''

''دروازہ بند ہے۔'' یاسر نے کہا۔ ''اب تو ایک ہی صورت ہے، کھڑکی کے ذریعے اندر جانا پڑے گا۔''

''دروازہ بند نہ بھی ہوتا، جب بھی ہمیں کھڑکی کے ذریعے ہی جانا ہوتا۔'' نازیہ بولی۔ اس کی بات صحیح تھی مگر یاسر نے بحث کرنے پر کھڑکی کی تلاش کرنے کو ترجیح دی۔ کھڑکی کے شیشوں کے اس طرف اندھیرا تھا۔ یاسر نے کھڑکی کے پٹ کو دھیرے سے اندر دھکیلا، اندر سے چٹخنی لگی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے نازیہ کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔

شیشہ ٹوٹنے کا چھنا کا ہوا اور یاسر نے ہاتھ اندر ڈال کر چٹخنی کھول لی۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ یاسر پہلے خود اندر کودا اور پھر نازیہ کو بھی اندر اتار لیا۔ ایک ایک کر کے وہ ہر کمرے کا جائزہ لیتے گئے۔ سارے کمرے خالی پڑے تھے۔ گھر کی بے ترتیبی سے صنفِ نازک کی عدم موجودگی عیاں تھی۔ وہ ہر کمرے میں لائٹ آن کر کے دیکھتے گئے۔ یاسر کو جس چیز کی تلاش تھی وہ ساتویں کمرے میں ملی۔

یہ فولاد کی ایک مضبوط تجوری تھی جو ایک بیڈ روم کی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ تجوری کے اوپر ایک ڈائل بنا ہوا تھا۔ تجوری کے نظام کو شکست دینے کے لیے ضروری تھا کہ درست نمبر گھمایا جائے۔ یاسر نے سیاہ رنگ دستانے پہن لیے اور فرش پر تجوری کے عین سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ نازیہ قریب پڑی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ صبح ابھی بہت دور تھی۔ یاسر نے ڈائل گھمانا شروع کر دیا۔ اندازہ کسی وقت بھی درست ہو سکتا تھا۔ درست نمبر کسی وقت بھی اتفاقاً ڈائل ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ حامد کار ڈرائیو کرتے کرتے بولا۔ ''میں تم تینوں کو گھر پر اتار دوں گا۔''

''کیوں؟'' مراد شاہ نے کہا۔ ''تم کہاں جاؤ گے؟''

''میں مسز بہرام خان کے پاس جاؤں گا۔'' حامد ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے جمائے مسکرایا۔ ''معاملہ طے کرنے۔''

''ٹھیک ہے۔'' قیصر بولا۔ ''ہماری جان تو چھوڑ دو۔ نیند سے حالت تباہ ہو رہی ہے۔'' مراد شاہ نے سر ہلا کر اپنی حمایت کا اعلان کیا اور کہنی مار کر سوتے ہوئے نومی کو اٹھا دیا۔

''کک...... کیا ہوا؟'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''بھارت نے حملہ کر دیا ہے۔'' مراد شاہ بولا۔ سب ہنسنے لگے۔ نومی نے بُرا سا منہ بنایا۔

☆☆☆

پانچ بج کر بیس منٹ پر یاسر کی ہمت جواب دے گئی۔ اب تک صحیح نمبر نہیں گھوم سکا تھا۔

''سوری۔'' اس نے پلٹ کر نازیہ سے کہا۔ اس طرح تو یہ نہیں کھل سکے گی۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے سیاہ رنگ کا ایک پیکٹ نکالا۔

''یہ کیا ہے؟'' نازیہ نے پوچھا۔

''پاکٹ سائز ڈائنامائٹ۔'' یاسر نے اس کے تار پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''جو بیٹری سیل سے چلتا ہے۔''

''ڈائنامائٹ......!'' نازیہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔

''ہاں! اب یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔'' یاسر نے ڈائنامائٹ کو تجوری کے ہینڈل میں پھنسا دیا۔ ''اگر یہ وار بھی ناکام ہوا تو اطمینان سے واپس چلیں گے۔ بچپن میں نقب زنی نہ سیکھ کر میں نے واقعی بڑی غلطی کی۔''

تجوری سے کافی دور، دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے ڈائنامائٹ کے دونوں تاروں کو آپس میں ملا دیا۔ روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور ایک ہلکی سی دھماکے کی آواز آئی تھی۔ تجوری کے ہینڈل کے پاس سے دھواں اٹھنے لگا۔ یاسر نے چمڑے کے دستانوں کی مدد سے ہینڈل کو باہر کھینچنے کی کوشش چاہی تو...... تجوری کا دروازہ اچانک کھل گیا۔

اندر بہت سے کاغذات، فائلوں اور تصویروں کے انبار کے درمیان سیاہ رنگ کا بریف کیس رکھا ہوا تھا۔

''ویری گڈ۔'' معاً پیچھے سے کسی نے تالی بجا... کر کہا۔ ''تم تو بہت عقل مند نکلے مسٹر یاسر خان......''

یاسر اپنی جگہ منجمد کھڑا رہ گیا۔ کمرے کے دروازے پر وہ تینوں کھڑے تھے۔ قیصر، مراد شاہ اور نومی۔ قیصر کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ ان کا درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ حملہ کرنے کی کوشش ہی فضول تھی۔ یاسر کو قیصر کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک میں اپنی موت کا پیغام نظر آیا۔ اس نے بے رحمی سے پستول بلند کیا اور یاسر کا نشانہ لیا۔

''تم ہمارے لیے ایک مستقل خطرہ بن گئے ہو یاسر!'' ... وہ بولا۔ ''تم سب کچھ جان گئے ہو اور ہم کسی خطرے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں گولی مار دیں گے، اس لیے......'' مگر اس کی بات مکمل نہ ہو سکی۔ پیچھے کھڑے ہوئے نومی نے اچانک اس کے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔

یاسر کو صرف ایک لمحے کی مہلت درکار تھی۔ وہ اچھل کر مراد شاہ کے اوپر جا پڑا۔ اگلے ہی لمحے کمرے میں دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ مراد شاہ اور یاسر باکسنگ میں مصروف تھے جبکہ نومی اور قیصر نے پستول چھیننے کو زیادہ دلچسپ سمجھا تھا۔

چند لمحوں بعد یہ جنگ جس طرح شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک ختم ہو گئی۔ نومی پستول چھیننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''کمینے!'' قیصر نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''تو نے یہ سارا چکر چلایا تھا۔ تو نے ہی ان کو فرار ہونے میں مدد دی تھی۔''

''ہاں۔'' نومی نے کہا۔ ''میں ان دونوں کے قتل کا کوئی ڈراما نہیں دیکھ سکتا تھا۔''

''تم زندہ نہیں بچو گے۔'' مراد شاہ بولا۔

''میں زندہ رہنا بھی نہیں چاہتا۔''

''حامد تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

نومی نے پلٹ کر نازیہ کی طرف دیکھا اور باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ ''تم لوگ جاؤ۔'' اس نے یاسر سے کہا۔ ''میں سب سنبھال لوں گا۔ تجوری میں سے وہ بریف کیس بھی نکال لو۔ اس میں بہرام سے چھینی ہوئی وہ رقم بھی ہے۔ پورے سات کروڑ۔'' وہ ہنسا۔ ''ایک انسانی جان کا معاوضہ۔ لہو بہانے کی اُجرت۔''

ذرا دیر بعد باہر کھڑی کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے تک اندر دو فائروں کی آواز آئی۔''

''یاسر!'' نازیہ کی آواز میں لرزش تھی۔ ''اس نے ان دونوں کو مار دیا ہے...... یقیناً......'' عین اسی وقت ایک تیسرا دھماکا ہوا اور یاسر نے چشم تصور سے کمرے میں پڑی ہوئی تینوں لاشوں کو دیکھا۔ نومی نے بھی یقیناً خودکشی کر لی تھی۔

''اوہ، میرے خدا!'' نازیہ نے یاسر کے کندھے پر سر رکھ کر کہا۔ یاسر نے کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے آگے چلا گیا۔

☆☆☆

کمرے میں حامد اور سین تھے اور باہر کھڑکی کے نیچے یاسر اور نازیہ ساکت بیٹھے تھے۔

''میں صرف ایک جواب چاہتا ہوں۔'' حامد نے کہا۔ ''اگر تمہیں سات کروڑ واپس مل جائیں تو کیا تم سب کچھ بھول جانے کو تیار ہو؟''

''مگر......'' سین کی آواز آئی۔ ''مگر یاسر کہاں ہے؟''

''یاسر جہاں بھی ہو۔'' حامد بولا۔ ''تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بات بھی میں واضح کر دوں کہ یاسر کو ہم ہر حال میں قتل کر دیں گے۔ خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ موت اس کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ اب اتنا کچھ جان چکا

ہے کہ اس کی زندگی ہمارے لیے خطرے کا باعث ہے۔ تم صرف اپنی بات کرو۔ اگر تمہیں سات کروڑ واپس مل جائیں تو کیا تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔ اپنے شوہر کی موت کو بھی اور یاسر کو بھی؟"

دیر تک کمرے میں اسرار بھری خاموشی طاری رہی۔ باہر کھڑکی کے نیچے بیٹھے ہوئے یاسر نے نازیہ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی اور اس کے نزدیک ہو گئی۔

"ٹھیک ہے۔" اندر کمرے میں سین نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ "رقم مجھے جلد مل جانی چاہیے۔"

"تو تم تیار ہو۔" حامد نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"ہاں۔"

یاسر اٹھا اور دروازہ کھول کر کمرے میں گھس گیا۔ سین اور حامد اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ویری فائن مسز بہرام!" یاسر نے کمرے کے وسط میں پورے اعتماد سے کھڑے ہو کر کہا۔ "لگا دی آپ نے میری قیمت۔ سات کروڑ روپے...... ! بہت سخی ہیں آپ مسز بہرام! بے وفائی کے خزانے سے دل کھول کر خرچ کرتی ہیں آپ۔" کہتے ہوئے اس نے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا یاسر!" سین کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ "میں...... میں تو...... میں تو اب بھی......"

"نہیں سین! اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں...... اب کوئی اور جھوٹ نہیں بولو۔ اتنے جھوٹ بول چکی ہو۔ اس وقت بغیر جھوٹ کے ہی گزارا کر لو۔ خاموشی سے...... کوئی لفظ نہ کہو...... کوئی بات نہ کرو۔ اب پہلی کہانی ختم، اور دوسری کہانی کی ابتدا دیکھو، نازیہ کے ساتھ......" کہتے ہوئے اس نے پاس کھڑی نازیہ کی طرف دیکھا تھا۔

"بات کو سمجھنے کی......"

"سب سے بڑا احمق یاسر خان تھا، محترمہ سین!" یاسر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "جو تمہاری خاطر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نکل گیا۔ بے وفائی کے ایک سابقہ زخم کو چھپا کر سات کروڑ کا سراغ لگانے چل پڑا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ جب وہ واپس آئے گا تو مسز بہرام ایک سودے میں مصروف ہوں گی۔ خود اس کے اپنے سودے میں۔" اس نے پلٹ کر نازیہ کو آواز دی۔

نازیہ قریب آ گئی تو اس کے ہاتھ میں سیاہ بریف کیس صاف نظر آنے لگا۔ یاسر نے ایک جھٹکے سے اسے کھول کر سین کے سامنے میز پر ڈھیر کر دیا۔

"یہ ہیں وہ سات کروڑ، جو تمہارے معزز مہمان مسٹر حامد ہمدانی کی آہنی تجوری سے نکالے گئے ہیں۔ اس میں سے اب میرے علاوہ مس نازیہ بھی حصہ دار بن چکی ہے، وجہ کا تمہیں یہ خوبی اندازہ ہو ہی گیا ہوگا، یقیناً تم اتنا بھی اپنے لیے کافی سمجھو گی یعنی تمہارے حصے میں تین کروڑ آ رہے ہیں۔ باقی تین کروڑ معاہدے کے مطابق میرے اور ایک کروڑ مس نازیہ کے...... اس دھوکے کے آشکار ہونے کے بعد تمہیں اپنا حصہ بھی بہت لگے گا۔ ورنہ تم اس کے بھی قابل نہ تھیں۔۔۔ لے لو اپنا حصہ۔ جلدی۔"

سین نے کانپتے ہاتھوں سے سیٹ کی ہوئی کچھ الگ گڈیاں اٹھالیں۔ باقی بریف کیس میں نازیہ نے بند کر لیں۔

پھر یاسر یک دک سے کھڑے حامد ہمدانی کی طرف مڑا۔

"اور تم مسٹر حامد ہمدانی...... ! میں تمہاری راہ سے ہٹ رہا ہوں۔ کیونکہ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ بہرام خان کے قتل کا افسوس جب اس کی بیوی تک کو نہیں ہے تو میں کون ہوتا ہوں۔ تم مجھے اپنا دشمن سمجھنا چھوڑ دو۔ مجھے قتل کرنے کی کوشش ترک کر دو۔ اس کے عوض میں تمہارے جرائم کے سلسلے میں خاموشی اختیار کر لوں گا۔ یہ سودا تمہیں یقیناً منظور ہوگا۔"

"تم...... تم کہاں جا رہے ہو۔" سین نے تڑپ کر پوچھا۔

"میں۔" یاسر نے کہا۔ "میں اپنی پہلی کہانی ختم کر کے دوسری کہانی کی ابتدا کرنے جا رہا ہوں، نازیہ کے ساتھ، شاید بہت دور......"

سین کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ یاسر بدستور زہریلے لہجے میں بولا۔ "میں چاہتا تو تمہیں گولی مار کر بھی جا سکتا تھا۔ مجھے حق تھا مگر میں زندہ رہنے دوں گا تمہیں۔ تاکہ تم دنیا کو دیکھتی رہو اور پچھتاتی رہو۔ شاید یہ ان بے وفائیوں کا صلہ ہو جو تم نے محبت کے نام پر کی ہیں۔ تم زندہ رہو گی اور اپنی زندگی پر افسوس کرو گی۔ تم موت کی خواہش کرو گی مگر موت نہیں آئے گی۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ تین کروڑ تمہارے پاس ہیں۔ یہ چھ کروڑ بھی بن سکتے ہیں۔ چھ ارب بھی۔ کوشش کرنا۔ شاید تم کوئی محبت خرید سکو۔"

وہ مڑا اور نازیہ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آیا۔ صبح کا اُجالا نمودار ہو چکا تھا اور سڑکوں پر چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسری کہانی کا کردار بنے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتے گئے۔ روشنی و سکون کے لیے اور محبت کے لیے......

❖❖❖



مقتولِ وفا

محمد فاروق انجم

شکاری کو کانٹے سے نکل جانے والی مچھلی ہی سب سے بڑی مچھلی محسوس ہوتی ہے اور دل اُسی شکار کے لیے بار بار مچلتا ہے... جس پر نشانہ نہ لگا ہو... بالکل اسی طرح صنفِ نازک کا معاملہ بھی ہے... جی اس کے لیے مچلتا ہے جو چھوڑ کر چلی گئی ہو... ایک سفاک بے مہر شخص کے سازشی ذہن کی حیلہ سازیاں... وہ ہر ایک کے لیے وبالِ جاں بنا ہوا تھا... خفت، ہزیمت اور ندامت کے چھینٹوں سے اس کا دامن داغ دار ہو رہا تھا... مگر سچ اور اپنے لالچ و ہوس کو چھپانے کے لیے اس کی بے حساب غلطیوں کا سلسلہ جاری تھا...

مصلحت کی بساط بچھا کر اپنی مرضی کے مہروں کی بدلتی چالوں کا کھیل......

بائیک کھڑی کرنے کے بعد اس نے اطمینان سے اپنی کلائی پر بندھی سستی سی گھڑی پر وقت دیکھا تو پونے نو بج رہے تھے۔ وہ آفس پندرہ منٹ قبل آ گیا تھا۔ اس نے جب سے اس کمپنی میں جاب کی تھی، وہ روزانہ تقریباً اس وقت تک آفس پہنچ جاتا تھا۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا تھا جب وہ آفس دیر سے پہنچا ہو۔

اس کا نام سمیع تھا، اسمارٹ اور خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا جسم توانا اور چُست تھا۔ ہر ایک کے ساتھ مسکرا کر

بات کرتا تھا۔ اس کے اندر ایک خاصیت یہ تھی کہ وہ دوسرے کے دل میں بہت جلدی گھر کر لیتا تھا۔ اپنے ساتھ کام کرنے والے اسٹاف کے ساتھ سمیع کی کسی کے ساتھ زیادہ اور کسی سے کم دوستی ہو چکی تھی۔

اس کے گھر اور آفس کا فاصلہ تقریباً ایک گھنٹے تھا۔ والدین شہر سے دور ایک ایسے علاقے میں رہتے تھے جو کبھی گاؤں ہوا کرتا تھا۔ وقت بدلنے اور ترقی ہونے سے وہ گاؤں شہر کی طرح کا ضرور ہو گیا تھا لیکن اس کی پہچان وہی ایک گاؤں کی ہی تھی۔ آبادی بڑھ جانے اور نئی سوسائٹیز وجود میں آنے سے وہ گاؤں شہر سے ہی جاملا تھا۔

جب سمیع کو اس کمپنی میں نوکری ملی تھی تو اس کے پاس آفس تک پہنچنے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ بس تھی۔ وقت پر پہنچنے کے لیے اسے بہت صبح سویرے گھر سے نکلنا پڑتا تھا۔ اس کا کام دیکھتے ہوئے ایک دن کمپنی کے مالک صابر بیگ نے اسے نئی موٹر سائیکل خرید دی تھی۔

صابر بیگ کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ وہ آفس میں اچھی طرح سے تیار ہو کر آتا تھا۔ اس کی ناک پر غصہ یوں براجمان ہو جاتا تھا جیسے مکھی کچھ دیر کے لیے اُڑ کر جائے اور پھر ناک پر بیٹھ جائے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کمپنی میں کام کرنے والے لوگوں کا خیال تھا کہ باس غصے کا تیز ضرور ہے لیکن وہ اپنے اسٹاف کا خیال بھی کرتا ہے۔ صابر بیگ کا کسی کے ساتھ نرم رویہ اختیار کر لینے کے پیچھے کیا راز تھا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

جب سمیع کو نئی بائیک ملی تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ وہ اور بھی دل جمعی سے کام کرنے لگا۔ جب کبھی اس کا باس اس پر برہم ہوتا تو وہ اسے نظر انداز کر دیتا تھا۔

سمیع سیڑھیاں چڑھ کر تیسرے فلور پر واقع اپنے آفس پہنچا تو اس کی سانس پھول چکی تھی۔ لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے اسے سیڑھیوں سے جانا پڑتا تھا۔ حسبِ معمول اس نے سب کے ساتھ سلام دعا کی۔ ہلکی پھلکی باتیں ہوئیں اور وہ اپنی میز پر چلا گیا۔

صابر بیگ اپنے معمول کے مطابق آفس پہنچا۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا کہ لنچ کے بعد صابر بیگ نے سمیع کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس وقت اس کے کمرے میں کمپنی کے کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے اور ہر ایک کے آگے ایک فائل کھلی ہوئی تھی۔ شاید ان کے درمیان کوئی میٹنگ ہوئی تھی۔

سمیع اندر گیا تو کرسی خالی ہونے کے باوجود صابر بیگ نے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا اور خفگی سے بولا۔ ”آج کل تمہارا دھیان کس طرف ہے؟“

سمیع چونکا۔ ”میرا دھیان سر کام کی طرف ہے۔“

”خاک کام کرتے ہو تم۔“ صابر بیگ ایک دم سے دہاڑا اور اپنے سامنے پڑی فائل کو اُٹھا کر اپنے دائیں جانب براجمان منیجر کی طرف پھینک دی۔ ”اسے بتاؤ کہ اس کا دھیان کام کی طرف کتنا ہے۔“

منیجر نے تھوک نگل کر پہلے اپنا گلا تر کیا اور اس کے بعد بولا۔ ”یہ بل تم نے بنایا تھا؟“

سمیع نے جھک کر فائل کی طرف دیکھا۔ اس کی مشکوک سی نگاہیں ابھی فائل پر مرکوز ہی تھیں کہ منیجر نے فائل ایک طرف ہٹا دی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا، وہ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

”یہ بل تم نے کیسے بنایا تھا؟“

”میں فائل دوبارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ سمیع نے کہا۔ صابر بیگ نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور اپنے غصے کو دبانے کے لیے اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔

منیجر پھر بولا۔ ”کتنی بار فائل دیکھو گے۔ یہ کام تم ہی کرتے ہو اور تمہارے ہاتھ کا ہی کیا ہوا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس بل کو بنانے میں تم نے کتنی بڑی غلطی کی تھی؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن بس مجھے ایک بار ٹھیک سے فائل دکھا دیں۔“ سمیع کو شک تھا کہ جو بل فائل میں لگا ہے، وہ اس نے نہیں بنایا تھا۔

اس بار منیجر کے بولنے سے قبل صابر بیگ دہاڑا۔ ”تمہارے اس ایک بل کی وجہ سے مجھے کئی ہزار کا نقصان ہو گیا ہے اور تم جواب دینے کے بجائے ڈرامے بازی کر رہے ہو۔“

”سر میں اپنا کام ٹھیک سے کرتا ہوں۔“ سمیع بولا۔

”ہم سب غلط ہیں؟ تمہارے سامنے وہ بل موجود ہے جو تم نے بنایا اور مجھے ہزاروں کا نقصان ہو گیا اور کہہ رہے ہو کہ میں کام ٹھیک سے کرتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت میرے دفتر سے نکلو، میں تم کو نوکری سے فارغ کر رہا ہوں۔ مجھے تم جیسا جاہل نہیں چاہیے۔“ صابر بیگ کی آواز بلند تھی اور سب کے سامنے جس حقارت سے صابر بیگ نے سمیع کو جاہل کہا تھا، وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت لفظ تھا۔ وہ لفظ سیدھا اس کے دل پر کسی تیر کی طرح پیوست ہو گیا تھا۔

سمیع نے ایک نظر وہاں پر موجود ہر فرد کی طرف دیکھا جو اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سمیع کو لگا جیسے وہ سب اس کا مذاق اُڑا رہے ہوں۔

''یہ بل میں نے نہیں بنایا۔'' کچھ دیر خاموش اور سب کا جائزہ لینے کے بعد سمیع نے کہہ دیا۔

''بکواس بند کرو..... کمینے انسان..... دفع ہو جاؤ اور آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا..... اور اس بات کو غنیمت جانو کہ میں تم کو صرف نوکری سے نکال رہا ہوں ورنہ تم سے اپنا نقصان پورا کرا کے جانے دیتا۔'' صابر بیگ جس کا نام صابر ضرور تھا لیکن اس کے اندر صبر کرنے کا ذرہ برابر بھی عنصر نہیں تھا۔ وہ غصے سے آنکھیں نکال کر ایسے چیخ رہا تھا جیسے ابھی وہ سمیع کو جان سے مار دے گا۔

اس وقت آفس میں جو لوگ موجود تھے، وہ اس کی طرف مسلسل دیکھ رہے تھے اور ان سب کے سامنے سمیع کو اپنی بہت تذلیل محسوس ہو رہی تھی۔

ناچار سمیع نے جانے کے لیے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس کا دل گھائل ہو چکا تھا اور وہ خون کے آنسو اس لیے رو رہا تھا کہ اسے ایک ایسے کام کی پاداش میں ذلیل کر کے نکالا جا رہا ہے جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اس کے خلاف آفس کے لوگوں میں سے کسی نے سازش کی تھی۔

سمیع دروازہ کھول کر باہر نکلا اور جونہی وہ اپنی میز کے پاس گیا اور بیگ اُٹھایا ہی تھا کہ اس کے پیچھے ہی صابر بیگ بھی نکل آیا تھا، وہ ایک دم دہاڑا تو سمیع نے چونک کر اپنے عقب میں دیکھا وہ غصے میں کھڑا چلّا رہا تھا۔

''میں نے جو تم کو بائیک دی تھی، اس کی چابی اس میز پر رکھو اور دفع ہو جاؤ، آئندہ مجھے اپنی یہ ذلیل شکل مت دکھانا۔''

سمیع نے ہال نما کمرے میں موجود اسٹاف کی طرف دیکھا، وہ سب اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کے باس نے ان سب کے سامنے بھی اسے ذلیل کر دیا تھا۔

سمیع نے اپنی جیب سے بائیک کی چابی نکالی اور چپ چاپ دروازے کی طرف چلا گیا۔

صابر بیگ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ دروازے کے پاس جا کر چوکیدار سے بولا۔ ''یہ بندہ آئندہ نظر آئے تو اسے گولی مار دینا.....''

سمیع رکا اور چاہتا تھا کہ وہ اسی وقت اپنے باس کا گریبان پکڑ کر اسے کھینچ کر باہر نکال لے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس بات کو بھی برداشت کر کے باہر نکل گیا۔

باس بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اور وہاں موجود اسٹاف ایک دوسرے سے سوالیہ نگاہوں سے پوچھ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہوا ہے؟

☆☆☆

سمیع کے جیسے سارے سپنے ٹوٹ گئے ہوں۔ اُس کا دل ایک ایسے درد سے بھر چکا تھا جو اسے بدستور مضطرب کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ چکی تھیں۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ اچانک کیا ہو گیا ہے؟ جو بل فائل میں لگا تھا اُسے دیکھتے ہی پہلی نظر میں اسے شک پڑ گیا تھا کہ وہ اس نے نہیں بنایا ہے۔

صابر بیگ نے جس طرح سے اسے تذلیل کر کے اپنے اسٹاف کے سامنے بغیر اس کی کوئی بات سنے، آفس سے نکالا تھا، وہ اس کے لیے وہ خنجر کے وار تھے جس نے اس کا جسم زخموں سے چُور کر دیا تھا۔

سمیع اپنی سوچوں میں خراماں خراماں چلتا جا رہا تھا۔ وہ اردگرد سے بے نیاز تھا۔ اچانک اس کے کان میں ایک نسوانی آواز پڑی۔

''ایکسکیوز می......''

سمیع سوچوں میں غوطہ زن تھا۔ کان میں وہ لفظ پڑنے کے باوجود اس نے کوئی توجہ نہیں دی اور اپنے حال میں چلتا رہا۔

ایک بار پھر وہی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟''

اس بار سمیع کے قدم رک گئے، اس نے گھوم کر اپنے عقب میں دیکھا۔ ایک نئی گاڑی کے پاس ایک عورت کھڑی تھی جس کی عمر پینتیس سال سے زیادہ تھی۔ وہ پُرکشش اور خوب صورت تھی اور اس نے قیمتی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ سمیع نے پہلے اس عورت کا جائزہ لیا اور پھر بادلِ ناخواستہ بولا۔

''جی میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' سمیع کے لہجے میں مکمل اداسی تھی۔

''میری کار کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔ کیا آپ ٹائر بدل دیں گے؟'' عورت نے جھجکتے ہوئے کہا۔

سمیع نے پنکچر ٹائر کی طرف دیکھا اور پھر اس عورت پر نظر گئی۔ وہ پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا اور اس وقت سوائے اس کام کے کہ اپنے باس کا گلا دبا دے، کوئی دوسرا کام کرنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے باوجود سڑک کے کنارے کھڑی بے بس عورت کی مدد کے لیے اس کا دل آمادہ ہو گیا۔

اس نے اپنے کندھے پر لٹکا ہوا آفس بیگ اتار کر

گاڑی کی چھت پر رکھا اور آستین چڑھانے کے بعد بولا۔ ''مجھے ٹائر کھولنے کا سامان دیں۔''

عورت نے ڈکی سے سامان نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ سمیع نے ٹائر کھولا اور خود ڈکی سے دوسرا ٹائر نکال کر لگایا اور پنکچر ٹائر اُٹھا کر ڈکی میں رکھا اور باقی سامان سمیٹ کر اس نے ڈکی بند کی اور اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنے ہاتھ صاف کرنا ہی چاہتا تھا کہ جانے کب اس عورت نے کار سے پانی کی بوتل نکال لی تھی اور بولی۔

''میں آپ کے ہاتھ دُھلا دیتی ہوں۔''

عورت نے پانی کی بوتل سے سمیع کے ہاتھ دُھلائے پھر اس نے ہاتھ اپنے رومال سے صاف کیے اور اپنا بیگ گاڑی کی چھت سے اُٹھا کر جانا ہی چاہتا تھا کہ وہ عورت ممنون نظروں سے بولی۔

''شکریہ...... میری مدد کرنے کا شکریہ۔''

''کوئی بات نہیں۔'' سمیع نے متانت سے کہہ کر قدم اُٹھایا۔

''اگر آپ کو اسی طرف جانا ہے تو میں آپ کو لفٹ دے سکتی ہوں۔'' عورت نے پیشکش کی۔

سمیع کے قدم پھر رک گئے۔ اس نے سوچا جانے یہ عورت کون ہے۔ لفٹ دینے کے بہانے وہ اس کے لیے کوئی نیا مسئلہ کھڑا کردے اور وہ راہ چلتے ایک اور مشکل میں پھنس جائے...... سمیع نے اس کی پیشکش کو شکریہ کے ساتھ رد کرنے کا سوچا ہی تھا کہ دوسرا خیال اس کے دماغ میں آیا، جو بُرا آفس میں اس کے ساتھ ہو چکا ہے، اس سے زیادہ اور کیا بُرا ہوگا......

سمیع نے عورت کی طرف دیکھا۔ ''اگر تکلیف نہ ہو تو مجھے ڈاک خانہ روڈ تک جانا ہے۔''

''میں بھی اسی طرف جارہی ہوں۔ آپ بیٹھ جائیں۔'' عورت ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ سمیع کار کی طرف بڑھا اور اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا ہی تھا کہ عورت نے کہا۔ ''آپ آگے اس سیٹ پر آجائیں۔''

سمیع کو کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے پچھلا دروازہ بند کیا اور عورت کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ عورت نے کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے ڈیش بورڈ پر لگے موبائل فون کے اسٹینڈ پر اپنا موبائل فون لگایا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی۔

دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی۔ اس خاموشی کو اس عورت نے توڑا۔ ''آپ کہیں نوکری کرتے ہیں؟''

''نوکری کرتا تھا...... ابھی کچھ دیر پہلے ذلیل کر کے نکالا گیا ہوں۔'' سمیع نے بلا تامل جواب دیا۔ اس کی نگاہیں سامنے تھیں۔

عورت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟''

سمیع نے زہر آلودی مسکراہٹ کے ساتھ اس عورت کی طرف دیکھا۔ ''کوئی اپنی ذلت کے بارے میں جھوٹ کیوں بولے گا؟ اس وقت میرا دل بھرا ہوا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ چیخ چیخ کر لوگوں کو وہ سب بتاؤں جو میرے ساتھ میرے باس نے کیا ہے۔''

''مجھے افسوس ہے...... آپ تو شائستہ لہجے کے مالک ہیں۔ پوچھ سکتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟'' عورت کے لہجے میں ایک بار پھر جھجک تھی۔

''اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں ہے۔ بس اچانک وہ ہوگیا جس کی میں نے کبھی امید بھی نہیں کی تھی...... جس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور جو میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔'' سمیع کو پھر سے وہ لمحات یاد آنے لگے تھے اور اس کے اندر کی بے چینی اس کے چہرے پر تاثرات بن کر ابھرنے لگی تھی۔ اس عورت نے اس کا جائزہ لیا اور کچھ پوچھنے کے لیے سوال کرنا ہی چاہتی تھی کہ اس کے موبائل فون پر بیل ہونے لگی۔ سمیع کی نگاہیں بدستور سامنے تھیں۔ عورت نے موبائل کو اسٹینڈ میں ہی لگا رہنے دیا اور اس کا اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز اُبھری۔ اس آواز میں بہت مٹھاس تھی اور وہ آواز جونہی سمیع کی سماعت میں پڑی، وہ چونکا۔

''کہاں ہو میری ڈارلنگ......؟''

''میں گھر جارہی ہوں۔'' عورت نے جواب دیا۔

''ابھی راستے میں ہو کیا؟'' دوسری طرف سے سوال ہوا۔

''ہاں...... دراصل کار کا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا۔'' عورت نے بتایا۔

''ٹائر تم نے خود بدلا......؟ مجھے کال کردیتیں، میں کسی کو بھیج دیتا۔'' دوسری طرف سے آواز میں پریشانی عیاں تھی۔

''میں نے کال کی تھی، آپ شاید مصروف تھے اس لیے میں نے کسی سے مدد لے لی تھی۔'' عورت نے جواب دیا۔

"ہاں میں مصروف تھا۔ ابھی کال دیکھی تو تمہیں کال کی۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "تم ٹھیک ہو نا۔"

"ہاں میں ٹھیک ہوں اور گھر پہنچ کر کال کرتی ہوں۔" عورت نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

سمیع ان دونوں کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور وہ مضطرب بھی تھا۔ جونہی ان دونوں کی باتیں ختم ہوئیں، اس نے پوچھا۔

"یہ آواز تو میرے باس جیسی تھی...... شاید میں غلط بول گیا ہوں۔ اب وہ میرا باس نہیں ہے۔ مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ یہ آواز اس شخص جیسی تھی جس نے مجھے ذلیل کر کے اپنے آفس سے نکالا ہے۔"

"آپ کا باس کون تھا؟" اس نے سوال کیا۔

"اس کا نام صابر بیگ ہے...... یہ آواز اس جیسی تھی۔" سمیع نے اس کا نام ایسے لیا جیسے اس نے منہ میں کڑوی گولی لے لی ہو۔

جونہی اس نے کہا، اس عورت نے کار کی رفتار آہستہ کی اور سڑک کی ایک جانب کھڑی کر کے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "یہ صابر بیگ ہی تھا۔"

سمیع چونکا۔ "وہ آپ کا شوہر ہے؟"

"نہیں......" عورت نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات عیاں ہوئے تھے۔

"اس سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" سمیع نے کچھ توقف کے بعد پوچھ ہی لیا۔

"زبردستی کا تعلق ہے۔" اس کا چہرہ تلخ ہو گیا۔ "وہ تعلق جو ایک آزاد انسان اور پنجرے میں بند پرندے کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" سمیع اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میرا نام روبینہ ہے لیکن سبھی مجھے عاشی کہتے ہیں۔" اس نے اپنا نام بتانے کے بعد کچھ توقف کیا اور جیسے اس نے کچھ سوچا ہو۔ "اگر آپ پسند کرو تو یہاں قریب ہی میرا گھر ہے وہاں چل کر اس بارے میں بات کر لیتے ہیں...... اگر آپ چاہو تو......"

سمیع کے لیے سب کچھ جیسے بے معنی سا ہو گیا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

وہ گھر بہت بڑا نہیں تھا۔ دو بیڈ روم، اٹیچڈ باتھ، ایک ڈرائنگ روم، ٹی وی لاؤنج، کچن اور گیراج تھا۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ قرینہ ہر طرف دکھائی دے رہا تھا۔

سمیع گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ دونوں اس وقت ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ عاشی اپنا بیگ اور موبائل فون ایک طرف رکھ چکی تھی۔ اس نے سمیع کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"چائے پینا چاہو گے یا کافی......؟"

سمیع گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایسا خوب صورت گھر وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ جس گھر میں وہ رہتا تھا، وہ پرانے انداز کا بنا ہوا تھا۔ عاشی کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

"چائے......"

"میں کافی بھی اچھی بناتی ہوں۔" عاشی مسکرائی۔

"چائے ہی ٹھیک ہے۔" سمیع کہتا ہوا ایک طرف بیٹھ گیا۔ عاشی کچن میں چلی گئی۔ سمیع سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں تک آ تو گیا ہے، یہاں اگر صابر بیگ آ گیا تو ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ لیکن سمیع کو اب کسی نتیجے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ نوکری سے اچانک ہاتھ دھونے کے بعد وہ پرندے سے جدا ہوئے اس پر کی طرح تھا جو اب ہوا کے رحم و کرم پر تھا۔

عاشی دو کپ چائے کے لے آئی تھی۔ ایک کپ اس نے سمیع کی طرف بڑھا دیا۔ سمیع نے چائے کا کپ لیا اور اپنی سائڈ میز پر رکھ دیا تھا۔

عاشی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور کپ ایک طرف رکھ کر پوچھا۔ "کب سے صابر بیگ کے پاس نوکری کر رہے تھے؟"

"زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا......" سمیع نے مختصر جواب دیا۔

"کسی کو کھڑے کھڑے اچانک ذلیل کر کے نوکری سے صابر بیگ ہی نکال سکتا ہے۔ وہ ظالم ہے۔ اُس کے دل میں دل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔" عاشی کا لہجہ پھر تلخ سا ہو گیا۔

"آپ صابر بیگ کے پنجرے میں کیوں قید ہیں؟" سمیع کی مشتاق نگاہیں اس کی طرف مرکوز تھیں۔

عاشی نے چائے کا کپ اُٹھایا اور ایک ساتھ دو تین گھونٹ لینے کے بعد کپ اسی جگہ رکھا اور کہا "تم اپنے آفس میں کام کرنے والے ایک شخص نصیر احمد کو جانتے ہو؟"

"ہاں جانتا ہوں۔ وہ ریکارڈ روم میں ہوتے تھے۔ بہت اچھے انسان تھے اور سب کے ساتھ ان کا رویہ بہت دوستانہ ہوتا تھا۔" سمیع نے بتایا۔

عاشی نے انکشاف کیا۔ "وہ میرے والد تھے۔"

عاشی کے اس انکشاف نے سمیع کو چونکا دیا۔ ''نصیر احمد آپ کے والد تھے؟''

''ہاں...... میں اُن کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ان کے بعد صابر بیگ نے جیسے مجھ پر قبضہ کرلیا ہو اور مجھے اس چھوٹے سے گھر سے اُٹھا کر اس گھر میں لا بٹھایا اور ہر آرائش مجھے دی۔ صابر بیگ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب تک شاید وہ مجھ سے شادی بھی کر چکا ہوتا لیکن وہ مناسب وقت دیکھ رہا ہے۔ اس کی پہلی بیوی بھی ہے۔'' عاشی نے بتانے کے بعد چائے کا کپ اُٹھایا اور دو گھونٹ لینے کے بعد ایک طرف رکھ دیا۔ ''اب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ مناسب وقت آگیا ہے اور وہ مجھ سے جلدی شادی کرلے گا۔''

''آپ اُس سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟''

''میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے کہ میں بھاگ جاؤں۔ یہاں سے بھاگ کر کہاں جاؤں...... کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے سوچا ہے کہ اس چھت کو چھوڑ کر کئی بھیڑیوں کی خوراک بننے سے بہتر ہے کہ اس ایک بھیڑیے کا نوالہ بن جاؤں...... لیکن اب تم اچانک ملے ہو تو ایک امید سی پیدا ہوئی ہے اس سے چھٹکارا پانے کی......''

''کیسی امید......؟''

''کیا تم جانتے ہو کہ نصیر احمد کی موت کیسے ہوئی تھی؟'' عاشی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آفس میں خبر ملی تھی کہ رات کو انہیں قتل کر دیا تھا۔ وہ گھر میں اکیلے تھے۔'' سمیع بولا۔

''میں تبھی گھر میں موجود تھی۔ بیل ہوئی تو ابا دروازے پر گئے اور جونہی انہوں نے دروازہ کھولا، آنے والے نے گولی ان کے سینے میں اتار دی تھا۔ اس کے بعد پولیس آئی تفتیش ہوئی اور سب کچھ وقت کی دھول میں دفن ہو گیا......'' عاشی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''ہم نے بھی ایسا ہی سنا تھا۔'' سمیع نے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ میرے ابا کو قتل صابر بیگ نے ہی کرایا تھا کیونکہ اس کی مجھ پر اچھی نگاہ نہیں تھی۔'' عاشی نے کہا تو سمیع اس کی طرف خاموشی سے دیکھنے لگا۔ اچانک خاموشی میں اس وقت بھونچال آگیا جب تیز بیل ہوئی اور دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''اس وقت کون آگیا ہے......'' عاشی اپنی جگہ سے اُٹھی اور کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ جونہی اس نے تھوڑا سا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا وہ خوفزدہ ہوگئی اور سمیع کے قریب آکر سرگوشی کی۔

''باہر صابر بیگ ہے۔ جلدی سے اپنا بیگ اُٹھاؤ اور اس کمرے میں آجاؤ۔'' عاشی کے پورے جسم میں بے چینی دوڑ گئی تھی۔ سمیع نے اپنا بیگ اُٹھایا اور اس کے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔ اس کا چائے کا کپ اسی جگہ پڑا رہ گیا تھا۔

وہ کمرا بیڈ روم نہیں تھا۔ اس کمرے میں ایک پرانا صوفہ پڑا تھا اور پوری دیوار پر نصب ایک الماری تھی۔

''تم یہاں صوفے کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ اپنا موبائل فون سائیلنٹ پر لگا دو اور باہر مت نکلنا۔ صابر اس کمرے میں نہیں آئے گا۔'' عاشی نے عجلت میں کہہ کر کمرے سے باہر نکلنے سے قبل لائٹ آف کر دی اور اندھیرا ہو گیا۔ صابر نے اپنا بیگ صوفے کے پیچھے رکھا اور اس کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا جس پر پردے گرے ہوئے تھے اور وہ کھڑکی ٹی وی لاؤنج کی طرف کھلتی تھی۔ سمیع نے تھوڑا سا شیشہ کھول کر رخنہ ڈال دیا تھا۔

ایک بار پھر تیز بیل ہوئی تھی۔ عاشی دروازے کی طرف دوڑی اور اس نے دروازہ کھولا تو سامنے صابر بیگ کھڑا تھا۔

''دروازہ کھولنے میں بہت دیر لگا دی تم نے۔'' صابر بیگ اندر آتا ہوا بولا۔

''میں کمرے میں تھی۔'' عاشی نے جواب دیا۔ وہ دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے چلتی ہوئی لاؤنج تک پہنچی۔

''میں آفس میں فارغ بیٹھا تھا۔ سوچا تمہاری خیریت دریافت کرلوں کہ تم ٹھیک سے گھر پہنچ گئی ہو۔''

''مجھے کیا ہوا تھا؟ ٹائر پنکچر ہو گیا تھا وہ کسی نے بدل دیا اور میں گھر آگئی۔'' عاشی کے لہجے سے ایسا عیاں تھا کہ جیسے اسے صابر بیگ کی اس وقت آمد ناگوار لگی ہو۔

صابر بیگ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ مجھے تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔ مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ تمہاری کار کا ٹائر پنکچر ہوا اور تم کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا میں بھاگتا ہوا آگیا۔''

''مہربانی ہے آپ کی۔'' عاشی نے کہا۔ ''آپ بیٹھیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''مجھے ابھی جانا ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہارے لیے ڈرائیور کا بھی انتظام کر دیتا ہوں۔ آئندہ تم کو ایسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' صابر بیگ نے کہا۔

''مجھے ڈرائیور کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی کے ساتھ کہیں نہیں جاسکتی۔'' عاشی نے صاف انکار کر دیا اور اس

دوران اس کی نگاہ سمیع کے چائے کے کپ کی طرف چلی گئی۔

صابر بیگ اس کی طرف مزید بڑھا۔ عاشی پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔ ”میں نے ایک بات کہی تھی آپ سے۔“

”کونسی بات؟“ اس کے قدم رک گئے۔

”آپ کو مجھ سے ملنا ہو تو کہیں باہر بلا لیا کریں۔ اس طرح میرے گھر نہ آیا کریں۔“ عاشی کا لہجہ سپاٹ تھا۔

صابر بیگ کو اس کی بات اچھی نہیں لگی۔ وہ اسے دیکھنے لگا اور پھر چلتا ہوا اس کرسی پر بیٹھ گیا جہاں کچھ دیر قبل عاشی بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ کرسی کے ساتھ ہی تپائی پر چائے کا کپ بھی پڑا تھا۔

”ہم اسی ہفتے شادی کر لیں گے۔ اور اب میں ایک ہفتہ تم سے صرف فون پر ہی بات کیا کروں گا۔ تم شادی کی تیاری کرو تمہارے اکاؤنٹ میں پیسے بھیج دوں گا۔“ صابر بیگ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ ”میں چلتا ہوں......“ وہ کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کے قدم رک گئے۔

وہ واپس آیا اور اس کرسی کے پاس رک گیا جہاں سمیع بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کا کپ رکھا تھا۔ اس نے چائے کے کپ کی طرف غور سے دیکھا۔ ”یہ چائے تم پی رہی تھیں؟“

”ہاں۔“ عاشی نے جواب دیا۔

صابر بیگ نے اس کرسی کی طرف دیکھا جہاں وہ ابھی کچھ دیر قبل بیٹھا تھا۔ ”مجھے لگا تھا کہ اس کرسی کے ساتھ بھی ایک کپ رکھا ہے۔“

عاشی ایک طرف ہٹ گئی۔ ”یہاں چائے کا کوئی کپ نہیں ہے۔“

صابر بیگ نے اس تپائی کی طرف دیکھا وہاں چائے کا کپ نہیں تھا۔ جب صابر بیگ جانے کے لیے دروازے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا تو عاشی نے سرعت سے وہ کپ اٹھا کر ایک طرف رکھے گلدان کے پیچھے رکھ دیا تھا۔

صابر بیگ شش و پنج میں کھڑا رہا اور پھر مسکرایا۔ ”پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگا۔“

صابر بیگ نے پیار بھری مسکراہٹ سے عاشی کی طرف دیکھا... اور ہاتھ ہلا کر باہر چلا گیا۔ اس کے باہر قدم رکھتے ہی عاشی نے دروازہ اندر سے مقفل کیا اور سکون کی سانس خارج کرتے ہوئے وہ کمرے کی طرف گئی اور لائٹ آن کرنے کے بعد سمیع کو باہر آنے کا کہا۔

سمیع اپنے کندھے پر بیگ لٹکائے اس کے سامنے ٹی وی لاؤنج میں کھڑا تھا۔

عاشی بولی۔ ”تم ابھی جاؤ۔ کیا تم مجھے اپنا موبائل نمبر دے سکتے ہو؟“

سمیع نے اسے اپنا موبائل نمبر دیا تو عاشی نے بھی اسے اپنا نمبر دے دیا اور بولی۔ ”رات کو اس نمبر پر میں کال کر سکتی ہوں۔“

”ہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟“

”کیسی مدد؟“

”یہ میں تم کو دوسری ملاقات میں بتاؤں گی۔ رات کو کال کروں گی کہ ہم کل کہاں مل سکتے ہیں۔“ عاشی سوچتے ہوئے بولی۔

”آپ کام کے بارے میں بات کرنا چاہیں تو ابھی کر سکتی ہیں۔“ سمیع جاننا چاہتا تھا۔

”ہم دونوں ایک ہی سانپ کے ڈسے ہوئے ہیں۔ اگر تم میرا ایک کام کر دو تو ہم اس سانپ کو کچل سکتے ہیں۔“

”میں اسے کچلنا چاہتا ہوں۔“ سمیع کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”میرا خیال ہے کہ ابھی بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ میرے اعصاب پر صابر سوار ہے۔ اس کا اس طرح اچانک آنا میرے لیے پریشانی کا باعث بن گیا ہے۔ جب چاہتا ہے کسی نہ کسی بہانے منہ اٹھا کر آ جاتا ہے۔“ عاشی کے لب و لہجے میں بے چینی تھی۔

”آپ پرسکون ہو جائیں۔ رات کو ہم کل کی ملاقات طے کر لیں گے۔“ سمیع نے کہا۔

عاشی تیزی سے دروازے کے پاس گئی اور اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر دائیں بائیں دیکھا، دونوں طرف کی گلی سنسان تھی۔ اس نے سمیع کو اشارہ کیا کہ وہ جلدی سے نکل جائے۔

سمیع باہر نکلا اور ایک طرف چلنے لگا۔ دو گلیاں گزرنے کے بعد وہ سیدھا مین روڈ کی طرف چلا گیا اور سڑک کنارے کھڑا ہو کر کسی سواری کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک رکشا آیا اور وہ اس میں بیٹھ کر چلا گیا۔

سمیع اس بات سے بالکل ہی بے خبر تھا کہ جب وہ عاشی کے گھر سے نکلا تھا تو کچھ دور جاتے ہی ایک شخص جس نے منہ پر ماسک لگایا ہوا تھا، اس کے پیچھے چلنے لگا تھا اور

اس وقت تک وہ اس سے کچھ فاصلے پر اس پر نظر رکھے کھڑا رہا تھا جب تک وہ رکشا میں سوار ہو کر چلا نہیں گیا تھا۔

☆☆☆

رات ہو گئی تھی۔ سمیع نے گھر میں کسی پر بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کے ساتھ آج آفس میں کیا ہوا تھا اور وہ پھر سے بے روزگار ہو گیا ہے۔ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد چھت پر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا اور وہ اس انتظار میں تھا کہ عاشی کی کال آئے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ سمیع کے دماغ سے صابر بیگ کی باتیں محو نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے کوئی راستہ ملے اور وہ صابر بیگ سے ان باتوں کا بدلہ لے سکے، اس لیے اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ عاشی کا ساتھ دے گا۔

سمیع چھت پر ٹہلتا رہا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے کہ اس کے موبائل پر میسج ٹون ابھری۔ اس نے جلدی سے موبائل فون کی اسکرین کی طرف دیکھا تو عاشی کی طرف سے ایک میسج تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''صبح ساڑھے نو بجے ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم کے پاس پہنچ جانا۔''

سمیع نے اس ایک لائن کو تین چار بار پڑھا اور اس کا دل چاہا کہ وہ عاشی کو کال کر کے پوچھے کہ اس نے اس جگہ اسے کیوں بلایا ہے......؟ اس نے کال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ صبح اس جگہ ٹھیک وقت پر پہنچنے کا ارادہ کرتے ہوئے نیچے چلا آیا۔

☆☆☆

سمیع مقررہ وقت سے ٹھیک پانچ منٹ قبل ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم پہنچ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس دفتری بیگ بھی تھا اور اس نے جیکٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ موسم سرد اور دھوپ ہلکی تھی۔ کسی ٹرین کا انتظار تھا اور پلیٹ فارم مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔

سمیع کو عاشی کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ ایک پُرکشش عورت لانگ کوٹ پہنے، آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے اس کی طرف ہی آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکا میک اپ تھا جس سے وہ اور بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دینے لگی تھی۔ سمیع اسے دیکھتا رہ گیا۔.. اور وہ جیسے اس کے حصار میں مقید سا ہو گیا ہو۔

عاشی اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بولی۔

''میرے پیچھے آ جاؤ۔''

عاشی اسی رفتار سے چلتی رہی اور سمیع اس کے پیچھے ہو لیا۔ کچھ آگے جا کر ایک طرف دیوار کے ساتھ لگی بینچ پر عاشی بیٹھ گئی۔ سمیع بھی اس کے ساتھ کچھ فاصلے پر براجمان ہو گیا۔

''ہم زیادہ دیر اس جگہ نہیں بیٹھ سکتے اس لیے میں مطلب کی بات کروں گی۔'' عاشی کا چہرہ سامنے تھا اور اس کی آنکھیں سیاہ چشمے میں چھپی ہوئی تھیں۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' سمیع نے کہا۔

''میرا یقین ہے کہ میرے والد نصیر احمد کو صابر بیگ نے ہی قتل کرایا تھا۔'' عاشی کا لہجہ دھیما تھا۔ ''میں جب بھی اس خبیث کو اپنے سامنے دیکھتی ہوں، میرا خون کھولنے لگتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ میں اسے جان سے مار دوں۔''

''وہ شخص نفرت کے ہی قابل ہے۔'' سمیع نے کہا۔

''تم اس سے نفرت کرتے ہو؟'' پہلی بار عاشی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر گردن سیدھی کر لی۔

''میں اس سے اتنی نفرت کرتا ہوں جس کی شاید اب کوئی حد نہیں ہے۔ اس نے مجھے پورے اسٹاف کے سامنے ذلیل کیا تھا۔'' سمیع نے دانت پیس کر کہا۔ اس کا لہجہ دھیما لیکن درشت تھا۔

''ہم دونوں کے انتقام کی منزل ایک ہی ہے۔ تم میرا ساتھ دو تو ہم اس کا وجود مٹا سکتے ہیں۔''

''میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔''

''کیا تم میرے ساتھ ہو؟''

''میں اس شخص سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے دشمنوں سے بھی مل سکتا ہوں......''

''تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔ اس کام کے لیے شاید تمہیں کچھ دن لگ جائیں۔ گھر کہہ دینا کہ تم کمپنی کے کام سے چند دنوں کے لیے شہر سے باہر جا رہے ہو۔'' عاشی نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم کبیر کو نہیں بھولے ہو گے؟''

کبیر کا نام سنتے ہی سمیع کی آنکھوں کے سامنے اس کا چہرہ آ گیا۔ جب سمیع کی نوکری نئی تھی اور اسے چند دن ہی ہوئے تھے تو اس کی ملاقات کبیر سے ہوئی تھی۔

کبیر کے چہرے پر ہلکی داڑھی اور چھوٹی مونچھیں تھیں۔ وہ ہنس مکھ نوجوان تھا اور اکثر جینز اور جیکٹ میں آفس آتا تھا۔ اس کی ہر ایک کے ساتھ اچھی دوستی تھی۔

کبیر کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات دوپہر کے کھانے پر ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات ہی ایسی تھی کہ دونوں جیسے سالوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ دونوں کے قہقہے ایک ساتھ گونجے تھے اور اس کے بعد تو وہ دونوں ایک دوسرے

کے بہت قریب ہو گئے تھے۔

کبیر نے بتایا تھا کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے، اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ اور باتیں بھی سمیع کو بتائی تھیں، جو اس کی ذاتی تھیں اور اس نے اس سے قبل کسی کو نہیں بتائی تھیں۔

پھر اچانک کبیر غائب ہو گیا۔ وہ ایسا غائب ہوا جیسے وہ کبھی اس آفس میں کام ہی نہیں کرتا تھا، اس کا وجود ایک خواب بن گیا۔ آفس میں چند دن اس کے بارے میں باتیں ہوتی رہی تھیں اور رفتہ رفتہ وہ باتیں دم توڑ گئی تھیں۔

سمیع اس کے لیے سب سے زیادہ فکر مند تھا۔ اس نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس شہر میں اکیلا رہتا تھا۔ کبیر کو تلاش کرنے کے کچھ اور راستے بھی تھے لیکن سمیع کی نوکری حائل تھی۔

وقت کے ساتھ کبیر کی گمشدگی کا معما دھول میں گم ہو گیا لیکن اس کے باوجود سمیع کے دل و دماغ میں اس کا خیال آتا ہی رہتا تھا۔

عاشی کہنے لگی۔ ”یہ اُس رات کی بات ہے جب میں اپنے والد کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ کبیر ہمارے گھر آ گیا۔ اس نے آہستہ آواز میں ابا سے کوئی بات کی اور ابا اسے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ دونوں اس کمرے میں بیس منٹ تک رہے اور کب کبیر چلا گیا تو ابا مجھے پریشان اور بے چین دکھائی دیے۔ میں نے اس کی وجہ جاننی چاہی تو ابا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“ عاشی چپ ہو گئی اور سمیع اس کے بولنے کا مزید انتظار کرنے لگا۔

کچھ توقف کے بعد وہ پھر بولی ”تھوڑی دیر کے بعد ابا نے مجھے کہا کہ میں تیار ہو جاؤں وہ مجھے منہ اندھیرے لے کر نکل جائیں گے اور مجھے دور دوسرے شہر میں اپنی بہن کے گھر چھوڑ آئیں گے۔ میں ابا کی بات سن کر پریشان ہو گئی۔ اس بارے میں جاننا چاہا کہ انہوں نے اچانک ایسا فیصلہ کیوں کیا ہے لیکن ابا نے مجھے اس کی وجہ نہیں بتائی۔“

عاشی چپ ہو گئی۔ ٹرین آ گئی تھی۔ وہاں کھڑے مسافروں میں ہلچل مچ گئی تھی۔ عاشی نے سلسلہ کلام جوڑا۔

”ابھی ہم سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ بیل ہوئی۔ ابا نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ کسی نے اندھیرے میں پستول کی گولی ان کے سینے میں اتاری اور وہاں سے بھاگ گیا۔ ابا چیخے، میں ان کی طرف دوڑی اور ابا نے میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔“

عاشی کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے وہ نمی صاف کی اور سمیع کی طرف دیکھا جو حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کبیر نے انہیں کوئی بات بتائی تھی اور ابا مجھے اس شہر سے دور لے جانا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم کوئی قدم اُٹھاتے، ابا قتل ہو گئے۔ کبیر کے پاس کوئی راز تھا۔ جو اس نے ابا کو بتایا تھا۔ میرے ابا تو قتل ہو گئے لیکن انہوں نے کبیر کو بھی نہیں چھوڑا اور وہ گم ہو گیا، یا اسے گم کر دیا گیا۔ اب اگر کبیر مل جائے تو ہم صابر بیگ کی گردن پکڑ سکتے ہیں......“

ایک بار پھر سمیع کی آنکھوں کے سامنے کبیر کی شکل گھومنے لگی۔ اگر اس کی نوکری مانع نہ ہوتی تو سمیع کو یقین تھا کہ وہ اپنے دوست کبیر کو تلاش کر سکتا تھا۔ عاشی کے بتانے کے مطابق صابر بیگ ہی ایک ایسا کردار تھا جس نے کبیر کو یا تو مروا دیا ہوگا، یا پھر اس نے اسے کہیں قید کر رکھا ہوگا۔ یقیناً کبیر کے پاس صابر بیگ کے کچھ ایسے راز ہوں گے جس کی بنیاد پر اس نے کبیر کو منظر سے ہٹا دیا تھا۔

”میں کبیر کو تلاش کر سکتا ہوں۔ میں اسے تلاش کروں گا۔“ ایک دم سے سمیع نے مصمم ارادے سے کہا۔

عاشی مسکرائی۔ ”مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔ ایک تم ہی ہو جو اسے تلاش کر سکتے ہو۔“

”میں کبیر کو شاید بہت پہلے تلاش کر لیتا۔ لیکن اس کام میں میری نوکری چلی جاتی۔“

”اب تمہیں نوکری کی کوئی فکر نہیں ہے۔ تم یہ کام کر سکتے ہو۔“ عاشی نے ایک بار پھر پورے یقین سے کہا۔

”وہ میرا اچھا دوست تھا۔ مل گیا تو وہ سب کچھ بتا دے گا اور پھر صابر بیگ سے اپنی بے عزتی کا ایسا بدلہ لوں گا کہ وہ موت کی آخری سانس تک یاد رکھے گا۔“ سمیع کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

عاشی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور دوسرے لمحے معدوم ہو گئی۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک لفافہ نکالا اور دونوں کے درمیان جو خالی جگہ تھی، وہاں رکھ دیا۔

”یہ لفافہ اُٹھا لو۔“ وہ بولی۔

”اس میں کیا ہے؟“ سمیع نے ایک نظر لفافے کی طرف دیکھا۔

”اس میں کچھ رقم ہے۔ کبیر کی تلاش میں کام آئے گی۔ رقم کی مزید ضرورت پڑے تو تم میرے نمبر پر ایک میسج لکھو گے اور اس پر صرف وہ ہندسہ لکھو گے جتنی تمہیں ضرورت ہوگی...... تم کہیں بھی ہوئے رقم مل جائے گی۔ اب

ہمیں چلنا چاہیے۔ بس ایک بات کہوں گی میں صابر بیگ سے اپنی زندگی بھی بچانا چاہتی ہوں اور اپنے باپ کا انتقام بھی...... مجھے مایوس مت کرنا۔'' عاشی کہہ کر اُٹھی اور سمیع کی کوئی بات سنے بغیر چلی گئی۔ مسافر ٹرین میں سوار ہو چکے تھے اور جن کی منزل آ گئی تھی وہ اتر گئے تھے۔ اب پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا۔

سمیع اُٹھا اور وہ لفافہ اُٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ کر ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ ایک شخص اس کا تعاقب کرتا ہوا اسٹینڈ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور جب سمیع اس جگہ سے چلا گیا تو وہ بھی دوسری طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

سمیع نے گھر جاتے ہی سب سے پہلے وہ لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس کے اندر پانچ ہزار کے نوٹ تھے۔ وہ پورا ایک لاکھ روپیہ تھا۔ سمیع نے وہ نوٹ لفافے میں رکھے اور اس کے دماغ میں کچھ نئی سوچوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ ان سوچوں کا جواب اس کے پاس نہیں تھا لیکن سوالوں کا انبار اسے مضطرب ضرور کرنے لگا تھا۔

سمیع ایک بار پھر گھر سے نکلا اور پیسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیے۔ اس نے محض ضرورت کے پیسے اپنے پاس رکھے تھے۔ پرس میں اس کا اے ٹی ایم کارڈ موجود تھا اس لیے وہ کہیں سے بھی پیسے نکال سکتا تھا۔

اسی دن اس نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ وہ کمپنی کے کام سے دوسرے شہر جا رہا ہے اور چند دن وہ اسی شہر میں رہے گا۔ اس نے ضرورت کا سامان بیگ میں رکھ لیا۔

دوسرے دن اسے صبح ناشتے کے بعد نکلنا تھا۔ بیگ کندھے پر لٹکا کر وہ گھر سے نکلا اور سیدھا اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا۔ اپنا بیگ اس کے پاس رکھوانے کے بعد اب اس کا رخ ایک پرانے محلے کی طرف تھا۔

وہ محلہ پہلی سیڑھی تھی جس پر قدم رکھ کر کبیر کی تلاش کا آغاز ہونا تھا۔ جب کبیر غائب ہوا تھا تو سمیع نے متعدد بار کوشش کی تھی کہ وہ اس محلے میں جا کر اس کا سراغ لگائے...... لیکن باوجود کوشش کے وہ جا نہیں سکا تھا اور چند دن کے بعد ہی اپنی دفتری مصروفیت کے سبب کبیر کو تلاش کرنے کا خیال اس کے دل و دماغ میں کہیں دفن ہو گیا تھا۔

اس محلے میں سمیع پہلے بھی دو بار کبیر کے ساتھ جا چکا تھا۔ وہاں ایک پان کی دکان تھی اور اس... دکان کا مالک، کبیر کا دوست تھا۔ وہ بھی ان کا تقریباً ہم عمر ہی تھا۔ کبیر کی اس کے ساتھ اچھی دوستی تھی۔ کبیر نے اس کا تعارف کراتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ، یہ سمیع ہے اور میرا بھائی ہے......

جب سمیع اس گلی میں داخل ہوا اور بازار کی طرف گیا تو اس کی دکان سامنے تھی۔ دور سے ہی کبیر کا دوست خالد اپنی دکان پر نظر آ گیا تھا۔ جونہی وہ اس کے پاس گیا، خالد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پہلی ہی نظر میں پہچان کر ہنستے ہوئے بولا۔

''ارے تم...... ہفتوں بعد شکل دکھا رہے ہو؟''

''کوشش تو کئی بار کی تھی کہ تم سے ملاقات کروں لیکن مصروفیت ہی ایسی آڑے آئی کہ ملاقات ہو نہیں سکی۔'' سمیع بھی مسکرایا۔

دونوں نے ایک دوسرے سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور خالد نے سمیع کو دکان کے اندر ہی ایک اسٹول پر بٹھا دیا۔ کاؤنٹر پر گاہک کھڑے تھے، وہ ان کو بھی نمٹا رہا تھا۔

''کیسی چل رہی ہے دکان داری۔'' سمیع نے پوچھا۔

''زبردست۔''

''میں نے تمہیں... اپنا فون نمبر دیا تھا، تم نے بھی کبھی کال نہیں کی۔'' سمیع نے کہا۔

''صبح گیارہ بجے آتا ہوں اور رات کے دو اور کبھی کبھار تین بھی بج جاتے ہیں۔ ملازم بس ابھی آتے ہی ہوں گے۔ پان سگریٹ کی دکان کا کام ہی ایسا ہے کہ باہر قدم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' خالد کے ہاتھ پان کے پتے پر بھی چل رہے تھے۔

اس دوران اس کا ایک ملازم آ گیا تو خالد نے کام اس کے سپرد کیا اور خود سمیع کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''بوتل کھولوں یا چائے پیو گے؟''

''مجھے کچھ نہیں کھانا پینا...... دفتر سے چھٹی تھی اس لیے آج تم سے ملنے کا ارادہ کیا ہوا تھا...... کبیر نہیں آیا کبھی......؟'' سمیع نے باتوں باتوں میں سوال کر دیا۔

خالد کے چہرے پر سنجیدگی ابھری۔ ''وہ تو ایسا غائب ہوا ہے کہ پھر اس کی شکل نہیں دکھائی دی۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں چلا گیا؟''

''ایک ہی شہر ہے جہاں وہ جا سکتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ اس شہر میں چلا گیا تھا تو مجھ سے کبھی رابطہ کیوں نہیں کیا۔ اس کا فون اسی دن سے بند ہے۔''

''کس شہر گیا ہے؟'' سمیع نے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

''یاد کرو ہم دونوں اسی جگہ بیٹھے تھے اور اس نے اپنی

محبوبہ کا نام لیا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اس کے پاس چلا جائے گا اور اس سے شادی کر لے گا۔'' خالد نے کہا۔

''ہاں مجھے یاد آیا اس نے ایسا کہا تھا۔ اگر وہ اس شہر چلا گیا ہے اور اس نے شادی کر لی ہے تو رابطہ تو کرنا چاہیے تھا۔''

''یہی میں سوچ رہا ہوں۔''

''کچھ معلوم ہے کہ اس کی محبوبہ اس شہر میں کہاں رہتی تھی؟'' سمیع نے کہا۔

''کبیر نے اس شہر کے ایک کاروباری پلازا کا نام لیا تھا، بہت مشہور تھا۔ اس میں اسٹار نام کی کمپنی کا آفس تھا۔ وہ لڑکی وہاں کام کرتی تھی......'' خالد نے ایک بار پھر ماضی کا ورق اُلٹا۔ سمیع کی سوچوں پر پڑی گرد ایک دم سے ایسے ہٹی جیسے اسے پھونک مار کر اُڑایا گیا ہو۔ سب کچھ اسے یاد آ گیا۔

''کبھی پتا کرایا اس شہر میں؟''

''کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔''

''آج میرے پاس فرصت ہے۔ ایک بار اس جگہ پتا کر کے آؤں؟'' سمیع نے کہا۔

''یہ تمہاری بہت بڑی نیکی ہوگی۔ وہ ہم دونوں کا دوست تھا اور دوست بھی ایسا کہ جس کا جگر ہیرے کا ہے۔''

''میں ایک بار اس شہر سے ہو کر آتا ہوں لیکن تم اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔''

''ایسا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' خالد کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

سمیع اُٹھا اور بغل گیر ہونے کے بعد جانے لگا تو ایک لمحے کے لیے رکا اور اسے کونے میں لے جا کر آہستہ سے کہا۔ ''کبیر نے کبھی تم سے کوئی ایسی بات کی تھی کہ جس سے تم کو اندازہ ہوا ہو کہ وہ شہر چھوڑ کر غائب ہو جانا چاہتا ہے......''

''بس یہی بات کہ وہ اپنی محبوبہ سے شادی کر لے گا۔ غائب ہونے اور رابطہ نہ کرنے کی کبھی اس نے بات نہیں کی تھی۔'' خالد نے جواب دیا۔ اس کی بات سن کر سمیع کچھ دیر خاموش رہا اور پھر سر ہلاتا ہوا اجازت لے کر اس کی دکان سے چلا گیا۔ جب وہ اس گلی سے نکل کر ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے رکشے میں سوار ہوا تو تب بھی اس سے کچھ فاصلے پر ایک شخص کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمیع کے گھر سے لے کر یہاں تک اس کے تعاقب میں تھا۔

☆☆☆

سمیع ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔

ٹرین آنے میں کچھ وقت تھا۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا ہجوم دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ سمیع کے دماغ میں اس وقت بھی کچھ سوال چیونٹیوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ ان سوالوں میں اس پر ایک جنون سا سوار تھا کہ اسے صابر بیگ سے اپنی تذلیل کا انتقام لینا ہے۔

ٹرین آئی اور جونہی رکی، مسافروں میں ہلچل برپا ہو گئی۔ جب اترنے والے اتر گئے اور سوار ہونے والے ٹرین میں داخل ہو گئے اور ٹرین نے جانے کے لیے تیز وسل بجائی اور پھر جیسے ہی وہ رینگنے لگی، سمیع اطمینان سے اُٹھا اور ٹرین کی طرف جانے لگا۔

سمیع رینگتی ہوئی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ اُس کے پاس ٹکٹ نہیں۔ وہ متلاشی نظروں سے خالی سیٹ دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور جیسے ہی اسے ایک سیٹ خالی دکھائی دی، وہ اس پر بیٹھ گیا۔

ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور اس نے شہر چھوڑ دیا تھا۔ مسلسل سفر میں تین گھنٹے گزارنے کے بعد ٹرین جب اس شہر کے پلیٹ فارم پر پہنچی جس شہر میں سمیع اپنے دوست کبیر کی تلاش میں آیا تھا تو اس کے اندر ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا۔

سمیع ٹرین سے اتر کر باہر نکلا اور ایک رکشے والے کو اس پلازا کا نام بتایا اور اندر بیٹھ گیا۔

وہ پلازا شہر کے کاروباری مرکز میں واقع تھا۔ اس میں بڑی بڑی کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ کئی منزلہ پلازا کو دیکھ کر سمیع کی آنکھیں خیرہ رہ گئی تھیں۔ وہ اندر گیا اور اس کمپنی کے استقبالیہ پر پہنچ گیا۔ وہاں کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ ایک لڑکی براجمان تھی۔

''میرا نام سمیع ہے اور مجھے فاخرہ فضل سے ملنا ہے۔'' سمیع نے اس لڑکی کے پاس جا کر شائستہ لہجے میں کہا۔ کبیر نے اپنی محبوبہ کا یہی نام بتایا تھا۔

لڑکی نے بلا تامل بتایا۔ ''انہوں نے شادی کے بعد جاب چھوڑ دی ہے۔''

''مجھے ان سے ضروری ملنا تھا۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کہاں مل سکتی ہیں؟'' سمیع کو ایک دھچکا سا لگا۔

''ایم سوری ان کے ساتھ ہمارا کوئی رابطہ نہیں ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ اس دوران آفس بوائے آ گیا اور وہ لڑکی کے لیے لائی ہوئی چائے کا کپ ٹھیک کر کے اس کے سامنے رکھنے لگا۔

''مجھے ان کا وہ پتا مل سکتا ہے جہاں وہ شادی سے

پہلے رہتی تھیں؟'' سمیع نے اس کی طرف دیکھا۔
''ایم سوری ہم ان کا وہ ایڈریس نہیں دے سکتے۔'' لڑکی نے اسی لہجے میں مسکراتے ہوئے انکار کیا۔
''ایک ایمرجنسی ہے۔'' سمیع نے منت کرنے کے انداز میں کہا۔
''سوری......'' لڑکی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر تھی۔
آفس بوائے جا چکا تھا۔ سمیع کے چہرے پر مایوسی سی آگئی۔ وہ اتنا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ کبیر کی محبوبہ مل جاتی تو کبیر تک پہنچنا آسان ہو جاتا۔
سمیع کچھ دیر بیٹھا اور اُٹھ کر بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکلا ہی تھا کہ اس کے عقب سے ایک آواز آئی۔
''سر، مدد چاہیے؟''
سمیع نے اسی وقت گھوم کر اپنے عقب میں دیکھا۔ آفس بوائے کھڑا تھا۔ سمیع کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔
''ہاں مجھے فاخرہ کا پتا چاہیے۔'' سمیع بولا۔
''ان کے گھر سے کھانا لاتا رہا ہوں۔ گھر کا پتا بتانا مشکل نہیں ہے۔'' اس نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر خارش کی تو اس کی بات کو سمجھتے ہوئے اسی وقت سمیع نے اپنے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے نوٹ پکڑ کر دائیں بائیں دیکھا اور اسے جیب میں ٹھونس کر، اسی ہاتھ سے اپنی جیب سے ایک پرچی نکال کر سمیع کی طرف بڑھا دی۔ ''جب آپ میڈم سے بات کر رہے تھے تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا آپ میرے پاس ہی آؤ گے۔ اس پرچی پر مکمل پتا لکھ دیا ہے۔ پانچ بجے وہ آفس سے نکلتی ہیں۔ پارکنگ میں وہ گاڑی کھڑی ہوگی جس میں وہ روز آتی ہیں۔ اس گاڑی کا نمبر لکھ دیا ہے۔ بس اس گاڑی کے پاس کھڑے ہو جایئے گا۔''
اس نے دھیمے انداز میں بات کی۔ سمیع نے پوچھا۔
''اگر آج وہ اپنی گاڑی پر نہ آئی تو کیسے تلاش کروں گا؟''
''وہ گاڑی پر ہی آتی ہیں۔'' وہ کہہ کر ایک طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بہت سے کام ہیں۔''
وہ لڑکا چلا گیا۔ سمیع نے وہ پرچی کھول کر دیکھی اور پتا پڑھا۔ ساتھ گاڑی کا نمبر بھی لکھا تھا۔ سمیع کے قدم لفٹ کی طرف اُٹھ گئے۔

☆☆☆

فاخرہ کا دفتر اس جگہ سے محض دس منٹ کی دوری پر تھا۔ ایک بڑی عمارت کے سامنے وسیع کار پارکنگ تھی۔ سمیع ترتیب میں لگی کاروں کے نمبر دیکھتا ہوا آگے چل رہا تھا۔ ایک گاڑی کے پاس پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ وہی نمبر تھا جس کی اسے تلاش تھی۔
سمیع نے دائیں بائیں دیکھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک درخت تھا اور اس درخت کے نیچے لکڑی کی بینچ رکھی تھی۔ سمیع اس بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے وقت دیکھا ابھی ایک گھنٹے سے زیادہ وقت تھا۔
سمیع نے کچھ دور چائے کا کھوکھا دیکھا اور وہ وہاں چلا گیا۔ چائے پینے اور وہاں وقت گزارنے کے بعد وہ پھر اسی جگہ آگیا۔ ساڑھے پانچ بجے ایک خوبصورت لڑکی چلتی ہوئی کار کے پاس آئی اور اس نے آٹومیٹک لاک کھولا ابھی اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ سمیع اس کے پاس پہنچ کر شائستہ لہجے میں بولا۔
''معاف کیجیے گا مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔''
فاخرہ نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک اجنبی کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں سوالیہ نشان ابھرا۔
''جی فرمایئے۔''
''میرا نام سمیع ہے اور میں کبیر کا دوست ہوں۔''
سمیع نے دیکھا کہ کبیر کا نام سنتے ہی وہ چونکی اور دوسرے ہی لمحے اس نے کہا ''کون کبیر......؟''
''کبیر نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے اس کی تلاش ہے۔ مجھے پتا چلا کہ آپ نے اس سے شادی کرلی ہے۔ میں کبیر سے ملنا چاہتا ہوں۔'' سمیع بولا۔
فاخرہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے کہا ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں کسی کبیر کو نہیں جانتی۔''
فاخرہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور اس نے دروازہ بند کرلیا۔ سمیع نے دیکھا تھا کہ فاخرہ کا چہرہ پریشان سا ہو گیا تھا۔
سمیع آگے بڑھا۔ اس نے کار کے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ وہ سمیع کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے کار بیک کی اور اس جگہ سے چلی گئی۔ سمیع جاتی ہوئی کار کو دیکھتا رہا۔ فاخرہ نے ایک بار بیک مرر سے سمیع کو کھڑا دیکھا اور نظریں ہٹالیں اور اس وقت فاخرہ کو یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ دو آدمیوں نے پیچھے سے آکر سمیع کو قابو کرلیا تھا۔ سمیع اپنے آپ کو چھڑانے کی مزاحمت کر رہا تھا اور فاخرہ اس جگہ سے دور جا چکی تھی۔

☆☆☆

جب فاخرہ نے گھر پہنچ کر اپنا پرس ایک طرف رکھا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز تھی اور گھبراہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ فریج کے پاس گئی اور پانی کی بوتل نکال کر اس کا ڈھکن کھولا اور دو گھونٹ لے کر ڈھکن بند کر کے بوتل فریج میں رکھ کر جونہی وہ گھومی تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اس سے کچھ فاصلے پر ناصر کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فاخرہ اپنے ڈر پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا......“

”کیا بات ہے۔تم نے کبھی بوتل سے منہ لگا کر پانی نہیں پیا؟ ہمیشہ گلاس سے پیتی ہو۔“ ناصر کا لہجہ دھیما مگر پُراسرار سا تھا۔

”گلا خشک ہو رہا تھا۔بس جلدی میں پی لیا؟“ فاخرہ نے بہانہ کیا۔

”کیا یہی وجہ ہے؟“ ناصر کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور لہجہ سرد تھا۔

”اور...... کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ فاخرہ نے اس جگہ سے ہٹنا چاہا۔ ناصر ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔

”اس کی وجہ کہیں وہ لڑکا تو نہیں جو آج تم سے ملا تھا...... جب تم اپنے آفس سے باہر نکلی تھیں......؟“ ناصر کی بات نے فاخرہ کو ششدر کر دیا۔

فاخرہ نے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ پتا پوچھ رہا تھا۔“

”کس کا پتا پوچھ رہا تھا......؟“ ناصر نے سوال کرنے کے بعد فاخرہ کی طرف دیکھتے ہوئے توقف کیا اور اچانک بولا۔ ”کبیر کا......؟“

کبیر کا نام سنتے ہی فاخرہ کا دل زور سے دھڑکا۔ ایک عجیب سا خوف اس کو اپنے حصار میں لینے لگا تھا۔ اپنے اندر کی کیفیت کو اس نے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور اس جگہ سے جانا چاہا تو ناصر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”چوبیس گھنٹے میری نگاہ تم پر ہے......“ یہ کہہ کر ناصر نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور فاخرہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اسی دوران ناصر کے فون پر کال آئی۔ اس نے ہیلو کہہ کر دوسری طرف کی بات سنی اور پھر اتنا کہہ کر فون کال منقطع کر دی۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

☆☆☆

وہ دونوں سمیع کو گاڑی میں ڈال کر ایک مکان پر لے گئے تھے۔ وہ مکان گنجان آبادی میں تھا۔ اس محلے کی گلیاں

تنگ تھیں۔ سمیع کی پسلیوں پر انہوں نے پستول لگایا ہوا تھا، اس لیے اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔

وہ مکان صاف ستھرا تھا اور بہت بڑا نہیں تھا۔ سمیع کے ساتھ کمرے میں ایک آدمی ہی آیا تھا۔ دوسرا آدمی باہر رک گیا تھا۔

''مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''ابھی پتا چل جائے گا۔'' اس آدمی نے اطمینان سے جواب دیا اور ایک طرف پڑے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''تم اس کمرے میں چلو پھیرو، بیٹھو لیکن کوئی ایسی حرکت مت کرنا جس سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے......''

سمیع اس کا جائزہ لیتا رہا اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں خاموشی کا راج رہا۔ سمیع نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ کسی کا انتظار ہو رہا ہے، اس کے آنے پر ہی معاملہ سامنے آسکتا تھا۔ سمیع کے لیے وہ صورتِ حال غیر متوقع تھی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ناصر آگیا۔ اس کو دیکھتے ہی وہ آدمی کھڑا ہو گیا۔ اس نے آتے ہی سمیع کو دیکھنا شروع کر دیا۔ سمیع بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' ناصر نے پوچھا۔

''مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟'' سمیع نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

''جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔'' ناصر کو اس کے سوال پر غصہ آگیا۔

سمیع نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ''میرا نام سمیع ہے۔''

''فاخرہ سے کیا بات کر رہے تھے؟ تم کو کبیر نے بھیجا ہے؟'' اس کے اچانک سوال نے سمیع کو سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

''میں کبیر کی تلاش میں یہاں آیا ہوں......''

''اوہ...... تم کبیر کی تلاش میں آئے ہو اور فاخرہ کو ڈھونڈ بھی لیا۔ تمہارا کبیر کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

''وہ دوست ہے میرا...... ہم کولیگ بھی تھے۔''

''صابر بیگ کی کمپنی میں؟'' ناصر کا لہجہ اب نرم ہو گیا تھا۔

''ہاں۔'' سمیع نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ نصیر احمد کو کس نے قتل کیا تھا۔ سنا ہے کہ اس میں صابر بیگ کا ہاتھ تھا؟'' ناصر نے کریدا۔

''اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا......''

ناصر نے طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''بے چارہ نصیر احمد...... مفت میں ہی مارا گیا اور کنوارا ہی اس دنیا سے چلا گیا......'' ناصر زیرِ لب مسکرایا۔

اس کی بات سے جیسے سمیع کو جھٹکا لگ گیا ہو۔ اس نے ششدر نگاہوں سے ناصر کی طرف دیکھا۔

''نصیر احمد غیر شادی شدہ تھا......؟ اس کی تو بیٹی ہے عاشی......'' حیرت میں غوطہ زن سمیع کے منہ سے سوال نکلے۔

''عاشی...... اس کی بیٹی ہے؟'' ناصر کہنے کے بعد ہنسنے لگا۔ سمیع متحیر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے اس کی ہنسی زہر لگ رہی تھی۔ وہ مضطرب ہو گیا۔

ناصر کی ہنسی تھمی تو وہ سمیع کی طرف جھک کر بولا۔ ''عاشی شاطر عورت ہے اور صابر بیگ کے لیے کام کرتی ہے۔ جب بھی کوئی کام صابر نے لینا ہوتا ہے، وہ عاشی کو اسکرپٹ تھما کر اپنا کام نکلواتا ہے اور اسے رقم دے کر اس وقت تک اس کی طرف رخ نہیں کرتا جب تک اسے کوئی اگلا کام نا پڑ جائے۔''

ناصر کے اس انکشاف نے سمیع کو دم بخود کر دیا۔ اس کا چہرہ حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا اور نگاہیں ناصر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''تم ایسا کرو، مجھے ساری بات بتاؤ۔ عاشی اور صابر بیگ کی حقیقت میں کھولتا ہوں۔'' ناصر کہہ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

پہلے تو سمیع سوچتا رہا کہ وہ کچھ بتائے، یا خاموش رہے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا اور اس دن کا سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔ البتہ اس نے اس بات کو مخفی رکھا تھا جو عاشی نے اسے پیسے دیے تھے۔

ناصر اس کی بات کو اطمینان سے سنتا رہا۔ جب وہ چپ ہوا تو اس نے متانت سے کہا ''دیکھو دوست...... یہ سب ایک منصوبہ بندی کے تحت ہوا ہوگا اور یہ بات میں سو فیصد یقین سے کہتا ہوں۔ پہلے اپنے آفس والوں کے سامنے تمہیں صابر نے ذلیل کر کے نکالا اور آگے اسی راستے میں تمہیں عاشی مل گئی اور اس کے بعد جو اس نے کہانی سنائی وہ محض اس لیے تھی کہ تم اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے پہلے ہی پُرجوش تھے، اس نے اپنی باتوں سے تمہاری سوچوں کو مزید قابو کر کے اس بات پر اکسایا کہ تم کبیر کو تلاش کرو کیونکہ وہ اس کے باپ کے قاتل کو جانتا ہے۔''

ناصر چپ ہوا تو سمیع نے جلدی سے پوچھا ''یہ سب کرنے کی اُن کو کیا ضرورت تھی؟''

''کبیر کو تم ہی تلاش کر سکتے ہو۔ کیونکہ وہ تمہارا دوست تھا اور تمہارے ساتھ اس نے اپنی باتیں شیئر کی تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ بھی ہے کہ کبیر کو تلاش کرنے کے لیے کسی اور کا سامنے آنا ٹھیک نہیں تھا۔ کیونکہ کبیر کو تین بندے تلاش کر رہے ہیں اور تینوں ایک دوسرے کے آدمیوں کو جانتے ہیں...... تمہارے ذریعے کبیر کی تلاش محفوظ ہو سکتی ہے...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ کبیر جوئے میں ایک بڑی رقم ہار کر اور صابر بیگ کے دو کروڑ لے کر فرار ہوا ہے......''

ناصر کی اس بات نے سمیع کو مزید حیرت کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ ناصر نے اپنا سلسلہ کلام جوڑا۔ ''صابر بیگ اپنے دو کروڑ اور، جواری اپنی رقم کے لیے کبیر کو تلاش کر رہے ہیں......''

سمیع نے اس کی بات کاٹ کر فوراً پوچھا۔ ''اور وہ تیسرا کون ہے جو کبیر کو تلاش کر رہا ہے۔''

''وہ تیسرا فاخرہ ہے، جو اس سے سچی محبت کرتی ہے اور اسے یقین ہے کہ کبیر ایسا نہیں ہے۔ وہ اس کے انتظار میں ہے......''

''فاخرہ نے تو شادی کر لی ہے۔'' سمیع نے پھر بات کاٹی۔

''فاخرہ نے شادی نہیں کی ہے۔ اس نے فرم بدل لی ہے اور ہم فاخرہ کو اپنی نظر میں چوبیس گھنٹے رکھے ہوئے ہیں۔ کبیر اگر کسی سے ملنے آ سکتا ہے تو وہ فاخرہ ہے۔''

''آپ کون ہو؟'' سمیع نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کچھ توقف کے بعد بتایا۔ ''میں وہ جواری ہوں جس کے پاس کبیر اسّی لاکھ روپے ہارا ہے...... اسّی لاکھ روپے اور وہ بھی ایک ہی رات میں...... کبیر نے دو کروڑ صابر کا اُٹھایا اور فرار ہو گیا۔ بے وقوف نے مجھے اسّی لاکھ روپیہ دے کر اپنی جان نہیں چھڑائی......''

سمیع کے لیے وہ تمام انکشافات حیران کن تھے۔ کبیر نے اپنی کچھ برائیوں کا ذکر سمیع سے کیا تھا لیکن اس نے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ جُوا بھی کھیلتا ہے۔ اس لیے وہ خود بھی اس بات پر تذبذب کا شکار تھا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ گہرا سکوت ناصر نے توڑا۔ ''ہم کھل کر کبیر کو تلاش نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے پولیس کے ساتھ سو معاملات ہوتے ہیں اور ہمیں پس پردہ رہنا پڑتا ہے۔ تم میرے ساتھ مل جاؤ اور اسے تلاش کرو۔ بدلے میں، میں صابر بیگ کو جو تم چاہو گے وہ سزا دوں گا کہ وہ تم سے معافی مانگنے پر مجبور ہو جائے گا۔'' ناصر نے پیشکش کرنے کے بعد اپنی سوالیہ نگاہیں سمیع کے چہرے پر جما دیں۔

سمیع کے لیے وہ سب باتیں حیران کن تھیں۔ سب باتوں سے قطع نظر اس کے دماغ میں ایک بات نے قدم جما لیے تھے کہ وہ کسی طرح سے فاخرہ سے ملے۔ اگر وہ فاخرہ کو اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ کبیر کو کسی مفاد کے بغیر تلاش کر رہا ہے تو فاخرہ اس کی مدد ضرور کرے گی اور فاخرہ یہ بھی جانتی ہوگی کہ کبیر کہاں ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' سمیع کی طویل خاموشی کو دیکھ کر ناصر نے پوچھا۔

''میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔'' سمیع نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''کیا شرط ہے؟''

''تم صابر بیگ سے بدلہ لو گے۔''

''مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔'' اس نے بغیر ہچکچاہٹ کے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس بات کی کیا گرانٹی ہے کہ تم صابر بیگ سے میرا بدلہ لو گے؟ کیونکہ جیسے ہی میں کبیر کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوا تم اسے لے کر رفو چکر ہو جاؤ گے۔'' سمیع نے کہا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' ناصر نے سوچنے کے بعد پوچھا۔

''جب میں کہوں کہ کبیر کو میں نے تلاش کر لیا ہے تو تم صابر اور عاشی کو وہ سزا دو گے جو میں کہوں گا۔ اس کے بعد میں کبیر تمہارے حوالے نہیں کروں گا بلکہ تمہارے اسّی لاکھ روپے دلوانے کے بعد کبیر کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔'' سمیع نے کہا۔

اس کی ساری بات اطمینان سے سننے کے بعد ناصر مسکرایا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک آنکھ دبائی پھر سمیع کی طرف رخ کرتے ہی بولا۔ ''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مجھے اسّی لاکھ سے غرض ہے، کبیر میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

سمیع نے اثبات میں سر ہلایا اور ناصر نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ سمیع کو آزاد کر دیں۔ جاتے ہوئے ناصر نے اپنے ایک ساتھی سے جو دروازے کے پاس کھڑا تھا، دھیمی آواز میں کہا۔

''جونہی یہ کبیر کو تلاش کر کے اطلاع دے، کسی بھی طرح اس تک پہنچ کر کبیر کو اپنے قبضے میں کر کے اسے گولی مار دینا۔''

☆☆☆

بظاہر فاخرہ چائے کے کپ میں چمچ گھمارہی تھی لیکن اس کی سوچیں اسے اپنے ساتھ لے کر کہیں دور نکل گئی تھیں۔ اس کے اداس اور کھوئے ہوئے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ چند مہینوں کے بعد کسی نے آکر اسے بتایا تھا کہ وہ کبیر کا دوست ہے۔ جب سمیع نے اسے یہ کہا تھا تو اس کے جسم میں جیسے بجلی دوڑنے لگی تھی، وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ نظروں کی قید میں ہے۔ سمیع سے بات کرنا اس کے لیے سوہانِ روح بن سکتا ہے۔

فاخرہ کو وہ شام یاد آگئی تھی جب اچانک کبیر کی کال آئی تھی اور اس نے اسی وقت اس سے ملنے کا کہا تھا۔

کبیر نے اسے جس جگہ بلایا تھا، شہر کا وہ حصہ تھا جس کے ایک طرف مچھلی بازار اور دوسری طرف بہت بڑی لنڈے کی مارکیٹ تھی۔ وہاں بہت زیادہ رش ہوتا تھا اور بیٹھنے کے لیے کوئی ایسی مناسب جگہ بھی نہیں تھی۔ ریسٹورنٹ اس جگہ سے کافی دور تھا۔

فاخرہ کو حیرانی ہوئی لیکن وہ اس وقت سوالوں میں الجھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسی وقت مچھلی بازار کی طرف چلی گئی۔

ٹیکسی سے اتر کر وہ پیدل ہی مچھلی بازار تک گئی تھی۔ اس کی متلاشی نگاہیں کبیر کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس وقت اچھا خاصا رش تھا اور بہت سے ٹرک کھڑے تھے جن سے مچھلی کے بڑے بڑے بکس اتر رہے تھے۔

فاخرہ چل رہی تھی کہ اچانک کبیر اس کے سامنے آگیا۔ کبیر کو دیکھتے ہی وہ مسکرادی تھی۔

''ادھر چلتے ہیں۔'' کبیر اس کو ایک طرف لے گیا۔ وہ ہجوم سے نکل کر کچھ فاصلے پر چلے گئے اور ایک بند دکان کے باہر بنے تھڑے کو کبیر نے اپنے رومال سے صاف کیا۔ اور فاخرہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

فاخرہ بیٹھی تو ساتھ ہی کبیر بھی بیٹھ گیا۔ فاخرہ نے پوچھا۔ ''تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ اپنا شہر چھوڑ آیا ہوں۔'' کبیر نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''شہر کیوں چھوڑ آئے ہو۔ تم تو وہاں نوکری کرتے تھے؟'' اس کی بات سن کر فاخرہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''نوکری بھی چھوڑ دی ہے۔''

''نوکری کیوں چھوڑ دی؟'' فاخرہ کو اور بھی حیرت ہوئی۔

''اپنا کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔''

''اپنا کاروبار کرنے کے لیے سرمایہ ہے؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''سرمائے کا انتظام کر کے آیا ہوں۔ تم بھی نوکری چھوڑ دو اور ہم دونوں یہ شہر چھوڑ کر ایک دوسرے شہر چلتے ہیں، وہاں شادی کریں گے، نئے کاروبار کا آغاز کر کے اپنی دنیا بسالیں گے۔'' بات کرتے ہوئے کبیر کی نگاہیں مسلسل دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔

''اس شہر میں کیا مسئلہ ہے۔ یہ بڑا شہر ہے۔ یہاں کاروبار کرتے ہیں اور اسی شہر میں اپنی دنیا بساتے ہیں۔'' فاخرہ نے کہا تھا۔

''ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔''

''یہاں کیوں نہیں رہ سکتے؟'' فاخرہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسے کبیر کے چہرے میں پریشانی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

کبیر چپ ہوگیا اور پھر بولا۔ ''ہم دونوں کا اس دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہتا...... دراصل......'' کبیر کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نگاہیں بازار کے ہجوم پر تھیں۔

''دراصل کیا......؟'' فاخرہ پریشان ہوگئی۔

کبیر مضطرب ہوگیا۔ اس کی نگاہیں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔ فاخرہ اس کی طرف دیکھ کر اور بھی پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوا ہے...... تم پریشان ہوگئے ہو؟''

''تم یہاں سے جاؤ...... میں تم سے رابطہ رکھوں گا......'' کبیر کھڑا ہوگیا۔

''بات کیا ہے...... مجھے بتاؤ...... کیا بات ہے؟'' فاخرہ بھی کھڑی ہوگئی اور وہ بھی دائیں بائیں دیکھنے لگی۔

''ابھی میں نے اسے دیکھا ہے...... وہ یقیناً اپنے آدمیوں کو بلانے گیا ہے...... تم یہاں سے نکلو اور میں تم سے رابطہ رکھوں گا...... اپنی وہ سم چھپا کر رکھنا......'' کبیر کی نگاہیں مسلسل دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔

''تم مجھے کچھ بتاؤ گے......'' فاخرہ کی پریشانی آسمان کو چھونے لگی تھی۔

''وہ مجھے جان سے مارنا چاہتا ہے...... میری جان کو

مقتول وفا

خطرہ ہے...... تم نکلو جلدی جاؤ۔'' کبیر نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ فاخرہ اس کے ساتھ رکنا چاہتی تھی۔ کبیر نے یہ بتا کر کہ اس کی جان کو خطرہ ہے...... فاخرہ کو اس بات نے دہشت زدہ کر دیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس جگہ سے جانے کے لیے ایک طرف چلی گئی۔ کبیر اسی جگہ کھڑا رہا تھا۔ وہ دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا اور اس کا دھیان فاخرہ کی طرف بھی تھا۔ فاخرہ جاتے ہوئے بار بار کبیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جونہی وہ گلی میں داخل ہوئی، اسی وقت کبیر نے بھی ایک طرف دوڑ لگا دی تھی۔ فاخرہ کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ واپس گئی اور دیوار کی اوٹ سے اس طرف دیکھنے لگی جہاں کچھ دیر قبل کبیر کھڑا تھا۔

وہاں کبیر نہیں تھا۔ دو آدمی تھے جو شکل ہی سے خطرناک لگتے تھے۔ وہ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے اور پھر ایک دم وہ دوسری طرف بھاگ گئے تھے۔

فاخرہ جیسے تیسے واپس گھر پہنچ گئی تھی۔ اس نے کبیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا موبائل فون بند جا رہا تھا۔ آخرکار اس نے وہ سم اپنے موبائل سے نکالی اور سوچنے لگی کہ وہ اسے کہاں چھپا کر رکھے۔ پھر وہ باتھ روم میں چلی گئی اور وہاں چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ جس میں مختلف بوتلیں اور صابن کی ٹکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ فاخرہ نے سم ایک بوتل کے پیچھے رکھ کر کیبن بند کر دیا تھا۔

جونہی فاخرہ باتھ روم سے باہر نکلی اور جیسے جان ہی نکل گئی ہو۔ سامنے صوفے پر ایک اجنبی ٹانگ پر ٹانگ جمائے براجمان تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ تھا اور وہ سگریٹ کی راکھ صاف شفاف فرش پر گرا رہا تھا۔

''تم کون ہو......؟ میرے گھر میں کیسے آئے؟'' فاخرہ ہمت کر کے بولی۔

اس نے اطمینان سے سگریٹ کا کش لیا اور دھواں چھوڑتے ہوئے ایک بار پھر چٹکی بجا کر راکھ فرش پر گرائی اور پُرسکون لہجے میں بولا۔

''آج تم کو کبیر کے ساتھ دیکھا تو میرا ایک آدمی تمہارے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچ گیا۔ ہم کبیر کو تلاش کرتے رہے اور وہ ہمیں نہیں ملا...... کبیر کے ساتھ تمہارا تعلق کیا ہے؟''

''تم فوراً میرے گھر سے نکلو...... ابھی اور اسی وقت ورنہ میں پولیس کو بلاؤں گی۔'' فاخرہ اندر سے ڈری ہوئی تھی لیکن پھر بھی ہمت کر کے بول رہی تھی۔

وہ مسکرایا اور آدھا سگریٹ فرش پر گرانے کے بعد اسے اپنے پیر سے مسلنے لگا۔ اپنے گھر کے صاف شفاف فرش کی یہ حالت دیکھتے ہوئے فاخرہ کو ناگوار گزر رہا تھا۔

''میرا نام ناصر خان ہے اور میں اس علاقے میں پولیس انسپکٹر ہوں......'' یہ بتانے کے بعد اس نے جیب سے کارڈ نکال کر میز پر رکھا اور مزید بولا۔ ''اس کارڈ پر میرا نمبر لکھا ہے۔ چاہو تو مجھے کال کر کے بلا سکتی ہو......'' ناصر کہنے کے بعد ہنسنے لگا تھا۔

فاخرہ اس کی طرف دیکھتی رہی اور کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''کبیر سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

فاخرہ سوچنے لگی کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''ہم...... شادی کرنے والے ہیں......''

''اوہ...... عاشق معشوق کا چکر ہے...... یہ تو بہت اچھا ہوا...... اب یہ بھی بتا دو کہ کبیر کہاں ملے گا؟'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

فاخرہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے جس لہجے میں بات کی تھی، وہ اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

فاخرہ کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر وہی سوال دہرایا تو فاخرہ نے جواب دیا۔ ''کبیر یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے، مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے......''

اس کا جواب سن کر اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور اس کے بعد اگلے چار گھنٹوں میں فاخرہ کے پورے گھر میں کیمرے لگ چکے تھے، اور ناصر کسی بھی جگہ بیٹھ کر فاخرہ کے گھر کے اندر اور باہر کی نقل و حرکت دیکھ سکتا تھا۔ فاخرہ کے گھر میں ایک کمرا اور باتھ روم کیمروں سے مبرّا تھے۔

اب کوئی بھی اس گھر کے اندر اور باہر خفیہ نہیں جا سکتا تھا۔ ناصر پولیس کا بدنام آفیسر تھا اور اس نے فاخرہ پر ایسا دباؤ ڈالا تھا کہ فاخرہ کی زبان بند ہو گئی تھی۔ اس کے بعد فاخرہ نے نئی جگہ نوکری کر لی تھی۔ اور وہ اس دن سے مسلسل ناصر کی نظر میں تھی۔

وہ سب سوچتے ہوئے فاخرہ نے اپنی چائے ختم کر لی تھی۔ کبیر کس مشکل میں تھا اور اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔ اگر اسے یہ ڈر نہ ہوتا کہ اس پر ناصر کے آدمیوں کی گہری نظر ہے اور اس کی کار میں ٹریکر لگا ہوا ہے جس کا علم ناصر کو ہوتا ہے تو وہ سمیع سے ضرور بات کرتی......

لیکن اب وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سے دوبارہ سمیع اسے ملے اور وہ اس سے بات کرنے کا کوئی راستہ ضرور نکالے کیونکہ اسے کبیر سے ہر حال میں ملنا تھا۔

☆☆☆

سمیع کے دماغ میں اُلجھنیں مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ ناصر نے اس کے سامنے عاشی اور صابر بیگ کی نئی حقیقت منکشف کی تھی اور ناصر کی شخصیت بھی اس کے سامنے پُراسرار تھی۔

ان تمام الجھنوں کے برعکس اب سمیع ہر حال میں کبیر تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دوبارہ فاخرہ سے کیسے ملے؟ ایک بات یہ بھی تھی کہ سمیع کے اندر ایک اور ہی سمیع جاگ اُٹھا تھا جو اب کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور سمیع کا رخ کسی ہوٹل کی طرف تھا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ ابھی وہ سڑک عبور کر کے دوسری طرف پہنچا ہی تھا کہ اس کے سامنے یکدم عاشی ایسے آ کھڑی ہوئی کہ سمیع ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی سوالیہ اور خیرہ نگاہیں اس کے سپاٹ چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس طرح اچانک عاشی کا سامنے آنا اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔

''میرے پیچھے آؤ۔'' وہ کہہ کر مڑی۔

''کہاں جانا ہے؟'' سمیع نے پوچھا۔

''سوال نہیں...... میرے پیچھے چلتے رہو۔'' وہ بولی اور چلنے لگی۔ سمیع بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔

عاشی کی رفتار تیز تھی اور وہ چلتی ہوئی سڑک سے دوسری جانب چلی گئی جہاں ایک پارک تھا اور پارک کے اندر اس وقت کچھ لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو بلاتعطل شام کی سیر کو آتے تھے۔

عاشی چلتی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ سمیع چپ چاپ اس سے کچھ فاصلے پر براجمان ہو گیا۔

''تم ناصر سے ملے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ناصر سے نہیں ملا تھا۔'' سمیع نے انکار میں گردن ہلائی۔

''جھوٹ مت بولو تم ناصر سے ملے تھے۔'' اس کا لہجہ غصے میں ڈوبا ہوا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں ناصر سے نہیں ملا تھا بلکہ اس کے آدمی مجھے اُٹھا کر لے گئے تھے اور وہاں میری ملاقات ناصر سے ہوئی تھی۔'' سمیع نے وضاحت کی۔

''کیا کہا تھا ناصر نے؟'' اس نے کچھ توقف کے بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو قابلِ ذکر ہو سوائے ایک بات کے۔'' سمیع کہتا ہوا رک گیا۔

عاشی کی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ چاہتی تھی کہ سمیع خود ہی بتائے لیکن جب سمیع نہیں بولا تو اس نے پوچھا۔ ''وہ بات کیا ہے؟''

''تم اور صابر ایک ہی ہو...... تم صابر کے لیے کام کرتی ہو اور اس کا مجھے ڈیل کر کے نوکری سے نکالنا اور تمہارا مجھ سے ملنا سب ایک پلان تھا۔'' سمیع نے سچ کہہ دیا۔

''ہم ایسا پلان کیوں کریں گے؟''

''کیونکہ صابر بیگ جانتا ہے کہ کبیر کو میں ہی تلاش کر سکتا ہوں۔ اس لیے اس نے پلان کیا اور تم نے اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مجھ سے جھوٹ بولا۔'' سمیع متانت سے بولا۔

''میں نہیں جانتی کہ ناصر نے تمہارے اندر کیسی کیسی غلط فہمی بھر دی ہے۔ میں خود صابر سے جان چھڑانا چاہتی ہوں۔''

''مجھ پر حقیقت کھل چکی ہے۔ تم نصیر احمد کی بیٹی نہیں ہو۔ کیونکہ اس کی شادی ہی نہیں ہوئی تھی۔''

''اب تم کو اس بات کا ثبوت دوں کہ میں کس کی بیٹی ہوں؟ پھر تم کو یقین آ جائے گا؟ ناصر ایک شاطر انسان ہے، وہ کرپٹ پولیس افسر ہے۔ کبیر کو وہ اپنے ایک مفاد کے لیے تلاش کر رہا ہے۔'' عاشی اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا کہ ایک لمحے کے لیے تو سمیع بھی چونک گیا کہ ناصر نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔

سمیع اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بھی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اچانک ایک جھٹکے میں سمیع نے اس کے کندھے پر لٹکا اس کا بیگ چھین لیا۔ عاشی کے لیے وہ غیر متوقع تھا۔ وہ تیزی سے اپنا ہینڈ بیگ لینے کے لیے اس کی طرف بڑھی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے، میرا بیگ مجھے واپس کرو۔''

''اسی جگہ رک جاؤ ورنہ اسے کہیں دور پھینک دوں گا۔'' سمیع نے اسے دھمکی دی۔

''میں کہتی ہوں تم میرا بیگ مجھے واپس کرو۔'' عاشی کی جیسے جان نکل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی عیاں تھی۔

''میں کہتا ہوں اسی جگہ رک جاؤ۔'' سمیع کا لہجہ درشت ہو گیا۔ ''مجھے صرف اس بیگ کی تلاشی لینی ہے۔''

''تم میرا بیگ نہیں دیکھ سکتے ہو۔'' عاشی نے کہا اور

ساتھ ہی اس نے اپنے بائیں جانب دیکھ کر اشارہ کیا۔ اچانک اس طرف سے نکل کر ایک آدمی آ گیا۔ وہ چہرے سے کوئی شریف آدمی نہیں لگتا تھا۔ عاشی نے اسے حکم دیا۔

”پکڑو اِسے اور میرا بیگ اس سے واپس لے کر دو۔“

”اوہ...... اس کا مطلب ہے تم اکیلی نہیں ہوتی ہو۔ تمہارے ٹٹو تمہارے ساتھ ہوتے ہیں۔“ سمیع نے اس کی طرف دیکھتے ہی کہا اور ایک دم سے دوسری طرف دوڑ لگا دی۔

سمیع کو بھاگتا دیکھ کر عاشی اپنے آدمی سے بلند آواز میں بولی۔ ”یہ جانے نہ پائے...... پکڑو اِسے۔“

اس آدمی نے بھی سمیع کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ سمیع تیز بھاگ رہا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے دور نکل گیا تھا۔ اس کی دانست میں تھا کہ اس کے تعاقب میں جو شخص بھاگ رہا تھا، وہ اس سے دور نکل چکا ہے...... لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ وہ بھی تیز بھاگ رہا تھا اور جونہی سمیع نے اپنے بھاگنے کی رفتار کم کی اور بھاگتے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا تھا وہ چونک گیا کیونکہ وہ آدمی اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اسے دیکھ کر سمیع نے اپنے بھاگنے کی رفتار اور بھی تیز کر دی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا سڑک عبور کر کے دوسری طرف چلا گیا اور آگے گلی میں ایک طرف دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑا ہو گیا۔ وہاں اندھیرا تھا اور گلی خالی تھی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ وہ آدمی بھاگتا ہوا اس طرف آ گیا اور کھڑا ہو کر ہانپتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اچانک سمیع تیزی سے باہر نکلا اور اس نے پوری قوت سے اس آدمی کی گردن پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ گھونسا پوری قوت سے غیر متوقع طور پر اس کی گردن پر لگا تھا کہ وہ نیچے جا پڑا۔

اس کے ساتھ ہی سمیع اس کے سینے پر سوار ہو کر بیٹھ گیا اور اس کے گلے کو اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر بولا۔

”جلدی بتا تم کون ہو ورنہ تمہاری یہ ہڈی توڑ دوں گا۔“

”میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔“

”تمہیں اس نے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے؟“

”ہاں......“ اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ سمیع نے اس کے گلے کی ہڈی پر گرفت رکھی ہوئی تھی اور اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سمیع نے اس پر مزید زور ڈال کر کہا۔

”سچ بتاؤ......“

”صابر...... کے کہنے پر ہوں۔“ اس نے بمشکل صابر کا نام لے کر جملہ مکمل کیا۔

”تم صابر بیگ کے آدمی ہو؟“

”ہاں۔“

”یہیں سے واپس چلے جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔“

سمیع کہہ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور ایک طرف چلتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔ وہ کھانستا ہوا بیٹھا رہا۔ سانس ٹھیک ہوئی تو وہ کھڑا ہو گیا۔

سمیع بھاگتا ہوا آگے چلا گیا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ ایک ایسی محفوظ جگہ پر پہنچ گیا تھا جہاں اسے اب ان کے آنے کا ڈر نہیں تھا۔ وہ ایک طرف چلتا رہا اور اس نے چلتے ہوئے بیگ کی زپ کھولی۔ اندر جھانکا تو پہلی نظر موبائل فون پر پڑی۔ سمیع نے موبائل فون نکال لیا۔ اسے لاک لگا ہوا تھا۔ ابھی وہ موبائل فون دیکھ ہی رہا تھا کہ بیل ہونے لگی۔ اسکرین پر ’بیگ‘ لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ صابر بیگ کی کال تھی۔

سمیع نے دائیں بائیں دیکھا، اس کے قریب کوئی نہیں تھا۔ اس نے موبائل فون کو جونہی کان سے لگایا صابر بیگ کی آواز آئی۔

”کیا بنا...... اُس سے ملی ہو تم؟“

”وہ مجھ سے ملی اور اس وقت میرے قبضے میں ہے۔“ سمیع نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”اوہ...... تم ہو......“ صابر فوراً اس کی آواز پہچان گیا تھا۔ ”وہ تمہارے قبضے میں ہے تو تم اس کا کیا کرو گے؟“ صابر کی آواز میں تمسخر تھا۔

”تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ تم اس کے گھر بھی آئے تھے......“ سمیع بولا۔

دوسری طرف سے صابر کے ہنسنے کی آواز آئی۔ ”اب اگر وہ تمہارے پاس ہے تو ہو سکتا ہے اس نے تم کو بہت کچھ بتایا ہو۔ عورت ذات ہے، جلدی ڈر جاتی ہے۔ یہ بھی سن لو وہ سب ایک ڈراما تھا۔ تم کو دکھانے کے لیے آیا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ تاکہ تم کو عاشی کی باتوں پر یقین ہو سکے...... اور اب اگلی بات سنو...... وہ میرے کسی کام کی نہیں رہی ہے، اسے مارنا چاہو تو مار دو، اگر تم نہیں مارو گے تو میرا آدمی اسے ضرور مار دے گا۔“ صابر نے اس سفاکی سے کہا جیسے اس کے لیے وہ معمولی بات ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

سمیع مضطرب ہو گیا۔ اس نے موبائل فون بیگ میں رکھا اور دائیں بائیں دیکھنے کے بعد اس جانب دوڑ لگا دی جہاں سے وہ عاشی سے بیگ چھین کر بھاگا تھا۔

سمیع بھاگتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ وہاں زیادہ رش نہیں تھا۔ اِکا دُکا کوئی وہاں سے گزر رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک جنرل اسٹور تھا جہاں دو، تین آدمی کھڑے اپنی باتوں میں مشغول تھے۔

سمیع متلاشی نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا تو ایک دم سے عاشی اس کے سامنے آگئی۔

”میرا بیگ مجھے دے دو۔“ اس نے منت کی۔

”ایک شرط پر دوں گا۔ صابر، کبیر کو کیوں تلاش کر رہا ہے؟ دیکھو ابھی تمہارے فون پر صابر کی کال آئی تھی۔ اسے میں نے کہا کہ تم میرے قبضے میں ہو تو اس نے کہا اسے مارنا چاہو تو مار دو ورنہ اسے میرا آدمی مار دے گا۔ کیونکہ وہ اب میرے کسی کام کی نہیں رہی......“

سمیع کی بات سن کر عاشی کے چہرے پر خوف لہرانے لگا۔ ”کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”مجھے اس سے یہی امید تھی۔“

”یہ امید تھی تو پھر اُس کے لیے کام کیوں کر رہی تھیں؟“ سمیع نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پیسا سب کی مجبوری ہوتی ہے۔ مجھے میرا بیگ دو، میں جانا چاہتی ہوں۔“ عاشی نے کہا۔

”مجھے میرے سوال کا جواب دو۔“ سمیع بولا۔

عاشی سوچتی ہوئی تذبذب کا شکار ہوگئی تھی۔ آخر کار اس نے زبان کھولی۔ ”کبیر اس کی بیوی کو لے کر بھاگا ہے......“

”کیا بکواس کر رہی ہو۔“ سمیع کو جیسے جھٹکا لگا ہو۔

”صابر کی بیوی کئی دنوں سے غائب تھی۔ پھر کچھ شواہد ملے کہ کبیر اسے لے کر بھاگا ہے اور وہ اس کے پاس ہے، پولیس میں بھی یہی رپورٹ درج ہے......“ عاشی نے کہا۔

”تم نے پہلے مجھے اور کہانی سنائی تھی، ناصر نے مجھے بتایا کہ وہ صابر کے دو کروڑ لے کر بھاگا ہے...... اور ناصر ایک جواری ہے اور اسے کبیر سے پیسے لینے ہیں...... آخر سچ ہے کیا؟“ سمیع چکرا کر رہ گیا تھا۔

”سچ یہ ہے کہ صابر کی بیوی، کبیر کے پاس ہے، صابر کا کہنا ہے کہ اس نے اس کی بیوی کو قتل کر دیا ہے...... ناصر ایک راشی آفیسر ہے جو صابر کے اشاروں اور اس کی پھینکی ہوئی ہڈیوں پر دوڑتا ہے۔“

”تم نے پہلے مجھے وہ کہانی کیوں سنائی تھی۔“

”مجھے جیسا صابر نے کہا، میں نے ویسی بات کر دی۔ پیسے مل رہے ہوں تو کام کرنا ہی پڑتا ہے۔“ عاشی نے کہا۔

”میں کیسے یقین کروں کہ تم اب مجھ سے سچ بول رہی ہو؟“ سمیع نے اس کی طرف دیکھا۔

”تم نے ابھی مجھے اس کے ساتھ ہونے والی فون پر بات بتائی ہے۔ مجھے دکھ ہوا کہ میری حیثیت اس کے آگے ٹشو پیپر سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے مجھے حقیقت بتانی پڑی...... میں جا رہی ہوں۔“

”میں ایک اور بات جاننا چاہتا ہوں......“ سمیع نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ایک گولی آئی اور سیدھی عاشی کی گردن میں پیوست ہوگئی۔ وہ چیخی اور زمین پر گر گئی۔ سمیع فوراً دیوار کی آڑ میں ہوگیا۔

سمیع نے دیوار کی آڑ سے جھانکا تو سامنے وہ آدمی کھڑا تھا جو عاشی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ عاشی کی طرف بڑھا۔ عاشی کا خون بہہ رہا تھا اور آخری سانسیں لے رہی تھیں۔

وہ آدمی قریب گیا اور اس پر جھک کر بولا۔ ”سوری، باس کا حکم تھا......“ یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور جس طرف سمیع چھپا تھا اس طرف چلنے لگا۔ سمیع نے دوڑ لگا دی۔ سامنے بند گلی تھی۔ کہیں جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سمیع مضطرب دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

وہ شخص اس گلی سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ سمیع بند گلی میں قید ہو کر رہ گیا تھا پھر اچانک اس نے ایک دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”دروازہ توڑنے کا ارادہ ہے کیا......“

سمیع نے دیکھا کہ وہ آدمی گلی میں داخل ہوگیا ہے۔ اس نے پستول تان لیا تھا۔ اسی وقت سمیع اندر چلا گیا۔ بوڑھی عورت چلّائی۔ ”کون ہو تم...... اس طرح میرے گھر میں کیوں گھسے ہو۔ چوری کا ارادہ ہے......“

وہ آدمی اسی جگہ سے واپس چلا گیا۔ اس کا ارادہ سمیع کو مارنے کا نہیں تھا۔ وہ اسے ڈرا کر اس جگہ سے بھگانا چاہتا تھا۔

سمیع اس گھر میں گھستے ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا جبکہ وہ بوڑھی عورت اس کے پیچھے چلّا رہی تھی۔ سمیع کو یہ بھی ڈر تھا کہ اگر اس عورت نے اپنے شور سے لوگوں کو جمع کر لیا تو اس کے لیے بھاگنا مشکل ہو جائے گا۔

چھت پر جاتے ہی وہ ساتھ والے گھر کی چھت پر کود

گیا اور وہاں سے دوسرے، تیسرے گھر کی چھتوں سے ہوتا، اسے نیچے اترنے کے لیے جو سہارا بھی میسر آیا، وہ اس سے نیچے اتر کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

سمیع ایک محفوظ جگہ پہنچ چکا تھا۔

ہر بار اس کے لیے ایک نئی گرہ کھل رہی تھی اور وہ اُلجھن کا شکار ہو رہا تھا۔ صابر بیگ ایک ظالم شخص تھا جس نے عاشی کو استعمال کرنے کے بعد بیدردی سے مروا دیا تھا۔ اب اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ کسی کی پروا کیے بغیر اب اس معاملے کی تہ تک پہنچ کر رہے گا اور اس نے بہت کچھ سوچ بھی لیا تھا۔

جونہی رات کا سایہ پھیلا سمیع نے فاخرہ کے گھر کے قریب ایک ہوٹل میں کمرا لے لیا۔ وہ ہوٹل بہت زیادہ اچھا نہیں تھا لیکن سمیع کو فاخرہ کے گھر کے قریب رہنا تھا۔

سمیع نے رات کچھ سوتے اور زیادہ تر جاگتے ہوئے گزاری۔ منہ اندھیرے وہ تیار ہوا اور ہوٹل چھوڑ کر پیدل ہی فاخرہ کے گھر کی طرف چل دیا۔ اس وقت اِکا دُکا ہی کوئی آتا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ چلتا ہوا فاخرہ کے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک ایسی جگہ رک گیا جہاں وہ اس کے گھر کے مین دروازے پر اچھی طرح سے نظر رکھ سکتا تھا۔ سمیع ایسی جگہ پر کھڑا تھا جہاں ایک گھنا درخت تھا اور اس سے چند قدم ایک بڑے بنگلے کا مین گیٹ تھا۔ سمیع کا اس جگہ کھڑا ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا، اسے مشکوک جان کر پکڑا بھی جاسکتا تھا۔

دن کا اُجالا اچھی طرح سے پھیل گیا تھا اور سمیع خراماں خراماں چلتا ایک طرف چل دیا۔ اس نے وقت دیکھا، فاخرہ کے آفس جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کے گھر کا مین گیٹ کھلا اور فاخرہ کی کار باہر نکلی۔ وہ خود گیٹ سے باہر نکل کر گیٹ بند کرنے لگی، اور جونہی وہ گیٹ بند کر کے گاڑی میں بیٹھی تب تک سمیع اس کی کار کے قریب پہنچ چکا تھا اور اس نے اپنے چہرے پر ماسک چڑھایا ہوا تھا، وہ برق رفتاری سے فاخرہ کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فاخرہ نے متوحش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون ہو تم......؟''

''میں سمیع ہوں۔ یہاں سے گاڑی نکالیں۔ ہمیں کیسر تک پہنچنا ہے۔'' سمیع نے اپنا ماسک چہرے سے ہٹا کر کہا اور فاخرہ نے بھی کار آگے بڑھا دی۔ جب اس کی کار آگے بڑھ رہی تھی، فاخرہ کے برابر والے مکان کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی ہاتھ میں ریوالور پکڑے کار کے پیچھے بھاگا......

فاخرہ نے بیک مرر سے اس آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ دائیں بائیں کیمرے لگے ہوئے ہیں اور برابر والے مکان میں اس کی نگرانی پر مامور دو آدمی چوبیس گھنٹے رہتے ہیں۔

کار کی رفتار بہت تیز تھی اور وہ اس کالونی سے باہر نکل گئی تھی۔ فاخرہ نے بتایا۔ ''میری کار میں ٹریکر ہے ہم کہاں جارہے ہیں ناصر اس سے بے خبر نہیں ہوگا۔''

''سب سے پہلے ہمیں کار کہیں چھوڑنی پڑے گی۔'' سمیع نے پیچھے دیکھا۔ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ان کی کار ہمارے پیچھے آئے گی۔''

''ہمیں جانا کہاں ہے؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''ابھی کہیں دور نکل کر یہ کار چھوڑنی ہے اس کے بعد فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کہاں جائیں گے۔'' سمیع بولا۔

فاخرہ نے کار کی رفتار تیز کردی تھی۔ وہ بہت آگے نکل آئے تھے۔ کار میں کیونکہ ٹریکر تھا اس لیے ناصر اس سے باخبر تھا کہ کار کس طرف جارہی ہے۔ اچانک فاخرہ کو بریک پر اپنے پیر کا دباؤ اس قدر بڑھانا پڑا کہ کار کے ٹائر چیخ اٹھے اور کار بھی اُلٹتے ہوئے بچی...... وہ سڑک پر ترچھی رک گئی۔ فاخرہ اور سمیع نے دیکھا کہ دائیں طرف سے ایک کار نکل کر سڑک پر راستہ روک کے کھڑی تھی اور فاخرہ کو فوری بریک لگانے پڑے تھے۔

''پیچھے لے چلیں۔'' سمیع چلایا۔

فاخرہ نے بیک گیئر لگایا اور کار پیچھے کی طرف جانے لگی۔ وہ کار بھی سیدھی ہوئی اور ان کی طرف بڑھنے لگی۔ جونہی ایک موڑ آیا، فاخرہ نے گیئر بدل کر کار کا رخ اس طرف کیا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔

''کار کی رفتار اور بڑھا دیں، اب ضروری ہے کہ کار کو ہم کہیں چھوڑ دیں۔'' سمیع نے کہا۔

فاخرہ نے کار کی رفتار اور بھی تیز کردی۔ اس نے شاید ہی زندگی میں اس رفتار سے کار چلائی ہو...... سمیع دائیں بائیں دیکھ رہا تھا کہ وہ کس طرف مڑ سکتے ہیں۔ وہ کار ان کے تعاقب میں تھی۔ آگے ایک چوراہا آرہا تھا۔

''گاڑی کو بائیں موڑ لینا۔'' سمیع نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

جونہی چوراہا آیا، فاخرہ نے کار بائیں موڑ لی اور سمیع

نے کار کی رفتار کم کرنے کا کہا۔ آگے دائیں بائیں سڑکیں نکل رہی تھیں۔ سمیع نے اشارہ کیا اور فاخرہ نے دائیں طرف کار موڑلی......

''کار روک لیں اور جلدی باہر نکلیں......'' سمیع نے کہہ کر پیچھے کی طرف دیکھا وہ کار ابھی اس سڑک پر داخل نہیں ہوئی تھی۔ کار جونہی رکی، دونوں ایک ساتھ باہر نکلے اور سمیع نے فاخرہ کو اپنے پیچھے بھاگنے کے لیے کہا...... دونوں جونہی آگے ایک گلی میں مڑے، پیچھے ان کے تعاقب میں آتی کار دکھائی دی۔

سمیع اور فاخرہ بھاگتے جارہے تھے۔ آگے دائیں بائیں گلیاں تھیں اور وہ ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہوجاتے تھے۔

وہ کار... فاخرہ کی کار کے پاس رک گئی تھی۔ اندر سے ایک ساتھ دو آدمی پھرتی سے باہر نکلے۔ دونوں تیزی سے کار کی طرف گئے اور کار کے اندر دیکھا اور پھر ایک نے کار کی اچھی طرح سے تلاشی لینے کے بعد دوسرے آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے موبائل فون نکال کر کال کی اور پہلی بیل پر ہی دوسری طرف سے ناصر کی آواز آئی۔

''ہاں بولو......''

''وہ گاڑی چھوڑ کر نکل گئے ہیں۔''

''اُن کا پیچھا کرو...... فاخرہ کہیں بھاگنے نہ پائے...... سمجھے......'' دوسری طرف سے ناصر کی چیختی ہوئی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہہ کر اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور دونوں اس طرف بھاگے جس گلی میں سمیع اور فاخرہ گئے تھے۔

☆☆☆

سمیع اور فاخرہ بھاگتے ہوئے کافی آگے نکل آئے تھے۔ فاخرہ کے لیے مزید بھاگنا مشکل ہورہا تھا۔ اس کی سانس پھول چکی تھی۔ سامنے ایک مارکیٹ تھی جس کے اندر کئی دکانیں تھیں اور زیادہ دکانیں بند تھیں۔ سمیع اور فاخرہ اس کی طرف چلے گئے۔

وہاں ایک بینچ ہے۔'' آپ بیٹھو میں پانی لے کر آتا ہوں۔''

فاخرہ اس بینچ پر دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ سمیع دکان سے پانی کی دو بوتلیں لے آیا۔ اس نے ایک بوتل فاخرہ کی طرف بڑھائی۔

پانی پینے کے بعد فاخرہ کو کچھ سکون محسوس ہوا۔ ''ہمیں اس جگہ سے نکلنا ہوگا ورنہ وہ یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔'' فاخرہ نے کہا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' سمیع نے دائیں بائیں دیکھا۔

''اس کے آدمی چاروں طرف پھیلے ہوں گے۔'' فاخرہ کی آنکھوں میں انجانا سا خوف تھا۔

''میرے ساتھ آجائیں۔'' سمیع نے کہا اور فاخرہ اس کے پیچھے چلنے لگی۔ دونوں آگے چلے گئے تھے۔ سمیع سوچنے لگا کہ وہ کس طرف جائے، لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کو وہ علاقہ چھوڑنا تھا۔ اس لیے سمیع نے رکشا روکا اور دونوں اس میں سوار ہوگئے۔ سمیع نے اس علاقے سے دور ایک جگہ کا نام بتایا اور رکشا اس طرف چل دیا۔

دونوں خاموشی سے سفر کرتے رہے اور پھر وہ اس جگہ سے کافی آگے نکل گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے رکشا چھوڑ کر ایک طرف پیدل چلنا شروع کردیا۔

☆☆☆

کمرا نیم روشن تھا۔

صابر بیگ صوفے پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا اُس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا۔ اچانک میز پر رکھے اس کے قیمتی موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ بیل دھیمی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے کمرے کے سناٹے کو توڑ کر ایک تلاطم برپا کر دیا تھا۔

صابر بیگ نے اطمینان سے فون اُٹھا کر اس کی اسکرین کی طرف دیکھا اور فون کان سے لگا کر دھیمے سے بولا۔ ''ہاں...... بولو۔''

کمرے کی خاموشی میں دوسری طرف سے آنے والی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ''وہ بھاگ گئی ہے۔''

''کیسے......؟'' صابر بیگ کا لہجہ دھیما اور بظاہر پُرسکون تھا لیکن اندر سے یہ سنتے ہی جیسے اسے آگ لگ گئی ہو۔ وہ اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگا تھا۔

''اس کے ساتھ سمیع ہے......'' وہ کہہ رہا تھا اور صابر نے اس کی بات کو کاٹ دیا۔

''وہ بھاگی کیسے ہے؟''

''ہم اس کی بھرپور نگرانی کررہے تھے۔'' دوسری طرف سے پھر اس نے کہنا چاہا۔

اس بار صابر بیگ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ ''تمہاری پوری نگرانی ہوتی تو اس کے اندر بھاگنے کی جرأت پیدا نہ ہوتی...... مجھ سے تم رقم ایسے لے رہے ہو جیسے رقم

تمہارے باپ کی ہو...... میں نے تجھے اس کی نگرانی پر رکھا تھا اور تم مجھے بتا رہے ہو کہ وہ بھاگ گئی ہے۔"

"جو بھی ہوا اچانک ہوا۔" دوسری طرف سے کچھ ثانیے کی خاموشی کے بعد آواز آئی۔

"میری بات کان کھول کے سن لو ناصر...... اگر ایک گھنٹے کے اندر وہ نہ ملی تو میں تجھے گولی سے اُڑا دوں گا اور یہ تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میرے لیے ایسا کرنا مشکل نہیں ہے۔" صابر بیگ نے کہہ کر کال کو ایک جھٹکے سے منقطع کیا اور موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ وہ مضطرب ہو گیا تھا۔ فاخرہ کا بھاگ جانا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اسے لگ رہا تھا جو منصوبہ اس نے بنایا تھا، وہ اس کے بھاگ جانے سے شاید مکمل نہ ہونے پائے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ پھر موبائل کی بیل نے اسے چونکا دیا۔ اس بار اسکرین پر اُبھرے نام کو دیکھ کر اس نے ایک لمحہ سوچا اور پھر فون کان سے لگا لیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کے اندر کی بے چینی اس کے لہجے سے عیاں نہ ہو۔

"جی انسپکٹر شاہد کیسے ہیں آپ؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ پکڑا گیا ہے......؟" صابر بیگ نے سوال کر دیا۔

"فی الحال تو تلاش جاری ہے اور آپ سے ملنا ضروری ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ابھی بھی تلاش ہی جاری ہے......" صابر بیگ کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ "خیر آپ کب ملنا چاہتے ہیں...... آج ملنا ہے تو رات کے کھانے پر آجایئے گا۔"

"کھانے کی ضرورت نہیں ہے، میں رات کو آجاؤں گا۔" دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

صابر بیگ کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور اس نے بغیر دروازے کی طرف دیکھے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور کمرے میں داخل ہونے والا ایک شخص تھا، وہ مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"عاشی کا کام تمام کر دیا ہے۔"

یہ سن کر صابر بیگ نے اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کا کہہ دیا۔ وہ باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد صابر بیگ بڑبڑایا۔ "میرے کام کی رہتی تو زندہ رہتی...... تیری زبان نے تجھے مروا دیا۔"

☆☆☆

وہ دونوں ایک گاڑی کے ذریعے سے ایک ایسے علاقے میں پہنچے تھے جہاں گنجان آبادی تھی اور تنگ گلیاں ایک دوسری سے ایسے ملی ہوئی تھیں کہ ایک انجان آدمی مکڑی کے جالے کے مانند گلیوں میں بھٹک کر رہ جائے۔

فاخرہ آگے آگے چل رہی تھی اور اس کے پیچھے سمیع تھا۔ ایک جگہ رک کر فاخرہ نے اپنے پیچھے دیکھا...... سمیع کی بھی گہری نظریں دور تک جا رہی تھیں۔

"ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہے۔" فاخرہ نے سرگوشی کی۔

اس کے بعد وہ پھر چلنے لگی۔ وہ ایک مختصر بند گلی تھی۔ وہ اس میں چلے گئے اور ایک پرانے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر فاخرہ نے بیل دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور اندر سے ایک بوڑھا شخص باہر نکلا۔ اس نے فاخرہ کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے اس کی نگاہ سمیع پر چلی گئی۔

"یہ کبیر کا دوست ہے۔" فاخرہ نے دو قدم آگے بڑھ کر آہستہ سے کہا تو اس بوڑھے شخص نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں کو اندر لے جاتے ہی دروازہ پھر سے بند کر دیا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے۔ ایک کمرے کے پاس جا کر بوڑھے شخص نے دروازے پر دستک دی اور جونہی دروازہ کھلا، کبیر نمودار ہوا اور اس نے جیسے ہی فاخرہ اور سمیع کو دیکھا اس کے چہرے پر خوشگوار سی حیرت دوڑ آئی۔ وہ دونوں کو کمرے میں لے گیا اور سمیع سے لپٹ گیا۔ بوڑھا شخص باہر سے ہی واپس لوٹ گیا تھا پھر اس نے فاخرہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

"سب ٹھیک ہے...... اُن سے نظر بچا کر کیسے یہاں تک پہنچی ہو۔"

"بہت مشکل سے بھاگی ہوں۔ چوبیس گھنٹوں کی پہرا داری تھی۔ یہاں تک لانے میں آپ کے اس دوست کا بہت ہاتھ ہے۔"

"یہ تو میری جان ہے۔" کبیر مسکرایا۔

سمیع نے کبیر کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے...... کیوں یہاں چھپے ہوئے ہو اور ان پر سخت پہرا...... میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

کبیر نے دونوں کو ایک طرف بٹھایا اور کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ پھر وہ اطمینان سے ان کے

سامنے کھڑا ہو گیا۔

''میں کس اذیت میں چھپ کر کسی قیدی کی زندگی گزار رہا ہوں یہ مجھے ہی معلوم ہے...... مجھے شطرنج کا وہ مہرہ بنانے کی کوشش ہے جو کھیل میں شامل ہی نہیں ہے...... میں بے بس، ڈر اور خوف کی کیفیت میں زندگی گزار رہا ہوں۔'' کبیر کے لہجے میں کرب تھا۔

''مجھے بھی تم کو بتانے کا موقع نہیں ملا...... آج مجھے بھی بتاؤ۔'' فاخرہ نے کہا۔

کبیر نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بتانا شروع کیا۔

''میں صابر بیگ کی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ ایک دن میں آفس سے چھٹی کے بعد اپنے فلیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ میری بائیک کی رفتار مناسب تھی۔ اچانک ایک کار پیچھے سے آئی...... اس کے ٹائر چیخ رہے تھے اور کار جیسے چلانے والے کے کنٹرول سے باہر ہو رہی تھی...... وہ کار ترچھی مڑی اور فٹ پاتھ پر چڑھ کر درخت سے ٹکرا گئی۔ اس وقت سڑک پر رش نہیں تھا۔ میری بائیک رک چکی تھی اور میں نے دیکھا کہ ایک عورت کار کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میری طرف دوڑ لگا دی اور میرے پاس آتے ہی بولی۔ ''پلیز مجھے ان لوگوں سے بچاؤ...... پلیز مجھے یہاں سے نکالو......'' اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا، وہ جلدی سے میری بائیک پر بیٹھ گئی۔ اس دوران کار کے اندر سے دو آدمی باہر نکلے، دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ میں نے مزید کچھ نہیں سوچا اور بائیک کو تیزی سے دوڑاتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

کبیر اتنا بتانے کے بعد چپ ہو گیا اور دونوں اس کی طرف متحیر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''جب میں اس عورت کو بہت دور لے گیا اور ایک جگہ اتارنے کے بعد پوچھا کہ اب کہاں جانا ہے تو اس نے مجھے پولیس اسٹیشن چلنے کو کہا۔ میں نے کچھ جاننا چاہا تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ صابر بیگ کی بیوی ہے اور وہ آدمی صابر بیگ کے تھے......''

''وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟'' ایک دم سے سمیع نے سوال کیا۔

کبیر نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''میں زیادہ دیر اس جگہ رک نہیں سکتا تھا۔ میں اسے پولیس اسٹیشن کی طرف لے جا رہا تھا کہ اس نے مجھے روک لیا اور کہا صابر بیگ کی ہر جگہ جان پہچان ہے اس لیے پولیس اسٹیشن جانا مناسب نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے ایک رات کے لیے میرے پاس پناہ لینے کی درخواست کی تو میں اسے اس طرح سے اپنے فلیٹ میں لے گیا کہ کسی کو علم نہ ہو سکے...... میرے فلیٹ میں پہنچ کر اس نے مجھے بتایا کہ اس کا شوہر اسے قتل کرنا چاہتا ہے......''

''کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟'' فاخرہ نے بے چینی سے سوال کیا۔

''یہ میں نے نہیں پوچھا تھا۔ بہرحال جونہی صبح ہوئی، مجھے صابر بیگ کی بیوی نے کہا کہ وہ آفس جائے اور حالات کا جائزہ لے اور مجھے تاکید کی کہ میں کچھ بھی محسوس نہ ہونے دوں۔ میں آفس چلا گیا۔ ابھی میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ آفس بوائے تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی بولا کہ میں آپ سے ہی ملنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے سنا ہے کہ میں جیسے ہی آفس میں آؤں، مجھے پکڑ لیا جائے...... مجھے آفس بوائے نے وہاں سے جانے کا کہا اور میں واپس چلا گیا۔ میں اپنے فلیٹ میں پہنچا تو صابر بیگ کی بیوی وہاں موجود نہیں تھی۔ اس دوران آفس بوائے کا فون آیا کہ میں کہیں بھاگ جاؤں کیونکہ وہ مجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ میں وہاں سے بھاگا اور شہر چھوڑ دیا۔ آخری بار فاخرہ میں تم سے ملا تھا اور مجھے بھاگنا پڑا تھا۔ دراصل ان کو یقین تھا کہ میں تمہارے پاس پہنچوں گا اس لیے تم ان کی نگرانی میں تھیں اور اس کے بعد تو انہوں نے تم کو چوبیس گھنٹے اپنی نگرانی میں رکھنا شروع کر دیا کہ جانے میں کب تم سے ملنے آ جاؤں......''

''ایسا کیوں کیا جا رہا تھا؟''

''ان باتوں کا ایک بندہ ہی جواب دے سکتا ہے۔'' کبیر نے دونوں کی طرف دیکھا۔

''کون......؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''صابر بیگ کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا ہے۔ اب مجھے کسی بھی طرح صابر بیگ کے پاس پہنچنا ہے...... اس زندگی سے میں اجیرن ہو گیا ہوں...... اب میں یہ سب ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' کبیر نے دانت پیس کر کہا۔

☆☆☆

صابر بیگ کے سامنے انسپکٹر براجمان تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور اس کے سر کے بالوں میں سفیدی نمایاں تھیں۔

صابر بیگ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر نے کچھ دیر قبل ہی اپنی بات مکمل کی تھی۔

''میں یہ بات پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میری بیوی کو

میری کمپنی میں کام کرنے والے کبیر نے پہلے اغوا کیا اور اس کے زیورات اپنے قبضے میں لیے، پستول اس کی پسلی سے لگا کر اس سے اے ٹی ایم مشین سے ایک بڑی رقم نکلوائی اور اس کے بعد شاید اس نے اسے قتل کر دیا ہے......"

"ان باتوں کا کوئی ثبوت نہیں مل رہا ہے کہ وہ انہیں بینک لے کر گیا تھا اور وہاں سے پیسے نکلوائے تھے۔"

"وہ میرا اور میری بیوی کا مشترکہ اکاؤنٹ ہے، میرے پاس اسٹیٹ منٹ ہے اور میں دکھا سکتا ہوں کہ اس دن کتنے پیسے نکلے تھے۔" صابر بیگ نے اپنی بات پر زور دیا۔

انسپکٹر نے اطمینان سے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔ "اب میں کچھ اپنی تفتیش بتاتا ہوں...... آپ کی قریبی دوست عاشی کا جہاں قتل ہوا وہاں کیمرے بھی لگے ہوئے تھے...... جس وقت وہ ایک نوجوان سے باتیں کر رہی تھی اور اسے کچھ حقیقت بتا رہی تھی وہاں ایک نوجوان چھپا بیٹھا تھا اور اس نے ان کی ساری باتیں سن لی تھیں جو اس نے پولیس کو اپنے بیان میں ریکارڈ کرائیں...... عاشی کا آپ کے ہاں بہت آنا جانا تھا جو ہم نے سی سی ٹی وی کیمروں کی مدد سے بھی دیکھا ہے...... جس نے عاشی کو قتل کیا تھا، اسے ہم نے گرفتار کر لیا ہے۔"

انسپکٹر کہنے کے بعد چپ ہو گیا اور صابر بیگ کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگا۔ اس کی بات سن کر پہلے تو وہ چپ رہا اور اس کے بعد اس نے ایک تمسخرانہ قہقہہ لگایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ جو بھی ایرا غیرا میرے بارے میں کچھ بھی بولے گا، وہ سچ ہوگا...... میں ایک بزنس مین ہوں مجھ سے درجنوں لوگ روز ملتے ہیں...... اپنی تفتیش کا رخ ٹھیک کیجیے انسپکٹر صاحب...... اور میری بیوی کے قاتل کو گرفتار کیجیے۔"

"آپ کو یقین ہے کہ وہ قتل ہو چکی ہیں؟" انسپکٹر کے سوال نے اندرونی طور پر صابر بیگ کو الجھا دیا۔

"کتنے ہفتوں سے وہ غائب ہے...... اس کا کوئی اتا پتا نہیں اور مجھے دل پر جبر کر کے یہ کہنا پڑتا ہے......"

"صابر بیگ صاحب...... میں آپ کو شاملِ تفتیش کر رہا ہوں اور کل آپ میرے پاس پولیس اسٹیشن آئیں گے۔" انسپکٹر کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور جانے کے لیے دروازے کی طرف چلا گیا۔

صابر بیگ اسے جاتا ہوا دیکھتا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔ جونہی انسپکٹر کمرے سے باہر نکلا، صابر بیگ نے موبائل فون نکالا اور کوئی نمبر تلاش کرنے لگا۔

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں کبیر، سمیع اور فاخرہ اس پرانے اور تنگ محلے سے نکلے اور ایک رکشے میں سوار ہو کر سیدھے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف چلے گئے۔

وہاں سے انہوں نے ٹیکسی کی اور اپنے شہر کی طرف رختِ سفر باندھ لیا۔ وہ راتوں رات واپس شہر پہنچ گئے تھے۔ کبیر نے جو جیکٹ پہن رکھی تھی، اس کے کالر کھڑے تھے اور ایک مفلر اس نے گردن کے گرد اس طرح سے لپیٹا ہوا تھا کہ اس کی شکل واضح نہیں تھی۔

وہ شہر تو پہنچ چکے تھے لیکن اب ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کس کے پاس جائیں......؟ پولیس میں صابر بیگ کے آدمی بھی ہو سکتے تھے۔ وہ ایک طرف کھڑے سوچ رہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ ان سے کچھ فاصلے پر ناصر بھی اپنے دو آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔

جب وہ تینوں ٹیکسی کی طرف جا رہے تھے تو وہاں ناصر کا آدمی موجود تھا۔ ناصر نے ہر اہم جگہ پر اپنے آدمی کھڑے کیے ہوئے تھے۔ اس نے ناصر کو اطلاع دی اور یوں ناصر ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا اور اس شہر تک پہنچ گیا۔

ناصر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور برق رفتاری سے وہ ان تینوں کی طرف بڑھے اور قریب جاتے ہی ناصر نے اپنا ریوالور فاخرہ کی پسلی کے ساتھ لگا دیا۔ ایک دم سے وہ ان کو دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔

"کوئی شور نہیں...... ورنہ آدھی رات کے اس سناٹے میں میری نکلی ہوئی گولی کی آواز بڑی دور تک جائے گی...... میرے ساتھ چلو۔"

وہ انہیں لے کر گاڑی کی طرف بڑھا اور کبیر کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ خود پچھلی سیٹ پر فاخرہ کے ساتھ بیٹھ گیا اور اپنے آدمیوں سے بولا۔ "اسے ٹیکسی میں بیٹھا کر پیچھے آجاؤ۔"

تھوڑی دیر کے بعد کبیر گاڑی چلانے لگا۔ پیچھے ناصر نے فاخرہ کی طرف ریوالور کا رخ کیا ہوا تھا۔ اور ان کے پیچھے ایک ٹیکسی آرہی تھی جس میں وہ تینوں بیٹھے ہوئے تھے۔

جس سے چھٹکارا پا کر وہ شہر چھوڑ کر بھاگے تھے وہ پھر اس کی گرفت میں آ چکے تھے۔

"مجھ سے بھاگنا آسان نہیں ہے۔ جگہ جگہ میرے آدمیوں کا جال تھا۔ تم لوگ بچ نکلتے تو وہ کمینہ مجھے جان سے

"مار دیتا......" یہ کہتے ہوئے ناصر نے موبائل فون نکال کر کال کی اور انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد جونہی رابطہ ہوا ناصر بولا۔ "میں نے تینوں کو پکڑ لیا ہے...... کہاں پہنچوں؟" ناصر ہدایت سننے لگا اور پھر فون بند کر دیا۔

"آگے سے دائیں موڑ لو......" ناصر نے کبیر کو حکم دیا۔

بیس منٹ تک ان کی کار سڑکوں پر دوڑتی رہی اور پھر وہ ایک فارم ہاؤس کے سامنے رک گئے۔ گیٹ کھلا اور کار اندر چلی گئی جبکہ پچھلی ٹیکسی خالی کرنے کے بعد انہوں نے وہ ٹیکسی جانے دی تھی۔

فارم ہاؤس کا گیٹ بند ہو چکا تھا۔ ناصر ان دونوں کو لے کر اندر چلا گیا۔ سامنے ایک ملازم کھڑا تھا، وہ انہیں ساتھ ساتھ ایک کمرے کی طرف بڑھا...... دروازے پر ہلکی دستک دی...... اور اس ملازم نے دروازہ کھول کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جونہی وہ اندر گئے...... کبیر بُری طرح سے چونک گیا...... سامنے صابر بیگ کی بیوی صوفے پر براجمان تھی۔

☆☆☆

ناصر کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی بات تو صابر بیگ سے ہوئی تھی اور اسی نے اس جگہ پہنچنے کے لیے کہا تھا لیکن اس کے بجائے اس کی بیوی موجود تھی۔ ان تینوں کی آنکھوں میں... حیرت تھی۔

صابر بیگ کی بیوی نے کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم ہی تھے وہ جس نے میری مدد کی تھی اور مجھے اپنے فلیٹ میں لے گئے تھے، ایسا نہ کرتے تو شاید میں آج زندہ نہ ہوتی......"

"آپ تو فلیٹ سے غائب ہو گئی تھیں؟" کبیر نے کہا۔

"صبح جب تم آفس گئے تھے میرے کہنے پر...... پیچھے ہی یہ لوگ آئے اور مجھے لے گئے، مجھے اس وقت پتا چلا کہ جو لوگ مجھے مارنے کے لیے لے جا رہے تھے، اور تم مجھے وہاں سے بھگا لے گئے تھے تو وہ لوگ تم کو جانتے تھے...... انہوں نے بتایا کہ کبیر لے گیا ہے۔"

"آگے کی کہانی کچھ میں اور کچھ صابر بیگ بتاتا ہے۔" اسی وقت عقب سے انسپکٹر، صابر بیگ اور دو اہلکار اندر آ گئے تھے۔ ان اہلکاروں نے ناصر کو اپنی گرفت میں کر لیا تھا۔ ان کے ساتھ سمیع بھی تھا۔

انسپکٹر نے صابر بیگ کو ایک طرف بٹھا دیا۔ اور پھر بولا۔ "یہ صابر بیگ ہے، جب اس نے اپنی بیوی کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تو انہیں کسی ویرانے میں لے جانے کے لیے اپنے پالتو غنڈوں سے مدد لی، لیکن اندر بیٹھی ہوئی بیگم صاحبہ مزاحمت کرتی رہیں اور ہینڈ بریک کھینچ لیا اور گاڑی رک گئی، یوں یہ تمہارے ساتھ بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئیں۔ جب صابر بیگ کے آدمیوں نے اسے بتایا کہ کبیر لے گیا ہے تو پھر اس نے سارا پلان بدل لیا اور بیوی کو قتل کر کے اس کا الزام تم پر لگانے کا منصوبہ بنا لیا لیکن تم بھی غائب ہو گئے۔" انسپکٹر بتاتے ہوئے رک گیا اور پھر توقف کے بعد بولا۔

"اپنی بیوی کو قید کر لیا اور تمہاری تلاش شروع کر دی، تمہارے خلاف رپورٹ بھی درج کرا دی کہ میری بیوی کو قتل کر کے رقم لے کر فرار ہو گیا ہے۔ جب تم نہ ملے تو اس نے ایک اور پلان بنایا کہ تمہارا دوست سمیع ہے اور وہ تمہیں ضرور تلاش کرے گا۔ سمیع کو پلان کے تحت ڈیل کر کے آفس سے نکالا، عاشی کو اس سے ملوایا اور عاشی نے مظلومیت کی کہانی سنا کر اسے کبیر کی تلاش میں لگا دیا اور پھر بھی صابر بیگ اپنے پلان پر عمل نہ کر سکا کیونکہ کہانی بدلتی رہی اور منصوبہ ہٹتا رہا۔ یہ ضرور ہوتا رہا کہ سمیع کو اُلجھانے کے لیے عاشی اور ناصر سچ اور جھوٹ بیان کر کے اسے اُلجھاتے رہے تھے۔"

"یہ اپنی بیوی کو کیوں مارنا چاہتا تھا؟" فاخرہ نے پوچھا۔

"اس کی شاہ خرچیاں، عیاشیاں ان میں لڑائی کا باعث بنیں، نوبت طلاق تک پہنچ گئی...... بیگم صاحبہ نے خلع لینا چاہا...... طلاق ہو جانے کا مطلب تھا کہ صابر بیگ سڑک پر آ جاتا کیونکہ جو کچھ تھا بیگم صاحبہ کا تھا اس لیے ان کے قتل کا پلان بنایا......"

"یہ پکڑا کیسے گیا؟" کبیر نے پوچھا۔

"جب میں صابر بیگ کے گھر گیا اور اس سے باتیں کیں، اپنی تفتیش کے بارے میں بتایا تو میں نے جونہی کمرے سے باہر قدم رکھا اس نے کسی کو فون کر کے کہا کہ انسپکٹر بہت کچھ جان گیا ہے...... پولیس اسٹیشن نہیں جانا چاہیے، اسے مار دو...... میں اسی وقت پلٹا اور اسے پولیس اسٹیشن لے گیا...... سب کچھ اگلوا لیا...... ناصر نے جب فون کیا تو میں صابر بیگ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔" انسپکٹر نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے یہ تھی دھند کے پیچھے کی ساری کہانی۔" سمیع سر ہلاتے ہوئے بولا۔

❖❖❖